دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

ستمبر 2016

نگران اعلیٰ
معراج رسول

عید مبارک

جلد 46 • شمارہ 09 • ستمبر 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السّلامُ علیکم!

ستمبر کا شمارہ عید قرباں سے ذرا پہلے پیشِ خدمت ہے۔ قارئین کو عید کی پیشگی مبارکباد۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں... تبدیلیاں ہی اٹل ہوتی ہیں ان کے سوا سب کچھ فنا ہو جانے والا ہوتا ہے۔ تندرست و توانا جانور زمین پر کھُر مار مار کر اپنے تیور دکھا رہا ہوتا ہے پھر پل بھر میں اسے گرایا جاتا ہے اور اللہ اکبر کے ساتھ وہ اپنے رب کے حضور قربان ہو جاتا ہے۔ سیف الملوک کے ایک گلیشیئر کے سائے میں سیلفی بنانے والوں پر اچانک گلیشیئر ٹوٹ کر گرتا ہے، کچھ بھاگ کر جان بچا لیتے ہیں، تین خواتین اس برفانی تودے تلے دب کر خالقِ حقیقی سے جا ملتی ہیں۔ ہزارہا برس سے یہ ہوتا آ رہا ہے۔ جو پیدا ہوا ہے، اسے موت ضرور دبوچے گی پھر اس فانی زندگی میں یہ معرکہ ہائے جور و ستم کیوں بپا ہوتے رہتے ہیں۔ زن، زر اور زمین پر جدال و قتال ہوتے ہیں۔ ہر طرف ہوس کے ہولناک سائے لرزاں نظر آتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ زندہ لوگ تابوتوں میں نہیں رکھے جا سکتے کہ جانے والے ہر شاہ و گدا کے چہرے پر کیسی بے کسی اور بے رونقی ثبت ہو جاتی ہے۔ رہے حکمراں تو وہ سجے سجائے، پھولوں سے لدے بند تابوتوں کا ہی نظارہ کرتے ہیں اور انہیں سلام کر کے اپنے محلوں میں چلے جاتے ہیں۔ جو کچلی ہوئی بے سروسامان لاشوں کو اپنے ہاتھوں سے سمیٹتے، غسل دیتے، کفناتے اور دفناتے ہیں، وہ عبدالستار ایدھی بن جاتے ہیں۔ ان کو مال کی پروا ہوتی ہے نہ جاہ و حشمت کی... وہ خاک نشین بن جاتے ہیں اور نفسی نفسی اپنے ہم نفسوں کی فلاح و بہبود کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ یہی اسلام کا درس ہے اور انسانیت کا بھی! کاش، ہم اور خصوصاً ہمارے حکمراں عبدالستار ایدھی مرحوم کی زندہ کی ہوئی روایت کو اپنے قول و فعل میں سمو سکیں... یوں ہو گیا تو سمجھیں ہم اپنی سرزمین کو جنت ارضی بنا لیں گے۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں قصہ ہائے زمین برسرِ زمین ہیں۔

ناظم آباد کراچی سے رانا بشیر احمد ایاز کی مکالمہ نگاری ''اگست کا شمارہ دو تاریخ کو ہی شام کے 6 بجے مل گیا لیکن سرورق کو دیکھ کر ایک جھٹکا سا لگا۔ ماہِ آزادی کا شمارہ اور وہ بھی پنک کلر کے رنگ سے مزین؟ لگتا ہے ادارے نے اپنی روایت بدل دی ہے۔ اگست کے حوالے سے ٹائٹل تو سبز رنگ کا ہونا چاہیے تھا، ایک جانب قومی جھنڈا لہراتا ہوا اور حسینہ کے حنائی ہاتھوں میں سبز اور سفید چوڑیاں ہونی چاہیے تھیں مگر ڈاکر انکل نے اس ٹائٹل پر توجہ نہیں دی اور تو اور اس دفعہ ادارے نے جشنِ آزادی کی مبارک بھی نہیں دی جو کہ ٹائٹل پر لکھنا ادارے کا خاصہ رہا۔ یہ تو تھا جناب ٹائٹل پر تبصرہ۔ کہانیوں کی فہرست اور اشتہارات کی دنیا سے آگے اپنی محفلِ دوستاں میں انٹری دی تو کراچی سے ادریس احمد خان کو ریاست جاسوسی کا بے تاج بادشاہ بنتے پایا۔ ایک دو مہینے کچھ ناگزیر وجوہات کی وجہ سے ہم محفل سے دور کیا ہوئے کسی نے بھولے سے بھی نہ پوچھا۔ چلو کوئی گل نہیں۔ محمد صفدر معاویہ بھی خوب صورت تبصرے کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ اسرار بشیر، محمد خواجہ، عبدالجبار رومی اور سید شکیل کا تبصرہ بھی محفل کی جان بنے رہے۔ باقی اس دفعہ پشاور سے محترمہ طاہرہ گلزار کی کمی محسوس ہوئی۔ طاہرہ باجی، مجھے بیلن سے بچانے کی فکر کرنے کا شکریہ۔ ویسے بیلن پڑنے کا ابھی کوئی چانس نہیں کیونکہ بیلن مارنے والی ابھی آئی ہی نہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سلیم فاروقی کی آتشِ جنون پڑھی۔ 71ء کی جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی کہانی کا ٹیمپو بہت تیز تھا۔ زلیخا نے جلد بازی میں اپنا ہی سہاگ اجاڑ دیا۔ کافی اچھی کہانی رہی۔ مغل اعظم صاحب کے انگارے اس دفعہ کچھ زیادہ ہی دہک رہے تھے۔ شاہ زیب نے بروقت صغیر کا بازو توڑ کر جو معلومات حاصل کیں آخر فائدہ اٹھا ہی لیا۔ گو شہزادے کی فلمی معلومات اور پہلوان حشمت کی شاعری بے ساختہ لوٹ پوٹ ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ شاہی جب بھی تاجور کو یاد کرتا ہے نہ جانے کیوں ہمارے دل کے کسی گوشے سے کسی اور تاجور کے نام کی دستک ہوتی ہے۔ جسے کوئی ضبط سے دبانا پڑتا ہے۔ نروان میں منظر امام صاحب نے دل چھو لیا۔ فہیم تین مہینے تک جنگل کی خاک چھانتا رہا لیکن پھر بھائی کی مدد کر کے ہی اس کو نروان حاصل ہوا۔ جب تک انسان حقوق العباد پورے نہیں کرے گا تو عبادات بھی قابلِ قبول نہیں ہوں گی۔ آوارہ گرد میں شہزاد خان کی آوارہ گردی حسبِ معمول عروج پر تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے گزارش ہے کہ کہانی کا ٹیمپو 4G سے کم کر کے 2G پر لائیں اور اول خیر، زہرہ بانو، وزیر جان، مز بیر خان... کو سامنے لائیں۔ تین چار اقساط سے یہ سب چھٹی پر گئے ہوئے ہیں۔ مسافت گزیدہ، ذوالفقار ایاز کی پہلی تحریر۔ اسلوب اور اندازِ بیان، مکالمہ نگاری اور کردار بہت شاندار، ویلڈن۔ انہیں نے ساری عمر ہندوستان سے وفاداری نبھائی۔ محبت اور وفا کے گیت گائے لیکن جو بویا وہ کاٹا۔ چھوٹی کہانیوں میں بہروپیا، ایک غلطی، زبان بندی، چالیس سال بس مناسب تھیں۔ کترنیں اس دفعہ کم لیکن لاجواب ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ بس گزارے لائق تھا لیکن دوسرے رنگ نے پہلے کی کمی پوری کر دی۔''

... نے لکھے ہیں... پہلے... ایک بار پھر حاضر ہیں۔ اگست کا شمارہ پانچ کو ملا۔ سرورق کی...

حسینہ کی نیلی آنکھوں میں ڈوب کر تیرتے ہوئے چٹکی نکتہ چینی میں پہنچے۔ جہاں کرسیِ صدارت پر ادریس احمد خان براجمان تھے، مبارکاں۔ احسان سحر کی دادی جان کے بارے میں پڑھ کر شدید افسوس ہوا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اسرار ساقی کا تبصروں پر تبصرہ پسند آیا لیکن ان سے گزارش ہے کہ کہانیاں بھی پڑھ لیا کریں۔ رضوان سلطان تنولی کی الٹی سیدھی باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ اس کے علاوہ محمد صفدر اور سید شکیل حسین کاظمی کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ مغل صاحب کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ قسط شاندار رہی۔ خصوصاً سانپوں والا سین پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آزادی اسپیشل میں زویا اعجاز کی مسافت گزیدہ بلاشبہ کہانی آف دی منتھ رہی۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ جاسوسی میں پہلی بار لکھ رہی ہیں۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد۔ کبیر عباسی نے بھی اچھا ڈیبیو کیا۔ نعمان کا منصوبہ بے شک شاندار تھا مگر سب مجرموں کی طرح نشان چھوڑ بیٹھا۔ مجموعی طور پر نئے رائٹرز نے اچھا لکھا۔ انہیں چانس دینے پر ادارے کو مبارک باد۔ پہلے نمبر پر سلیم فاروقی صاحب کا نام دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مگر کہانی پڑھ کر سارا جوش ٹھنڈا ہو گیا۔ پہلا رنگ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ آوارہ گرد کی پوری قسط میں کچھ خاص پیش رفت نہیں ہوئی۔ منظر امام صاحب کی نروان پڑھ کر احساس ہوا کہ روح کا سکون صرف خدمتِ خلق میں ہے۔ اس کے علاوہ چالیس سال اور ایک غلطی پسند آئیں۔‘‘

فیصل آباد سے شعیب الرؤف اور سیف الرؤف کی بلتے بازی ’’اگست کا جاسوسی ڈائجسٹ 3 تاریخ کو وڈے ویر شعیب کو ملا تو ہم دونوں نے صلح صفائی سے پڑھنے کی باریاں مقرر کر لیں۔ ٹائٹل کی سوہنی کڑی ہمیں دیکھ کے خوامخواہ شرما رہی تھی لیکن ہم نے اسے کوئی لفٹ نہیں کرائی اور سیدھا کہانیوں کی فہرست پر اڑان بھری جہاں دو پرانے تبصرہ نگاروں کے نام جگمگاتے دیکھ کر دل شالا مار باغ ہو گیا۔ تبدیلی آ نہیں رہی۔ تبدیلی آ گئی ہے۔ وڈے شاہ جی کی تجویز سے ہم دونوں بھائی اتفاق کرتے ہیں۔ طاہرہ آنٹی کے خطوط پر مشتمل کتاب جاسوسی ادب کے لیے عظیم تحفہ ہو گی اور وڈے شاہ جی نے پہچانا ہی نہیں بلکہ اصل بندہ برآمد بھی کر لیا۔ کہانیوں کی ابتدا زویا اعجاز کی مسافت گزیدہ سے کی۔ آزادی کا یہ خصوصی تحفہ شائقینِ جاسوسی کے لیے یادگار ہے۔ انیس احمد کا انجام دکھی کر گیا تو دوسری جانب دل میں شکرانے کے جذبات بھی پیدا ہوئے کہ ہمارے سروں پر اپنا سائبان اور پیروں تلے اپنی زمین ہے۔ ہمارا پاکستان۔ سرورق کا پہلا رنگ اچھا تھا مگر دوسرا رنگ زیادہ اچھا تھا۔ کبیر عباسی نے اچھی تحریر لکھی لیکن ان کے لکھنے کا انداز کاشف زبیر جیسا ہے۔ امید ہے اگلی تحریروں میں کبیر عباسی کا منفرد اسٹائل پڑھنے کو ملے گا۔ انگارے کی یہ قسط انتہائی اچھی تھی۔ سانپوں کی کھوہ میں شاہ زیب کی موجودگی اور نیگر پارا ہاؤس کے دونوں لڑکوں کے زہریلا ہونے کے انکشاف نے اس ناول کو ٹاپ آف آل بنا دیا ہے۔ اگلی قسط میں اب جانے کون سے گل کھلتے ہیں۔ آوارہ گرد اور محمد حفیظ کو ہم دونوں نے ہی ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ سلیم فاروقی کی کہانی نے بالکل پاکستانی کرکٹ میچ کے جیسا مزہ دیا۔ آغاز شاندار اور اختتام پہ بلاوجہ مایوسی۔ کہانی میں سلیم فاروقی نے پاکستانی کھلاڑیوں ہی کی طرح کئی غیر ذمے دارانہ شارٹس کھیلے۔ مختصر کہانیوں کا مطالعہ ابھی کرنا ہے۔‘‘

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کی خصوصی مبارک باد ’’دو تین ماہ کی مسلسل حاضری کے بعد بندہ ایک بار اگر تبصرہ نہ بھی لکھ سکے تو میرا نہیں خیال کوئی فرق پڑتا ہے۔ بالکل ایسا ہی سوچ رہا تھا کہ اس ماہ نکتہ چینی سے رخصت لیتا ہوں۔ ہم کون سا سو فیصد حاضری پر کوئی وڈا کپ مل جانا ہے، مگر یا حیرت... میرے دو انتہائی قریبی احباب محمد کبیر عباسی کا سرورق کا رنگ لکھنا اور اگست کے لیے زویا اعجاز کی خصوصی تحریر نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس دفعہ اپنی شمولیت کو یقینی بناؤں۔ یقیناً ان کے نام دیکھ کر کچھ لوگوں کے منہ بن گئے ہوں گے۔ جاسوسی ڈائجسٹ کس تاریخ کو ملتا ہے اب حساب نہیں رہتا۔ وجہ آپ جانتے ہی ہیں لیکن اتنا ضرور بتا دیا ہے کہ اگست کے پہلے ہفتے میں ہی ہم ڈائجسٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ سرورق میں صرف سبز رنگ کی کمی محسوس کی۔ اگست کا مہینہ اور سرورق سبز رنگ سے محروم رہے۔ یہ عدل نہیں شیخ صاحب، معذرت، بلکہ ساجد باقی ہو گیا۔ شگفتہ نہ ہوتی تو بات دور تک نکل جاتی۔ چینی نکتہ چینی میں اداریہ خوب لکھا گیا تھا جبکہ ابتدائی تبصرہ ادریس احمد خان صاحب کا تھا جو انتہائی جامع تھا اور ہومیو پیتھک بھی۔ یعنی ہر ایک کو آسانی سے ہضم ہونے والا تبصرہ۔ بنا کسی تردد کے احسان سحر صاحب دوسرے نمبر پر براجمان تھے۔ قانون کے ہاتھ لمبے ہوتے ہیں جبکہ آپ کی ناک لمبی ہے جو اتنی دور سے آپ نے جلنے کی بو سونگھ لی۔ ویسے بھی جلنے کے لیے ابھی تک کوئی وجہ نہیں مل سکی یہاں۔ حسد اور رشک میں بہت باریک فاصلہ ہوتا ہے اور یہ صرف لطیف لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسرار ساقی آپ شگفتہ کو نہیں جانتے؟ یہ جان کر شگفتہ انتہائی ناراض ہوئی ہے، یقین کریں۔ محمد صفدر معاویہ شکریہ تبصرہ پسند کرنے کے لیے۔ محمد انعام کے لیے بھی اظہارِ تشکر۔ عبدالجبار رومی کشمکش میں نظر آئے۔ جناب ایک ہنگامے پر موقوف ہے گھر کی رونق۔ کیا سمجھے؟ تبصرہ نگاری اور کبوتر بازی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا طاہرہ گلزار آنٹی کے تبصرے کی وضاحت رضوان بی یا ٹوٹی کے تبصرے میں موجود تھی۔ سوال اور اعتراض آنٹی کے تبصرے پر کیا گیا اور جواب ان کا بھائی دے رہا ہے۔ یعنی طاہرہ آنٹی کے آنچل میں ٹوٹی پہلوان چھپا ہوا ہے۔ اچھی بات ہے ویسے بھی باہمی تعاون سے ہی سارے کام ہوتے جاتے ہیں۔ علی رحمان کو واپس آنے پر خوش آمدید۔ اس دفعہ وہ کام بہت عجیب ہوئے۔ ایک تو کوئی صنفِ نازک شامل نہیں تھی چینی نکتہ چینی میں اور دوسرا نکتہ چینی کے صفحات بھی کم۔ خیر ٹوٹی پہلوان کو ہم دونوں اصناف کا مشترکہ نمائندہ سمجھ لیتے ہیں۔ ویسے بھی تو طاہرہ آنٹی کے تبصرے آدھے سے زیادہ اسی کی مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ بات ہو جائے کہانیوں کی تو... انگارے کی قسط اس دفعہ بہت شاندار تھی۔ مولوی

صاحب کی بیٹی جلد یا بدیر شاہ زیب تک پہنچنے والی ہے اور ہو سکتا ہے تاجور کے لیے بھی گھات لگ چکی ہو۔ دلچسپی کافی بڑھ گئی ہے۔ آوارہ گرد میں رینا کا مل جانا اتنا بڑا اتفاق؟ خیر یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن دوسرا مسئلہ سوشیلا بھی لگتا ہے نظریں پھیر گئی ہے۔ یہ مشکل ہو جائے گی شہزی کا کے کے لیے۔ اب بات کرتے ہیں سرورق کے رنگوں کی۔ پہلا رنگ فاروق انجم صاحب کا حصار۔ ہوس اور لالچ میں گرفتار لوگوں کی عبرت ناک کہانی۔ نیلم اور کاشف کی پریم کہانی تھوڑی عامیانہ سی لگی۔ باقی اچھا رہا یہ رنگ۔ کبیر عباسی کا دوسرا رنگ بے داغ منصوبہ بہترین کہانی ثابت ہوئی۔ واقعات اور کردار نگاری میں تسلسل سے کہانی کا مزہ دوبالا ہو گیا۔ نعمان قاتل ہوگا، یہ اس کا کردار سامنے آتے ہی پتا چل گیا تھا لیکن قتل کے اصل محرک نے آخر تک سسپنس میں مبتلا رکھا۔ مجموعی طور پر ایک شاندار تحریر۔ بہت مبارکباد۔ اب بات کرتا ہوں اس ماہ کی خصوصی تحریر مسافت گزیدہ کی جو کہ زویا اعجاز کی کاوش تھی۔ ماہ اگست کے لیے ایسی ہی تحاریر زیب دیتی ہیں۔ انیس احمد جیسے عاقبت نااندیش کے غرور کو خاک میں ملتا دیکھ کر بہت سکون پہنچا۔ اور اس آزادی کی قدر بھی محسوس ہوئی جو ہمارے بزرگوں نے ہزاروں نہیں لاکھوں جانیں قربان کر کے حاصل کی۔ جذبۂ حب الوطنی کو جواں کرتی ہوئی کاٹ دار تحریر کے لیے زویا اعجاز کو خصوصی مبارک باد۔''

راجن پور سے ماہ تاب گل رانا کی حاضری ''ایک طویل عرصے کی غیر حاضری کے بعد محفل کا چاند بلکہ چاندنی حاضر خدمت ہے۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ جاسوسی پر ایسا وقت بھی آئے گا جب اپنے پیارے جاسوسی کے لیے بھی ٹائم نہیں ہوگا لیکن بات وہی جیسے ساحر لدھیانوی فرما گئے تھے۔

میں اور تم سے ترکِ تعلق کی بات
دیوانہ کر دیا ہے غمِ روزگار نے

یا پھر تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! خیر اس مرتبہ تو جیسے ہی ایف بی پر پتا چلا کہ اپنے دو تبصرہ نگاروں کی تحریریں جاسوسی کا حصہ بنی ہیں، سوچ لیا کہ چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے سورج مغرب سے نکلے یا چاندوں میں، تبصرہ لکھنا ہی لکھنا..... اور جناب میں اپنے زبردست سے تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں۔ اب باقاعدہ طور پر تبصرے کا آغاز سرورق کے ساتھ۔ ارے یہ کیا پہلا جھٹکا۔ آزادی کا شمارہ اور نہ چاند نہ ستارہ..... ویری بیڈ۔ اب سرورق پہ نو مور تبصرہ۔ حد ہے یعنی کے۔ سرگوشیاں تو لازمی پڑھنا تھا اور مجھے اپنی پیاری محفل کی طرف۔ انکل جی کا ابتدائیہ تلخ حقائق پہ مبنی تھا سو اس سے نظریں چرا کے خطوط کی دنیا میں پناہ لینے میں ہی عافیت جانی۔ کرسی صدارت پر تشریف فرما تھے اور یس احمد خان، عمدہ تبصرہ اور مبارک باد۔ کرسی وزارت احسان سحر آپ کو بھی مبارک باد۔ شگفتہ آنٹی! اوہ سوری..... وڈے شاہ جی، کیوں ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئے طاہرہ آنٹی کے..... او چھوڑو جی بڑے بڑے شہروں میں چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ باقی تبصرے بھی اچھے رہے بس بہت سے پرانے دوستوں کی کمی محسوس ہوئی۔ امید ہے میرے پیچھے پیچھے وہ بھی آتے ہوں گے۔ اب ذرا بات ہو جائے تحریروں کی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے نا کہ ابتدا کہاں سے کی ہوگی۔ زویا اعجاز کی آزادی کے مہینے کی خاص تحریر مسافت گزیدہ بہترین کہانی حقائق پر مبنی ویلڈن زویا۔ پھر پہنچی سرورق کے دوسرے رنگ پہ کبیر عباسی کی بے داغ منصوبہ جو واقعی بے داغ تحریر رہی ڈھونڈنے کے باوجود بھی کوئی جھول کوئی کمی نہیں ملی، بہت بہت مبارک باد آپ کو کبیر۔ آوارہ گرد ڈاکٹر صاحب کے کیا کہنے شہزی کے ساتھ ہمیں بھی تھکا کے رکھ دیا۔ انفیکٹ ہمیں چکرا دیا۔ اب یہاں اور اب وہاں..... اب دیکھنا اسی سوچ میں گزرے گا کہ سوشیلا نون کی ہو یا.....؟ انگارے مغل انکل دیکھیے اب کیا انکشاف کرنے والے ہیں۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی صاحب کی آتشِ جنوں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسی ٹاپ کی ان کی پہلے بھی ایک تحریر سرورق کے رنگ پہ آئی تھی۔ اس میں بس یہ تھا کہ ہیرو نے جیل میں دوسری شادی کر چکا ہوتا ہے پاکستان آکے یا شاید پہلے سے شادی شدہ تھا۔ خیر کوئی نئی بات نہیں۔ چالیس سال میں چالیس سال کے طویل انتظار کے بعد آخر قاتل کو ڈھونڈ ہی نکالا، باقی ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی باتیں ''سرورق اگست 2016ء بے روزگاری کا مارا نوجوان نیلی آنکھوں والی کو انتظار کی آس پر لگا کر خود ایرانی بارڈر پار کرتے ہوئے زندگی کی حد پار کرتا نظر آیا، اب نیلی کیا کرے؟ لیلیٰ مجنوں کا دور تو ہے نہیں سو اس نے اللہ دار باس کا انتخاب کر لیا۔ کراچی میں بارش بھی ہوگئی۔ خوب جل تھل ہوا اور وہی ہوا جس کا اداریے میں ذکر کیا گیا۔ بعض علاقے تالاب کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کچرا تلف کرنے کے لیے ہمارے اداروں کے پاس ویژن نہیں ہے۔ محفل گزشتہ میں ہمارے سدا بہار تبصرہ نگار اویس خان کا راج تھا۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ بغیر مکھن مالش، تیل چونے کے اپنا کام چلا رہے ہیں۔ نہ کسی کو چڑاتے ہیں نہ اٹھا کر گراتے ہیں۔ نادر سیال! مجھے یوں لگا جیسے اللہ تعالیٰ نے میری سن لی، میں آپ کی رہائی پر کتنی خوش ہوں اس کا تصور بھی آپ نہیں کر سکتے۔ رضوان تنولی! آپ نے میری خواہش کا احترام کیا۔ میرا مان رکھا بے حد خوشی ہوئی پرفیوم لگا کے۔ کیا کروں کستوری بہت مہنگی ہے سو پرفیوم سے کام چلا رہی ہوں۔ سید عبادت کاظمی آپ کے والد صاحب اور افتخار اعوان کی شریکِ زندگی کی رحلت کا دکھ ہے۔ اللہ پاک آپ کو مزید غموں سے بچائے۔ رانا بشیر ایاز شکریے کے چار عدد ٹو کرے روانہ کر دیے ہیں قبول فرمائیے۔ معراج محبوب عباسی! شاعر نے جو کہا ہے وہ کچھ یوں ہے:

واقتیں کے ٹوٹنے کا فائدہ ہوا
اب ہے جھکے کا نہ کوئی ہماہر جھنیں جواب

اسرار ساقی! شگفتہ وہ ہیں جو اب تک حیران و پریشان ہیں کہ کس شگوفے سے پالا پڑا۔ احسان سحر! ہم نے تو اس لیے آپ کا ذکر نہ کیا سنا تھا آپ بھی تبصرہ چھوڑ، کہانی کار بننے چلے ہو۔ سوچا چلو کوئی اپنا ساتھی رائٹر کہلائے گا۔ کیا پتا تھا آپ ناراض ہو جاؤ گے۔ میانوالی کے لوگ سادہ اور مخلص ہیں اس کا پتا ہمیں تب چلا جب ہماری گل لالہ کی شادی وہاں ہوئی۔ طویل ترین تبصرے لکھنے کا اعزاز رکھنے والی طاہرہ گلزار اور مرحا گل جس ماہ نظر نہ آئیں، بے رونقی سی لگتی ہے۔ محمد صفدر معاویہ! آپ کی طرح میں بھی منظر سلیم، شوکت شہر یار، اعجاز راحیل، پری زے خان، بشریٰ افضل، سید اکبر، سعدیہ بخاری کی شدت سے منتظر ہوں۔ ہارٹ کچھ تو کبھی کبھی درشن کراتے ہیں۔ بڑے لوگ جو ٹھہرے۔ ہمایوں سعید، تفسیر عباس بابر اور ماہا ایمان تو قصۂ پارینہ بن چکے۔ عبدالجبار رومی، ایدھی کا ہم پلہ پاکستان میں تو کوئی ہو نہیں سکتا۔ محمد انعام لودھراں کورنگی کے محمد خواجہ علی رحمان اور محمد اقبال کے تبصرے خوب تھے۔ پھر دھرنوں کا موسم ہے اسلام آباد والوں کا پارا ہائی ہے۔ اس لیے ان کا ذکر پھر کبھی۔ انگارے سے آغاز کیا۔ پہلی بار ہمارے مغل بھائی ایسا ہیرو لائے ہیں جو کچی عاشقی میں مبتلا ہے اور عیاش بھی ہے۔ گناہ کر کے نادم ہونے والا۔ ہمیں رستم سیال، عمران جیسا ہیرو چاہیے۔ طاہر بھائی کچھ خیال رکھیں۔ پھر آوارہ گرد کا رخ کیا۔ کوہار اپچ نکلا۔ اب پھر کوئی حرام زدگی دکھائے گا۔ سوشیلا کی حب الوطنی کو سیلیوٹ۔ ملت فروش کوئی بھی ہو گوارا نہیں۔ شہزی ایک بار پھر مشکل میں ہے۔ تین جرنیلوں میں دو چار جرنیل مزید شامل کر لیں ڈاکٹر صاحب۔ پھر جمپ لگائی آتش جنوں کی طرف۔ 1947ء کے واقعات ہوں یا 65ء، 71ء کی جنگ کے، پڑھنے سے اجتناب کرتی ہوں۔ پڑھے نہیں جاتے۔ مگر نام چونکہ سلیم فاروقی کا تھا اس لیے کمر بستہ ہو گئی کہ اب جو ہو سو ہو، آتش جنوں سے اگر زلیخا کو نکال دیا جائے تو پھر کیا رہ جاتا ہے؟ عامر کو تو فولادی انسان بنا دیا کہ بیک وقت پانچ پانچ ٹرینڈ لوگوں کو مار دیتا ہے اور پکڑا بھی نہیں جاتا۔ پارسا بنتا ہے شادی بھی نہیں کرتا۔ سیدھی سادی زلیخا کو پھولن دیوی بنا دیا۔ انجام اتنا دل آزار، چھوٹی کہانیوں کو کھوجتے مسافت گزیدہ تک پہنچے۔ زدیا اعجاز اریب! تو آپ زویا اعجاز ہے۔ وہی قصہ تقسیم ہند مگر زویا کی خاطر ہمت باندھی۔ لفظوں کا چناؤ زبردست، پلاٹ پر مکمل گرفت، بہت خوب زویا اعجاز یقین ہی نہیں آ رہا کہ یہ آپ کی پہلی تحریر ہے۔ تاہم کہانی کے مندرجات سے متفق نہیں ہوں۔ اگر مبین احمد اوران کا خاندان لاہور کی چھوٹے موٹے سانحے جیسے سانحہ ماڈل ٹاؤن، بچوں کے اغوا اور زیادتی کیس وغیرہ وغیرہ سے دوچار نہیں ہوا تو اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ ادھر سب خیر ہے۔ کلمے کی ڈور سے بندھے وطن میں ہو کیا رہا ہے۔ 70 سالوں سے انہیں جھوٹ کھایا پڑھایا گیا۔ لوگ باشعور ہو کر بھی بے شعور ہیں۔ ملک کو دولخت کیا اور اب اس کی لخت لخت کرنے کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ عبادت گاہیں، اسکولز اور اسپتال کو دو ٹانگوں والے جانور نشانہ بنا رہے ہیں۔ جو ہمارے ہاں ہو رہا ہے وہ تو دنیا میں کہیں بھی نہیں ہو رہا ہے۔''

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا عذر ''اگست کا جاسوسی صدر بازار کراچی میں دستیاب ہوا۔ سرورق کو نہایت ہی خوب صورت طریقے سے سجایا گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا در اصل یہ ایک ناسور کی طرح کے لوگ گھر بیٹھے مزے سے تنخواہیں لے رہے ہوتے ہیں اور کئی تو ایسے سفارشی ہوتے ہیں جن کو پتا نہیں ہوتا کہ دفتر کدھر ہے بس تنخواہ آ رہی ہے۔ آخر کار کراچی کی عوام کی سن لی گئی اور اللہ پاک نے باران رحمت عطا کر دیا پھر وہی ہوا جس کا آپ نے ذکر کیا تھا۔ اپنی محفل میں آئے تو ادریس احمد خان کو اچھے تبصرے کے ساتھ پایا۔ احسان سحر اللہ پاک آپ کی دادی کو جنت الفردوس میں مقام اعلیٰ نصیب فرمائے اور آپ کو صبر کی ہمت دے۔ اسرار ساقی بھائی بھی بہترین تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بنے۔ محمد انعام کا شکوہ بجا اور خواجہ صاحب کا فکر مند ہونا بجا۔ ہم کہہ رہے ہیں کہ حالات ہی ایسے ہیں۔ عبدالجبار رومی، شکیل حسین، علی رحمان کی بھرپور

آہ...... مختار آزاد

صیغۂ ماضی استعمال کرتے ہوئے دل دکھ رہا ہے مگر مشیت ایزدی یہی تھی۔ سانس گنے جا چکے تھے اور 18 اور 19 اگست کی درمیانی شب اس نے اپنے سانس پورے کر لیے۔ عجب آزاد مرد تھا، نام کا بھی اور کام کا بھی۔ مختار آزاد نے کبھی کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ بس اپنے بچوں سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ آزاد منش تھا اس لیے کبھی کہیں ٹک کر کام نہیں کیا۔ جب بھی مصلحت کوشی سامنے آئی اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ بہت بارسوخ لوگوں سے بے تکلفی تھی لیکن کبھی کسی کی کاسہ لیسی نہیں کی۔ بڑوں کی خوشامد نہ کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ اکثر و بیشتر اپنی مسہری پر دراز، اپنے لیپ ٹاپ کو سینے سے لگائے فری لانسر کے طور پر اپنی روزی کماتا رہا۔ متعدد سرکاری و نیم سرکاری ادارے، این جی اوز اور افراد اس کے ہنر سے فیض یاب ہوتے رہے۔ سندھی، اردو اور انگریزی میں اس کی یکساں مہارت نے اسے بہت سے حلقوں میں مقبول بنایا ہوا تھا۔ بی بی سی سے نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے معتبر اور خوش حال اداروں میں کام کیا۔ اس ادارے کے لیے اس کی فطری اہمیت تھی۔ وہ جاسوسی ڈائجسٹ کی مدیرہ کی بیٹی کا شوہر اور ایک اچھا اخباری تھا۔ ابھی اسے سر کا تاج

تبصرہ نگاری اچھی رہی۔ کہانیوں میں آتشِ جنوں سے شروع کیا، زلیخا کا آتشِ جنوں سب کچھ بہا کر لے گیا۔ اگست کے مہینے کے لحاظ سے بہترین کہانی تھی کہ کچھ پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ انگارے تک پہنچے۔ سجاول اور شاہی نے ابراہیم کو چھڑوالیا۔ باقی کہانی ابھی پاراہاؤس میں الجھی ہے کہ کیا دونوں لڑکے بھی زہریلے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اگلی قسط کون سے بکھیڑے لے کر آتی ہے۔ آوارہ گرد تک پہنچے۔ شہزی بہت برے شکنجے میں پھنس گیا۔ آخر میں سوشیلا کا بدل جانا سمجھ نہیں آرہا۔ بہرحال اگلی قسط کا انتظار ہے۔ سرورا کرام کی ایک غلطی مختصر پر بہترین کہانی تھی۔ استاد کا حق بنتا تھا کہ اس بارے میں بھی کوئی گُر بتاتا۔ محمد فاروق انجم کی حصار سرورق کا پہلا رنگ بنی۔ ایک غلطی انسان سے کیا کیا کرواتی ہے یہی کچھ کاشف حسن، نیلم اور خیام کے ساتھ ہوا پھر قسمت خراب کہ ڈکیتی بھی اسی وقت ہوئی تھی جب چنگیزی پیسے لے چکا تھا۔ کبیر عباسی بے داغ منصوبے لے کر آئے، واقعی نعمان کا منصوبہ بالکل سیف تھا پر آگے درانی جیسا آفیسر نہ ہوتا تو پھر ممکن تھا کہ نعمان نہ پکڑا جاتا۔ باقی کہانیاں اچھی تھیں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اتنا ہی لکھ پایا اگر زندگی باقی رہی تو انشاء اللہ بھرپور تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گے۔“

لاہور سے **عبدالجبار رومی انصاری** کی دل داری ”حسنِ مشرق کی جدید دوشیزہ کی آنکھوں میں لالی دہکتے رخساروں کے ساتھ ہونٹوں پر مسکراہٹ عجیب لگی۔ پہلو میں مرد جاسوسی کا آئینہ دار لگا جبکہ پہاڑ کی چوٹی پر خودکشی کا منظر بھی بزدلی کا تصویر بنا ہوا تھا۔ جہاں تک قدرتی آفات کا تعلق ہے تو قومی ادارے ان کے نازل ہونے کے بعد ہی حرکت میں آتے ہیں، پہلے سے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوتی ورنہ ایسی قدرتی آفات پر آدھے سے زیادہ کنٹرول حاصل ہوجائے اور نقصان بھی نہ ہونے کے برابر ہو۔ ایک دفعہ پھر کوئٹہ کی دہشت گردی نے ہلا کے رکھ دیا۔ یہ سب حکمرانوں کی نااہلی ہے جو عوام کی جان و مال کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ ادریس احمد خان کی شمولیت، مبارک ہو جناب۔ احسان سحر کی شاعرانہ طبیعت کچھ بوجھل سی لگی۔ اسرار ساتی آپ کو خوش دیکھ کر لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ صفدر بھائی کراچی میں تو کچھ زیادہ ہی بادل برس گئے تھے۔ محمد خواجہ کا بحر اور لحمہ فکریہ اچھا تاثر دے گیا۔ رومی انصاری کی کتھا نگاری اچھی لگی۔ یہ کستوری کی خوشبو کافی عرصے بعد محسوس ہوئی کہاں رہی ہوئی تھی جناب؟ سید شکیل حسین کاظمی کا عذر بھی ٹھیک ہے چلو تبصرہ تو حاضر ہے۔ علی رحمان کی واپسی پر تبصرہ نگاری بیسٹ رہی۔ محمد اقبال ہمارا تسلسل ٹوٹ بھی جائے تو خیر ہے پر قومی کرکٹ ٹیم کا تسلسل ٹوٹتا تو پوری قوم کو مایوس کردیتا ہے۔ آتشِ جنوں زرک دست زرینی ہیرا منڈ پر آکے سارا حجرہ کر کرا کر دیا۔ جس نے بھان کو پالیا اس نے خدا کو پالیا اور اپنی روح تلاش کرلی۔ شاید یہی انسان کا اپنے مرکز کی طرف لوٹنا ہے اور اسی کو ”نروان“ بھی کہتے ہیں۔ سجاول اور شاہ زیب کا ابراہیم کو تاقب وغیرہ سے واپس لانے میں پاراہاؤس کی ہلچل بھی جچی اور کچھ انگارے ٹھنڈے پڑ گئے کہ چاند گڑھی سے جو گرم ہوا آرہی ہے... اس سے انگارے پھر دہکنا شروع ہوں گے۔ دیکھنا ہے اب کون سا اپ سیٹ سامنے آتا ہے۔ نیشی کی موت سے ایڈم معذوری کی شل چلا اور رابرٹ چالیس سال بعد فریڈرک سے انتقام لے پایا۔ یہ دل کا درد ہی تھا جو وہ چالیس سال تک محسوس کرتا رہا بھی تو اس درد نے دماغ کو بھی ہلا کے رکھ دیا تھا۔ آدمی کو کبھی بھی گزرے ہوئے کل پر فخر نہیں کرنا چاہیے، یہ طاقت نہیں بلکہ تکلیف دہ کمزوری ہے۔ لیجیے پرائے ہوئے تھے اپنے اور پھر اپنے ہی ہوئے پرائے۔ سوشیلا جو شہزی کا دم بھرتی تھی ایک دم سے اس کے خلاف ہوگئی دیکھتے ہیں اب شہزی بچنے کے لیے اگلی چال کون سی چلتا ہے۔ شاید سوشیلا بھی آوارہ گرد کو ٹھیک سے جان نہیں پائی۔ جاسوسی میں بعض اوقات چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی اہمیت اختیار کرجاتی ہے جیسے کہ جوتے کی گواہی، اور ان لارڈ ولنگر کی تفتیش نے مجرم اور سرقہ شدہ سامان کو آخر ڈھونڈ ہی نکالا۔ بے داغ منصوبہ بھائی دماغ نعمان نے منصوبہ تو خوب ترتیب دیا جس میں جان علی بے گناہ مارا گیا اور معصوم دوشیزہ صبا کے ساتھ زیادتی کے مجرم بھی نعمان نے کیفرِ کردار تک پہنچادیے یوں کڑی

چلا گیا، ادارہ ایک اچھے کہانی کار اور مترجم سے محروم ہوگیا۔ وہ مدت سے اندر ہی اندر ایک شوگر مل پال رہا تھا۔ یہ فیکٹری دن رات اس کے وجود میں برسرِ کار رہتی تھی۔ دل میں آتی تو روز پیداواری ریکارڈ دیکھتا ورنہ ہفتوں خبر نہ لیتا اور اسی شکر سازی کے طفیل اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب اس کے دل پر ایک کاری وار ہوا ہے۔ لیاری جنرل اسپتال سے ہوتا ہوا امراضِ قلب کے ادارے میں پہنچا تو پتا چلا کہ دل کی گلیاں لہو کی آبیاری سے تقریباً محروم ہیں۔ سینہ چاک ہوا، نشتر چلے، تین شہ رگوں میں پیوند کاری ہوئی، چراغِ سحری کی لو تیز ہوئی۔ اس کی صحت یابی کی امیدیں بندھیں پھر یکا یک علم ہوا کہ گردے تھک چکے ہیں اور وہ اپنے بیوی بچوں اور ہم سب سے بچھڑ گیا۔ اللہ اس کی مغفرت فرمائے اور اس کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

سے کڑی مل گئی اور لوٹا اپنی کھوئی عزت کا انتقام لے رہی تھی جبکہ فاروق کو قدرتی طور پر سرزنش مل گئی کہ اب لڑکیوں کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے یوں بے داغ منصوبہ بھی اپنے انجام کو پہنچی۔ سب کہانیاں ایک دم سے زبردست ہیں۔''

گوجر خان سے عرفان راجہ کا پروانہ ''ماہ اگست کا شمارہ 6 اگست کو موصول ہوا۔ ٹائٹل یکسانیت کا شکار ہے، براہِ مہربانی کوئی تبدیلی لائیں۔ ویسے جشنِ آزادی مبارک کے الفاظ سرورق پر لکھنے سے کوئی خرچہ زیادہ ہو جانا تھا؟ اور یس احمد خان کی شمولیت حسبِ روایت بہترین رہی۔ احسان سحر! آپ فلسفی بن گئے ہو بھئی۔ اسرار ساقی صاحب نے محفل پر تبصرہ لکھ مارا۔ صفدر معاویہ جی! شمارہ کراچی سے لیا اور تبصرہ خانیوال سے۔ واہ کیا بات ہے، ویسے تبصرہ بہترین لکھتے ہو۔ انعام صاحب بھی شکوہ کرتے نظر آئے۔ محمد خواجہ، رضوان تنولی، عبدالجبار رومی انصاری بھی زینت بنے۔ وہ بھی خوب صورت انداز میں۔ شکیل کاظمی صاحب لگتا ہے کتابی شکل کا مشورہ محترمہ شگفتہ کا ہی ہے۔ علی رحمان اور محمد اقبال کو دوبارہ خوش آمدید۔ اس بار حیرت کی بات یہ ہے کہ محفل میں ایک بھی صنفِ نازک جگہ حاصل نہ کر سکی۔ انگارے کی قسط نمبر 14، شاہ زیب اور رجاول کا تیز رفتار ایکشن، ابراہیم کا بازیاب ہونا، اور اب شاہ زیب اینڈ کمپنی کا پارا ہاؤس کی پرپیچ عمارت میں پوشیدہ انوکھا اسرار و راز کی تلاش میں ہونا تجسس چھوڑ گیا۔ مغل صاحب نے الفاظ کا جادو خوب بکھیرا۔ آوارہ گرد میں شہری میاں۔ سوشیلا کے سنگ انڈیا میں سنگ دلی کا مظاہرہ تہلکہ خیز انداز میں کر رہے ہیں۔ جشنِ آزادی کا شاہکار مسافت گزیدہ محترمہ زویا اعجاز نے الفاظ کے خوب صورت موتی جاسوسی کی نذر کیے۔ انیس احمد نے جو سلوک غیروں کی حمایت میں اپنے چچا اور ان کے خاندان کے ساتھ کیا، بدلے میں وقت نے اسے ایسی چوٹ لگائی کہ وہ تلملا اٹھا اور عقل ٹھکانے آگئی لیکن اس وقت پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ اب بات ہو جائے اپنے ہم پیشہ دوست کبیر عباسی کی بے داغ منصوبہ کی۔ پہلی ہی کاوش اتنی کارسائی سے پیش کی کہ ہم نے انگلیاں دانتوں میں دبالیں۔ نعمان نے انتقام میں اندھا ہو کر حاکم اور نور کو بھی موت کی بھینٹ چڑھا دیا لیکن دُرانی کی ذہانت سے جرم کی گتھی سلجھ گئی۔ عباسی صاحب کو مبارک باد کے ٹوکرے۔ حصار کہانی کچھ خاص نہیں لگی۔ کاشف قاسم اسد ہوٹل میں گیا اور پھر اس کا دوست خیام پستول لے کر گیا۔ ایسے ہوٹل میں پستول لے جانا، وہ بھی آسانی سے، ہضم نہیں ہوا۔ آتش جنوں کا آغاز جتنا شاندار تھا، اختتام اتنا ہی بدمزہ اور رنجیدہ تھا۔ عامر کا انڈیا کی فوج کو ناکوں چنے چبوانا خوب لگا لیکن زلیخا کا عامر کو مارنا کہانی کے سارے مزے کو کرکرا کر گیا۔ خونی اتفاق میں مسز آرویل اور میری نے شوہروں سے جان چھڑائی لیکن شیرف کی ذہانت بھی خوب کام آئی۔ زوان بھی معاشرے میں مثبت پہلو کو اجاگر کرتی تحریر تھی۔ چالیس سال میں رابرٹ نے نینسی کے قاتل کو آخر کار چالیس سال بعد کیفرِ کردار تک پہنچا دیا۔ دلچسپ تحریر رہی۔ ایک غلطی میں تو پارکنگ نے نواز کو پولیس کی ہتھکڑی سے نواز دیا۔''

اٹک جیل سے اسرار ساقی کی بادہ پیمائی ''ماہ اگست کا شمارہ تھوڑا لیٹ ملا یعنی کہ 10 تاریخ کو، جب ملا تو دل کو قرار آگیا، ایسے لگا کہ ہماری کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رسالے کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور ادارے والوں کو لمبی صحت والی زندگی دے آمین۔ ٹائٹل پر نظر پڑی تو حسینہ کا دیدار کیا۔ اوپر بیٹھے اپنے رقیب کو غصے کی حالت میں چھوڑ کر ہم اوارئیے تک جا پہنچے۔ یوم آزادی کی مبارک باد لیتے اور روتے ہوئے سیلاب کی تباہ کاریوں کا جائزہ لیا، یقین مانیں دل خون کے آنسو روتا ہے، یہ تباہ کاریاں پہلی دفعہ نہیں ہوئی ہیں۔ ہر سال یہی حال ہوتا ہے، غریب آدمی دربدر ہو جاتے ہیں، لوگوں کی مال و جان کی حفاظت حکومت کا کام ہے پر ان لوگوں کو اپنے عالیشان گھروں میں بیٹھ کر سوائے اعلانات کرنے کے کیا آتا ہے۔ ہمارے ملک میں سب سے بڑا المیہ ہے کہ ہمارے حکمران جب بھی ایسی ویسی صورتِ حال ہوتی ہے تو اپنی سیاست چمکاتے ہیں یا پھر دھرنا دے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ناگہانی آفتوں سے محفوظ رکھے، آمین۔ اس کے بعد چلے اپنے دوستوں کی محفل میں، آغاز ہی میں اور یس احمد خان موجود تھے وہ واقعی پہلے نمبر کے حق دار تھے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ احسان سحر بھائی مختصر تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ کاظمی صاحب کو تسبیح پڑھنے کا مشورہ دیتے نظر آئے۔ تبصروں کے کنگ اور میرے آئیڈیل تبصرہ نگار محترم جناب بھائی صفدر معاویہ صاحب دعاؤں اور حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ۔ بھائی جان میں سسپنس رسالے میں آپ کے شعر بھی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں، آپ انتہائی اچھے انداز کے ساتھ لفظوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی صحت زندگی دے، آمین۔ لودھراں سے انعام صاحب شکوہ کرتے نظر آئے۔ بھائی جان آپ غیر حاضر نہ ہوا کریں آپ کی حاضری ہمیں اچھی لگتی ہے۔ پیارا تبصرہ تھا۔ کراچی سے خواجہ صاحب تشریف فرما تھے جناب کے کیا کہنے رسالے پر گہرا اور جامع تبصرہ کرتے ہیں ویلڈن۔ لاہور سے جناب عبدالجبار رومی صاحب بہترین تبصرہ لے کر حاضر تھے تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ بڑے ٹائم کے بعد رضوان تنولی کریزی کستوری لگا کے حاضر تھے جناب تو پرانے تبصرہ نگار ہیں پھر اتنی غیر حاضری کیوں محفل میں آتے رہا کریں اچھا لکھتے ہیں تبصرہ پسند کرنے پر شکریہ جناب کا۔ اس کے علاوہ سید شکیل کاظمی صاب بھی حاضر تھے جاندار تبصرہ لے کر۔ علی رحمان کی واپسی اچھی لگی ویلکم بیک۔ محمد اقبال صاحب بہترین لکھنے والے ہیں اس کے علاوہ چند دوست محفل سے واک آؤٹ ہیں، محترمہ طاہرہ گلزار صاحبہ، مریم گل چوہدری، سرفراز، مشال اینڈ نوال، نادر سیال، باجی بلقیس آپ لوگ کدھر ہیں جلد حاضر ہوں، اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف تو سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی انگارے سے اسٹارٹ لیا۔ انتہائی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ شاہ زیب نے نہایت حاضر دماغی اور دلیری سے ابراہیم کو بازیاب کرایا، اینی کا کردار نہایت دلچسپ ہے۔ کہانی میں ایسے کردار کا ہونا بہت ضروری ہے جو آپ کو تھوڑا بہت ہنسا بھی

دیتا ہے۔طاہر جاوید مغل صاحب دیلڈن۔اس کے بعد آوارہ گرد پڑھی۔شہزاد عرف شہزی دلیری کے ساتھ دشمن ملک میں اپنی فتح کا جھنڈا گاڑتا آگے بڑھ رہا ہے۔ اینڈ میں سوشیلا کی حرکت پریشان کر دینے والی تھی دیکھتے ہیں کہ آگے کیا ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آتش جنوں دلچسپ کہانی تھی خون کو گرما کر رکھ دیا۔ایسی کہانیاں زیادہ ہونی چاہئیں جو وطن سے محبت کا پیغام دیں۔''

کراچی سے **محمد اقبال** کے جذبات ''ماہ اگست کا موسم شروع ہی سے میرا پسندیدہ موسم رہا ہے۔ اگست کا مہینہ شروع ہوتے ہی بادلوں کی ٹکڑیاں آسمان پر مٹرگشت شروع کر دیتی ہیں جس سے طبیعت پر سرور کی کیفیت رہتی ہے بلکہ اس بار تو کراچی میں بارش نے بھی خوب جل تھل مچائی اور کراچی والوں کے لیے باران رحمت کے ساتھ نشیبی بستیوں میں پریشانی کا باعث بھی بنی، بہرحال یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ جاسوسی ہاتھ میں آیا تو طبیعت خوش ہو گئی لیکن یہ دیکھ کر ساری خوشی کافور ہو گئی کہ ماہ اگست اور پھر 14 اگست پورے پاکستان میں دھوم دھام سے منائی جاتی ہے لیکن ہمارے پیارے جاسوسی کے ٹائٹل پر ایسی کوئی نشانی نہ مل سکی جس سے یہ تاثر ملتا کہ ادارے نے 14 اگست منانے میں اپنا حصہ ڈالا ہے، اب اسے ذاکر انکل کی کوتاہی کہا جائے یا ادارے کی بہرحال جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ٹائٹل سے نظریں چرا کے فہرست پر نظر ڈالی تو زدیا اعجاز کے نام نے چونکا دیا۔کیونکہ یہ نام ہماری محفل میں بھی ہوتا ہے شاید وہی ہوں۔فہرست سے ہوتے ہوئے پہنچے دوستوں کی محفل میں جہاں کراچی سے ادریس احمد خان اپنے دلکش اور خوب صورت طرز تحریر کے ساتھ پہلے نمبر پر براجمان تھے، بہت بہت مبارک ہو آپ کو۔دیگر دوستوں میں محمد صفدر معاویہ، اسرار بشیر محمد خواجہ، عبدالجبار رومی اور سید شکیل کاظمی کے تبصرے بہت پسند آئے۔باقی دوست ناراض نہ ہوں سب نے اپنا حصہ بھرپور طریقے سے ڈالنے کی کوشش کی۔محترمہ طاہرہ گلزار کی کمی محسوس ہوئی۔کہانیوں میں حسب عادت طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے سے شروع کیا اور پڑھتے رہے پڑھتے رہے کہانی کے بیچ نے وقفہ کرنے کی اجازت نہیں دی، شاہ زیب نے ہمیشہ کی طرح اپنے آپ کو پیچھے رکھتے ہوئے اپنی کامیابیوں کو دوسرے کے حصے میں ڈالنے کا کام جاری رکھا ہوا ہے، پہلے یاسر بھائی کے کردار کی داد واہ کروا دی، اب یہاں پر سجاول ڈکیت کو ہیرو بنا کر پیش کیا ہوا ہے۔بہرحال خوب اجاگر کیا ہم نے۔اس کے بعد باری آئی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد کی جس میں شہزی تن تنہا اپنے دشمنوں سے پڑوسی ملک میں برسرپیکار ہے۔بھٹی صاحب نے اسے خوب صورتی سے دشمنوں سے بچایا ہوا ہے لیکن بھٹی صاحب سے درخواست ہے کہ اب اسے واپس پاکستان لے آئیں، یا پھر پاکستان میں اس کے دیگر ساتھیوں کا تذکرہ بھی کہیں بیچ میں لے آئیں تاکہ باقی کردار ان کو قاری بھول نہ جائیں۔اس کے بعد حکیم فاروقی کی لکھی گئی تحریر آتش جنوں پڑھی جو 71ء کے حوالے سے تھی، اس نے ہمارے حب الوطنی کے جذبے کو جگا دیا، پڑھ کر کیا احساسات تھے انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا بس ادارے سے اتنی گزارش ہی کر سکتے ہیں کہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہر دوسرے یا تیسرے مہینے میں حب الوطنی کے جذبے سے سرشار کہانی ضرور شائع کی جائے، اس سے نوجوانوں کو اپنے ملک سے محبت کی بہترین ترغیب دی جا سکتی ہے۔زدیا اعجاز کی مسافت گزیدہ نے واقعی حیران کیا، بہت عمدہ طرز تحریر تھی، لکھتی رہیے گا، رائٹرز میں اچھا اضافہ ہیں۔نروان میں منظر امام نے کمال کیا۔پہلا رنگ فاروق انجم صاحب کا حصار اچھی تحریر تھی۔چھوٹی کہانی زیر مطالعہ ہیں۔''

کاشف عزیز کا شکوہ کوٹری سے ''کئی بار بک اسٹال کے چکر لگانے کے بعد بالآخر اپنا پیارا جاسوسی مل ہی گیا ٹائٹل پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد سرسری انداز میں فہرست دیکھی اور اس کے بعد اشتہارات سے ہوتے ہوئے اداریہ پڑھا، اس کے بعد دل تھام کر دوستوں کی محفل میں اپنا نام تلاش کرتے رہے، بالآخر کامیابی ہوئی مگر یہاں بلیک لسٹ میں۔کئی بار کی ناکامیوں کے باوجود مسلسل خط ارسال کر رہا ہوں کہ شاید کبھی ہمارا خط بھی دوستوں کی محفل میں جگہ بنا سکے۔کراچی سے ادریس احمد خان کو بہت بہت مبارک باد، پہلے نمبر پر براجمان ہونے کی۔بہت اچھا لکھتے ہیں۔محمد صفدر معاویہ بھی خوب صورت تبصرے کے ساتھ موجود تھے ان کا انداز بھی بہت عمدہ ہے۔اسرار بشیر محمد خواجہ، عبدالجبار رومی اور سید شکیل کاظمی بھی محفل کی رونق ہیں۔پشاور سے محترمہ طاہرہ گلزار کی کمی محسوس ہوئی۔ایک اور بات نے چونکایا کہ صنف نازک کی تعداد کم تھی، کیا سب نے بائیکاٹ کیا ہوا ہے یا دھرنوں میں شرکت کی ہوئی ہے، خدارا ایسا نہ کریں، صنف نازک سے ہی تو کائنات میں رنگ ہیں اور ہمارے جاسوسی میں بھی، آپ لوگوں کی ہلکی پھلکی نوک جھونک مزہ دیتی ہے اس لیے سب خواتین سے درخواست ہے کہ اپنی واپسی کو یقینی بنائیں۔کہانیوں میں تیز رفتاری سے اسٹارٹ لیا جہاں مختار آزاد اپنی قلمکاری کے جوہر دکھا رہے تھے اچھی کہانی تھی۔منظر امام کی کیا بات ہے نروان میں ان کی تحریر نے متاثر کیا۔بہروپیا میں جمال دستی نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ایک غلطی، سرور اکرام کی شگفتہ سی تحریر تھی۔بے داغ منصوبہ میں کبیر عباسی نے بھی متاثر کیا۔عبدالرب بھٹی صاحب کی آوارہ گرد، اور طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے اس لیے نہیں پڑھی کہ پہلے خط لکھ کر ارسال کر دوں تاکہ وقت پر ادارے کو مل سکے اور ہم بلیک لسٹ سے وائٹ لسٹ میں اپنے نام کا اندراج کروا لیں، زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گے۔''

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شامل اشاعت نہ ہو سکے۔

روبینہ حنیف، کراچی۔عمران ملک، منڈوآدم۔حرا افتخار، حیدر آباد۔ہما انصار، کراچی۔شاکر لطیف۔(شاکر لطیف صاحب اگر آپ اتنے ہی بدگمان ہیں تو تواتر سے ہمیں کہانیاں ارسال کیوں کر رہے ہیں، تسلی، صبر اور یقین سے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ہمارے پاس صرف آپ ہی کی کہانیاں نہیں آتیں، اور بھی حضرات ہیں جو کہانیاں ارسال کرتے ہیں۔)

فتنہ

کاشف زبیر

زندگی میں کچھ ملے نہ ملے بس اچھی رفاقت ہو تو کوئی غم نہیں... کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شام کسی کے لیے اندوہ گیں ہے تو کہیں ہر سمت جیسے چراغاں ہوا ہو... وہی روز کے قہقہے، قمقمے جیسے جشنِ طرب ہو... وہی رقص گاہوں کے منظر... نغموں کا سیلاب... بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رہ گیر... خوش بخت پیکر... اور وہی زندگی کی روشنی... لیکن اس کی دنیا میں صرف اندھیروں کا بسیرا تھا... ظلمتیں نوحہ کناں تھیں... زندگی میں رفاقت کا دم بھرنے والے محبوب نے ایسا دھوکا دیا تھا کہ اس کی دنیا اندھیر کر دی تھی... مال و دولت کے ساتھ سب خوشیاں بکھر گئی تھیں... بے وفائی کی چوٹ نے تلخی کے عنصر کو بڑھا دیا تھا... بس اب انتقام لینا ہی اس کا مقصد تھا... مگر وہ اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ جو محبت کرتے ہیں وہ انتقام کے شعلوں کو بجھانے کی کیا سکت رکھتے ہیں...؟ انہی الجھاؤں میں آگے بڑھتی ایک سنسنی خیز داستاں کے دلربا و دل شکن مناظر...

ذہانت و فطانت میں یکتا ایک حسینہ کی فتنہ انگیزیاں... ایک زمانہ اس پر فدا تھا

کیوبا کے قید خانے کی کوٹھری دو طرف سے سنگی دیواروں اور ایک طرف سے فولادی سلاخوں سے بند تھی۔ سلاخوں کے پاس کھڑکی نما شیشہ تھا... قلعے کی فصیل تھی۔ فصیل پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے دو قدیم توپیں نصب تھیں جو کسی زمانے میں سمندر کی طرف سے حملہ کرنے والوں کو روکا کرتی تھیں۔

کوٹھری میں تنہائی میں خاموشی اور ایک اذیت سی تھی۔ سرتاپا سفید لباس میں ملبوس یہ حسین عورت سلاخوں سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور باہر قلعے کی فصیل پر لگی دھات کی کرسی نما مشین کو دیکھ رہی تھی۔ کوٹھری چوکور ساخت کی نہیں تھی بلکہ اس میں ایک طرف پتھر کا ستون بھی تھا جو قلعے کی اوپری منزلوں کو سہارا دیتا تھا۔ مخالف سمت میں دھات کا دروازہ تھا جس کے اوپری حصے میں چھوٹی سی کھڑکی تھی۔ دروازے کے عین اوپر لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی روشنی باہر چمکتے چاند کی روشنی کے مقابلے میں کم پڑ رہی تھی۔

عورت جوان تھی مگر وہ نوجوانی کے دور سے گزر چکی تھی۔ سفید بلاؤز اور سفید ہی اسکرٹ کے اوپر اس نے باریک کپڑے کی سفید چادر یوں لپیٹ رکھی تھی کہ اس کے لباس کا [illegible]

[illegible]

ہوا اور اس کے عقب میں فولادی دروازہ آواز سے بند ہو گیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک مخصوص چوغہ پہنا ہوا تھا جس پر کمر کی جگہ ایک ڈوری بندھی ہوئی تھی۔ چوغے کا سرپوش نوجوان پادری کے شانوں کی طرف ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ شاید بیس یا اکیس برس کا عام صورت اور متوسط جسامت کا آدمی تھا۔ اس نے عورت کو دیکھا اور کسی قدر توقف کے بعد بولا۔ ”میں فادر ایڈون جو نے تمہارے لیے دعا کرنے آیا ہوں۔“

عورت نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”یہ کس طرح کام کرتی ہے؟“

پادری کو مشین نظر نہیں آرہی تھی مگر اسے مشین کا فنکشن معلوم تھا۔ ”اس پر آدمی کو بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ دیتے ہیں۔ اس کا سر ایک آہنی خود میں قید کر دیا جاتا تھا اور پھر عقب سے ایک مٹھ گردن پر زور لگاتی ہے، اسے پیچ کی مدد سے آگے دھکیلا جاتا ہے۔ یہ گردن پر اتنا زور دیتی ہے کہ گردن کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور......“ پادری بولتے بولتے رک گیا۔

عورت نے مڑ کر اپنی فسوں خیز آنکھوں سے اسے دیکھا اور جملہ مکمل کیا۔ ”آدمی مر جاتا ہے۔ مگر عورت زیادہ نازک ہوتی ہے۔“

وہ عورت کو دیکھ کر سحر زدہ سا رہ گیا تھا۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے جس عورت کے لیے بھیجا جا رہا ہے وہ اتنی حسین ہوگی۔ شاید اس نے کبھی اس قدر خوب صورت عورت نہیں دیکھی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سادہ اور کسی [illegible] حزنیہ تھا۔ یہ فطری چہرہ تھا اس کے باوجود وہ پادری کو اساطیری داستانوں کی کوئی دیوی لگی۔ عورت نے نوجوان پادری کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ وہ ڈولتے بدن کے ساتھ اس کی طرف آئی۔ ”تم دعا کرنے آئے ہو، اس میں کتنا وقت لگتا ہے؟“

”پانچ منٹ یا زیادہ سے زیادہ دس منٹ۔“

”اور ابھی رات بہت لمبی ہے۔ تم جلدی نہیں آ گئے؟“

”اگر تم تنہائی چاہتی ہو تو میں دعا کرا کے ابھی چلا جاتا ہوں۔“

وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بھی کم کشش انگیز نہیں تھی۔ نوجوان ایک بار پھر بھول گیا کہ وہ پادری ہے اور یہاں دعا کرانے آیا ہے۔ عورت نے کہا۔ ”مجھے دعا کی نہیں اس وقت کسی کے ساتھ کی ضرورت ہے جو مجھ سے بات کرے اور میری بات سنے۔“

نوجوان پادری نے سر ہلایا۔ ”میں پادری ہوں، میرا کام ہی لوگوں کی باتیں سننا ہے۔ اگر تمہارے پاس کوئی اعتراف ہے تو تم کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر سکتی ہو۔“

”میرے پاس اعترافات ہیں مگر ان معنوں میں نہیں۔“ عورت بولی۔ ”میرے ماں باپ کیتھولک تھے مگر میں کیتھولک نہیں ہوں، بڑے ہونے کے بعد میں نے بپتسمہ لینے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے میں اعتراف کی قائل بھی نہیں ہوں۔“

”اگر تم اعتراف نہیں کرنا چاہتیں تو تمہاری مرضی لیکن تم نے کہا ہے، تم کسی سے بات کرنا چاہتی ہو۔“

”ہاں میرے پاس کچھ کہانیاں ہیں یا شاید ایک ہی کہانی ہے اگر تم سننا چاہو تو میں ضرور سناؤں گی۔“

پادری ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ”میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔“

☆☆

جیک سے تقریباً بیس میل شمال کا یہ سفر خاصا دشوار اور [illegible] بہت ہوا تھا۔ [illegible] سے نکلتے ہی [illegible] اور اس کے بعد زیادہ راستہ کچا اور ناہموار تھا جس پر جیک بریسٹن کی گھوڑا گاڑی چلتی چلی جا رہی [illegible] کے ساتھ آرتھر ک ولیم شاٹ تھا۔ اس کا شمار جیک کے بہترین وکیلوں میں ہوتا تھا۔ آرتھر اسے جاگیر کے بارے میں بتا رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ [illegible] نے وانٹ بال کی یہ پیشکش قبول کر کے [illegible] سالہ خوبرو جیک [illegible] اور رکھ رکھاؤ سے [illegible] حقیقت تھی کہ اسے اپنے خاندان کا پتا نہیں تھا۔ اس نے سرکاری یتیم خانے میں ہوش سنبھالا اور وہیں پرورش پائی۔ سرکاری کالج میں تعلیم حاصل کر کے وہ سرکاری ملازمت میں آیا تب اسے فکر یہ تھی کہ وہ کسی اچھے عہدے پر پہنچ کر [illegible] ہو۔ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک دن اسے ایک بہت بڑی جاگیر کا نگران اور عملی لحاظ سے مالک بنا کر بھیجا جائے گا۔ دو سال وہ یارک شائر میں محکمہ زراعت میں کام کرتا رہا پھر اسے شاہی ملازمت میں لندن بھیج دیا گیا۔

1904ء کا لندن خوب صورت اور جدید شہر تھا۔ جیک لندن میں خوش تھا۔ مگر ایک پوری جاگیر کا مالک بننا بھی کم خوش کن نہیں تھا۔ اس وقت کے ایک برطانوی قانون کے تحت بیرون ملک کسی انگریز کے مرنے کے بعد اگر اس کی [illegible] جائیداد کا کوئی [illegible] وارث نہیں ہوتا تھا تو یہ تاج برطانیہ کی ملکیت شمار ہوتی تھی مگر ایک ان لکھے قانون کے

تخت تاج برطانیہ اس دولت اور جائیداد کو ذاتی تصرف میں لینے کے بجائے اپنے کسی اہل اور ملک سے مخلص وفادار کے سپرد کرنے کا پابند تھا۔ اس میں ملکیت منتقل نہیں ہوتی تھی مگر مالک بننے والا آمدنی پر تصرف حاصل کر سکتا تھا۔ وہ جائیداد کے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا مگر اسے فروخت کر کے کسی اور کو منتقل نہیں کر سکتا تھا۔ جیک بھی جانتا تھا کہ وہ مالک نہیں بن سکے گا۔ مگر پیشکش وائٹ ہال سے ایک چیلنج کی صورت میں آئی تھی۔

جیک جانتا تھا کہ اس کے پس منظر کی وجہ سے بعض خاندانی افراد کو اس کا اتنی تیزی سے ترقی کرنا اور دربار کے نزدیک آنا پسند نہیں آیا تھا۔ شاید اس فیصلے کے پس پشت وہ لوگ بھی تھے۔ اس طرح وہ اسے دربار سے دور کر رہے تھے۔ اگرچہ اسے اختیار دیا گیا تھا کہ وہ چاہے تو انکار کر سکتا ہے مگر پیشکش کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے انکار کا حقیقی اختیار نہیں ہے۔ اس صورت میں وہ دربار کی نظروں سے گر جائے گا۔ اس کے ساتھ اس جاگیر کا ایک امیدوار اور بھی تھا۔ جیک کی ہچکچاہٹ کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ جان نامی یہ شخص وائٹ ہال کے پرانے ملازموں میں سے ایک تھا۔ جیک ذاتی طور پر اس سے واقف نہیں تھا مگر اس نے سنا تھا کہ جان کی ازحد خواہش و کوشش تھی کہ یہ جاگیر اسے عطا کی جائے۔ مگر وائٹ ہال کا فیصلہ اس کی توقع کے خلاف آیا تھا۔

دو دن بعد وہ اپنا سامان پیک کر رہا تھا اور اس سے چند گھنٹے پہلے الزبتھ سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔ الزبتھ اور اس کے درمیان ایک خاموش پسندیدگی کا رشتہ تھا۔ وہ کھل کر اس کا اعلان نہیں کر سکتے تھے کیونکہ الزبتھ کا باپ ایک نامعلوم پس منظر کے لڑکے سے اپنی بیٹی کی شادی کے خلاف تھا۔ اس بات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی کہ جیک ایک دولت مند جاگیردار بننے جا رہا تھا۔ جیک کو بھی یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی، اس کے خیال میں اس کا یہاں سے چلے جانا ہی اس تعلق کا سب سے بہتر اختتام تھا۔ الزبتھ اس کی روانگی کے وقت بندرگاہ پر موجود تھی۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا اور شاید وہ اس بات کو یقینی بنانے آیا تھا کہ جیک اس کی بیٹی سے کئی ہزار میل دور جا رہا ہے۔ اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ البتہ الزبتھ اپنی آنکھوں پہ لرزتے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ اگر جیک اشارہ کر دے تو وہ ابھی سب کچھ چھوڑ کر اس کے ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔

کروز [illegible]

کا طویل اور پرلطف سفر کیا مگر جب وہ جمیکا، کنگسٹن کی بندرگاہ پر اترا تو اسے کسی قدر مایوسی ہوئی تھی۔ یہ چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ جس پر درمیانے بحری جہاز بھی لنگر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ ایک کشتی نے اسے اور دوسرے مسافروں کو گہرے سمندر سے بندرگاہ تک پہنچایا تھا۔ بندرگاہ پر لوگوں کا ہجوم اور بدنظمی تھی۔ یہاں مچھلیوں کے ساتھ سڑ جانے والے پانی کی بدبو بھی تھی۔ آئزک ولیم شاٹ اس کا منتظر تھا۔ آئزک جاگیر کا وکیل تھا اور فی الحال اس کی دیکھ بھال وہی کر رہا تھا۔ اس نے جیک کا سامان بگھی میں رکھوایا اور وہ بندرگاہ سے براہ راست جاگیر کی طرف روانہ ہوئے۔ سفر کو دو گھنٹے ہو چکے تھے اور اب تک جیک کو منزل نظر نہیں آئی تھی۔ آئزک اسے ہر تھوڑی دیر بعد تسلی دیتا تھا کہ بس اب کچھ ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ گرمی بلا کی تھی اور جیک کا کوٹ میں دم گھٹ رہا تھا۔ مگر جب بگھی ناہموار راستوں سے ہوتی اس بلند سطح مرتفع پر پہنچی تو موسم کسی قدر خوشگوار ہو گیا تھا۔ یہاں چاروں طرف دلکش مناظر تھے اور کوئی جگہ سبزے سے خالی نہیں تھی۔ جیک بگھی سے باہر دیکھ رہا تھا جب سفید رنگ کی ایک خوب صورت عمارت نمودار ہوئی۔

”کافی پیلس۔“ آئزک نے عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ بدرنگ کھپریل والی عمارت کے گرد پتھر کی اونچی دیواریں تھیں اور اس کے چاروں طرف کافی کے باغات کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کافی کے شوقین جیک نے کافی کا کوئی باغ دیکھا تھا اور اسے فوراً محسوس ہوا کہ باغ اور درختوں کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہیں ہو رہی تھی۔ بگھی ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی پیلس کے بڑے سے مضبوط لکڑی اور لوہے کے دروازے میں داخل ہوئی اور ایک چھت والی راہداری سے گزرتی ہوئی پتھروں سے بنے ہوئے ایک کھلے صحن میں آ کر رک گئی۔ وہاں ہر طرف سفید لباس میں سیاہ فام مرد اور عورتیں کاموں میں مصروف تھے۔ اس کے استقبال کے لیے ایک ادھیڑ عمر سیاہ فام عورت موجود تھی۔ جیک کے اترتے اس نے گرم جوشی سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

”باپالا۔“

آئزک نے رومال سے پسینا صاف کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ افریقی زبان میں تمہیں خوش آمدید کہہ رہی ہے۔“

[illegible] سے کہا۔
[illegible] تمہارا ابھی

کروا رہا ہے۔

"ماما سوبی۔" آئزک نے رومال سے اپنی سرخ ناک صاف کرتے ہوئے تعارف کرایا۔ "اس گھر کی نگراں ہے اور یہاں موجود تمام افراد اس کی ماتحتی میں ہیں۔"

"ہاں سوائے تمہارے۔" ماما سوبی نے آئزک سے کہا اور پھر چلا چلا کر دوسروں کو بلانے لگی۔ کئی خادم دوڑے آئے اور جیک کا سامان اتار کر اوپر لے جانے لگے۔ ماما سوبی اسے اوپر لائی۔ اس نے آئزک کو قطعی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ پیلس کا نچلا حصہ، گودام، ملازموں اور بعض دوسرے کاموں کے لیے مخصوص تھا۔ رہائش اوپر تھی۔ یہ پورا حصہ مکمل طور پر جیک کے لیے تھا۔ پیلس کا نچلا حصہ پتھر سے اور اوپری حصہ لکڑی سے بنا ہوا تھا۔ پہاڑی کی سب سے بلند جگہ پر ہونے کی وجہ سے کئی میل دور سمندر یہاں سے بھی صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اوپری حصے میں ایک بڑا سا ہال اور آر پار لاؤنج تھا اور اس کے دونوں جانب کئی کمرے تھے۔ یہاں وکٹورین اسٹائل کا پرانا اور بھاری فرنیچر تھا۔ فرش اور کھڑکیوں پر سفید ریشمی پردے لہرا رہے تھے اور [illegible] سے [illegible] وہ بہت بڑے باتھ روم تھے۔ اس کے بیڈ روم میں چھپر کھٹ والی مسہری تھی۔ اس کے بھی چاروں طرف باریک سفید پردے لٹک رہے تھے۔ مجموعی طور پر ہر چیز صاف ستھری اور چمک رہی تھی۔ مگر اس میں وہ سلیقہ اور [illegible] نہیں تھا جو اتنی بڑی جاگیر کے مالک میں ہونا چاہیے تھا۔ ماما سوبی مسلسل بول رہی تھی اور اسے ہر چیز کے بارے میں بتا رہی تھی۔ جیسے ہی اس نے سانس لینے میں وقفہ لیا جیک نے کہا۔

"اب میں آگیا ہوں تم مجھے آرام سے سب بتا سکتی ہو۔"

ماما سوبی نے کچھ کہنا چاہا پھر رک کر مسکرائی اور اسی طرح مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد غسل کر کے جیک نے لباس بدلا اور آرام دہ موسم کی مناسبت سے لباس پہن لیا۔ آرام اور لنچ کے بعد وہ شام کے قریب باہر آیا۔ اس نے پہلے پورے پیلس کا معائنہ کیا۔ ماما سوبی اس کے ساتھ تھی اور اس کے ہر سوال کا جواب دے رہی تھی۔ پھر وہ باہر نکل آیا اور اس نے باغات کے انچارج مائیکل کالون کو طلب کرلیا۔ تاریکی چھانے تک وہ اس کے ساتھ باغات میں گھومتا رہا اور اس نے ایک ایک گوشہ دیکھا اور جہاں اسے کوئی گڑبڑ نظر آئی [illegible] اپنی چھوٹی سی ڈائری میں نوٹ کرلیا۔ اس کا اگلا پورا دن بھی فارم دیکھنے میں گزرا اور شام تک وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ فارم کے معاملات حد درجے بدنظمی کا شکار تھے۔ ملازمین بے شمار تھے مگر کام نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا۔ جو کام ہوتا وہ بھی ٹھیک نہیں تھا اور اس کا اثر مجموعی طور پر جاگیر کی آمدنی پر پڑ رہا تھا۔ جیک نے محسوس کیا کہ اسے جاگیر عطا نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک بہت مشکل کام اس کے سر مار دیا گیا ہے جو اسے کرنا ہی ہے۔ درست معلومات حاصل کرنے کے لیے جو قابلِ اعتماد ہستی اسے نظر آئی وہ ماما سوبی تھی۔ رات ڈنر کے بعد اس نے ماما سوبی کو اپنی اسٹڈی میں طلب کیا۔

"ماما میں یہاں مالک بنا کر بھیجا گیا ہوں لیکن یہاں آکر میں نے محسوس کیا ہے کہ میری حیثیت تم لوگوں سے مختلف نہیں ہے۔"

"تم مالک ہو......" ماما سوبی نے کہنا چاہا۔

"صرف نام کا۔" جیک نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مجھے یہاں بھیجا گیا ہے [illegible] اس جاگیر کو نفع بخش بناؤں۔ میں جو کماؤں گا وہی میرا ہوگا۔ اب مجھے بتاؤ یہاں کیا گڑبڑ ہے۔ تم مجھے مکمل [illegible] کرسکتی ہو۔"

ماما سوبی متذبذب تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ "میں سچ بتاؤں گی لیکن تم وعدہ کرو کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔"

"میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ ہاں یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ میں یہاں [illegible] حالات بدل کر دکھاؤں گا۔"

ماما [illegible] اس نے جیک کو سب بتا دیا۔ اس کے مطابق جاگیر کا [illegible] رچرڈ کارلس ایک سخت گیر اور [illegible] تھا، وہ [illegible] کو بہت اہمیت دیتا تھا اور ملازمین کے ساتھ بہت زیادہ حقارت سے پیش آتا تھا۔ ملازمین اس سے ڈرتے بھی تھے اور اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ وہ دل سے اس کے لیے محنت نہیں کرتے تھے اور جہاں موقع ملتا وہ اسے نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ رچرڈ کو بھی نقصان کی پروا نہیں تھی کیونکہ وہ اکیلا آدمی تھا اور شاید اس نے اپنی کسی کمزوری کی بنا پر شادی نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی عورت یہاں اس کے پاس آئی۔ وہ خود بہت کم کہیں جاتا تھا۔ اس کا کوئی قریبی عزیز بھی نہیں تھا۔ وہ دنیا میں اکیلا تھا اور شاید اس اکیلے پن کا انتقام وہ اپنے ماتحتوں سے لیتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت پینے اور سونے میں گزرتا تھا۔ جاگیر اور فارم کے کام کیسے چل رہے [illegible]

ملازمین نے اس کا رویہ [illegible]

بھی وہ ان کا ناجائز استعمال بھی کرتا تھا۔ مقرر کردہ اجرت سے کم دینا اور بات بات پر جرمانے معمول کی بات تھی۔ اگر کوئی ملازم چھٹی کرتا، کہیں جاتا یا بیمار ہو جاتا تو اس کی جگہ اس کے گھر کے کسی فرد کو کام کرنا پڑتا۔ رچرڈ پیلس اور فارم میں زیادہ سے زیادہ ملازم دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور اس کی متعصب انا کو اس سے تسکین ملتی تھی۔ اسے اپنے رویے سے ہونے والے نقصانات کی پروا نہیں تھی۔ جاگیر اگر خسارے میں جا رہی تھی تو وہ اس کا ملبا ملازموں پر ڈال دیتا تھا اور اس کے ذاتی خرچے اسی طرح جاری رہتے تھے۔ پھر ایک دن وہ رات بے تحاشا پی کر سویا تو اگلے دن بے ہوش پایا گیا۔ اسے کنگسٹن کے اسپتال منتقل کیا گیا جہاں وہ ایک ہفتہ رہ کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے اس کی موت کی وجہ حد سے زیادہ شراب نوشی کو قرار دیا تھا۔ رچرڈ کا اکاؤنٹ خالی تھا اور اس نے تقریباً پانچ ہزار پاؤنڈز قرض لیا ہوا تھا اور یہ بھی جاگیر سے ادا ہونا تھا۔

جیسے جیسے جیک صورت حال سے واقف ہوتا جا رہا تھا ویسے ویسے اس کی فکر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ماما موبی نے اس کے سامنے سب کھول کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ پُرامید نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جیک نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”ماما تم فکر مت کرو، کسی کو ملازمت سے نہیں نکالا جائے گا۔ میں سب کی تنخواہیں ادا کروں گا اور جب جاگیر نفع کمانے لگے گی تو میں تنخواہیں بھی بڑھاؤں گا لیکن......“

ماما کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ یہاں کام کرنے والے اکثر ملازمین اس کے رشتے دار اور اس کے لیے بچے تھے۔ وہ انہیں بے روزگار ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی، یہاں ان کے کرنے کے لیے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ مگر جیک کی ادھوری بات نے اسے پھر فکرمند کر دیا۔ ”لیکن کیا؟“

”میں متعصب نہیں ہوں، میرے نزدیک سیاہ فام بھی اسی طرح انسان ہیں جس طرح سفید فام ہیں۔ میں تمہیں کبھی بے عزت نہیں کروں گا اور نہ حقیر سمجھوں گا لیکن تمہیں اور ملازموں کو میرا پورا ساتھ دینا ہوگا۔ میں سب سے زیادہ محنت کروں گا مگر میں چاہوں گا کہ کوئی ملازم کام چوری نہ کرے۔“

ماما موبی پُرجوش ہو گئی۔ ”میں یقین دلاتی ہوں، کوئی کام چوری نہیں کرے گا۔“

اگلے دن ناشتے کے بعد جیک نیچے اترا تو اس نے کام کا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ پیلس سے باہر آیا تو ملازمین اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ جیک نے انہیں دیکھا اور بولا۔ ”آج سے میں تم سب کے ساتھ کام کا آغاز کروں گا۔ ہم سب مل کر محنت کریں گے تاکہ یہ فارم نفع دے اور اس کا نفع سب کو ملے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے سب محنت کریں اور سب اپنا کام سمجھ کر کریں۔ کیا تم سب میرا ساتھ دو گے؟“

”ہم ساتھ دیں گے۔“ ملازموں نے پُرجوش انداز میں کہا۔

☆☆☆

چار سال بعد، مئی 1908ء۔ جیک ڈریسنگ کے آئینے کے سامنے اپنی نک ٹائی درست کر رہا تھا۔ دروازہ کھلا اور ماما موبی اندر آئی۔ اس نے تعریفی نظروں سے جیک کو دیکھا۔ ”بہت اچھے لگ رہے ہو۔“

”شکریہ، کیا آئزک آ گیا ہے؟“ جیک نے مڑ کر پوچھا۔

آئزک کے نام پر ماما موبی کا چہرا سا منہ بن گیا۔ وہ اس سے چڑتی تھی اور جب اس کا ذکر ہوتا تو ماما کا منہ بن جاتا تھا۔ ”وہ بڈھا کھوسٹ آیا ہوا ہے۔ جیک یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے اس میں بھی کیا یہ شخص دخل دے گا؟“

”تم بھول رہی ہو ماما، آئزک نے ہی مجھے یہ رشتہ تجویز کیا ہے۔“

”اس لیے تم زیادہ محتاط رہنا۔ اس شخص کی نیکی بھی خطرے سے خالی نہیں ہوتی۔“ ماما نے اس کی نک ٹائی درست کی۔ ”شکر ہے میری یہ ذمے داری تو ختم ہو گی۔ تم کبھی نک ٹائی ڈھنگ سے نہیں لگاتے۔“

”میں بہت سے کام اچھے طریقے سے نہیں کرتا۔“ جیک نے ہیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی وجہ تم ہو، تم نے مجھے بہت کاہل اور نکما بنا دیا ہے۔“

ماما اس کے ساتھ نیچے تک آئی۔ چار سالوں میں پیلس کا حلیہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کی ریلنگ کے ساتھ لگے لکڑی کے ستون کی جگہ سفید ماربل کے ستون آ گئے تھے اور صحن بھی ٹائلوں سے سج گیا تھا۔ بلند چار دیواری جو کسی زمانے میں چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لیے بنائی گئی تھی۔ اب چھوٹی اور خوب صورت ہو گئی تھی اس پر پھولدار بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ نچلے فلور کے گوداموں کے بڑے اور بھدے لکڑی کے دروازے بدل دیے گئے تھے اور ان کی جگہ لکڑی کے ہی خوب صورت منقش اور جالی والے دروازے لگے تھے۔ البتہ داخلی دروازہ جو پہلے بھی لکڑی کا تھا اب بھی لکڑی کا تھا مگر اسے

پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیا گیا تھا۔ سمندر کی طرف کھلنے والی بالکونی کو بڑا کر کے ٹیرس کی صورت دے دی گئی تھی اور پیلس کی چھت جو پہلے بدرنگ ہلکی سرمئی تھی اب مکمل طور پر سفید کر دی گئی تھی۔ جیک نے اس کا نام بھی بدل دیا تھا اور اب یہ کارنس پیلس کے بجائے وہائٹ پیلس کہلاتا تھا۔ اس نے رچرڈ کی تقریباً تمام نشانیاں بدل دی تھیں سوائے بھاری فرنیچر کے جسے اس نے کسی قدر مرمت اور پالش کے بعد نیا جیسا کروا لیا تھا۔ آئزک بگھی کے پاس اس کا منتظر تھا۔ اس نے ماما سوبی کو دیکھا۔

''یہ ابھی تک زندہ ہے۔''

''بہت سے لوگ مجھے مردہ دیکھنے کی خواہش لیے دنیا سے گزر گئے۔'' ماما نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور آخری بار جیک کی تیاری کا جائزہ لیا۔ اس نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا جو کنگسٹن کے بہترین درزی نے سیا تھا۔ جیک بگھی میں بیٹھا تو آئزک بھی بڑبڑاتا ہوا اس کے ساتھ آ بیٹھا اور بگھی چلتے ہی اس نے جیک سے پوچھا۔

''تم اب تک اس زبان دراز عورت کو کیسے برداشت کر رہے ہو؟''

''وہ دل کی بہت اچھی ہے۔'' جیک مسکرایا۔ ''یہ بات تم بھی جانتے ہو ورنہ اسے ملازمت سے نکال چکے ہوتے جب یہ جاگیر تمہارے ہاتھ میں تھی۔''

آئزک نے گہری سانس لی۔ ''یہی تو مصیبت ہے، اس جاگیر کے حرام خور ملازموں کو یہی عورت ٹھیک کر سکتی ہے۔''

''سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ مس بٹلر آ چکی ہے؟''

''اس کا جہاز تو پرسوں سے بندرگاہ پر لنگر انداز ہے لیکن وہ خود کب آئے گی مجھے اس کا علم نہیں ہے۔''

''تمہیں کس نے اس کے بارے میں بتایا؟''

''کسی نے نہیں۔'' آئزک نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''تم جانتے ہو ہر سال اشرافی طبقے سے بہترین لڑکیاں چن کر بیرونِ ملک مادرِ وطن کی خدمت کرنے والے افراد کے لیے روانہ کی جاتی ہیں۔''

جیک نے سر ہلایا۔ یہ کام باقاعدہ پالیسی کے تحت ہوتا تھا اور اس کا مقصد برطانیہ کے بین الاقوامی مفادات کا تحفظ کرنے والے اہلکاروں کو معاشرتی زندگی اور رکھ رکھاؤ والی بیوی مہیا کرنا تھا تاکہ وہ دیارِ غیر میں اپنی ذمے داریاں تمام تفکرات سے آزاد ہو کر احسن طریقے سے نبھا سکیں۔ آئزک نے واضح جواب نہیں دیا تھا۔ آئزک کے پاس کوئی سرکاری عہدہ نہیں تھا مگر وہ جمیکا میں برٹش مفادات کا ایک ان کہا ذمے دار تھا۔ ایسے بہت سے کام اس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ شاید اس آس پر کہ ایک دن اسے ان خدمات کے صلے میں آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کا خطاب مل جائے گا۔ جیک اسے بدستور سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آئزک نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''الزبتھ بٹلر اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ بھی تاجِ برطانیہ کا خدمت گار تھا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں پسند آئے گی۔''

جیک الزبتھ کے نام پر چونکا تھا مگر اس نے کوئی اور ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ کنگسٹن کا قدیم قلعہ جو کبھی یہاں حملہ آور اسپینیوں نے تعمیر کیا تھا اب گورنر جنرل کی رہائش گاہ اور سرکاری دفاتر کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہیں کنٹری کلب بھی تھا جہاں اکثر جمیکا میں رہنے والے انگریز مختلف تقاریب میں آپس میں ملتے تھے۔ آج بھی وہاں ایک تقریب تھی اور جیک ان تقاریب سے کم ہی سروکار رکھتا تھا۔ مجبوراً وہ ایسی تقاریب میں شامل ہوتا جو اصل میں سرکاری ہوتی تھیں اور جن میں شرکت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ بگھی جلد کنگسٹن پہنچ گئی۔ پچھلے کچھ عرصے میں سڑکیں خاصی بہتر ہوئی تھیں۔ اس میں بڑا ہاتھ جیک کا بھی تھا۔ وہ فارغ دنوں میں اپنے ملازموں کے ہمراہ علاقے کی سڑکوں کو بہتر کرتا تھا۔ جاگیر سے مین ہائی وے تک چار میل کی پختہ سڑک اس نے اپنی محنت اور اپنے ذرائع سے بنائی تھی۔ کنگسٹن سے جاگیر تک کا سفر جو پہلے دو گھنٹے سے زیادہ وقت میں طے ہوتا تھا اب ایک گھنٹے میں اور خاصے آرام سے طے ہوتا تھا کیونکہ راستے میں اب گڑھوں زدہ کچے راستے کے بجائے ہموار پختہ سڑک تھی۔ ان چار سالوں میں اس نے جاگیر کا حلیہ بھی بدل دیا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تو اخراجات بھی بمشکل پورے ہو رہے تھے۔ سر پر مالک کے نہ ہونے سے ملازموں کی عدم توجہی کی وجہ سے پیداوار بہت گر گئی تھی۔

ملازم خوفزدہ تھے کہ شاید انہیں ملازمت سے نکال دیا جائے گا مگر جیک نے انہیں یقین دلایا کہ کسی کو ملازمت سے نہیں نکالا جائے گا۔ اس نے پیداوار میں کمی کے اسباب جانے اور پھر ان کا سدِباب کرنے لگا۔ اس نے پرانے اور ناکارہ ہو جانے والے درخت نکلوا کر ان کی جگہ نئے اور زیادہ پیداوار دینے والے اعلیٰ کافی کے درخت لگوائے۔ یہاں بارش خاصی ہوتی تھی مگر بعض اوقات پورے پورے مہینے بھی بارش نہیں ہوتی تھی اور ایسے میں خشک موسم سے پودوں کو نقصان ہوتا تھا۔ جیک نے پوری جاگیر میں جگہ جگہ

تالاب بنوائے جن میں نہ صرف پانی ذخیرہ ہوتا تھا بلکہ ان میں مچھلیاں بھی پالی جاتی تھیں۔ اضافی زمین پر اس نے سبزیاں کاشت کرائیں، ان سے اضافی آمدنی ہوتی تھی۔

ایک سال میں جاگیر اپنے پیروں پر کھڑی ہوگئی اور جیک نے قرض اتارنے کے بعد ملازموں کو ان کے مکمل واجبات ادا کیے اور اچھی کارکردگی دکھانے والے ملازموں کو بونس بھی دیا تھا۔ وہ صرف مالک بن کر نہیں بیٹھا تھا بلکہ خود بھی برابر کی محنت کرتا تھا۔ اس وجہ سے وہی ملازمین جو پہلے کام سے جان چراتے تھے اب ہمت سے بڑھ کر محنت کرتے تھے۔ پہلے سال جیک کو کچھ نہیں ملا تھا۔ اس نے جو کمایا وہ جاگیر اور اس کے ملازموں پر لگا دیا۔ پھر قرض تھا وہ بھی اتارا۔ اس نے آزک کے توسط سے قرض لیا تھا اور جیمز کا لیا ہوا قرض بھی تھا۔ اس نے پہلے سال ہی یہ سارا قرض اتار دیا۔ محنت کا صلہ اسے دوسرے سال بہت شاندار ملا۔ اس کے بعد سال بہ سال اس کی آمدنی بڑھتی چلی گئی تھی۔

اب وہ اس قابل تھا کہ شادی کر سکے۔ اسے الزبتھ کا خیال آیا تھا مگر پھر اس نے یہ خیال دل سے نکال دیا۔ الزبتھ اسے پسند تھی مگر اسے محبت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چار سال بہت ہوتے ہیں۔ انسان اور اس کے جذبات دونوں بدل جاتے ہیں۔ یہ اتفاق تھا کہ آزک نے اس کے لیے جس لڑکی کو چنا تھا اس کا نام بھی الزبتھ تھا۔ وہ ایک کروز شپ سے جیکا پہنچی رہی تھی اور آزک کی خواہش تھی کہ اس سے پہلے کوئی اور اسے متاثر کرے جیک ایک بار اس سے مل لے۔ آج وہ اسی سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ تقریب اندر ہال میں جاری تھی مگر جیک قلعے کی اوپری دیوار کے سامنے ایک بنچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کریبین کا بہت نیلا سمندر تھا اور سامنے سے تیز ہوا چل رہی تھی۔ اچانک اس پر سایہ سا آیا اور جیک نے سورج کے بالکل سامنے موجود اس ہستی کو دیکھنے کی کوشش کی جو سنہری رنگ کے فراک میں ملبوس تھی اور اس کے ہاتھوں میں سفید دستانے تھے جو چھتری کی ڈنڈی تھامے ہوئے تھے مگر اس کا چہرہ غیر واضح تھا۔

''مسٹر بریسٹن؟'' دلکش نسوانی آواز نے پوچھا۔

''ہاں۔'' جیک بدستور اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''الزبتھ بٹلر۔''

''اوہ......'' جیک جلدی سے کھڑا ہوا اور تب اسے سامنے ایک نہایت دلکش چہرہ نظر آیا۔ بڑی بڑی آنکھیں، نازک نقوش، اس کی جلد اتنی نازک تھی کہ اس کے اندر ہلکی گلابی لکیریں بھی نمایاں تھیں۔ اس کے سرخی مائل بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ بہت نازک اور حسین وجود تھا۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سے زیادہ نہیں تھی۔ جیک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس نے نزاکت سے اپنا ہاتھ آگے کیا جسے جیک نے ادب سے لبوں سے لگا لیا اور بولا۔ ''جیک بریسٹن۔''

''میں جانتی ہوں، کیا تم مجھے بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گے؟''

''اوہ......'' جیک نے چونک کر کہا اور بنچ کی طرف اشارہ کیا۔ الزبتھ بیٹھی تو وہ اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔ جیک کچھ جھینپ رہا تھا اور اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ الزبتھ مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ اتنی دلکش تھی کہ اس کی طرف نہ دیکھنے کے باوجود جیک اس کی دلکشی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بے تکلفی سے بولی۔

''تم نے پوچھا نہیں کہ میں بنا پوچھے تم تک کیسے پہنچی؟''

''ہاں مجھے خیال نہیں رہا۔''

''مسٹر ولیم شاسن نے مجھ سے کہا کہ میں باہر جاؤں اور جو شخص سب سے الگ تھلگ بیٹھا نظر آئے وہی مسٹر جیک بریسٹن ہوگا۔''

پہلی بار جیک مسکرایا۔ ''آج میں تہ دل سے آزک کا شکر گزار ہوں۔''

''تم جاگیردار ہو؟''

''ایک طرح سے کہہ سکتی ہو۔''

''لیکن مجھے جاگیردار پسند نہیں ہیں۔''

''مجھے بھی جاگیرداری پسند نہیں ہے لیکن شادی کے بعد تم مجھے پسند کرنے لگو گی۔''

الزبتھ ہنسی۔ ''ابھی ہماری بات شروع ہوئی اور تم نے شادی کا بھی سوچ لیا۔''

جیک پُراعتماد ہو گیا تھا۔ ''کیونکہ ہم اسی لیے آئے تھے۔''

''تم نے صرف مجھے دیکھ کر فیصلہ کر لیا؟''

''فیصلہ نیت دیکھ کر ہوتا ہے باقی معاملات تو شادی کے بعد کھلتے ہیں۔'' جیک نے منطقی انداز میں کہا۔

الزبتھ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ''بعض معاملات ایسے نہیں کھلتے

"اگر ان کا تعلق آپ سے معمولی سا بھی ہو تو وہ لازمی کھلتے ہیں۔" جیک نے یقین سے کہا تھا۔ الزبتھ کھڑی ہو گئی۔

"یہاں بہت گرمی ہے۔"

"تمہیں گرمی پسند نہیں ہے۔" جیک بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں فصیل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ سمندر کی طرف سے تیز ہوا چل رہی تھی مگر یہ بھی گرمی کا اثر کم کرنے میں ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

"اس کے برعکس مجھے گرمی اور چمکتا سورج پسند ہے، میں نے اسی لیے ویسٹ انڈیز کا انتخاب کیا ہے۔"

☆☆☆

"اب تم دونوں میاں بیوی ہو۔" پادری نے ان سے کہا۔ "مسٹر برینسن اپنی بیوی کو بوسہ دو۔"

جیک نے الزبتھ کے چہرے پر موجود نقاب الٹا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ جیک اس کے ہونٹوں پر جھک گیا۔ چرچ میں موجود لوگ تالیاں بجانے لگے۔ ان میں جیک کے واقف کار اور اس کا واحد دوست آرک بھی تھا۔ کچھ دیر بعد وہ خصوصی بگھی میں سوار پیلس کی طرف جا رہے تھے۔ اس شادی کے لیے پیلس کی خصوصی تزئین اور آرائش کی گئی تھی۔ پیلس کے عقبی سبزہ زار میں شادی کی اصل تقریب منعقد کی جانی تھی جس میں پورے کنگسٹن سے چیدہ چیدہ شخصیات کو مدعو کیا گیا تھا۔ سرشام ہی مہمان آنا شروع ہو گئے تھے اور جیک ان کو پیلس کے دروازے پر ریسیو کر رہا تھا۔ اندر الزبتھ ملازماؤں کی مدد سے تیاری کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ آج اس کی زندگی کا سب سے یادگار دن تھا۔

سورج ڈوبتے ہی تقریب کا آغاز ہوا اور جب الزبتھ سج دھج کر سامنے آئی تو محفل کے ہر مرد نے جیک کی قسمت پر رشک کیا تھا۔ وہ حسین تھی مگر آج اس کی دلکشی الگ ہی تھی۔ محفل میں اور بھی حسین عورتیں شامل تھیں مگر وہ الزبتھ کے سامنے یوں بجھ گئیں جیسے چاند کے سامنے ستارے بجھ جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد رقص کا دور شروع ہوا اور جوڑے درمیان میں آگئے۔ آرکسٹرا میوزک دے رہا تھا۔ دوسرے دور میں الزبتھ نے جیک سے کہا۔ "ہم بھی رقص کرتے ہیں۔"

"نہیں..... نہیں، میں نے آج تک نہیں کیا۔" جیک نے گھبرا کر کہا۔

"لیکن آج کرو گے۔" الزبتھ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا تو وہ خود کو روک نہ سکا۔ الزبتھ اسے لے کر وسط میں آئی۔ باقی سب پیچھے ہٹ گئے اور الزبتھ اسے رقص کا سبق دینے لگی۔ وہ ماہر رقاصہ تھی۔ کچھ دیر بعد جیک کو لگا کہ یہ تو بہت آسان کام ہے۔ اگر آپ کا ساتھی رقص کرنا جانتا ہے تو اس کا ساتھ دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا ہے۔ جیک نارمل میں بھی کم پیتا تھا اور اس رات کے لیے اس نے خاص طور سے سوچا تھا کہ وہ ڈرنک بس چکھے گا۔ وہ اپنی زندگی کی اہم ترین رات پورے ہوش و حواس میں گزارنا چاہتا تھا اور وہ اس کے لیے بہت بے تاب تھا۔ مگر انہیں رات بارہ بجے سے پہلے حجلۂ عروسی میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان کا کمرا ماما موبی نے خاص طور سے پھولوں سے سجایا تھا۔ یہ حجلہ عروسی کا افریقی انداز تھا۔

جیک کے برعکس الزبتھ نے خاصی پی تھی اور جب وہ ماما موبی کے ساتھ جا رہی تھی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جیک کو امید تھی کہ جب تک وہ جائے گا الزبتھ خود کو سنبھال چکی ہو گی۔ مگر نصف گھنٹے بعد جیک کمرے میں پہنچا تو الزبتھ بستر پر کروٹ لیے بے خبر سو رہی تھی۔ جیک نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کا بازو سہلایا مگر اس کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ جیک نے حسرت سے اپنی حسین دلہن کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔ لباس بدلتے ہوئے اس کی نظر کمرے کے کونے میں رکھی لکڑی کی پیٹی پر گئی۔ یہ واحد چیز تھی جو الزبتھ اپنے ساتھ لائی تھی اور پیٹی پر دو مضبوط تالے لگے ہوئے تھے۔ جب یہ پیٹی آئی تو الزبتھ نے کئی ملازمین کی مدد سے اسے بہت احتیاط سے لا کر یہاں رکھوایا تھا۔ جیک نے اسے کھلا نہیں دیکھا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے؟

صبح ماما موبی نے آکر دروازے کھولے اور کھڑکیوں سے پردے ہٹائے تو جیک کی آنکھ کھلی تھی۔ الزبتھ بستر پر نہیں تھی۔ جیک نے ماما سے پوچھا۔ "الز کہاں ہے؟"

"میم باہر ہے۔" ماما نے اشارہ کیا اور شوخی سے مسکرائی۔ "مجھے یقین ہے تمہاری رات بہت اچھی گزری ہو گی۔"

جیک زبردستی مسکرایا اور بستر سے اتر آیا۔ اس نے کرسی پر پڑا اپنا گاؤن اٹھایا اور اسے پہنتے ہوئے باہر نکل آیا۔ الزبتھ گاؤن میں ٹیرس پر کھڑی دور تک پھیلی ہوئی جاگیر کا نظارہ کر رہی تھی۔ جیک باہر آیا تو الزبتھ نے اس کی طرف دیکھا۔

"ہائے۔"

"ہائے۔" جیک مسکرایا۔ "رات جب میں آیا تو تم سو چکی تھیں۔ تمہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔"

''شاید میں نے زیادہ پی لی تھی۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ میں اس کمرے میں کب آئی؟''

''تم بہت گہری نیند میں تھیں۔'' جیک نے ریلنگ سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے میں بھی سو گیا۔''

''فکر مت کرو ابھی ہمارے پاس بہت سی راتیں ہیں۔'' الزبتھ نے شرمیلے انداز میں کہا۔ جیک اس کے نزدیک آیا اور اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا تھا کہ ماما آ گئی۔

''تم دونوں ناشتا کب کرو گے؟''

''کچھ دیر بعد۔'' الزبتھ نے جواب دیا۔ ''ابھی ہم جاگیر دیکھیں گے۔ کیا خیال ہے؟'' اس نے جیک کی طرف دیکھا۔

جیک خوش ہو گیا۔ ''ضرور۔''

وہ باہر آئے اور جیک اسے جاگیر دکھانے لگا۔ الزبتھ دلچسپی لے رہی تھی اور اس سے سوالات بھی کر رہی تھی۔ جیک نے اسے بتایا کہ کافی کے باغات کتنے نفع بخش ہوتے ہیں تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''میرے خدا، یہ معمولی سی چیز اتنی دولت دیتی ہے۔''

''لیکن بہت زیادہ محنت کے بعد۔'' جیک نے سر ہلایا۔ ''تم سوچ نہیں سکتیں کہ اس جاگیر کو نفع بخش بنانے کے لیے میں نے کتنی محنت کی ہے۔ بے شمار ملازموں کے ہوتے ہوئے میں خود بھی مزدوروں کی طرح کام کرتا رہا ہوں۔ اب بھی کرتا ہوں۔''

الزبتھ نے سر ہلایا۔ ''ماما نے بتایا ہے کہ تم اس علاقے اور ملازمین کے لیے بہت کچھ کرتے رہے ہو۔''

''یہ اس علاقے اور ان لوگوں کا حق ہے۔'' جیک نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ زمین ان لوگوں کی ہے جلد یا بدیر ہم انگریز یہاں سے چلے جائیں گے۔ تب یہ یہاں کے مالک ہوں گے۔ میری کوشش ہے ان کے لیے اچھی چیز چھوڑ کر جاؤں۔''

درختوں کے درمیان چلتے ہوئے الزبتھ نے کہا۔ ''مجھے یہ جگہ اچھی لگی ہے یہاں سورج چمکتا ہے اور موسم گرم ہے۔''

''مجھے بھی یہ جگہ اسی وجہ سے اچھی لگتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہاں کے لوگوں میں جذبات ہیں جن سے ہم لوگ تقریباً عاری ہو چکے ہیں۔''

وہ چلتے ہوئے بانسوں سے بنے ایک ہٹ تک آئے۔ تقریباً چوکور ساخت کا یہ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا شکل سے بارہ بائی بارہ کا تھا۔ الزبتھ نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''میری تفریح گاہ۔'' جیک نے جواب دیا۔ ''اندر سے دیکھو گی؟''

الزبتھ نے سر ہلایا تو اس نے دروازہ کھولا اور وہ اندر آئے۔ پورا ہٹ بانسوں سے بنا ہوا تھا سوائے چھت اور فرش کے۔ چھت کھپریل کی تھی اور فرش اعلیٰ درجے کی لکڑی کا پالش کیا ہوا تھا۔ تین طرف کھڑکیوں کی جگہ بیضوی خلا تھے جن پر حریری پردے تھے۔ پردے ہوا سے لہرا رہے تھے۔ اندر ایک پیانو تھا۔ ایک طرف ریک پر سوسے اوپر کتابیں تھیں، چمڑے سے بنی ہوئی کاؤچ تھی۔ الزبتھ متاثر نظر آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آرٹسٹک۔''

''جب میرا آرام یا تفریح کرنے کا موڈ ہوتا ہے میں یہاں آجاتا ہوں۔ یہی میری تفریح ہے اور یہی آرام ہے۔''

الزبتھ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ''میں نے تو سنا تھا کہ غیر ملک میں تاج برطانیہ کی خدمت کرنے والے سرکاری اہلکار بہت مزے میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے اپنے بار ہوتے ہیں اور باقاعدہ حرم ہوتے ہیں۔''

جیک مسکرایا۔ ''ایسے بھی ہیں لیکن میں حرم کا قائل نہیں ہوں۔ میرے خیال میں انسان کی زندگی میں ایک ہی عورت ہو تو اس کی زندگی پُرسکون گزر سکتی ہے۔ ایک سے زیادہ عورتیں ہمیشہ پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔''

''تمہارے کبھی کسی عورت سے تعلقات رہے؟''

جیک مسکرایا۔ ''یہ سوال مت کرو۔''

''اچھا تم نے کبھی کسی سے محبت کی؟''

''اگر تمہارا اشارہ ماضی کی طرف ہے تو میں نے ایک بار کسی کو پسند کیا تھا مگر پھر میں یہاں آگیا اور بات ختم ہو گئی۔''

''کون تھی وہ؟''

''تم نہیں جانتیں، بس اتنا جان لو کہ اس کا نام بھی الزبتھ تھا۔''

''میرے انتخاب کی وجہ یہ نام تو نہیں ہے؟''

''نہیں، تمہارا نام مجھے اس وقت پتا چلا جب میں تم سے ملنے کنگسٹن آرہا تھا۔'' جیک نے کہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میں اب بھی تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

الزبتھ نے اس کی بات نظرانداز کی اور پیانو کی کیز پر ہاتھ پھیرا تو سُر سے بکھر گئے۔ جیک چونکا۔ ''تمہیں پیانو بجانا آتا ہے؟''

الزبتھ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ مخالف سمتوں میں پھیلاتے ہوئے کیز چھیڑیں اور چند لمحے بعد وہ باقاعدہ دھن بجا رہی تھی۔ جیک اس کے پاس کھڑا اسے محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ الزبتھ نے دھن مکمل کی تو اس نے بے ساختہ تالی بجائی۔ ''تم نے کمال کر دیا۔''

''میں صرف چار سال کی تھی جب میں نے اپنے باپ سے پیانو بجانا سیکھا تھا۔''

''مسٹر بٹلر یقیناً فنکار ہوں گے۔''

''پاپا بہت اچھے تھے۔ وہ صرف پیانو ہی اچھا نہیں بجاتے تھے، میں نے انہیں ہر کام بہت سلیقے اور مہارت سے کرتے دیکھا۔ وہ بہت مکمل انسان تھے۔''

''اوہ...... مجھے افسوس ہے۔'' جیک نے آہستہ کہا۔ ''وہ مر چکے ہیں؟''

الزبتھ کا چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ ''ایک صبح جب ان کے کمرے کا دروازہ کھلا تو ان کی لاش چھت سے بندھی رسی سے جھول رہی تھی۔''

اس سے پہلے جیک کچھ کہتا، پیلس کی طرف سے کھانے کی بیل کی آواز آئی۔ اس نے الزبتھ کا ہاتھ تھاما اور وہ واپس آ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر تھے جس پر انگریزی طرز کا بھرپور ناشتا موجود تھا۔ ساتھ ہی مقامی طرز کی کچھ ڈشیں بھی تھیں۔ جیک نے کھانے کے دوران کہا۔ ''مجھے افسوس ہوا، مسٹر بٹلر نے خودکشی کی تھی؟''

الزبتھ نے سر ہلایا۔ ''پولیس کا یہی کہنا ہے مگر میں خود کو آج تک اس پر متفق نہیں کر سکی۔''

جیک چونکا۔ ''قتل؟''

''شاید۔'' الزبتھ نے یوں کہا جیسے اب اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہ رہی ہو۔ جیک خاموش ہو گیا اور وہ ناشتا کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ماما ڈاک سے آنے والے دعوت ناموں کا ایک پلندا چاندی جیسی طشتری میں سجا کر لے آئی۔ یہ دعوت نامے کنگسٹن اور جمیکا کی مختلف اعلیٰ شخصیات کی طرف سے نئے شادی شدہ جوڑے کے لیے آئے تھے۔ ناشتے کے بعد چائے کے دوران جیک نے اسے دعوت ناموں کی تفصیل بتائی کہ ایک درجن دعوت نامے کہاں کہاں سے آئے تھے۔ الزبتھ چائے نوش کرتے ہوئے خاموشی سے سنتی رہی پھر اس نے کہا۔ ''میرا فی الحال کہیں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''ان دعوت ناموں پر تاریخ نہیں ہے۔'' جیک نے اسے تسلی دی۔ ''اس لیے تم فکر مت کرو، یہ ہم پر ہے کہ ہم کب جاتے ہیں۔''

الزبتھ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''ابھی ہم کیا کریں گے؟''

''ہنی مون۔'' جیک نے جواب دیا۔

الزبتھ خوش ہو گئی۔ ''سچ میں اور کہاں؟''

''جہاں تم چاہو؟''

☆☆☆

میامی فلوریڈا سے ٹرین نے اسٹیشن چھوڑا۔ ان کی منزل کی باسی تھی۔ دو مہینے پر مشتمل ہنی مون کا یہ آخری حصہ تھا۔ پہلے وہ کروز شپ سے نیویارک گئے۔ وہاں سے انہوں نے ٹرین سے ویسٹ کوسٹ تک کا سفر کیا۔ وہ سان فرانسسکو اور سان ڈیاگو گئے۔ وہاں سے انہوں نے ایک اور کروز شپ سے میکسیکو تک کا سفر کیا اور وہاں سے وہ فلوریڈا آئے تھے۔ جیک اور الزبتھ دونوں نے اسے بہت انجوائے کیا تھا۔ خاص طور سے الزبتھ بہت خوش تھی۔ جیک بھی خوش کہ اسے من پسند عورت مل گئی۔ اسے لگا کہ وہ الزبتھ سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ بے پناہ حسین تھی بلکہ اس لیے کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ جیک کے لیے مخصوص تھا۔ ابتدائی جھجک کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے کھل گئے تھے۔

اسی لیے ہنی مون کے دوران جیک نے اس کی ہر بات مانی اور ہر فرمائش پوری کی۔ اس نے سان فرانسسکو اور سان ڈیاگو جیسی دور دراز جگہوں پر چلنے کا کہا تو جیک اسے وہاں بھی لے گیا، حالانکہ اتنی دور جانے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ خاص طور سے سان ڈیاگو جو کوئی بہت خاص جگہ نہیں تھی۔ بس ایک ابھرتا ہوا شہر تھا۔ میامی میں انہوں نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ امریکا ایک ترقی یافتہ اور بڑا ملک تھا اس کا اندازہ انہیں میامی دیکھ کر ہو گیا تھا جب کہ میامی اس وقت خاص شہر نہیں تھا مگر تفریح کے حوالے سے اس کے خدوخال واضح ہونے لگے تھے۔ جیک کو بھی امریکا اور میامی پسند آئے تھے۔ الزبتھ نے جیک سے کہا۔ ''کاش ہم یہاں رہ سکیں۔''

''شاید تمہاری یہ خواہش کبھی پوری ہو۔'' جیک نے جواب دیا اور اس نے اسی وقت دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ میامی کے ساحل پر ایک گھر ضرور لے گا جہاں وہ سال میں کچھ وقت ضرور ٹھہرا کریں گے۔ شاید ابھی اس کے پاس اتنی دولت نہیں تھی مگر اسے امید تھی کہ وہ چند سالوں میں اتنی

دولت جمع ضرور کرنے لگا۔ کیوبا تک انہوں نے بحری سفر کیا۔ کیوبا میں اس کا قیام مختصر تھا اور وہ جلد جمیکا کی طرف روانہ ہوگئے کیونکہ کافی کی فصل تیاری کے آخری مراحل میں تھی۔ وہ واپس آئے تو معمول کی زندگی کا آغاز ہوا۔ جب تک جیک کام کے لیے نیچے نہیں آتا تھا تب تک الزبتھ اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ جب وہ شام کو اوپر جاتا تو وہ تیار ہوکر اس کی منتظر ہوتی تھی۔ درمیان میں جب جیک جاگیر کے امور دیکھ رہا ہوتا تو وہ بار بار ٹیرس یا بالکونی میں آکر اسے دیکھتی۔ اس کے انداز میں ایسی محبت ہوتی کہ جیک اندر تک سرشار ہوجاتا تھا۔

☆☆☆

آئزک اور جیک دفتر میں تھے۔ برطانیہ اور امریکا سے آنے والے تاجر اس کی کافی کی نیلامی میں شرکت کے خواہش مند تھے۔ جیک کا رجحان امریکیوں کی طرف تھا کیونکہ وہ زیادہ قیمت دے سکتے تھے جب کہ آئزک چاہتا تھا کہ اس نیلامی میں برطانوی تاجروں کو فوقیت دی جائے کیونکہ وہ جو کچھ تھے تاج برطانیہ کی وجہ سے تھے۔ اس وقت بھی ان کے درمیان یہی بحث چل رہی تھی۔ جیک نے دونوں ہاتھ پھیلائے۔ ''تم سوچو کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں اپنی چیز وہیں فروخت کروں گا جہاں مجھے زیادہ قیمت ملے گی۔''

''ہماری ترجیح سب سے پہلے برطانوی مفادات ہونے چاہئیں۔''

''میری بھی یہی خواہش ہے لیکن ڈیئر آئزک تم بھول رہے ہو بین الاقوامی قیمتیں خاصی اوپر جاچکی ہیں۔ ہمارے یہی پیارے برطانوی تاجر مجھ سے پرانی قیمتوں پر کافی لے کر نئی قیمتوں پر آگے فروخت کررہے ہیں۔ جب یہ زیادہ نفع کمارہے ہیں تو میں زیادہ نفع کیوں نہ کماؤں؟''

آئزک کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ جیک کی بات سے متفق نہیں ہے، اس نے آہستہ سے کہا۔ ''تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہیں یہ جاگیر نفع کمانے کے لیے نہیں بلکہ تاج برطانیہ کی خدمت کے لیے دی گئی ہے۔''

''میں تاج برطانیہ کی خدمت ہی کررہا ہوں۔ یہاں میں جو ٹیکس ادا کرتا ہوں وہ بالآخر برطانیہ کے خزانے میں جاتا ہے۔ زیادہ کمائی کا مطلب ہے زیادہ ٹیکس اور تاج برطانیہ کی زیادہ خدمت۔''

آئزک نے گہری سانس لی۔ ''تو تم نہیں مانو گے۔''

''جمیکا میں اس وقت ایک ہزار بڑے کافی کے فارم ہیں جن میں سے اکثر انگریز ہیں مگر اب یہاں پیدا ہونے والی کافی کے نوے فیصد خریدار امریکی ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں تم کیا کہو گے؟ پھر ہم برطانوی تاجر تو مشہور ہیں تو تجارت کے بنیادی اصول سے کس طرح پہلو تہی کر سکتے ہیں؟''

آئزک سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں ایک فطری عمل کو روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

''ہمیں حقیقت پسند بننا چاہیے۔'' جیک نے کہا۔ ''میں نے جو امریکا میں دیکھا ہے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ نصف صدی بعد وہ دنیا کی سپر پاور ہوگا۔ ہم ابھی تک زیادہ تر گھوڑوں اور بگھیوں میں سفر کررہے ہیں۔ امریکا میں لوگ گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں اور وہاں ایک شخص نے اڑنے والی مشین بنائی اور اب بے شمار لوگ اڑنے والی مشینیں بنا رہے ہیں۔ وہ نئی چیز اور ایجاد کو اپنانے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرتے اور خاصی دیر بعد جاکر ہم کوئی جدت اپناتے ہیں۔ صرف وفاداری برطانیہ کو زیادہ عرصے تک سپر پاور نہیں رکھ سکتی۔ ہمیں خود کو جدید دنیا کے مطابق بدلنا ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' آئزک نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔ ''لگ رہا ہے کہ جلد برطانوی سلطنت پر سورج جو غروب نہیں ہوتا ہے طلوع ہونا بھول جائے گا۔''

''یہ فطرت کا اصول ہے ہر کمال کو زوال ہوتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں برطانوی تاجروں کے وفد کو بتا دیتا ہوں کہ اگر انہوں نے اس مقابلے میں رہنا ہے تو وہی قیمت دینا ہوگی جو امریکی تاجر دینے کو تیار ہیں۔''

''کل نیلامی ہے۔'' جیک نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''پرسوں مجھے مسٹر ل بیری سے ملنا ہے۔''

آئزک چونکا۔ ''خیریت؟''

''ہاں۔'' جیک مسکرایا۔ ''میں سوچ رہا ہوں کہ اب اپنا اور الزبتھ کا اکاؤنٹ جوائنٹ کرلوں۔''

آئزک اس بار بھی اس سے متفق نظر نہیں آیا۔ ''تمہاری شادی کو ابھی صرف چار مہینے ہوئے ہیں؟''

''ہاں لیکن ان چار مہینوں میں، میں نے الزبتھ کو پرکھ لیا اور پھر تم نے ہی تو اسے تجویز کیا تھا۔''

''ہاں لیکن میرے خیال میں عورت کو پرکھنے کے لیے مرد کی پوری زندگی بھی ناکافی ہے۔'' آئزک نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''عورت ایک جواہر ہوتی ہے۔''

"تمہارا مطلب ہے آدمی کو کسی اپنی بیوی پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے؟"

آئزک نے سر ہلایا۔ "میری شادی کو چالیس سال ہو گئے ہیں۔ میرے چھ بچے ہیں۔ ربیکا نے آج تک کوئی کام مجھ سے پوچھے بغیر نہیں کیا مگر میں نے کبھی اس پر اندھا اعتماد نہیں کیا۔"

"اس کے برعکس میں الزبتھ پر مکمل اعتماد کرتا ہوں۔" جیک نے کہا اور دفتر سے نکل گیا۔ یہ آئزک کا دفتر تھا مگر اس کا ایک حصہ جیک نے اپنے بزنس کے لیے حاصل کر لیا تھا۔ البتہ اس کا یہاں آنا جانا بہت کم ہوتا تھا۔ اس کے پاس بہترین ذاتی بگھی تھی۔ مگر وہ دفتر آنے جانے کے لیے گھوڑا استعمال کرتا تھا اس طرح وہ جلدی سفر کر لیتا تھا۔ صاف سڑکوں اور بعض شارٹ کٹس کی مدد سے وہ صرف آدھے گھنٹے میں جاگیر پہنچ جاتا تھا۔ آج اسے جلدی جانا تھا کیونکہ برطانیہ سے آنے والا تھیٹر مقامی ہال میں پرفارم کرنے جا رہا تھا۔ یہ شو دیکھنے کے لیے جیک نے باکس بک کرا لیا تھا اور آئزک اور اس کی بیوی کو بھی مدعو کیا تھا۔

وہ گھوڑا دوڑاتا ہوا پیلس میں داخل ہوا تو ایک ملازم نے اس کا گھوڑا پکڑا۔ جیک نے لگام اس کے حوالے کی اور نیچے اترا تھا کہ باغات کا انچارج مائیکل وہاں آیا اور اس نے جیک کو رپورٹ دینا شروع کی۔ یہ اہم تھی اس لیے اوپر جانے کی عجلت کے باوجود جیک رک کر سننے لگا۔ مائیکل کے مطابق آخری کافی بھی اتر چکی تھی اور بیجوں کی گریڈنگ کا کام بھی آخری مرحلے میں تھا۔ کل تک یہ سب پیک ہو کر صبح سویرے نیلام گھر کے لیے روانہ کر دیا جاتا۔ جب تک جیک نے جاگیر کا انتظام نہیں سنبھالا تھا یہاں کافی کی گریڈنگ اور فصل پیک کرنے کا رواج بھی نہیں تھا۔ رچرڈ فصل ایسے ہی فروخت کر دیتا تھا اور خریدار اپنی مرضی سے فصل اترواتا تھا۔ اس دوران میں درختوں کو کتنا نقصان ہوتا تھا اور فصل کی اصل قیمت کیا ہوتی تھی رچرڈ اس پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔

جیک نے بیجوں کا معیار طے کرنا اور انہیں پیک کر کے باقاعدہ نیلام کر کے فروخت کرنا شروع کیا۔ اس سے کہیں بہتر قیمت ملتی تھی اور اس کے فارم کا نام بھی ہوتا تھا۔ جیک رپورٹ سن رہا تھا کہ اوپر بالکونی میں الزبتھ نمودار ہوئی اور اس نے سرخی مائل سنہری رنگ کا فراک اسے جسم سے لگا کر دکھایا۔ جیک نے نفی میں سر ہلایا تو وہ واپس اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ نمودار ہوئی اور اس بار اس نے سفید اور نیلا گاؤن دکھایا۔ یہ جیک کا پسندیدہ رنگ تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو الزبتھ خوش ہوتی اندر چلی گئی۔

رپورٹ سن کر اس نے مائیکل کو کچھ ہدایات دیں اور واضح کیا کہ ان پر مکمل عمل ہونا چاہیے۔ مائیکل کے جانے کے بعد وہ اوپر آیا تو تین خادمائیں الزبتھ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ یہ سب نوعمر سیاہ فام لڑکیاں تھیں اور ماما موبی نے انہیں خاص طور سے الزبتھ کے لیے رکھا تھا۔

"پلیز سب باہر جاؤ، مجھے اپنی بیوی سے کچھ بات کرنی ہے۔"

لڑکیاں کھلکھلاتی اور معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی باہر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی جیک نے دروازہ بند کر کے الزبتھ کو آغوش میں لے لیا۔ "تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "کیسی خوشخبری؟"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنا بینک اکاؤنٹ تمہارے ساتھ جوائنٹ کر رہا ہوں۔"

"سچ میں؟" الزبتھ بولی۔ "لیکن کیوں؟"

"کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی ہی نہیں میری ہر چیز میں شریک ہو۔ یہ جاگیر میری نہیں ہے۔ اس لیے اس میں شریک نہیں کر سکتا ورنہ اس میں بھی شریک کر لیتا۔ میری واحد دولت میرا بینک اکاؤنٹ ہے اور میں اس میں تمہیں شریک کر رہا ہوں اپنی زندگی کی طرح۔" جیک نے کہا اور اسے اٹھا کر بیڈ کی طرف بڑھا۔

الزبتھ اس کا مقصد بھانپ کر کسمسائی۔ "ہمیں جانا بھی ہے اور وقت نہیں ہے۔"

"ابھی تین بجے ہیں اور شو نو بجے شروع ہو گا۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔"

کچھ دیر بعد الزبتھ اس کے بازو پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔ "تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟"

"ہاں۔"

"کتنی؟"

"میں نہیں جانتا۔" جیک نے اس کی طرف دیکھا۔ "لیکن اب مجھے زندگی تمہارے بغیر ادھوری لگتی ہے۔"

الزبتھ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مجھ سے اتنی محبت مت کرو۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

شام ہوئی تو ماما نے دروازہ بجا کر انہیں یاد دلایا کہ انہیں جانا بھی تھا۔ جیک دستک پر بڑبڑایا۔ "ماما خدا تم سے

لگے۔''
الزبتھ ہنسی۔ ''یہ مجھے سانس کی کمی محسوس نہیں ہونے دیتی۔''

''ماما مجھ سے اور تم سے بہت محبت کرتی ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' الزبتھ اٹھ بیٹھی۔ ''تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ یہ سانس کی کمی محسوس ہونے نہیں دیتی۔ خاص طور سے تمہارے لیے یوں فکر مند رہتی ہے جیسے ماں ہو۔''

''میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے بن مانگے یہ جاگیر ملی اور پھر ماما جیسی مخلص عورت ملی۔ اس نے آج تک مجھ سے اپنے لیے کچھ نہیں مانگا۔ ملازموں کے لیے لڑ جاتی ہے جیسے ان کو میرے لیے سناتی ہے۔ پھر مجھے خدا کا سب سے حسین تحفہ ملا۔'' اس نے الزبتھ کی طرف دیکھا۔

''فی الحال یہ حسین تحفہ دور جا رہا ہے۔'' الزبتھ نے کہا اور اٹھ گئی۔ اس لیے مجبوراً جیک بھی اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو رہے تھے۔ چھ بجے ان کی بگھی پیلس سے نکلی۔ وہ پہلے براؤن پیلس پہنچے جو کنگسٹن کا سب سے بہترین ہوٹل تھا اور تھیٹر یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ انہوں نے یہاں ڈنر کیا اور پھر ٹہلتے ہوئے تھیٹر پہنچ گئے۔ جیک نے بگھی چلانے والے ملازم سے کہا کہ وہ تھیٹر کے پاس پہنچ جائے۔ شو میں کام کرنے والے تمام اداکار برطانوی تھے۔ یہ ایک تمثیلی کھیل تھا جس میں کرداروں کی نشان دہی کے لیے بیاجک لگائے گئے تھے۔ الزبتھ ساکت بیٹھی کھیل دیکھ رہی تھی، اس کے انداز میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی، جب کہ آئزک، اس کی بیوی مارلین اور جیک بہت دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ جب شیطان کا ماسک لگائے ولن نمودار ہوا اور اس نے گرجدار آواز میں ہیرو کو للکارا تو الزبتھ چونک گئی تھی اور اس کے بعد وہ پوری توجہ سے کھیل دیکھنے لگی۔ اس نے پہلی بار اپنی چھوٹی سی دوربین آنکھوں سے لگائی۔

''یہ اچھا اداکار ہے۔'' جیک نے سرگوشی میں کہا۔

''مجھے بھی لگ رہا ہے۔''

پھر ولن کا پارٹ ختم ہوا اور وہ پردے کے پیچھے گیا تو الزبتھ کی دلچسپی۔۔ پھر ختم ہو گئی اور بے توجہی سے کھیل دیکھنے لگی۔ اس کے بعد جب ولن آتا تب ہی الزبتھ دلچسپی لیتی تھی۔ خاصی دیر بعد کھیل ختم ہوا اور جیک، آئزک سے محو گفتگو تھا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ الزبتھ کب باکس سے نکل گئی۔ جب اسے احساس ہوا تو وہ مضطرب ہو کر اٹھا اور آئزک سے معذرت کر کے باکس سے نکل آیا۔ اس وقت تک بیشتر تماشائی تھیٹر سے نکل چکے تھے اور کچھ لوگ آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ان میں اسے الزبتھ کہیں نظر نہیں آئی تب وہ اسٹیج کے پیچھے والے حصے میں آیا جہاں فنکار اور دوسرے لوگ شو ختم ہونے کے بعد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ جیک دیکھتا ہوا آگے بڑھا تو اسے الزبتھ کی جھلک دکھائی دی جو کسی سے بات کر رہی تھی۔ جیک اس آدمی کے صرف سنہری بال دیکھ سکا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تھا کہ ایک چھوٹے قد کا آدمی اس کے سامنے آ گیا۔ ''سر یہ مخصوص علاقہ ہے یہاں ہر کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں اپنی بیوی کی تلاش میں آیا ہوں۔'' جیک نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

''یہ شو والوں کا ایریا ہے اور یہاں باہر سے کسی فرد کو آنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''ڈیم اٹ۔'' جیک نے برہمی سے کہا۔ ''میری بیوی اندر موجود ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ کیسے اندر چلی گئی۔''

''جیک۔'' الزبتھ کی آواز آئی۔ وہ ان کے پاس آ گئی تھی۔ ''کیا ہوا؟''

''چلو یہاں سے۔'' جیک نے اس کا بازو تھاما اور پستہ قد آدمی کو گھورتے ہوئے باہر نکل آیا۔ بگھی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''تم اندر کیا کر رہی تھیں۔''

''میں فن کاروں سے ملنے گئی تھی۔'' الزبتھ نے جواب دیا۔

''میں نے تمہیں کسی سے بات کرتے دیکھا تھا۔''

''میں نے کئی فنکاروں سے بات کی۔'' الزبتھ نے واضح جواب دینے سے گریز کیا۔ جیک اسے سنہری بالوں کا حوالہ دینے جا رہا تھا مگر پھر رک گیا۔ اس کا موڈ خراب تھا اور وہ خود بھی حیران تھا کہ اس کا موڈ کیوں خراب تھا۔ الزبتھ کچھ دیر کے لیے اس سے دور گئی اور وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ اس نے الزبتھ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ 'اگر یہ عورت مجھ سے دور ہوئی تو میں ہمیشہ کے لیے پاگل ہو جاؤں گا۔' الزبتھ نے محسوس کر لیا اس نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''یہی کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

الزبتھ اٹھ کر اس کے برابر میں آ گئی اور اس کے شانے سے سر ٹکا دیا۔ ''میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ مگر میری درخواست ہے مجھ سے اتنی محبت نہ کرو، اگر کبھی میں نہ رہی تو......؟''

''تب مجھے لگا۔'' جیک نے اسے آغوش میں لیتے

ہوئے کہا۔ ''جیک بھی نہیں رہا ہے۔''

☆☆☆

جیک دفتر سے باہر آیا جہاں اس کے آدمی کافی کے تھیلے گاڑیوں سے اتار کر تاجروں کے گودام میں منتقل کر رہے تھے۔ امریکی تاجروں نے اس کی توقع سے کچھ بڑھ کر ہی اسے قیمت دی تھی اور جیک بہت خوش تھا۔ اس نے چیک بینک میں جمع کرا دیے تھے جو چند روز میں اس کے اکاؤنٹ میں شامل ہو جاتے۔ اس نے خود جا کر گودام میں مال دیکھنا شروع کیا۔ یہاں بھی اس کے ملازم کام کر رہے تھے۔ اگرچہ اس کی ذمے داری ختم ہو گئی تھی مگر وہ اس کا قائل تھا کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ دو اس لیے آخر تک مال کی نگرانی کر رہا تھا۔ تاکہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ ہو تو وہ فوراً حل کروا دے۔ بات خریدار تک نہ جائے۔ وہ اندر منیجر کے ساتھ تھا کہ مزدوروں کے سپر وائزر نے اسے آواز دی۔ ''مسٹر بریسٹن، یہ شریف آدمی تمہیں تلاش کر رہا ہے۔''

آنے والا ایک خوش پوش اور خوش رُو نوجوان تھا۔ خاص طور سے اس کی مونچھیں خوب صورت تھیں۔ بھوری آنکھوں اور تیکھے نقوش کے ساتھ وہ متوسط اور چھریرے جسم کا مالک تھا۔ اس کے براؤن بال بڑھے ہوئے تھے اور اس کی گردن تک آ رہے تھے۔ اس کا قیمتی سوٹ اس پر سج رہا تھا۔ جیک اس کی طرف متوجہ ہوا۔ آدمی نے آگے آتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ ''راجر نیکو، راجر بیرسٹر فرام لندن۔'' اس نے دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے پولیس بیج کی جھلک دکھائی۔

''جیک بریسٹن۔'' جیک نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جوابی تعارف کرایا۔

راجر نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور بولا۔ ''مسٹر بریسٹن، الزبتھ بٹلر تمہاری بیوی ہے۔''

جیک چوکنا ہو گیا اور وہ اسے لے کر باہر کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل ہے۔ مگر اب وہ الزبتھ بریسٹن ہے۔''

''اس کی بہن سارہ بٹلر......''

جیک نے اس کی بات کاٹی۔ ''ایک منٹ...... الزبتھ نے مجھ سے کبھی کسی بہن کا ذکر نہیں کیا۔''

''مگر اس کی بہن موجود ہے۔'' راجر نے زور دے کر کہا۔ ''اور وہ اپنی بہن کے لیے بہت پریشان ہے۔''

''کیا اس نے پولیس سے کہا ہے کہ اس کی بہن کو تلاش کیا جائے؟''

''بالکل کیونکہ اس کا کہنا ہے گزشتہ جون سے اسے الزبتھ کی کوئی خبر نہیں ہے جب وہ لندن سے روانہ ہوئی تھی۔''

''اس بات کو چھ مہینے ہو چکے ہیں۔'' جیک نے زیر لب کہا۔ ''میری الزبتھ سے پانچ مہینے اور بیس دن پہلے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔''

راجر مسکرایا۔ ''تمہاری یادداشت بہت تیز ہے مسٹر بریسٹن۔''

''میرا کام ہی ایسا ہے۔'' جیک نے ملازم کو اپنا گھوڑا لانے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''ویل مسٹر ڈی نیکو، اب تمہیں علم ہو گیا ہے کہ الزبتھ میری بیوی ہے۔ تم اس کی بہن کو اطلاع کر سکتے ہو۔''

''میں بالکل کروں گا۔'' راجر نے سر ہلایا۔ ''چند دن پہلے میں بے آف ہوانا میں ملنے والی ایک لاش کے بارے میں پُر امید تھا کہ شاید یہی الزبتھ ہے مگر وہ یہاں نکل آئی ہے۔ میں اس کے لیے اس کی بہن کا ایک خط لایا ہوں اور پرسوں میری روانگی ہے۔ اگر تم کل تک اس کا جواب لا دو تو خط میں ساتھ لے جاؤں گا۔''

جیک لاش کا سن کر ٹھٹکا تھا پھر اس نے کہا۔ ''میں الزبتھ کو دے دوں گا۔ آگے اس کی مرضی ہے کہ جواب دے یا نہ دے۔''

راجر نے اپنے ہیٹ کو چھوا۔ ''میں کراؤن پیلس ہوٹل میں ٹھہرا ہوں، اگر مسز بریسٹن نے جواب دیا تو تم مجھ سے یہاں رابطہ کر سکتے ہو۔''

جیک نے اس سے خط لیا اور روانہ ہو گیا۔ وہ پریشان نہیں تھا مگر اس کے اندر کہیں بے چینی سی سرایت کر گئی تھی۔ الزبتھ نے کبھی اس سے اپنے خاندان کے بارے میں کھل کر بات نہیں کی تھی۔ اس کے ذکر کا احاطہ زیادہ تر اس کے باپ کی حد تک رہا تھا۔ چند ایک بار اس نے اپنی ماں کا ذکر بھی کیا تھا مگر جیک کو اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے کبھی سارہ نامی کسی بہن کا ذکر نہیں کیا۔ جیک گھر آیا تو الزبتھ ایک ملازمہ کی مدد سے اپنے گھنے اور لمبے بال سنوار رہی تھی۔ جیک نے ملازمہ کو دیکھا تو وہ کمرے سے چلی گئی اور اس نے خط والا لفافہ الزبتھ کے حوالے کیا جو اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہے اس میں؟ تم بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہو؟''

''بات ہی ایسی ہے۔'' جیک نے ٹائی اتارتے ہوئے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے مجھ سے لندن پولیس کا ایک

جاسوس ملا ہے اور وہ تمہاری تلاش میں ہے۔ وہ تمہارے لیے یہ خط لایا ہے۔"

"کس کا خط؟"

"تمہاری بہن سارہ بٹلر کا۔" جیک نے کہا تو وہ غم زدہ نظر آنے لگی۔ اس نے لفافہ مٹھی میں جکڑ لیا اور بولی۔

"سارہ سے میری کبھی نہیں بنی۔ اسے ہمارے باپ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کی موت کا بھی اس نے کوئی اثر نہیں لیا اور اپنی دنیا میں مگن رہی۔ اب نہ جانے اسے میرا خیال کیسے آیا اور اس نے میرے لیے پولیس سے رجوع کیا اس کا مجھے بالکل یقین نہیں آرہا ہے۔"

جیک نے نرمی سے کہا۔ "وہ بہرحال تمہاری بہن ہے اور یہ خط سرکاری ذریعے سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی نہ کوئی جواب تو دو۔"

الزبتھ نے سر ہلایا۔ "میں جواب دوں گی۔"

اگلی صبح الزبتھ نے جواب اس کے سپرد کر دیا۔ نہ جیک نے پوچھا اور نہ اس نے بتایا کہ اس نے سارہ کو کیا جواب دیا ہے۔ جیک نے خود جانے کے بجائے آزرک کے بیٹے کے ہاتھ خط پراون پیلس راجر میسرز کو بھیج دیا۔ اس نے جیک کو خط کی رسید بھیجی تھی۔ آزرک حیران تھا۔ "تم اپنی سالی سے بے خبر ہو؟"

"الزبتھ نے کبھی اس کے بارے میں نہیں بتایا۔"

"اس نے اپنے خاندان کے بارے میں بھی بتایا ہے کہ نہیں؟"

"میں صرف اس کے باپ کے بارے میں جانتا ہوں۔" جیک نے آزرک کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اس کے خاندان سے براہ راست کوئی واقفیت رکھتے ہو؟"

آزرک نے نفی میں سر ہلایا۔ "الزبتھ کا معاملہ وزارت خارجہ کے توسط سے میرے پاس آیا تھا اور اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یہاں بھیجا گیا تھا۔ میں ذاتی طور پر اسے یا اس کے خاندان کو نہیں جانتا۔"

"کیا تم معلوم کر سکتے ہو؟"

"میں کوشش کروں گا۔" آزرک نے وعدہ نہیں کیا اور پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ "مبارک ہو اس بار تمہیں ہر بار سے زیادہ نفع ہوا ہے۔"

جیک مسکرایا۔ "اس کے لیے میں امریکی تاجروں کا شکرگزار ہوں۔"

آزرک نے سر ہلایا۔ "وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے جب کافی کی تجارت سے انگریزوں کی اجارہ داری ختم ہو [illegible] جائے گی۔ اس بزنس سے باہر ہونے کی صورت میں ہمیں بہت نقصان ہوگا۔"

"کوئی ہمیں اس بزنس سے باہر نہیں کر سکے گا۔" جیک نے یقین سے کہا۔ "بہ شرطے کہ ہم زمانے کے ساتھ چلیں۔"

راجر میسرز کے آنے اور سارہ بٹلر کے بارے میں جاننے کے بعد جیک نے جو بے چینی محسوس کی تھی وہ اب تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ اسے امید تھی کہ الزبتھ کے اس جواب کے بعد معاملہ ختم ہو جائے گا اور سارہ اسے پھر سے تلاش کرنے یا خط لکھنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ان دنوں وہ پھل اترنے کے بعد درختوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا تاکہ جو درخت پیداوار کے لحاظ سے کمزور ہو چکے ہوں ان کی جگہ نئے درخت لگائے جائیں۔ اس نے پھل اترنے والے کا ایسا نظام بنایا تھا جس میں ہر درخت کو ایک نمبر دیا ہوا تھا اور اس سے اترنے والے پھل کا حساب رکھا جاتا تھا۔ یوں اسے علم ہو جاتا تھا کہ کس درخت کی پیداوار کم ہوئی ہے اور وہ اس کا جائزہ لے کر اسے ٹھیک کرنے یا پھر تبدیل کرنے کا فیصلہ کرتا تھا۔ جیک نے فارم کا اپنا نرسری ہاؤس بنا لیا تھا جہاں کافی کے بہترین پودے تیار ہوتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ان میں سے ہی کسی درخت کی جگہ لگائے جاتے تھے۔ اس نے آزرک سے کہا۔

"شاید میں اس ہفتے پیلس نہ آؤں۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے اگر کوئی کام ہوا تو میں دیکھ لوں گا یا تم کو بتا دوں گا۔"

پیلس جاتے ہوئے جیک خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے آزرک جیسا مددگار ساتھی دیا۔ پھر اسے الزبتھ کا خیال آیا تو وہ مسکرا دیا۔ شاید وہ خدا کے اس تحفے کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا تھا۔ کئی دن سے وہ بہت مصروف تھا اور اسے الزبتھ سے ملنے یا اس کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع کم ملتا تھا۔ وہ صبح سویرے جو نیچے اترتا تھا تو پھر اسے رات گئے ہی اوپر جانے کا موقع ملتا تھا۔ وہ بس کھانا کھاتا اور اس دوران میں الزبتھ سے کچھ گفتگو ہوتی اس کے بعد وہ لیٹتا تو اس کی آنکھ صبح ہی کھلتی تھی۔ پیلس جاتے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ اس ہفتے وہ الزبتھ کے ساتھ زیادہ سارا وقت گزارے گا۔ اس وقت کو یادگار کر لے گا۔ اس وقت اس نے سوچا نہیں تھا کہ یہ وقت سچ مچ یادگار ہو جائے گا۔ اس نے الزبتھ [illegible] بڑے سے ہاتھ

تب ملی بیٹھے جیک نے اپنے شانے پر ٹکے الزبتھ کے سر کو سہلاتے ہوئے اس سے کہا۔
''تم نے سارہ کو کیا جواب دیا ہے؟''
''یہی کہ میں خیریت سے ہوں اور وہ میری فکر نہ کرے۔''
''تم اس سے ملنا چاہو گی؟''
''خود سے نہیں، ہاں اگر وہ ملنا چاہے تو میں سوچوں گی۔''
جیک نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ ''دنیا میں تمہاری ایک ہی بہن ہے۔''
''ہاں لیکن میری دنیا اب تم ہو۔''
''اور ہمارے بچے۔'' جیک نے کہا تو وہ ٹھٹکی۔
''بچے......؟''
''کیا تمہیں بچے پسند نہیں ہیں؟''
''پسند ہیں لیکن سچی بات ہے میں نے ان کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا ہے۔''
''اب سوچنا چاہیے۔'' جیک نے اصرار کیا۔
الزبتھ مسکرانے لگی۔ ''اچھا سوچوں گی۔''
یہ ہفتہ جیک نے الزبتھ کے ساتھ ہی گزارا۔ وہ فارم پر بھی کم جاتا تھا۔ جو ماسٹر گیارہ بجے پہنچ جاتا اور دو تین بجے تک واپس آجاتا تھا۔ شام کو اگر وہ باہر جاتا تو الزبتھ اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ پیلس کے سامنے اس نے جو پانی کا تالاب بنوایا تھا اب اسے گہرا کروا رہا تھا۔ اس نے الزبتھ کو بتایا کہ اگلے سال وہ اس میں تیراکی کر سکے گی۔ جیک نے اس کے لیے نیا گھوڑا بھی منگوایا تھا۔ الزبتھ کو گھڑسواری آتی تھی مگر وہ زیادہ ماہر نہیں تھی، کبھی کبھی وہ جیک کے گھوڑے پر سواری کرتی تھی۔ ملازمین ابھی ان کے لیے آنے والے گھوڑے کی تربیت کر رہے تھے۔ جیک نے الزبتھ سے کہا۔ ''جب تمہارا گھوڑا تیار ہو جائے گا تو ہم طویل رائڈ پر جایا کریں گے۔''
پیر والے دن جیک کا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اسے معلوم تھا کئی معاملات اس کی توجہ کے منتظر ہوں گے۔ اسے تصدیق کرنی تھی کہ کاٹن کے تاجروں کی طرف سے کیے جانے والے چیک اس کے اکاؤنٹ میں جمع ہو گئے ہیں۔ اکثر چیک میامی اور نیویارک کے ہوتے۔ جس وقت وہ اٹھا الزبتھ بستر میں تھی اور اس کا جلدی اٹھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ جیک نے اکیلے ہی ناشتا کیا اور پیلس سے روانہ ہو کر پہلے بینک گیا اور منیجر جیمس سائمن سے ملا۔ وہ تقریباً...

برٹس کا دبلا اور پتلے چہرے والا شخص تھا۔ کریسن کے علاقے میں اس سے زیادہ تجربے کار بینکر اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے تصدیق کی کہ تمام چیک کلیئر ہو کر اس کے اکاؤنٹ میں آگئے تھے۔ مل ہیری نے اس سے کہا۔ ''مسٹر بریسنن ساڑھے سولہ ہزار پاؤنڈز اسٹرلنگ ایک بہت بڑی رقم ہے جو تمہارے اکاؤنٹ میں ایسے ہی پڑی ہے کیوں نہ تم اسے بینک کی کسی اسکیم میں لگا دو۔''

''میرے ذہن میں سرمایہ کاری ہے لیکن بینک میں نہیں۔'' جیک نے کہا۔ ''اگر میں رقم امریکا منتقل کرنا چاہوں تو؟''

''ہمارے پاس ٹی ٹی کی سہولت ہے۔'' منیجر نے کہا۔ ''تین دن میں تمہاری رقم امریکا کے کسی بھی بینک کے کسی بھی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کی جاسکتی ہے۔''

جیک بینک سے باہر آیا۔ اس کا دفتر یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل چل پڑا۔ ابھی وہ دفتر کے پاس تھا کہ کسی نے اسے آواز دی۔ ''مسٹر بریسنن......''

اس نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک کے دوسری طرف وہی کیتھو راجر میسٹر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سڑک پار کی اور اس کی طرف آیا۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے راجر نے کہا۔ ''اچھا ہوا مسٹر بریسنن تم یہاں مل گئے، میں تمہارے دفتر ہی جارہا تھا۔''

جیک نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''سوری مسٹر راجر، میں مصروف ہوں اگر یہ آفیشل ملاقات نہیں ہے تو میں فی الحال معذرت چاہوں گا۔''

''آفیشل تو نہیں ہے لیکن......''

''میں نے کہا ناں میں معذرت چاہوں گا۔''

جیک آگے بڑھا۔

''مسٹر بریسنن۔'' راجر نے عقب سے کہا۔ ''سارہ بٹلر خود یہاں آچکی ہے اور اس کے پاس تمہارے لیے ایک نہایت اہم خبر ہے۔ ممکن ہے اس سے نہ ملنے کی صورت میں تم نہایت اہم حقائق سے محروم رہ جاؤ۔''

جیک رکا اور پلٹ کر راجر کے پاس آیا۔ ''کیسے حقائق؟''

''مسز بریسنن سے متعلق حقائق۔''

''مسٹر میسٹر اگر حقائق جاندار نہ ہوئے تو بات بہت دور تک جائے گی۔''

''بات بہت دور تک ہی جائے گی۔'' راجر نے اطمینان سے کہا۔ کچھ دیر بعد جیک ہوٹل کے لاؤنج میں سارہ کے سامنے تھا۔ وہ تقریباً تیس برس کی دبلی سی عورت تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور کمزور تھا۔ جیک کو اس کے نقوش میں الزبتھ کی ذرا بھی جھلک نظر نہیں آئی تھی، وہ اس سے بالکل مختلف خد و خال کی مالک تھی۔ جیک اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارہ کی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ اس نے اچانک کہا۔

''کون ہے یہ عورت جس نے میری بہن کا نام اختیار کیا ہوا ہے؟''

جیک اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''میں سمجھا نہیں، تم الزبتھ کی بات کررہی ہو؟''

''وہ الزبتھ نہیں ہے۔''

''ایک منٹ۔'' جیک کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ الزبتھ نہیں ہے۔''

سارہ نے اپنے بیگ سے ایک کاغذ نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ خط تمہاری بیوی نے مجھے لکھا ہے۔''

جیک نے خط لے کر دیکھا، وہ الزبتھ کی خوب صورت ہینڈ رائٹنگ میں تھا۔ اس نے وہی سب لکھا تھا جو اس نے جیک کو بھی بتایا تھا۔ جیک نے سارہ کی طرف دیکھا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ خط الزبتھ نے لکھا ہے۔''

''تب اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ الزبتھ نہیں ہے۔ اس نے میری بہن الزبتھ کی شخصیت ادھار لی ہے۔'' سارہ نے کہتے ہوئے اپنے بیگ سے ایک خط نکالا اور اس کی طرف بڑھایا۔ ''یہ الزبتھ کی تحریر ہے۔ میری بہن الزبتھ کی۔''

جیک نے دونوں خطوط کا آپس میں موازنہ کیا اور اسے چند لمحے لگے یہ جاننے میں کہ دونوں تحریریں بالکل مختلف تھیں اور الگ الگ عورتوں نے لکھی تھیں۔ جیک کا دل ڈوبنے لگا اور اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ ''ہوسکتا ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو اور تمہاری بہن الزبتھ بٹلر کوئی اور ہو یہ الزبتھ بٹلر کوئی......''

''تم بھول رہے ہو اس نے سارہ کو بہن تسلیم کرتے ہوئے اس کے خط کا جواب دیا ہے۔'' راجر میسٹر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ جیک کو لگا کہ اس کا سر چکرا رہا ہے۔ اس نے ڈوبتے لہجے میں کہا۔

''لیکن اسے ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''تاکہ وہ تم سے شادی کرسکے۔'' راجر میسٹر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک دولت مند جاگیردار ہو۔''

"...پھر تمہاری [illegible] ہاں ہے؟" جیک نے [illegible] کی طرف دیکھا تو وہ رونے لگی۔

"میں نہیں جانتی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔"

راجر نے کہا۔ "میں کیو بار روانہ ہو رہا ہوں، مجھے بے آف ہوانا سے ملنے والی لاش کے بارے میں پھر تفتیش کرنا ہوگی۔ لیکن اس سے پہلے مجھے اس عورت کو گرفتار کرنا ہوگا جو الزبتھ بٹلر بن کر تمہارے گھر میں موجود ہے۔"

جیک کھڑا ہو گیا۔ "مجھے جانا ہوگا۔"

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔" راجر نے کہا۔

"کیا تمہارے پاس گھوڑا ہے؟"

"نہیں۔"

"تب تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے۔"

کچھ دیر بعد جیک گھوڑے پر سوار اسے دوڑاتا ہوا پیلس کی طرف جا رہا تھا۔ وہ مسلسل گھوڑے کو ایڑ لگا رہا تھا اور اس نے ایک لمحے کو بھی اسے رفتار کم کرنے نہیں دی تھی۔ وہ پیلس کے پاس پہنچا تو اس نے دور سے چلا کر گیٹ [illegible] کیا اور اس نے بچاؤ [illegible] بمشکل گھوڑے کے دروازے سے ٹکرانے سے پہلے دروازہ کھلا اور گھوڑا پوری رفتار سے اندر آیا۔ آدھے گھنٹے کا سفر اس نے بیس منٹ سے بھی پہلے طے کیا اور پیلس میں داخل ہوا اور پوری طاقت سے لگام کھینچی تو گھوڑا الف ہو گیا تھا۔ جیک کود کر اترا۔ صحن میں ملازمین [illegible] صحن میں گرے [illegible] رہے تھے۔ الزبتھ کی فرمائش پر جیک یہاں پام اور ناریل کے درخت لگوا رہا تھا۔ اس نے پوری قوت سے چلا کر الزبتھ کو آواز دی۔ "الزبتھ کہاں ہو؟"

اس کی پکار پر بالکونی کے ماما مولی نمودار ہوئی۔ اس نے جیک کے تاثرات سے بھانپ لیا اور تیزی سے نیچے آئی۔ جیک سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ماما سے پوچھا۔ "لِز کہاں ہے؟"

"وہ تو تمہارے جانے کے مشکل سے آدھے گھنٹے بعد ہی یہاں سے روانہ ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا سارا سامان بھی ساتھ لے لیا تھا۔ سامان وہ سوٹ کیسوں میں لے گئی ہے اور اپنی بگھی لے کر گئی ہے۔ کیا ہوا ہے تم دونوں میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔"

جیک بیڈ روم میں آیا جہاں تمام الماریاں اور تمام درازیں کھلی ہوئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ الزبتھ بہت عجلت میں روانہ ہوئی ہے۔ یہاں صرف لکڑی کی پیٹی رہ گئی تھی اور اس پر بدستور تالے لگے ہوئے تھے۔ جیک نے الماری میں اپنا خفیہ خانہ کھول کر اس میں رکھا ہوا پستول نکالا اور ایک ایک کر کے پیٹی کے دونوں تالے فائر کر کے توڑ دیے۔ اس نے پیٹی کھولی تو اس میں سوائے چند پرانے ملبوسات کے اور کچھ نہیں تھا۔ الزبتھ کو اب ان کی ضرورت نہیں تھی اس لیے وہ انہیں یہاں چھوڑ گئی تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اس کی نشان دہی کر سکتی۔ جیک نے مشتعل ہو کر پیٹی کا ڈھکن پوری قوت سے بند کیا۔ پھر وہ ڈریسنگ کی طرف آیا تو وہاں شادی کی انگوٹھی موجود تھی جو اس نے شادی کے وقت اسے پہنائی تھی۔ اس میں خاصا بڑا ہیرا جڑا ہوا تھا اور الزبتھ یہ بھی انگوٹھی چھوڑ گئی تھی۔ اس نے انگوٹھی مٹھی میں بھینچ لی اور ماما کی طرف دیکھا۔ "وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔"

"اوہ۔" ماما آگے آئی، اس نے جیک کے لرزتے ہاتھ تھام لیے۔ "کیا ہوا میرے بچے؟"

"میں نہیں جانتا، مجھے نہیں معلوم وہ کیوں مجھے چھوڑ گئی ہے۔"

"وہ کہاں گئی ہے۔"

جیک سوچ رہا تھا اور ماما کے اس سوال پر چونکا۔ تب اس کے ذہن میں ایک چونکا دینے والا خیال آیا اور اس نے ماما سے کہا۔ "مجھے جانا ہے۔"

اس سے پہلے ماما پوچھتی کہ اسے کہاں جانا ہے وہ نیچے جا چکا تھا۔ اس نے سیڑھیوں پر ہی سے چلا کر اپنا گھوڑا باہر لانے کو کہا اور ایک منٹ بعد وہ اسی رفتار سے واپس کنگسٹن کی طرف جا رہا تھا۔ ابھی وہ پیلس سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ کنگسٹن کی طرف سے ایک بگھی آتی دکھائی دی اور پھر اس میں سے راجر نے ہاتھ نکال کر اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ اگر راجر پولیس میں نہ ہوتا تو جیک کسی صورت نہ رکتا۔ بادلِ ناخواستہ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ راجر بگھی سے باہر آیا۔

"کیا ہوا، وہ کہاں ہے؟"

"پیلس میں نہیں ہے۔ وہ اپنا سارا سامان ساتھ لے گئی ہے۔" جیک نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ راجر نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو اسے بچانے کی کوشش تو نہیں کر رہے؟"

"جہنم میں جاؤ تم۔" جیک نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ راجر اسے عقب میں آواز دیتا رہ گیا۔ وہ آندھی طوفان کی طرح آئزک کے دفتر پہنچا اور اس سے کہا۔

"میرے ساتھ جیک چلو..."

"کیا ہوا ہے؟" آئزک اس کے پیچھے آتا ہوا بولا۔ جیک نے اسے دروازے سے ہی کہا تھا اور وہیں سے پلٹ گیا۔ اس نے راستے میں آئزک کو بتایا۔

"الزبتھ غائب ہے اور وہ اپنا سارا سامان بھی لے گئی ہے۔"

"میرے خدا۔" آئزک کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ معاملہ کیا ہے۔ جیک بینک میں داخل ہوتے ہی منیجر مل بیری کے کمرے کی طرف لپکا۔ وہ اس وقت ایک گاہک سے بات کر رہا تھا اور یوں بلا اجازت اندر آنے پر اس نے جیک کو گھورا۔ اس نے جاتے ہی سوال کیا۔

"الزبتھ یہاں آئی تھی؟"

"ہاں مسٹر بریسٹن، وہ ابھی ایک گھنٹا پہلے ہی یہاں سے گئی ہے۔" مل بیری نے اسے غور سے دیکھا۔ "کوئی مسئلہ ہے؟"

"اس نے چیک کیش کرایا تھا؟" جیک نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا۔

مل بیری نے سر ہلایا۔ "بالکل مسٹر بریسٹن۔"

"کتنے کا؟"

"اکاؤنٹ میں جتنی رقم تھی۔" مل بیری نے کہا اور اپنے سامنے رکھا ہوا رجسٹر کھولا۔ "مسٹر بریسٹن اس وقت تمہارے اکاؤنٹ میں صرف دو شلنگ اور دو پنس ہیں۔ مسز بریسٹن نے ستائیس ہزار سات سو اکتیس پاؤنڈز کا چیک کیش کرایا ہے۔"

"اور تم نے کیش کر دیا۔" جیک نے چیخ کر کہا اور آگے بڑھ کر بوڑھے مل بیری کے کوٹ کا کالر پکڑ لیا۔ لیکن اس سے پہلے وہ کوئی کارروائی کرتا، آئزک نے جلدی سے اسے پیچھے کیا اور اس کے کان میں بولا۔

"یہ کیا کر رہے ہو، کیا جیل جانا چاہتے ہو؟"

منیجر کو غصہ آ گیا تھا۔ "یہ کون سا طریقہ ہے مسٹر بریسٹن۔"

"تم نے چیک کیوں کیش کیا۔" جیک چلّایا۔

آئزک نے مل بیری سے معذرت کی۔ "اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔"

مل بیری کسی حد تک صورت حال سمجھ رہا تھا اور پھر جیک اس کا مستقل کسٹمر تھا اس لیے اس نے بھی بات آگے بڑھانے سے گریز کیا اور نرمی سے بولا۔ "میں سمجھتا ہوں مسٹر ولیم شاٹ، مگر میں یقین دلاتا ہوں، بینک نے خلاف قانون کچھ نہیں کیا ہے۔ مسز بریسٹن نے خود مسٹر بریسٹن کی جو چیک سائن کیا تھا اور وہ اسی طرح رقم نکلوانے کی مجاز ہے جیسے مسٹر بریسٹن ہیں۔" اس نے کہتے ہوئے جیک کی طرف دیکھا۔ "اگر مسٹر بریسٹن میری بات مان لیتے اور رقم کو بینک میں انویسٹ کر دیتے تو ان کے علاوہ کوئی دوسرا اس رقم کو نکلوا نہیں سکتا تھا۔"

جیک منیجر کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اس کا دماغ سن ہو رہا تھا اور وہ الزبتھ کی گزشتہ روز کہی بات یاد کر رہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ آج کے دن اسے سرپرائز دے گی اور اس نے سچ مچ سرپرائز دیا تھا۔ وہ یقیناً پہلے سے اس کام کے لیے تیار تھی اور اس وقت وہ شاید جمیکا سے بھی نکل چکی تھی۔ اس نے چونک کر خود کو آئزک سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں فوراً بندرگاہ جانا ہوگا۔"

مگر جب وہ بندرگاہ پہنچے تو انہیں علم ہوا کہ نصف گھنٹے پہلے ایک کروزر شپ کیوبا کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ بندرگاہ کے چند ملازمین کو وہ حسین عورت یاد تھی جس کے پاس خاصا سامان تھا اور اس نے سامان جہاز پر لے جانے کے لیے دو قلی کیے تھے۔ قلیوں نے تصدیق کی کہ انہوں نے اس حسین خاتون کا سامان کروزر شپ کے فرسٹ کلاس کیبن میں پہنچایا تھا۔ بندرگاہ کے بکنگ آفس سے معلوم ہوا کہ لیڈی جولیانہ جونز نے ہوانا تک کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا تھا اور وہ اکیلی سفر کر رہی تھی۔

☆☆☆

عورت نے پادری کی طرف دیکھا جو بہت غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ "نادر، ایسی عورت کو کیا کہا جائے جو اپنے محبت کرنے والے شوہر کو دھوکا دے اور اس کی زندگی سے خاموشی سے نکل جائے۔ یہی نہیں وہ اس کی ساری جمع پونجی بھی لے جائے۔"

پادری ہچکچایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ عورت اپنی کہانی بیان کر رہی ہے مگر اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا اسے بے راہ رو اور دھوکے باز قرار دے۔ "ظاہر ہے اچھا نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کے پس پشت بہت سے عوامل ہو سکتے ہیں کہ کوئی عورت ایسا کیوں کر سکتی ہے۔ ہاں اگر وہ مجرم ذہن رکھتی ہو تو الگ بات ہے۔"

عورت نے تشکر آمیز انداز میں پادری کی طرف دیکھا۔ "شکریہ نادر، تم پہلے آدمی ہو جس نے ایسی رائے دی ہے۔ تم نے ٹھیک کہا ہر عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔"

وہ ستون سے ہٹی اور دوبارہ سلاخوں تک آئی جہاں

پورے چاند کی روشنی میں فلیٹ سی پتھریلی ابھری ہوئی سطح پر لیٹی ہوئی اور اس کے ساتھ سزائے موت کی مشین صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مشین دیکھ کر اس کا نازک جسم کانپ اٹھا تھا۔ ایک لمحے کو لگا کہ وہ نیچے گر جائے گی مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ پادری اس کی طرف بڑھتے بڑھتے رہ گیا۔ وہ اسے سہارا دینے جا رہا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے آگے آیا تھا اتنی ہی تیزی سے رک گیا۔ عورت پلٹ آئی، اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''بہت خوفناک ہے۔''

''موت خوفناک ہی ہوتی ہے۔''

''میں مشین کی بات کر رہی ہوں۔''

''یہ موت کی مشین ہے اس لیے خوفناک ہے۔'' پادری نے نرمی سے کہا۔ ''یہ موت ہے جو متعلقہ چیزوں کو خوفناک بناتی ہے۔''

عورت نے سر تھاما۔ شاید اسے پھر چکر آیا تھا، وہ گرنے لگی تھی۔ اس بار پادری کو اسے تھامنے کے لیے آگے نہیں آنا پڑا کیونکہ وہ اس کے بالکل پاس تھی۔ اس کا نازک وجود بانہوں میں آیا تو پادری کانپ اٹھا۔ اس نے جلدی سے عورت کو نیچے ڈھلوان پر لٹا دیا اور پھر کونے میں رکھے مٹی کے جگ سے مٹی کے پیالے میں پانی نکالا۔ اس نے پیالہ زمین پر رکھا اور پہلے عورت کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا اور پیالے سے پانی تھوڑا تھوڑا کر کے اس کے ہونٹوں پر ٹپکانے لگا۔ عورت کو جلد ہوش آ گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پادری نے روک دیا۔ ''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، پہلے پانی پی لو۔''

اس نے پیالہ عورت کے لبوں سے لگا دیا اور وہ گھونٹ گھونٹ کر کے پانی پینے لگی۔ نصف پیالہ پی کر وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے باقی پانی بھی پیا۔ پادری اس کی شفاف گردن سے اترتا ہر گھونٹ دیکھ سکتا تھا۔ پانی پی کر اس کی حالت خاصی بہتر نظر آنے لگی اور اس نے تشکر آمیز انداز میں پادری کو دیکھا۔ ''فادر میں شکر گزار ہوں۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے، اگر تمہیں آرام کی ضرورت ہے تو میں چلا جاؤں؟''

''نہیں۔'' عورت کانپ اٹھی۔ ''میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''

''تم فکر مت کرو جب تک تم جانے کو نہیں کہو گی میں یہاں موجود ہوں۔'' پادری نے اسے یقین دلایا۔ قلعے کے گجر نے دو گھنٹے بجائے۔ یعنی ابھی دو بجے تھے اور صبح میں خاصا وقت باقی تھا۔ عورت نے پادری کی طرف دیکھا۔

میری کہانی ابھی باقی ہے۔

''میرے پاس بہت وقت ہے۔'' نوجوان پادری نے نرمی سے کہا۔

☆☆☆

یہ تیسرا دن تھا کہ جیک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا، اس دوران میں اس نے برائے نام کھایا تھا اور زیادہ تر پیتا رہا تھا یا مدہوش پڑا رہا تھا۔ ملازمین آتے اور اندر جھانک کر چلے جاتے۔ اس نے واضح حکم دیا تھا کہ کوئی اس کی تنہائی میں مداخلت نہ کرے۔ ورنہ وہ اسے ملازمت سے نکال دے گا۔ آرنک اسے مل بیری کے پاس سے لے آیا تھا پھر راجر بیسر بھی اس کے دفتر پہنچ گیا اور وہاں اس کا جیک سے جھگڑا ہوا۔ جیک اسے مارنے کو دوڑا تھا مگر آرنک نے یہاں بھی بیچ بچاؤ کرایا اور اسے زبردستی ہیلی پیڈ بھیج دیا۔ تب سے وہ اپنے کمرے میں تھا۔ ماما دو دن سے برداشت کر رہی تھی۔ مگر آج اس سے برداشت نہیں ہو سکا۔ وہ اندر آ گئی۔ جیک کھڑکی کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے میز پر بوتل کے ساتھ گلاس اور اس کا پستول رکھا ہوا تھا۔ ماما اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور دردمندی سے بولی۔ ''میرے بچے، کب تک اپنے کمرے میں بند رہو گے۔''

''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔'' جیک نے بوجھل لہجے میں کہا۔

''اسے بھول جاؤ، وہ بے وفا اور دغاباز عورت تھی۔''

''میں اسے نہیں بھول سکتا۔''

''تو کیا ساری عمر یونہی کمرے میں بند رہو گے؟''

جیک نے سرخ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اب نہیں رہوں گا۔ میں نے سوچ لیا ہے۔''

''کیا؟''

جواب میں جیک نے پستول اٹھایا تو ماما کا رنگ سفید ہو گیا۔ اس نے پستول لینا چاہا مگر جیک نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم فکر مت کرو، میں نے خودکشی کرنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔''

☆☆☆

ہوٹل کراؤن پیلس کے بار میں جیک ایک میز پر موجود تھا۔ یہاں سے کنگسٹن کا دور تک پھیلا ہوا سفید ریت والا ساحل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ڈیسک کلرک کو ڈیڑھ ڈالر دے کر بار میں پیغام دیا تھا کہ وہ بار میں اس کا منتظر ہے۔ وہ تقریباً آدھے گھنٹے بعد آیا اور

اس نے معذرت کی۔ ''میں ذرا مصروف تھا۔''

جیک نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''کوئی بات نہیں میں بالکل بھی مصروف نہیں ہوں اور میرے پاس آج کل وقت ہی وقت ہے۔ میں اس دن کی تلخ کلامی پر شرمندہ ہوں۔''

راجر سنجیدہ ہوگیا۔ ''مجھے تمہارے بارے پتا چلا ہے کہ وہ تمہاری ساری جمع پونجی لے کر فرار ہوئی ہے۔''

جیک نے یوں ہاتھ ہلایا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ ہو۔ ''اسے بھول جاؤ، یہ بتاؤ کہ سارہ بٹلر کہاں ہے؟''

''وہ واپس ہوانا جا چکی ہے۔'' راجر نے بتایا۔

''وہاں سے وہ شاید لندن چلی جائے۔''

''تم کیوں نہیں گئے؟'' جیک نے پوچھا۔ ''تم نے بھی تو بے آف ہوانا سے ملنے والی لاش کے بارے میں تفتیش کرنی تھی؟''

''مجھے یہاں اس عورت کے بارے میں مزید کچھ معلومات درکار ہیں۔ مجھے یقین ہے اصل الزبتھ بٹلر کی قاتل یہی عورت ہے جس نے اس کا روپ دھار رکھا ہے۔''

جیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ الزبتھ بٹلر بھی نہیں رہی ہوگی۔''

''مجھے معلوم ہے اس نے حلیہ بدل لیا ہوگا۔ مگر وہ کچھ بھی کر لے، میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا، اسے تلاش کر کے رہوں گا۔''

''جب تم اس تک پہنچ جاؤ گے تو تم کیا کرو گے؟''

''میں اسے گرفتار کر کے برطانیہ لے جاؤں گا اور وہاں اسے عدالت میں پیش کروں گا۔ پورا امکان ہے کہ اسے سزائے موت ملے گی اور اسے لٹکا دیا جائے گا۔''

''فرض کرو میں تم سے کہتا ہوں کہ اسے میرے لیے تلاش کرو۔''

راجر نے غور سے اسے دیکھا۔ ''کیوں؟''

''کیونکہ میں اس سے..... اپنی رقم واپس لینا چاہتا ہوں۔ یہ میرا حق ہے۔''

راجر سوچ میں پڑ گیا۔ ''دیکھو میں قانون کا محافظ ہوں اور قانون کے لیے کام کرتا ہوں، مجھے نجی پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں جانتا ہوں، میں اس سے صرف اپنی رقم لوں گا اگر اس نے شرافت سے دے دی ورنہ پھر میں بھی عدالت میں ہی جاؤں گا۔''

راجر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

جیک نے اپنا خالی گلاس میز پر پٹخ دیا۔ ''میں دنیا کے آخری سرے اور جہنم تک جانے کے لیے تیار ہوں اگر مجھے الزبتھ کے ملنے کا ذرا سا بھی آسرا ہو۔''

''بس تو تیاری کرلو، کل یہاں سے ایک کروزر شپ ہوانا کے لیے جا رہا ہے۔ اگر وہ ہوانا سے آگے نہیں گئی ہے تو وہیں ہوگی۔''

جیک کے پاس اب زیادہ رقم نہیں رہی تھی۔ کم سے کم وہ فارم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ واپس پیلس آیا اور اس نے ماما موبی سے کہا۔ ''میرا تمام ذاتی سامان نکال دو۔''

وہ پریشان ہوگئی۔ ''کیوں؟''

''میں یہاں سے جا رہا ہوں اور جاگیر بھی بند رہے گی۔''

ماما کی پریشانی بڑھ گئی۔ ''اور ہم ملازم؟''

جیک نے اس کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولا۔ ''ماما میں خالی ہاتھ ہو گیا ہوں۔ الزبتھ میری ساری جمع پونجی لے گئی ہے۔ میں اس کی تلاش میں جا رہا ہوں اگر وہ مل گئی اور میری رقم مل گئی تو میں واپس آؤں گا۔ دوسری صورت میں میں یہ جاگیر نہیں چلا سکتا۔ تم لوگوں کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات ادا نہیں کرسکتا۔''

ماما موبی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''میں تمہاری مجبوری سمجھ رہی ہوں میرے بچے۔''

جیک نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ ''تم نہیں جانتیں میں کس دل سے جا رہا ہوں لیکن میرا وعدہ ہے اگر میں جاگیر سنبھالنے کے قابل ہوا تو ضرور واپس آؤں گا۔''

جیک نے تمام ملازمین کو نوکری سے نکال دیا۔ اس نے پیلس اور فارم کی تمام چیزیں ان لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ پیلس بند کروا دیا اور فارم کے لیے کہا کہ اگر ملازمین چاہیں تو اس کی دیکھ بھال کرلیں اور حاصل ہونے والی فصل سے اپنے اخراجات پورے کرلیں۔ مگر کیونکہ فارم کا مالک نہیں ہوتا اس لیے ملازمین یہاں کام کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ انہوں نے ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ جیک نے اپنا ذاتی سامان لیا، پیلس بند کرایا اور وہاں سے نکل آیا۔

اگلے دن وہ کروزر شپ پر سوار کیوبا کی طرف جا رہے تھے۔ راجر اس سفر میں اس کے ساتھ تھا اور وہ دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ جمیکا سے کیوبا کا فاصلہ سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔ دونوں جزائر کریبین سی میں

ہیں۔ مگر کیوبا خاصا بڑا ہے۔ کنگسٹن سے ہوانا تک کا بحری فاصلہ پانچ سو کلومیٹرز بنتا ہے کیونکہ کنگسٹن، جمیکا کے جنوب میں ہے جب کہ ہوانا، کیوبا کے شمال اور خاصے مغرب میں واقع ہے۔ اس لیے دونوں بندرگاہوں کے درمیان سفر کرنے والے بحری جہازوں کو خاصا گھوم کر جانا پڑتا ہے۔

وہ دو دن بعد ہوانا کی بندرگاہ پر اترے تھے۔ جیک پہلے بھی کئی بار ہوانا آچکا تھا۔ یہاں اسپینش زبان بولی جاتی ہے اور سو فیصد آبادی ہسپانوی نژاد لوگوں کی ہے۔ کچھ سیاہ فام اور کچھ امریکی تھے مگر وہ یہاں کے شہری شمار نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہاں آنے والے امریکی اور برطانوی سیاحوں اور تاجروں کی وجہ سے انگریزی نامانوس زبان نہیں تھی۔ ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس وقت امریکا جزائر کریبین میں اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہا تھا۔ کیوبا پر اس کا اثر ورسوخ بڑھ رہا تھا۔ وہ بندرگاہ سے نکلے تو رات ہوانا پر اپنے پر پھیلا چکی تھی اور اس کی گلیوں میں موسیقی اور رقص کا سیلاب سا امنڈ آیا تھا۔ بہ ظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی میلہ ہے مگر جیک جانتا تھا یہاں ہر رات ہی میلہ لگتا ہے۔ مختلف طرح کے سازندے ساز بجا رہے تھے۔ لڑکیاں اور عورتیں ناچ رہی تھیں۔ ان میں بڑی تعداد سیاح عورتوں کی تھی۔

مقامی لڑکیاں سیاحوں کا دل لبھانے کے لیے اپنے جسم کی نمائش میں کسی بخل سے کام نہیں لے رہی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سیاح یہی سب دیکھنے کے لیے اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور آتے تھے۔ خاص طور سے یورپ اور امریکا سے آنے والے سیاحوں کے لیے اس ماحول میں بڑی کشش تھی۔ تنگ گلیوں کی وجہ سے انہیں گھوڑا گاڑی بہت پہلے چھوڑنا پڑی تھی اور اب وہ پیدل ہوٹل ڈی ہوانا کی طرف رواں تھے جس کا شمار ہوانا کے بہترین ہوٹلوں میں ہوتا تھا۔ یہاں سب اپنی موج مستی میں مصروف تھے۔ جیک بار بار ان خواتین سے معذرت کر رہا تھا جن سے وہ ٹکرا رہا تھا مگر کوئی اس کے ٹکرانے کا برا نہیں مان رہی تھی۔ ان میں سے بیشتر نشے میں دھت تھیں۔ تقریباً سب کے ہاتھوں میں مقامی بیئر کے بڑے بڑے مگ تھے۔

جیک جانتا تھا کہ یہ خاصی تیز ہوتی ہے۔ عادی شرابی بھی اس کا ایک مگ پی کر جھوم جاتے ہیں۔ بہ مشکل وہ ہوٹل تک پہنچے اور وہاں کے ملازمین نے ان کا سامان اوپر ان کے کمروں تک پہنچایا تھا۔ اس سفر کے دوران راجر کا رویہ خاصا مختلف تھا۔ جیک نے محسوس کیا کہ وہ عورتوں میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے دوران سفر ایک اوتیز عمر کی عورت سے دوستانہ طور پر [illegible] روابط استوار کرلیے تھے، اس کا بیشتر وقت اسی کے کیبن میں گزرا تھا۔ جیک کو اس کا رویہ ایک ذمے دار پولیس آفیسر کے شایانِ شان نہیں لگا۔ راجر جیک کے ساتھ تھا اور وہ اس کے سامان کے ساتھ ہی کمرے میں چلا آیا تھا۔ جیک تھکن اور بیزاری سی محسوس کر رہا تھا۔ وہ آرام چاہتا تھا مگر راجر اس کا ساتھ چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''اگر تم تھکے نہیں ہو تو ہم باہر چلتے ہیں اس وقت یہاں کا ماحول دیکھنے والا ہے۔ کتنی رونق ہے یہاں۔''

جیک نے دروازہ کھول کر بالکونی سے نیچے دیکھا اور اس نے راجر سے اتفاق کیا کہ ماحول دیکھنے والا تھا۔ مگر اسے اس ہنگامے اور شور سے الجھن ہو رہی تھی۔ اس نے اندر آکر دروازہ بند کرلیا اور اپنا کوٹ اتارا۔ یہاں گرمی زیادہ تھی۔ شاید ماحول کا اثر تھا۔ اس نے سامان لانے والے ملازمین کو ٹپ دی اور بولا۔ ''اب میں تنہائی چاہتا ہوں۔''

ملازمین باہر نکل گئے مگر راجر وہیں رہا تھا۔ جیک نے اس کی طرف دیکھا۔ ''میری مراد مکمل تنہائی ہے۔''

''اوہ۔'' بہتر ہے تم دروازہ راجر جلدی سے اٹھا اور اپنا بیئر پر جاتے ہوئے بولا۔ ''تب تم سے کل ملاقات ہوگی۔''

اس کے جانے کے بعد جیک نے دروازہ بند کیا اور اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے رات کا لباس نکالا۔ پھر اس نے اپنے لیے وسکی اور برف منگوائی۔ ویٹر اس کے لیے ٹرے میں دونوں چیزیں سجا کر لایا تو اس نے باہر بہت زیادہ شور شرابے کی وجہ پوچھی۔ ویٹر نے حیرت سے کہا۔ ''آپ نہیں جانتے سینور، آج ہولوین نائٹ ہے۔ لوگ کاسٹیوم پارٹیاں کر رہے ہیں اور حلیے بنا کر گھوم رہے ہیں۔''

جیک کو خیال آیا کہ اگر الزبتھ یہاں ہوئی تو وہ بھی کہیں نہ کہیں کسی پارٹی میں ہوگی۔ اسے ڈنر کے لیے باہر جانا ہی تھا۔ اس نے دوبارہ سوٹ پہنا اور باہر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ ویٹر نے ہی اسے بتایا کہ سب سے بڑی پارٹی... لاکا سٹیلا میں ہو رہی تھی یہ شہر کی سب سے معروف تفریح گاہ اور ہوٹل تھا۔ جیک کو ایک بار پھر پرہجوم گلیوں سے گزرنا پڑا تھا جہاں لوگوں کا ہجوم اور شور مزید بڑھ گیا تھا۔ لاکا سٹیلا امرا کی تفریح گاہ تھی اور وہاں اس وقت سارے شہر کی کریم جمع تھی۔ دولت مند سیاح بھی یہیں آئے ہوئے تھے۔ جیک اندر آیا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اس لیے اس نے ڈائننگ ہال کا رخ کیا۔ وہ میز پر بیٹھا اور اشارے سے ہیڈ ویٹر کو

طلب کیا اور اسے آرڈر نوٹ کرانے لگا۔ وہ داخلی دروازے سے ذرا ہی دور ایک گدیلی نشستوں والے ایسے بوتھ میں تھا جو تین طرف سے بند تھا اور صرف ایک سمت کھلی تھی۔ وہ داخلی دروازے کے پاس ہی تھا مگر اس جگہ سے دروازہ نظر نہیں آرہا تھا۔ داخلی دروازے کے پاس سے ایک مردانہ آواز آئی۔

''مائی لیڈی، یہ کیسا رہے گا؟''

''ٹھیک ہے۔'' عورت نے جواب دیا تو جیک چونکا تھا۔ اسے شبہ ہوا کہ آواز الزبتھ کی تھی۔ اگرچہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے الزبتھ کا روپ دھارا تھا اس کا اصل نام کچھ اور تھا مگر وہ جب اس کے بارے میں سوچتا تو ذہن میں الزبتھ نام ہی آتا۔ اس نے بوتھ سے جھانک کر دیکھا۔ ایک پستہ قد اور معمر لیکن لباس سے دولت مند نظر آنے والے مرد کے ساتھ سیاہ سوٹ اور سیاہ ہی نقاب میں ایک عورت کھڑی تھی۔ مرد اس کے ساتھ آگے بڑھا۔ عورت کی چال دیکھ کر جیک کا رہا سہا شبہ بھی جاتا رہا۔ وہ الزبتھ تھی۔ دونوں ایک کونے والی میز پر جا بیٹھے مگر شاید الزبتھ کو یہاں کا ماحول پسند نہیں آیا تھا۔ اس نے کچھ کہا اور مرد نے ہیڈ ویٹر سے کسی الگ جگہ کی فرمائش کی اور وہ انہیں اوپر ٹیرس پر لے گیا۔ ہیڈ ویٹر کی واپسی پر جیک نے اشارے سے بلایا اور آہستہ سے کہا۔

''اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو تم جن صاحب کو اوپر لے کر گئے ہو یہ یہاں کے ایک مشہور دولت مند......'' جیک بولتے ہوئے یوں رکا جیسے دماغ پر زور دے رہا ہو۔ ہیڈ ویٹر نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

''یہ مار دے ڈی فلپ ہیں یہاں کے مشہور سرمایہ دار اور دولت مند۔''

''بالکل۔'' جیک نے جوش سے کہا۔ ''میرے ذہن سے نام نکل گیا تھا۔ میں اسے جانتا ہوں۔''

''اگر آپ جانتے ہیں تو میں کیا ان سے ذکر کروں؟''

''اوہ نہیں۔ وہ اس وقت شاید اپنی بیوی کے ساتھ ہیں۔''

''مادام جولیا ڈی لستا ان کی منگیتر ہیں۔'' ہیڈ ویٹر نے انکشاف کیا۔

''ٹھیک ہے میں ان سے مل لوں گا۔ مگر ابھی تم ذکر مت کرنا۔''

ہیڈ ویٹر چلا گیا۔ کچھ دیر میں کھانا لگ گیا۔ جیک نے آرام سے کھانا کھایا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ الزبتھ بہت سست روی سے کھاتی ہے۔ اصل میں اسے کھانے میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ کھانے کے دوران جیک سوچ رہا تھا کہ کیا الزبتھ نے اس کی دولت اتنی تیزی سے خرچ کر دی کہ اب اسے ایسے بڈھے آدمی کی منگیتر بننا پڑا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے کافی طلب کی اور بل ادا کر دیا تاکہ اسے فوری اٹھنا پڑے تو اس میں تاخیر نہ ہو۔ اس کا اندازہ درست نکلا جب مار دے اور الزبتھ دو گھنٹے بعد اوپر سے اترے۔ مار دے کے لڑکھڑاتے قدم بتا رہے تھے کہ اس نے کھانے سے زیادہ پیا تھا۔ وہ دونوں اس کے پاس سے گزرنے لگے تو جیک نے نشست سے ٹیک لگاتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ وہ ممکنہ حد تک الزبتھ یا جولیا کی نظروں سے بچ رہا تھا۔ ان کے ہال سے نکلتے ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ دونوں باہر جائیں گے مگر انہیں سیڑھیوں سے ہوٹل کے اوپری حصے میں جاتے دیکھ کر وہ حیران ہوا تھا۔ مار دے کو ہوٹل میں رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی شہر میں اس کی عالی شان رہائش گاہ ہونی چاہیے تھی۔ شاید یہاں الزبتھ رکی ہوئی تھی۔ وہ ان کے پیچھے سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ دوسرے فلور پر سیڑھیوں کے ساتھ ہی ایک سویٹ کے دروازے کے سامنے وہ دونوں رکے تھے۔ جیک پیچھے ریلنگ کے پاس رک گیا۔ الزبتھ چابی سے دروازہ کھول رہی تھی اور مار دے اس پر لڑھکا جا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کمرے کے باہر ہی الزبتھ سے چمٹ جائے۔ اس کی وجہ سے الزبتھ کو دروازے کا لاک کھولنے میں دشواری پیش آرہی تھی اور یہ مشکل اس نے لاک کھولا تو وہ اس کے ساتھ ہی اندر جانے لگا۔ مگر الزبتھ نے اسے روک دیا۔ ''ابھی میں صرف منگیتر ہوں بیوی نہیں بنی ہوں۔''

''جلد ہم میاں بیوی بن جائیں گے، اب میں صبر نہیں کر سکتا۔'' مار دے نے نشے میں لڑکھڑاتی آواز میں کہا اور تقریباً زبردستی اندر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوا تو جیک اوپر آیا، اس نے آس پاس دیکھا اور دروازے سے کان لگا کر سنا۔ الزبتھ کہہ رہی تھی۔

''میری قمیص کی ڈوری کھول دو۔''

جیک الزبتھ کا یہ لہجہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ وہ بوڑھے سے کھیل رہی تھی اور یقیناً اس کی باچھیں یہ سوچ کر کھل گئی تھیں کہ وہ راضی ہو گئی ہے۔ جیک نے تالے کے سوراخ سے اندر جھانکا تو اتفاق سے وہ دونوں سامنے ہی تھے۔

ماردے نے جوش وخروش سے اس کی قمیص کی پشت سے ہُک کی ڈوری کھولی تو وہ اس کی طرف مڑی۔ ''بہت شکریہ اب تم جا سکتے ہو۔''

''میں آج یہیں رکوں گا۔''

مگر الزبتھ نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔''

بوڑھا ماردے سمجھ گیا کہ آج وہ مہربان نہیں ہے۔ مگر اس نے صبح کا آسرا دے دیا تھا اس لیے بادلِ ناخواستہ وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس وقت جیک سیڑھیوں سے مخالف سمت میں منہ دوسری طرف کیے کھڑا تھا۔ ماردے چند لمحے کھڑا حسرت سے بند دروازے کو دیکھتا رہا پھر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جاتے ہی جیک پلٹ کر دروازے پر آگیا اور اس نے دستک دی۔ اندر فراک اتارتی الزبتھ رکی اور پھر فراک اتار کر کسی قدر غصے میں دروازے تک آئی۔ اس کا خیال تھا کہ دروازے پر ماردے ہوگا مگر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا، جیک کا پستول اس کے سینے سے آلگا اور اس نے اسے پیچھے دھکیلا۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ اسے لاک کر کے وہ الزبتھ کی طرف متوجہ ہوا جو شاک کی کیفیت میں تھی اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''کیا پکاروں تمہیں، الزبتھ بٹلر یا جولیا ڈی لسٹا؟''

وہ اسے ایک ٹک دیکھ رہی تھی اور اس کی شفاف آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ ''جو تمہارا دل چاہے۔''

''میں تمہیں پکارنے نہیں آیا ہوں۔'' جیک کا غصہ بڑھنے لگا۔ ''میں تمہیں سزا دینے آیا ہوں۔''

''کس بات کی سزا......؟'' اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جیک کا ہاتھ اس کے منہ پر پڑا تھا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گری۔ جیک نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پھر تھپڑ مارا۔

''یاد آیا کس بات کی سزا؟''

''اگر تم رقم کے پیچھے آئے ہو تو وہ سان ڈیاگو جا چکی ہے اور اب وہ سوائے میرے اور کسی کو نہیں ملے گی۔''

جیک نے اس کی بات سنی نہیں۔ اس کے ہمیشہ... پُرسکون رہنے والے وجود میں اس وقت شدید اضطراب تھا۔ اس کا پورا جسم حرکت میں تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے تم سے شادی کی، تمہیں اپنی زندگی کا شریکِ سفر بنایا۔ تم کو اپنی ساری محبت اور پورا اعتماد دیا اور تم نے کیا کیا؟''

''میں تمہاری رقم لے کر بھاگ گئی۔''

جیک نے پھر اسے تھپڑ مارا۔ ''ذلیل عورت تو کیا سمجھ رہی ہے میں رقم کے لیے تیرے پیچھے آیا ہوں۔ میں اس محبت کے لیے آیا ہوں جو میں نے تجھ سے کی تھی اور اب میں تیری جان لے کر جاؤں گا۔''

الزبتھ فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اس نے جیک کا پستول والا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے سر پر رکھا۔ ''ماردو، لے لو میری جان۔''

''میں مارنے ہی آیا ہوں۔'' جیک نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے ذرا بھی رحم کی توقع مت رکھنا۔ اب میں تمہاری کسی چال میں نہیں آؤں گا۔''

وہ پیچھے ہٹا اور اس نے یوں پستول الزبتھ کے سر کی طرف کیا جیسے گولی چلانے والا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جیک کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ پورا زور لگا رہا کہ اس کی انگلی لبلبی دبا دے۔ مگر اس کی انگلی جنبش نہیں کر رہی تھی۔ وہ اس کے گرد گھوم رہا تھا اور پستول کا رخ مستقل الزبتھ کے سر کی جانب تھا۔ اچانک جیک نے پستول بستر پر پھینک دیا اور سر تھام کر چلایا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا لعنت ہو...... تم پر لعنت ہو۔''

الزبتھ نے آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم گولی چلاتے ہوئے ڈر رہے ہو تو میرا گلا دبا دو۔''

جیک غراتے ہوئے اس پر جھپٹا اور اس کا نازک گلا دبوچ لیا۔ ''مجھے یہی کرنا ہوگا۔ میں ہر صورت یہ کام کر کے جاؤں گا۔''

الزبتھ کی سانس رک رہی تھی مگر اس نے مداخلت نہیں کی اور جیک کو گلا دبانے دیا۔ اس کی سانس رک رہی تھی اور منہ کھل گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بس چند لمحوں کی مہمان ہے۔ اگر جیک اپنی گرفت چند لمحے اور برقرار رکھتا تو شاید ایسا ہی ہوتا مگر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر الزبتھ بے ہوش ہو کر اس کے ہاتھوں میں جھول گئی۔ اس نے اسے گرنے نہیں دیا تھا۔ جیک نے اسے اٹھا کر بستر ڈالا اور اس کی نبض دیکھنے لگا۔ نبض سست تھی مگر باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ اس کی لمبی اور شفاف گردن پر جیک کی انگلیوں کے نشانات چھپ گئے تھے۔ اس نے مضطرب لہجے میں خود سے کہا۔ ''یہ میں کیا کر رہا ہوں، میں اس عورت کو قتل کرنے آیا ہوں۔ میں اس کے لیے فکرمند کیوں ہوں، اس ناگن کو ختم کر دینا ہی بہتر ہوگا۔''

اس کے ہاتھ الزبتھ کی طرف بڑھے تھے لیکن وہ اس کے سنہرے بال سہلانے لگا۔ اس کے انداز میں محبت تھی۔ پھر اس نے اسے بے تابی سے سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ ''میں

تمہیں کہیں مار سکتا۔"

"کیوں؟" الزبتھ نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔ وہ ہوش میں آ گئی تھی۔ "میں واجب القتل ہوں، تم ذرا بھی قصوروار نہیں ہو گے۔"

"کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" جیک نے اسے دیکھا۔ "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا اگر تم میرے ساتھ نہ گئیں۔"

"میں اس قابل ہوں کہ تمہارے ساتھ جاؤں اور تمہارے ساتھ رہوں۔"

"ہاں، مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ پہلے میں دولت مند تھا، اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ مجھے کچھ کھونے کا خوف نہیں ہے سوائے تمہارے۔ میں سب کھو سکتا ہوں لیکن تمہیں نہیں کھو سکتا۔"

الزبتھ جو اب تک ساکت تھی اس کا انداز اچانک جنونانہ ہو گیا۔ وہ والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گئی اور اپنی محبت اور سپردگی کا پُرجوش اظہار کرنے لگی۔ جیک کے اندر رہی سہی ناراضگی اور غصہ بھی اس کے اس محبوبانہ انداز نے ختم کر دیا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر لمحوں میں بھول گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایک طویل اور بہت تھکا دینے والی رات کے بعد دن چڑھے جیک خود کو بہت ترو تازہ محسوس کر رہا تھا۔ الزبتھ کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھی اور وہ اس کے شانے پر پیار سے انگلی پھیر رہا تھا۔ الزبتھ کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ جاگ رہی تھی۔ جیک نے کہا۔ "الزبتھ یا جولیا، ان میں سے کون سا نام اصلی ہے۔"

"کوئی نہیں۔" وہ اس کی طرف مڑی۔ "میرا اصل نام جین ریکس جون ہے۔"

"جین۔" جیک نے زیرلب کہا۔ "یہ بھی اچھا نام ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ مار وے کیا ہے؟"

"میری اس سے چند دن پہلے ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے پروپوز کیا۔ میں نے ہاں کر دی۔"

"کیسے، تم میری بیوی ہو۔ شادی پر شادی کیسے کر سکتی ہو۔"

"میں شادی توڑ آئی تھی۔" جین نے اسے یاد دلایا۔ "شادی کی انگوٹھی میں وہیں چھوڑ آئی تھی۔"

جیک نے بستر کے ساتھ پڑے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ انگوٹھی نکالی جو جین پیلس میں چھوڑ آئی تھی۔ اس نے انگوٹھی جین کی انگلی میں پہنا دی۔ "میں اس شادی کو پھر سے بحال کرتا ہوں جو کبھی ختم ہونے کے لیے...

جین مسکرانے لگی۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور باہر سے مار وے ڈی فلپ کی آواز آئی۔ "میری پیاری جولیا دروازہ کھولو اور اپنے عاشق کو اپنا چہرہ دکھاؤ تاکہ اس کی صبح ہو سکے۔"

"یہ بڈھا پھر آ گیا۔" جیک نے بدمزگی سے کہا۔ "میں ابھی اس کا دماغ اور شاعری دونوں درست کرتا ہوں۔"

جیک صرف پاجامے میں تھا۔ وہ اٹھ کر دروازے تک آیا پھر اس نے دروازہ کھولا تو مار وے ایک بہت بڑا گلدستہ سامنے کیے اور زمین پر ایک پاؤں ٹیک کر نیازمندانہ انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔ جین کی جگہ نیم برہنہ جیک کو دیکھ کر اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا اور پھر اس نے غصے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کون ہو تم اور میری منگیتر کے کمرے میں کیا کر رہے ہو؟"

"میں تمہاری منگیتر کو نہیں جانتا لیکن اس وقت میں اپنی بیوی کے کمرے میں ہوں۔" جیک نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم کس خوشی میں صبح صبح یہاں آ کر اسے پکار رہے ہو اور اس انداز میں؟"

مار وے کا منہ مزید کھل گیا تھا۔ "بیوی؟"

"ہاں، جولیا میری بیوی ہے جو مجھ سے ناراض ہو کر چلی آئی تھی۔ میں نے اسے منا لیا۔"

جین بھی اٹھ کر دروازے تک آئی اور اس نے جیک کے پیچھے سے کہا۔ "یہ سچ ہے مسٹر فلپ۔"

مار وے ڈی فلپ کا حال ایسا تھا جیسے اس کی روح جسم سے پرواز کر گئی ہو۔ وہ یوں ڈھلک گیا تھا کہ اپنی اصل عمر سے بھی بہت بڑا دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر اس نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "میں معذرت خواہ ہوں مسٹر..."

"جیک بریسنن۔"

"مسٹر بریسنن اور مادام میں آپ سے بھی معذرت چاہتا ہوں۔" مار وے نے جین کی طرف دیکھا۔ "امید ہے کہ میری مداخلت کا برا نہیں منائیں گے۔"

وہ جھکا اور چلا گیا۔ اس کا لایا ہوا گلدستہ وہیں رہ گیا تھا۔ جیک نے دروازہ بند کر دیا اور جین کی طرف مڑا تو سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔ "اس سے جان چھوٹی لیکن ابھی ایک مسئلہ اور باقی ہے۔"

"کیسا مسئلہ؟" جین نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک برٹش پولیس انسپکٹر راجر میسرز جو اصلی الزبتھ کی

تلاش میں ہے اور اس کا خیال ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔

جین کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ ''کیا وہ مجھ پر شک کر رہا ہے؟''

جیک نے سر ہلایا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ خلیج ہوانا سے ایک لاش ملی ہے جو شناخت کے قابل نہیں ہے اور امکان ہے کہ وہی الزبتھ بٹلر کی لاش ہے۔''

''مگر میں نے کچھ نہیں کیا۔'' جین نے گھبرا کر کہا۔ ''وہ مجھے لندن سے آتے ہوئے بحری جہاز میں ملی تھی اور جب وہ ہوانا میں اتر گئی تو میں نے اس کی شخصیت اپنا کر اپنا سفر آگے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔''

جیک اس کے پاس آیا اور اسے بازوؤں میں لے لیا۔ ''مجھے یقین ہے تم بے گناہ ہو۔''

''راجر میسر کہاں ہے؟''

''وہ یہیں ہے۔ درحقیقت میں اس کے ساتھ آیا ہوں۔ اسے بھی تمہاری تلاش ہے۔''

''وہ مجھے گرفتار کرے گا۔'' جین پریشان ہو گئی۔

''فکر مت کرو، میرے ہوتے ہوئے وہ ایسا نہیں کر سکے گا۔'' جیک نے کہا اور باتھ روم کی طرف چلا گیا۔ وہ غسل کر کے آیا تو جین نہانے گئی۔ جیک نے لباس پہنا۔ ڈریسنگ پر جین کے زیورات کا باکس رکھا ہوا تھا۔ جیک نے اسے یونہی کھول کر دیکھ لیا۔ اس میں اوپر زیورات تھے۔ جیک جانتا تھا کہ اس کا ایک نچلا خفیہ خانہ بھی ہوتا ہے۔ اس نے نچلا دبا کر اسے کھولا تو اس میں ایک چاقو تھا اور اس کی نوک کا کچھ حصہ ٹوٹا ہوا تھا۔ شاید چاقو کہیں گرایا گیا تھا اور اس کی نوک ٹوٹ گئی تھی۔ جیک نے اسے دیکھا اور پھر واپس رکھ کر باکس بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ نیچے ڈائننگ ہال میں ناشتا کر رہا تھا۔ جین نے کہا تھا کہ وہ تیار ہو کر اس کے ساتھ چلے گی۔ البتہ اس نے ناشتے سے منع کر دیا تھا کہ اس کا موڈ نہیں تھا۔ اچانک ہی جیک نے سامنے راجر میسر کو پایا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔

''مسٹر برینسن تم بالکل بدلے ہوئے لگ رہے ہو۔''

جیک اسے اچانک دیکھ کر پریشان ہوا تھا، وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب اب تم تروتازہ اور مطمئن لگ رہے ہو، کل تک تم بالکل بھی ایسے نہیں تھے۔''

اس دوران میں جیک خود پر قابو پا چکا تھا۔ ''ہاں کیونکہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ الزبتھ کا پیچھا کرنا فضول ہے اور اگر وہ مل بھی گئی تو میری رقم نہیں ملے گی۔ اس لیے میں واپس جا رہا ہوں۔''

''تمہاری مرضی ہے لیکن میری یہ ڈیوٹی ہے اور میں نے آج کچھ تفتیش بھی کی ہے۔ وہ اسی کروز رشپ پر یہاں آئی تھی جو اس کی جیکا سے گم شدگی والے دن وہاں سے روانہ ہوا تھا۔ شپ کے عملے کو الزبتھ یاد ہے۔ وہ یہاں ہوانا میں اتری اور اس کے بعد باہر نہیں گئی۔ وہ یہیں ہے اور میں جلد یا بدیر اسے تلاش کر لوں گا۔''

جیک کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اس نے ایک طرف موجود مادرے ڈی فلپ کو دیکھا۔ وہ ناشتا تقریباً مکمل کر چکا تھا اس نے چند نوٹ چائے کی پیالی میں رکھے اور راجر کو بازو سے پکڑ کر باہر لے آیا۔ جیک کو خطرہ محسوس ہوا کہ اگر مادرے نے اسے دیکھ لیا اور اس نے کوئی ایسی بات کی جس سے جین کا پتا راجر کو چل گیا تو اس کا یہ حفاظت یہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ ہوٹل لا کاسٹیلا کے سامنے بڑا سا صحن تھا۔ اس میں بھی کرسیاں اور میزیں لگی تھیں اور سیاح وہاں ناشتے میں مصروف تھے۔ یہاں سے اس کمرے کی بالکونی بھی نظر آ رہی تھی جہاں جین مقیم تھی۔ جیک کا رخ بالکونی کی طرف تھا اور اچانک ہی جین وہاں نمودار ہوئی۔ اس نے ایک لباس جیک کو دکھایا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتی تھی مگر جیک نے صرف سرسری نظر سے دیکھا۔ وہ جین کو کوئی اشارہ نہیں کر سکتا تھا کیونکہ راجر اسے ہی دیکھ رہا تھا البتہ پشت ہونے کی وجہ سے وہ جین کو نہیں دیکھ سکا۔ جین یہ سمجھ کر واپس گئی کہ شاید اسے یہ لباس پسند نہیں آیا ہے۔ اس سے پہلے وہ دوبارہ آتی، جیک نے راجر سے کہا۔

''اب میں چلوں گا۔ میرا خیال ہے شاید آج یا کل کوئی نہ کوئی جہاز جیکا کی طرف جا رہا ہو گا۔''

''اگر الزبتھ کی تلاش میں کوئی پیش رفت ہوئی تو میں تمہیں آگاہ کروں گا۔'' راجر نے کہا۔ اسی لمحے جین دوبارہ نمودار ہوئی اور جیک نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ راجر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا کیونکہ جیک کے جانے کے بعد اس نے گھوم کر بالکونیوں کی طرف دیکھا۔ مگر جین اندر جا چکی تھی۔ جیک سڑک کراس کر کے ایک بگھی کی طرف جا رہا تھا۔ راجر کچھ دیر وہاں کھڑا رہا پھر وہ بھی چلا گیا۔

☆☆☆

کروز رشپ کا سفر بہت دیر کرنے والا تھا کیونکہ اچانک ہی جیک نے پیچھا کرنے کا انتخاب کیا تھا۔ جین راستے بھر

ایک چغہ نما لباس پہنے رہتی تھی اور جہاں بھی اس کا کسی سے سامنا ہوا جیک نے یہی بتایا کہ اس کی بیوی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی اس کی صورت نہیں دیکھ پایا تھا۔ کیبن معمولی سا تھا اور اس میں کوئی کھڑکی نہ ہونے کی وجہ سے شدید حبس تھا۔ دو دن کا یہ سفر جین کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گیا تھا۔ وہ عرشے پر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کی وجہ سے جیک بھی زیادہ باہر نہیں گیا۔ اس نے اپنا متمول حلیہ بدل لیا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ امیر نظر نہ آئے۔ درحقیقت وہ امیر رہا بھی نہیں تھا مگر وہ اپنے سامان کا کیا کرتا جس سے امارت جھلکتی تھی۔ گلگسٹن کی بندرگاہ پر اسے زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہاں اسے جاننے والے خاصے لوگ تھے۔ وہ ان سے بچتا ہوا جین کو لے کر باہر آیا پھر اس نے ایک بگھی حاصل کی جو اسے اور جین کو پیلس تک لے جاتی۔ بگھی چلی تو جین نے سکون کا سانس لیا۔

''شکر ہے ورنہ مجھے لگ رہا تھا کہ میں دم گھٹ کر مرنے والی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے اس سفر میں تم مشکل میں رہیں۔ لیکن آگے بھی تمہارے لیے حالات مشکل ہوں گے۔''

جین چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

جیک نے اسے بتایا۔ ''میں نے پیلس اور فارم کے ملازمین کی چھٹی کر دی ہے اور عملاً جاگیر بند پڑی ہے۔ اب وہاں کوئی نہیں ہے اور ہمیں اپنے سارے کام خود کرنے ہوں گے۔''

جین یہ سن کر افسردہ ہو گئی تھی۔ ''اس کی وجہ میں ہوں۔''

''کوئی بات نہیں ہم اسے پھر سے آباد کر لیں گے۔'' جیک نے اسے تسلی دی۔ ''میرے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے، میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ میں جاتے ہی ملازموں کو بلا لوں گا۔ وہ مجھے جانتے ہیں وہ میرا ساتھ دیں گے اور ایک سال کے اندر میں سب ویسا کر لوں گا۔''

جین کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ اس نے جیک کی طرف دیکھا۔ ''کاش میں نے حماقت نہ کی ہوتی۔''

کچھ دیر بعد بگھی پیلس کے سامنے رکی۔ اس کا داخلی دروازہ بند تھا۔ لیکن اس کی چابیاں جیک کے پاس تھیں۔ اس نے اتر کر دروازہ کھولا اور بگھی اندر آئی۔ گرد آلود صحن میں سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جیک نے سامان اوپر پہنچایا اور پھر بگھی والے کو رخصت کر کے دروازہ بند کر دیا۔ وہ اوپر آیا تو جین ویران اکرد ولی میں گھوم رہی تھی۔

بیشتر سامان سیاہ فام ملازمین لے جا چکے تھے البتہ کچن میں کچھ کراکری بچی تھی اسی طرح ان کی مسہری بھی موجود تھی۔ کم سے کم انہیں زمین پر نہیں سونا پڑتا۔ جین نے پوچھا۔ ''تم نے یہ سب کیوں ختم کیا؟''

''کیونکہ تمہارے جانے کے بعد مجھے لگ رہا تھا کہ میری زندگی میں کچھ باقی نہیں رہا ہے۔'' جیک نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں سب ختم کر کے دوبارہ کبھی نہ آنے کے ارادے سے یہاں سے نکلا تھا۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں کبھی یہاں واپس نہ آتا۔''

جین نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم مجھ سے اتنی محبت کرتے ہو تو میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہ جاتی۔''

''اسے بھول جاؤ۔'' جیک نے کہا۔ خود اس کے رویے سے لگ رہا تھا کہ وہ سب بھول گیا ہے۔ اس نے ایک بار بھی جین سے نہیں پوچھا کہ اس نے رقم کا کیا کیا اور وہ اسے واپس حاصل کر سکتی ہے یا نہیں۔ جین نے بھی رقم کا ذکر نہیں کیا تھا مگر جب اس نے پیلس اور جاگیر کی حالت دیکھی تو جیک سے کہا۔

''اسے ٹھیک کرنے کے لیے رقم کی اشد ضرورت ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے سان ڈیاگو جانا ہوگا۔''

اس وقت سان ڈیاگو پورے شمالی اور جنوبی امریکا میں بلیک منی کا سب سے بڑا گڑھ تھا۔ یہاں بینک خفیہ اکاؤنٹس کھولتے تھے اور ان اکاؤنٹ کو کوئی فرد ذاتی طور پر آپریٹ کر سکتا تھا۔ مگر سان ڈیاگو یہاں سے بہت دور تھا۔ گلگسٹن سے یہ فاصلہ کوئی پانچ ہزار کلومیٹرز بنتا تھا۔ انہیں وہاں تک جانے کے لیے بھی وسائل کی ضرورت تھی۔ جیک نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ مجھے قرض مل جائے اور ہم سان ڈیاگو جا سکیں۔ مگر میں سوچ رہا ہوں کہ وقت ضائع کرنے کے بجائے میں فارم کو بحال کرنے کی کوشش کیوں نہ کروں۔ ابھی تک سب بہترین حالت میں ہے اور ملازمین بھی واپس آ جائیں گے۔''

''اگلی فصل تک ملازموں کی تنخواہیں اور دوسرے اخراجات کے لیے بہت بڑی رقم قرض لینا پڑے گی۔ جب کہ تمہاری اپنی رقم موجود ہے بس اسے جا کر حاصل کرنا ہے۔''

''یہ بہت طویل سفر ہے اور ہمیں جا کر آنے میں ایک مہینے سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔'' جیک نے اسے سمجھایا۔ اس دوران میں فارم کی دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے

بہت زیادہ نقصان ہو سکتا ہے جب کہ یہاں مجھے ترقی حاصل کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس دوران میں، میں ملازموں کو واپس بلوا کر کام شروع کرا دوں گا۔ ایک بار کام شروع ہو جائے تو ہم کسی وقت بھی سان ڈیاگو جا کر رقم لا سکتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا۔ کام شروع کرانے کے ساتھ ساتھ مجھے بھی یہاں ہونا ہے ورنہ ملازمین ٹھیک سے کام نہیں کریں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' جین نے بے دلی سے کہا۔ ''ورنہ رقم لانا بھی اتنا مشکل نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تم بہت زیادہ مشکل میں پڑو اور سود پر قرض لو۔''

اگلے دن جیک ناشتے کے بعد کنگسٹن کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں وہ آئزک سے ملا جو اس کے یوں اچانک غائب ہونے پر پریشان تھا۔ اس نے آئزک کو بتایا کہ وہ واپس آگیا ہے لیکن اس نے جین کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس نے آئزک سے کہا کہ اسے فارم کو چلانے کے لیے رقم کی ضرورت ہے اور بینک اسے قرض دے سکتا ہے بہ شرطے کہ وہ اس کی ضمانت دے۔ آئزک نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ اسے خوشی تھی کہ جیک واپس آگیا تھا۔ آئزک سے مل کر جیک باہر آیا اور پیلس کے لیے روانہ ہونے والا تھا کہ اس نے ایک طرف سے راجر کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ حسبِ معمول نک سک سے تیار تھا اور رنت ہاتھ میں خراماں خراماں چلا آرہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جیک کی چھٹی حس شور کرنے لگی۔ راجر بلاسبب یہاں نہیں آیا تھا۔ وہ یقیناً اس کے اور جین کے پیچھے آیا تھا۔ کیا اسے علم ہو گیا تھا کہ جین جیک کے پاس ہے اور وہ اسے یہاں لے آیا ہے۔ یہی بات تھی ورنہ وہ یہاں کیوں آتا؟

جیک اس کی نظر بچا کر وہاں سے روانہ ہوا اور سیدھا پیلس پہنچا۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے چلا کر جین کو آواز دی۔ اس کی طرف سے جواب نہیں آیا تو وہ اوپر بھاگا۔ اس نے ایک ایک کر کے سارے کمرے دیکھ لیے۔ جین وہاں نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کہاں چلی گئی تھی؟ خطرے کا احساس ہوتے ہی جیک نے ڈریسنگ کی دراز میں رکھا ہوا پستول نکالا اور نیچے کی طرف بڑھا تھا مگر جیسے ہی وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچا، رک گیا۔ نیچے راجر میسر کھڑا تھا اور اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ اس نے تالی بجائی۔ ''تو تم واپس پہنچ گئے مسٹر بریسٹن۔''

''تم یہاں کیوں آئے ہو اور بغیر اجازت کے میری پراپرٹی میں کیسے داخل ہوئے؟''

میں ایک ممکنہ مجرمہ کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہوں اور ایک قانون کے محافظ کی حیثیت سے مجھے حق ہے کہ میں کسی بھی جگہ جا سکوں۔'' وہ کہتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''تم اوپر نہیں جا سکتے۔'' جیک نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ اسے دھکیل کر آگے بڑھ گیا۔ جیک اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ اس نے پہلے بیڈروم میں جھانکا اور جیک کی طرف دیکھا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''تم کس کی بات کر رہے ہو یہاں کوئی نہیں ہے۔''

جیک اب ذرا دلیر ہو رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ جین اوپر نہیں ہے اور دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ وہ جہاں ہے ابھی وہیں رہے۔ اس منحوس پولیس والے کی موجودگی میں یہاں نہ آئے جو آسیب بن کر ان کے پیچھے لگ گیا تھا۔ راجر اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہر جگہ دیکھ رہا تھا اور جیک اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اس نے اوپر کا پورا فلور دیکھ لیا۔ جیک نے اس کا بازو پکڑا تھا کہ اچانک راجر نے اسے گریبان سے پکڑا اور دیوار پر مار کر اپنی کہنی اس کی گردن پر رکھ دی۔ وہ غرا کر بولا۔

''تم کیوں ایک مجرمہ کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو۔ وہ قاتل ہے اور اس نے شاید ایک قتل اور کر دیا ہے۔ تمہیں معلوم ہے سارہ بٹلر کی لاش بھی ہوانا کی ایک عمارت سے ملی ہے اور اس کی گردن چاقو سے کاٹ دی گئی تھی۔ اس کی گردن میں ٹوٹ جانے والا چاقو کا چھوٹا سا ٹکڑا ملا ہے۔ یہ دیکھو۔''

جیک کا سانس رک رہا تھا اور اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ راجر نے چاقو کی نوک کا ٹکڑا اس کے سامنے لہرایا۔ اسے جین کے جیولری باکس میں رکھا ہوا چاقو یاد آیا جس کی نوک ٹوٹ گئی تھی۔ جیک نے زور لگا کر خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن راجر اس سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس نے دوبارہ اسے پیچھے دھکیل دیا۔ راجر بار بار اس سے جین کا پوچھ رہا تھا۔ اچانک فائر کی آواز آئی اور راجر لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس کا ایک ہاتھ پیٹ پر تھا اور وہ بے یقینی سے جیک کو دیکھ رہا تھا جو دیوانہ وار سانس لے رہا تھا۔ اسی لمحے سیڑھیوں کی طرف سے جین نمودار ہوئی اور اس نے چلا کر پوچھا۔ ''یہاں کیا ہو رہا ہے، گولی کس نے چلائی ہے؟''

راجر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''تو میرا شبہ درست نکلا۔ اس مجرمہ کو تم نے پناہ دے رکھی ہے۔ اب تم بھی نہیں بچ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

گے۔''

''تم بچ گئے تو ہمیں پکڑ و گے۔'' جیک نے کہا اور اس کی طرف پستول سیدھا کیا۔ راجر بھاگا تھا کہ جیک نے عقب سے اس پر دو فائر کیے اور وہ ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے اندر جا گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ جین منہ پر ہاتھ رکھے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے جیک سے کہا۔

''یہ تم نے کیا کیا؟''

جیک کو بھی احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کیا کیا تھا۔ اس نے ساری عمر معمولی سی قانون شکنی بھی نہیں کی تھی اور اب اس نے قانون کے محافظ کا قتل کر دیا تھا۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر گم سم رہا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے۔ جین اس کے پاس سے ہو کر راجر کی لاش تک آئی اور پھر اس کی گردن پر نبض دیکھ کر اس نے نفی میں سر ہلایا۔ راجر مر چکا تھا۔ لاش فرش پر بچھی دری پر پڑی تھی۔ جین اسی میں اس کو لپیٹنے لگی۔ جیک اس کے پاس آیا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''اسے دری میں لپیٹ رہی ہوں۔''

''مگر کیوں؟''

جین پلٹ کر اس کی طرف آئی۔ ''سنو جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب اسے ٹھکانے لگانا ہے۔''

''لاش کو؟'' جیک نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں اور اس سے پہلے کوئی یہاں ہماری موجودگی سے باخبر ہو ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''وہ کیوں؟''

''راجر یہاں آیا ہے اور بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ یہ کس لیے یہاں آیا ہے۔ اب اگر ہم یہاں پائے گئے تو اس کی گمشدگی کا شبہ ہم پر جائے گا۔ اگر ہم یہاں نہیں ہوں گے تو کسی کا شبہ ہم پر نہیں جائے گا۔ خوش قسمتی سے کوئی یہاں ہماری آمد سے واقف نہیں ہے۔''

''تم بھول رہی ہو میں آرزک سے مل چکا ہوں۔''

''ایک تو وہ تمہارا دوست ہے، دوسرے وہ صرف تمہاری آمد سے واقف ہے، میرے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''یہ درست ہے۔''

اس لیے اس سے پہلے کہ دوسروں کو تمہاری یا میری آمد کا پتا چلے، ہم خاموشی سے چلے جاتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''تم اسی وقت جاؤ اور کنگسٹن جا کر یہاں سے جانے والے کسی بھی بحری جہاز میں ہوانا کے لیے ٹکٹ لے لو۔''

''اس وقت؟'' جیک بولا۔

''ہاں اسی وقت۔'' جین تیز لہجے میں بولی۔ ''ہمیں بہت تیزی سے کام کرنا ہے۔''

''اوکے۔'' جیک نے کہا اور سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ جین لاش والے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے آئی۔ جیک نے اسے بانہوں میں لے کر کہا۔ ''میں جلد آؤں گا۔''

جین نے پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم پریشان ہو، تم سکون سے جاؤ اور کچھ دیر کسی بار میں گزار کر پھر ٹکٹ لینے جانا۔ کسی کو تم پر شک نہ ہو۔''

جیک نے غور سے اسے دیکھا۔ ''میرے مقابلے میں تم زیادہ پُرسکون ہو۔''

''کیونکہ میں نے مشکل زندگی گزاری ہے۔''

''اوپری فلور کا دروازہ اندر سے بند کر لینا اور جب تک میری آواز نہ سنو دروازہ مت کھولنا۔''

جین نے سر ہلایا اور جیک باہر نکل گیا۔ اس علاقے میں بس کا اسٹیشن ذرا دور تھا اور جیک سوچ رہا تھا کہیں اسے کوئی واقف کار نہ مل جائے مگر خوش قسمتی سے جس بس میں وہ بیٹھا وہ اسے نہیں جانتا تھا۔ بس چلی تو اسے خیال آیا کہ جین کے چاقو کی نوک کا ٹکڑا راجر کے پاس کہاں سے آیا؟

☆☆☆

عورت بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے پادری کی طرف دیکھا جو سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے یہ اس کی کہانی کا سحر تھا یا پھر اس کی شخصیت کا جس نے پادری کو مسحور کر دیا تھا۔ ''فادر ایسے شخص کو تم کیا کہو گے جو اپنی دھوکا دے کر بھاگ جانے والی بیوی کو تلاش کرے اور پھر دوبارہ اسے اپنی زندگی میں شامل کرے۔''

وہ جواب دیتے ہوئے پھر ہچکچایا۔ ''ایک ایسا مرد جو سچ مچ اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہو۔''

''نہیں، عقل کے نقطۂ نظر سے اسے کیا کہو گے؟''

''بے وقوفی۔'' پادری نے اس بار ایمان داری سے جواب دیا۔ ''آزمائے ہوئے کو پھر سے آزمانا حماقت کہلاتی ہے۔''

عورت پادری کے بالکل پاس چلی آئی۔ اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک لمحے کو کانپ اٹھا۔ وہ اس کی کیفیت محسوس کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم شادی شدہ ہو؟''

''نہیں وہ ہم پادری شادی نہیں کرتے۔''

''اب تو کرنے لگے ہیں۔''

''ہاں لیکن میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''تم نے کبھی محبت بھی نہیں کی؟''

''نہیں۔''

عورت مسکرائی۔ ''تب تم مرد اور عورت کے تعلق کی باریکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''میں نے آج تک کسی عورت کو پاس سے نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی عورت سے اتنی دیر بات کی ہے۔ تم پہلی عورت ہو جس کا اعتراف سننے کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے۔''

''اگر مرد عورت سے محبت کرتا ہے تو سوائے اس کی بے وفائی کے وہ ہر خطا معاف کر سکتا ہے۔ بعض اوقات تو بے وفائی بھی معاف کر دیتا ہے۔''

پادری جب سے آیا اس نے پہلی بار عورت کی کہانی پر خود سے بات کی۔ ''بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی مرد ان کو سزا دے ہی نہیں سکتا۔''

عورت نے سلاخوں کے پاس فصیل کے ساتھ لگی موت کی مشین کی طرف دیکھا۔ ''تم کیا سچ سمجھتے ہو کہ مرنے والے کو ان اعترافات سے کوئی فائدہ ہوتا ہے۔''

''کیا تم نہیں سمجھتیں؟''

''میں نے تمہیں نہیں بلایا تمہیں ان لوگوں نے بلایا ہے۔'' عورت کا اشارہ قید خانے کے حکام کی طرف تھا۔ اس کا اشارہ واضح تھا کہ وہ اعتراف کو بے سود چیز سمجھتی تھی۔

''ممکن ہے فائدہ ہو اور ممکن ہے نہ ہو۔ مگر آدمی کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''میرا بوجھ بڑھ رہا ہے۔'' عورت کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

پادری نے اسے حوصلہ دیا۔ ''ممکن ہے جب تم بات مکمل کر لو تو بوجھ ہلکا ہو جائے۔''

''ہاں۔'' عورت نے پُرخیال نظروں سے پادری کی طرف دیکھا۔ ''اب اعتراف کا وقت آ گیا ہے۔''

☆☆☆

جیک کے جاتے ہی جین تیزی سے اوپر آئی۔ اس نے اوپری فلور کا بڑا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر اس کمرے تک آئی جہاں لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے دری الٹ دی اور پھر زور لگا کر راجر کی لاش کو بھی سیدھا کر دیا۔ اس کے پیٹ والی جگہ ہلکا سا خون پھیلا ہوا تھا۔ جین کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے جھک کر اس کی مونچھیں پکڑ لیں

اور ایک جھٹکے سے کھینچ لیں۔ راجر نے چیخ ماری اور اٹھ بیٹھا۔ دوسری چیخ جین نے ماری تھی۔ مگر اب راجر ہنس رہا تھا اور جین برہم تھی۔ ''تم کچھ زیادہ ہی ڈرامے نہیں کرنے لگے ہو۔''

''ڈراما میری فطرت میں شامل ہے۔'' راجر نے اسے بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے اپنے بالوں کو کھینچا تو اس کی وگ اتر آئی، نیچے اس کے بال سنہری اور مختصر تھے۔ ''تم جانتی ہو میں پیدائشی اداکار ہوں۔ تمہارے نام نہاد شوہر کو ایک لمحے کو شک نہیں ہوا کہ میرا تعلق لندن پولیس سے نہیں ہے۔''

جین نے کسمسا کر کہا۔ ''وہ میرا حقیقی شوہر ہے۔''

''تمہارا پہلا اور واحد حق دار میں ہوں۔'' راجر نے بازو سخت کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے نزدیک آنے والا پہلا مرد میں ہوں اور آخری مرد بھی میں ہی ہوں گا۔''

اسے جکڑ کر راجر کا موڈ بدل گیا۔ اس کے تاثرات سے بھی واضح تھا مگر جین نے کسی نہ کسی طرح خود کو اس سے آزاد کرا لیا۔ اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''گلبرٹ یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ جیک کسی وقت بھی واپس آ جائے گا۔''

''نہیں، کنگسٹن جا کر واپس آنے میں اسے کئی گھنٹے لگ سکتے ہیں اور ہمارے پاس یقیناً کافی وقت ہے۔'' راجر کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ اس نے اپنے کوٹ کے نیچے موجود سرخ پانی کی تھیلی سے تھیلی نکالی جس کا پانی باہر نکل آیا تھا اور اس کے کوٹ پر خون کا تاثر دے رہا تھا۔

''زیادہ دیر نہیں لگے گی اور ابھی مجھے صفائی کا کام بھی کرنا ہے۔''

''کام تم نے صفائی سے کیا۔ جیک کو پتا بھی نہیں چلا اور تم نے گولیاں بدل دیں۔''

''اس کے باوجود مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی گولی اصلی نہ ہو۔''

''ممکن ہی نہیں تھا، میں بہت چھان پھٹک کر تمام گولیاں لایا تھا۔'' جیک نے کہتے ہوئے اسے پھر دبوچ لیا۔ ''میں بہت دن تم سے دور رہ لیا ہوں۔ اب صبر نہیں ہوتا۔''

''پلیز۔'' جین نے پھر مزاحمت کی۔ ''ابھی موقع نہیں ہے۔ ابھی پلان مکمل نہیں ہوا ہے۔''

''بھاڑ میں گیا پلان۔''

''میں اسی شرط پر ہمیشہ کے لیے تمہارا ساتھ دینے پر تیار ہوئی ہوں۔'' جین کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''کیا تم بھول رہے

ہو سان ڈیاگو کے ایک بینک میں ستائیس ہزار پاؤنڈ اسٹرلنگ کی دولت پڑی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ہم پلان پر پوری طرح عمل کریں۔''

''میں سمجھنے سے قاصر ہوں جب تم نے اس شخص سے چھٹکارا پالیا تھا تب اسے کیوں اپنے پاس بلوایا۔ تم نے کتنا بڑا رسک لیا اگر یہ غصے میں تمہیں قتل کر دیتا؟''

جینی مسکرانے لگی۔ ''میں اسے جانتی ہوں۔ وہ مجھے قتل کر ہی نہیں سکتا۔ ہاں اگر وہ خودکشی کا سوچ لے تو شاید پہلے مجھے مار دے۔''

''پھر بھی تم نے جان کا خطرہ مول لیا۔''

''میرا مقصد اپنی جان سے بڑا ہے۔'' جینی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے جیک سے انتقام لینا ہے۔''

☆☆☆

جیک بندرگاہ پہنچا اور اس نے ہوانا جانے والے بحری جہازوں اور کشتیوں کا پوچھا۔ اسے معلوم ہوا کہ تین دن سے پہلے کوئی کروزرشپ ہوانا نہیں جائے گا البتہ کل دوپہر میں ایک تجارتی کشتی جا رہی تھی جس میں کچھ مسافروں کی بھی گنجائش تھی۔ جیک نے اسی میں بکنگ کرالی۔ اسے معلوم تھا کہ تجارتی کشتی کا سفر آسان نہیں ہوتا ہے لیکن ایک تو یہ کروزرشپ کے مقابلے میں تیز سفر کرتی اور دوسرے انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ اس سے پہلے کہ لوگ ان کی یہاں موجودگی سے واقف ہو جاتے۔ جیک نے جینی کے مشورے کے برعکس کسی بار کا رخ کرنے سے گریز کیا۔ اسے خیال تھا کہ ابھی اسے جا کر راجر کی لاش بھی ٹھکانے لگانی تھی اور اس کے لیے ہوش و حواس میں رہنا لازمی تھا۔ بندرگاہ پہنچ کر اس نے بگھی چھوڑ دی تھی کیونکہ واپسی میں مسئلہ نہیں تھا اور بندرگاہ سے آرام سے بگھی مل گئی۔ تقریباً تین گھنٹے بعد وہ پیلس کے دروازے پر اترا۔ لاک کھول کر وہ اندر آیا اور اوپر آ کر اس نے جینی کو آواز دی۔

''تم کہاں ہو؟''

جواب نہیں آیا تو اس نے پہلے بیڈروم میں دیکھا اور اسے خالی پا کر وہ لاش والے کمرے میں آیا۔ اسے دھچکا لگا تھا لاش دری سمیت غائب تھی۔ جینی اور لاش بیک وقت کیسے غائب ہو سکتے تھے؟ ابھی وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کیا اسرار ہے کہ اسے کچن کی طرف سے برتن کھنکنے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے وہاں پہنچا۔ جینی کو ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے پا کر اس نے سکون کا سانس لیا۔ ''میں پکار رہا تھا تم نے جواب نہیں دیا۔''

جینی نوڈلز سوپ کے پیالے پر جھکی ہوئی تھی۔ اس نے لباس بدلا ہوا تھا اور اس کے گیلے بالوں سے ظاہر تھا کہ اس نے غسل کیا ہے۔ جینی نے سر ہلایا اور آہستہ سے بولی۔ ''مجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ بھوک سے مرنے والی ہو رہی ہوں۔''

''کیوں؟...... اور لاش؟''

جینی نے سر ہلایا۔ ''میں نے اسے دفنا دیا ہے۔ صحن میں درختوں کے لیے جو گڑھے کھودے گئے تھے، ان میں سے ایک میں اسے ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔''

جیک تیزی سے باہر آیا اور اس نے بالکونی سے جھانک کر دیکھا۔ پام اور ناریل کے درخت لگانے کے لیے کل سات گڑھے کھودے گئے تھے اور اس کے بعد اس نے ملازمین کو فارغ کر دیا تھا۔ کام جوں کا توں رہ گیا تھا۔ اس نے واپس آ کر جینی سے کہا۔ ''یہ گڑھے اتنے بڑے نہیں تھے کہ ایک آدمی کو پوری طرح دفن کیا جاتا۔''

''میں نے گڑھا مزید بڑا کیا تھا۔''

جیک فکرمند تھا۔ باقی سارے گڑھے بھی بند کرنے ہوں گے ورنہ صرف ایک گڑھا بند ہونے سے شک ہوگا۔

جینی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ لاش نیچے لے جا کر، گڑھے کو مزید گہرا کر کے اس میں لاش ڈال کر مٹی بھرنے میں میری ساری توانائی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ جب میں نے لاش دفنا دی تو مجھے لگا کہ میں بے ہوش ہو کر وہیں گر جاؤں گی۔ پتا نہیں میں اوپر کیسے آئی؟''

''تم آرام کرو، میں یہ کام نمٹا لوں گا۔'' جیک نے کوٹ اتارتے ہوئے کہا۔ وہ صرف ایک نیکر میں نیچے آیا۔ اس نے گودام سے اوزار نکالے اور گڑھوں میں مٹی بھرنے لگا۔ اسے کئی گھنٹے لگے اور وہ سر سے پاؤں تک مٹی میں بھر گیا تھا مگر کام تسلی بخش انداز میں مکمل ہو گیا اور اب کوئی شک نہیں کرسکتا تھا کہ صحن کے کسی گڑھے میں کوئی لاش دفن کی گئی ہے۔ لاش والے گڑھے میں پانی ڈال کر مٹی بٹھائی اور پھر مزید مٹی ڈالی۔ وہ نہا دھو کر اوپر آیا تو جینی سو چکی تھی۔ جیک نے کچھ دیر اسے دیکھا اور پھر خود بھی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ کل سے ان کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہونے والا تھا۔ اس کی ساری سوچیں یہیں رہ گئی تھیں۔ زندگی کو پھر سے شروع کرنے کا منصوبہ ختم ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھ کھلی تو جینی ساری تیاری کر چکی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ اٹھ کر جلدی سے تیار ہو جائے اور ناشتا کر لے تاکہ وہ سب پہلے کی طرح کر دے اور کسی کو شک نہ ہو کہ

کوئی یہاں آیا تھا اور رکا تھا۔ جیک نے اسی ایجنسی والے سے کہہ دیا تھا کہ وہ صبح بارہ بجے انہیں لینے آجائے۔ جب تک وہ ناشتے سے فارغ ہو کر تیار ہوا جین نے تمام کمرے اور خاص طور سے کچن ویسا ہی کر دیا جیسا ان کے آنے سے پہلے تھا۔ اسی اثنا میں ٹیکسی آگئی تھی اور وہ کنگسٹن کے لیے روانہ ہوئے۔ خلافِ توقع جاتے وقت جین خوش تھی۔ شاید یہاں رہنا اسے بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ جیک نے بھی خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا کہ اب انہیں کبھی یہاں واپس نہیں آنا ہے۔ اس کے پاس مشکل سے چند سو پاؤنڈز بچے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس رقم سے وہ سان ڈیاگو جا سکیں گے؟

☆☆☆

ہوانا میں وہ ایک چھوٹے سے مکان میں رکے تھے۔ اب جیک کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ مہنگے ہوٹلوں میں ٹھہر سکتا اور سستے ہوٹلوں میں رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔ پھر ہوٹل میں دوسروں کی نظروں میں آنے کا امکان رہتا تھا۔ اس لیے اس نے جین کے مشورے پر یہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ یہاں وہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر سکون سے رہ سکتے تھے۔ جیک کو خدشہ تھا کہ کہیں راجر مسز کے قتل کا پول نہ کھل جائے اور قانون ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک نہ آجائے۔ انہوں نے اپنے سارے قیمتی اور اچھے لباس پیک رکھے تھے اور وہ یہیں سے خریدے ہوئے سستے لباس استعمال کر رہے تھے۔ جیک نے معلوم کیا تھا۔ سان ڈیاگو تک جانے کے تین طریقے تھے۔ ایک وہ پاناما کے راستے بحرالکاہل تک جا کر کوئی کروز شپ پکڑیں جو سان فرانسسکو جا رہا ہو۔ اس وقت تک نہر پاناما مکمل نہیں ہوئی تھی۔ البتہ اس کی تعمیر کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ سفر سب سے مختصر ثابت ہوتا اور وہ دو ہفتے میں سان ڈیاگو پہنچ سکتے تھے۔ مگر اس میں خرچ سب سے زیادہ تھا۔

دوسرا طریقہ ٹرین کا تھا۔ یہ زیادہ وقت لیتا کیونکہ اس وقت تک فلوریڈا سے کوئی ریل لائن براہ راست سان فرانسسکو تک نہیں جاتی تھی بلکہ یہ لائن واشنگٹن کی طرف سے جاتی تھی یوں سفر بہت طویل ہو جاتا اس میں زیادہ وقت اور زیادہ پیسا لگتا۔ پھر ٹرین میں اتنا طویل سفر بہت تھکن والا ہو جاتا۔ اگر وہ رکتے ہوئے جاتے تو اس کا مطلب ہوتا مزید خرچ۔ سب سے کم خرچ طریقہ زمینی راستے سے سفر کا تھا۔ وہ میکسیکو تک فیری میں سفر کرتے اور اس کے بعد وہ کوچز میں سفر کرتے ہوئے سان ڈیاگو پہنچ سکتے تھے۔ اس سفر میں خرچ سب سے کم ہوتا مگر یہ سب سے پُرخطر اور خطرناک ترین سفر تھا۔ ٹریولنگ ایجنٹ سے جیک اور جین نے بات کی تھی اس نے یہ تینوں طریقے اس کے سامنے رکھ دیے تھے۔ اس نے جین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''مسٹر برنسن اتنی خوب صورت بیوی کے ساتھ میں آپ کو تیسرا طریقہ استعمال کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔ میکسیکو اور امریکا دونوں جگہوں پر ڈاکو سرگرم ہوتے ہیں اور وہ لوٹ مار کے ساتھ ملنے والی حسین خواتین کو بھی اٹھا لے جاتے ہیں۔''

کروز شپ سے دو افراد کا خرچ کم سے کم بھی پانچ سو پاؤنڈز تھا جب کہ ٹرین کا خرچ بھی تقریباً اتنا ہی تھا۔ البتہ فیری اور زمینی راستے سے سفر کی صورت میں خرچ تین سو پاؤنڈز ہو جاتا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اب ان کے پاس اتنی رقم بھی نہیں بچی تھی۔ جین کے پاس جو زیور تھا اس میں نقلی پتھر جڑے ہوئے تھے اور ان کی قیمت سو پاؤنڈز بھی نہیں تھی۔ اس کے پاس سب سے قیمتی چیز اس کی شادی کی انگوٹھی تھی۔ مگر جیک نے اسے فروخت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جین نے کہا۔ ''اس کے بدلے شاید دو سو پاؤنڈز مل جائیں۔ اس صورت میں ہم ٹرین سے سفر کر سکیں گے۔''

''نہیں، ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا ہوگا۔''

وہ اپنے مکان میں ڈنر کر رہے تھے اور یہ آلو گاجر کے سوپ کا معمولی سا ڈنر تھا۔ وہ اپنی جمع پونجی خرچ کرنے میں حد درجے کفایت شعاری دکھا رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اسی بارے میں بحث کر رہے تھے۔ جین نے کہا۔ ''تب ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے۔''

''کون سا طریقہ؟''

''ہم جوا کھیلیں گے اور اس سے رقم کما لیں گے۔''

جین نے چند دن پہلے بھی یہ تجویز پیش کی تھی مگر جیک نے توجہ نہیں دی تھی۔ آج پھر اس نے کہا تو جیک نے ملائمت سے جواب دیا۔ ''جوئے میں جیت کے ساتھ ہار بھی ہوتی ہے اور ہمارے پاس لگانے کے لیے زیادہ رقم نہیں ہے۔''

''ہم جیتیں گے۔'' جین نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''اگر تمہیں معلوم ہو جائے کہ تمہارے مخالفوں کے پاس کون سے پتے ہیں تو کیا جیت تمہاری نہیں ہوگی۔''

''ہاں۔'' جیک نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''مگر مجھے کیسے علم ہوگا؟''

''میں تمہیں بتاؤں گی۔'' جین نے کہا اور کھڑی ہو

گئی۔ ''سمجھو! تم جوے کی میز پر ہو اور ان تین کرسیوں پر تمہارے مخالف کھلاڑی ہیں۔'' اس نے میز کے باقی تین اطراف میں رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں ساقی ہوں اور تم چاروں کو شراب دے رہی ہوں۔'' اس نے کیتلی اٹھا کر شراب فرضی گلاسوں میں ڈالنے کا مظاہرہ کیا۔ ''اس کے ساتھ ساتھ میں ان کے پتے بھی دیکھ رہی ہوں۔''

جیک نے سر ہلایا اور نقطہ اٹھایا۔ ''تم مجھے کیسے بتاؤ گی۔''

جین مسکرائی۔ ''ساقی اگر حسین ہو تو ناز و ادا بھی دکھاتی ہے۔ اگر میں رخسار کے ساتھ اپنے بالوں کی لٹ کر پیچھے کروں تو تم سمجھ لینا کہ اس کے پاس اِکّا ہے۔ دو اِکّے ہونے کی صورت میں، میں لٹ دو بار سنواروں گی، اگر میں اپنے شانے کو چھوؤں تو اس کا مطلب ہوگا کنگ، مسکرانے کا مطلب ہوگا کوئن اور اگر میں گلے پر انگلی پھیروں تو اس کا مطلب ہوگا تم سامنے والے کو مار سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے مگر اس میں خطرہ ہے، جواری ہوشیار ہوتے ہیں کسی کو تم پر شک ہو سکتا ہے۔''

''کیسے؟ اگر ہوا بھی تو کسی کے پاس کیا ثبوت ہوگا؟'' جین نے سوال کیا۔ ''میں کہہ دوں گی میں غیر ارادی ایسا کر رہی تھی۔''

''جوئے خانے میں ہم ایسی کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔''

''میں جانتی ہوں یہاں بعض لوگ ایک رات کے لیے گھر کرائے پر دیتے ہیں اور وہاں دولت مند جوا کھیلنے آتے ہیں۔''

''مکان کون تلاش کرے گا؟'' جیک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہاں کسی کو نہیں جانتا۔''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو اگر تم راضی ہو تو؟''

جیک سوچ میں پڑ گیا۔ وہ تاش کے کھیلوں سے اچھی طرح واقف تھا اور ہلکا پھلکا جوا بھی کھیل چکا تھا۔ مگر وہ عادی جواری نہیں تھا اور اس قسم کا کام کبھی نہیں کیا تھا مگر انہیں رقم کی بھی اشد ضرورت تھی۔ اگر ان کی جمع پونجی ختم ہو جاتی تو وہ جلد فٹ پاتھ پر آ جاتے۔ یہ شاید آخری موقع تھا۔ مجبوراً اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

☆☆☆

اس چھوٹے سے مکان کے ایک کمرے میں چار افراد میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جیک تھا اور اس نے اپنا سب سے بہترین سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے منہ میں ہوانا سگار دبا ہوا تھا۔ باقی تین افراد بھی لباس اور انداز سے ذی حیثیت لگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتے اور سامنے شراب کے گلاس تھے۔ بنی سنوری جین کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں قدیم عربی طرز کا جگ نما برتن تھا جس میں شراب تھی۔ ان چاروں کے گلاس خالی ہو چکے تھے اور اس نے پوچھے بغیر ان کے گلاسوں کو بھرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ان کے پتے بھی دیکھ رہی تھی۔ پہلے آدمی کا گلاس بھر کر اس نے مسکرا کر جیک کو دیکھا اور پھر اپنے رخسار تک آئی لٹ چھوئی۔ وہ دوسرے کے پاس آئی، اس کا گلاس بھرا اور گلے پر کاٹنے کا اشارہ کیا۔ یعنی اس آدمی کے پتے سب سے کمزور تھے۔ تیسرے کے پاس سب سے بہترین پتے تھے اور جین نے اس سے محتاط رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ کمرے سے نکل گئی۔

جیک جان گیا تھا کہ اس کے مخالفوں کے پاس کون سے پتے ہیں اس لیے بازی جیتنا اس کے لیے زیادہ مشکل نہیں ہوا تھا۔ اس نے سو پاؤنڈز لگائے تھے اور اب اس کے سامنے سات سو پاؤنڈز تھے۔ جس کے پاس سب سے بہترین پتے تھے، وہ جیک کی فتح پر ناخوش اور نامطمئن تھا۔ جیک نے پورے اعتماد سے اسے شو کرنے کو کہا اور اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے اگر وہ پتے شو کرا لیتا تو جیت اسی کی ہوتی۔ دوسری بازی شروع ہوئی اور کچھ دیر بعد جین اندر آئی۔ اس نے کھلاڑیوں کے گلاس بھرے اور پھر ان کے پتے دیکھ کر جیک کو مطلع کر رہی تھی کہ اچانک نامطمئن کھلاڑی نے اٹھ کر جین کو کلائی سے پکڑتے ہوئے دیوار سے لگایا اور بولا۔ ''یہ اشارے دے رہی ہے۔''

''کیسے؟'' دوسرے نے پوچھا۔

''اسے۔'' آدمی نے جیک کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جین کو بہت سختی سے پکڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ جیک اب تک اس سے انجان بنا ہوا تھا مگر جین کی تکلیف اس سے برداشت نہیں ہوئی اور اس نے آدمی سے کہا۔

''میری بیوی کو چھوڑ دو۔''

''اوہ تو یہ اس کی بیوی ہے۔'' آدمی نے کہتے ہوئے جین کو بالوں سے پکڑ لیا۔ معاملہ جیک کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ وہ اٹھ کر اس آدمی پر ٹوٹ پڑا اور اسے چند گھونسے مارنے میں بھی کامیاب رہا مگر وہ لڑنے والا آدمی نہیں تھا۔ باقی تین دولت مند ہی نہیں بلکہ ہوئے بدمعاش بھی تھے۔

انہوں نے اپنے آپ سے بے بس کیا اور پھر مار مار کر ادھ مؤا کر دیا۔ جبین نے اسے بچانے کی کوشش کی تو اسے بھی چند ہاتھ پڑے تھے۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے نہیں آئی۔ دل بھر کر جیک کی مرمت لگانے کے بعد انہوں نے اسے اٹھایا اور لا کر سیڑھیوں سے نیچے دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے تک گیا اور وہیں بے دم پڑا رہ گیا۔ اس نے ڈوبتی آنکھوں نے آخری منظر دیکھا کہ ایک آدمی اس کی بیوی کو پکڑ کر اس سے دست درازی کر رہا تھا اور دوسرا مکان کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ اس کے بعد جیک کو ہوش نہیں رہا۔

جیک کو ہوش آیا تو اوپر دروازہ بدستور بند تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور اندر سے جبین نکلی۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں نمایاں تھیں۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی۔ جیک نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا مگر وہ اس کی طرف دیکھے بغیر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد جیک ہمت کر کے اٹھا اور اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ جبین گھر میں تھی اور اس سے آنکھیں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ خود جیک بھی اس کی طرف نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ پھر وہ جا کر بستر پر پڑ گئی اور جیک نشست گاہ میں بیٹھا رہا۔ اگلی صبح وہ دونوں کچن کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ جیک نے کہا۔ ''تو یہ انجام ہوا ہماری کوشش کا۔''

''مجھے دکھ اپنی بے حرمتی کا نہیں ہے۔'' جبین نے تلخی سے کہا۔ ''مجھے دکھ تمہاری بدذاتی کا ہے۔ تم نے مجھے یونہی تسلیم کر لیا۔''

''تو اور کیا کرتا اپنے سامنے تمہارے ساتھ زیادتی ہوتے دیکھتا۔''

''وہ تو ہو گئی۔'' جبین طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''اور تم کچھ نہ کر سکے۔''

اس ذلت پر جیک کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''میں کیا کرتا؟ انہوں نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔''

''تم ہوش میں ہوتے تب بھی کیا کر لیتے۔'' جبین کا لہجہ مزید زہریلا ہو گیا۔ ''شکر کرو انہوں نے یہ سب تمہارے سامنے نہیں کیا۔''

''میں ان لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں۔''

''کیا فائدہ اگر تم انہیں تلاش کر کے قتل بھی کر دو تب بھی میری کھوئی عزت واپس نہیں آئے گی۔''

جیک ایک ناکام شخص تھا۔ ایک دن پہلے تک اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی حالت سے گزرنا پڑے گا۔ اس کی بیوی اسے دھوکا دے کر بھاگ جائے گی اور اس کے ہوتے ہوئے کسی اور سے شادی کی تیاری کر لے گی۔ پھر ملنے پر ایک جاسوس ان کے پیچھے لگ جائے گا۔ انجام کار وہ جیک کے ہاتھوں مارا جائے گا اور اب اسے یہ صدمہ بھی سہنا پڑا کہ کچھ لوگوں نے ان کے کیے کی سزا یوں دی اور اس کی بیوی کو زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اس کے پاس دولت، حیثیت، مرتبہ اور اب عزت کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر اپنا پستول نکالا اور باہر جانے لگا تو جبین نے کہا۔ ''بیکار ہے، وہ تینوں انگریز تھے اور میں نے خود سنا، وہ کہہ رہے تھے کہ چند گھنٹوں بعد ان کا جہاز برطانیہ جانے والا ہے۔ وہ اس وقت تک ہوانا سے بہت دور نکل گئے ہوں گے۔ کیا تم ان کے پیچھے برطانیہ جاؤ گے۔''

جیک نے اس کی طرف دیکھا اور باہر نکل گیا۔ مگر وہ اس مکان کی طرف نہیں گیا تھا۔ وہ ہوانا کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ یہاں رات جاگتی تھی مگر ان میں گلیاں روشن تھیں۔ البتہ سیاح خوش و خرم گھوم پھر رہے تھے۔ کہیں موسیقی پر ناچ رہے تھے اور کہیں کھا پی رہے تھے۔ سیاح وطن سے دور خوشیوں کے ان لمحات کو سمیٹ رہے تھے۔ وہ ان کے درمیان میں پھرتا رہا۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کی تفریح گاہ کے سامنے سے گزرا تو اس نے بادرے ڈی ٹلپ کو اندر سے ایک حسین عورت کے ساتھ باہر آتے دیکھا۔ وہ نشے میں لڑکھڑا رہا تھا اور مسرور نظر آ رہا تھا۔ وہ عورت کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اس کی رات یقیناً اس عورت کے ساتھ اسی تفریح گاہ میں گزری تھی۔ جیک اسے جاتے دیکھ رہا تھا۔ بادرے سے صرف ایک عورت چھنی تھی اور اس نے فوراً دوسری کا بندوبست کر لیا مگر اس کا سب چھن گیا تھا اور تب اسے خیال آیا کہ کاش جبین اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی۔

☆☆☆

اس واقعے کو تیسرا دن تھا۔ اس کے بعد سے نہ تو جبین اس کے پاس آئی تھی اور نہ خود اس نے اسے چھوا تھا۔ دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار سی آ گئی تھی۔ جیک صبح گھر سے نکل جاتا اور عام طور سے شام کو یا رات کو واپس آتا تھا۔ جب بدمعاشوں نے اسے مارا پیٹا تھا تو اس کی جیبی رقم بھی چھین لی تھی۔ اب باقی رقم بھی تیزی سے ختم ہو رہی تھی اور جیک سوچ رہا تھا کہ اپنی کچھ چیزیں فروخت کر دے۔

مگر یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ مسئلے کا حل وہ رقم تھی جو سان ڈیا گو کے کسی بینک میں پڑی تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے وہاں جانا لازمی تھا۔ جین کا جانا ضروری تھا اور وہ اکیلی نہیں جاسکتی تھی۔ اس نے جیک کو بتایا کہ اس نے ماورے ڈی تلپ سے بھی روابط اسی لیے بڑھائے تھے کہ وہ اسے اپنی مدد کے لیے سان ڈیاگو جانے پر آمادہ کرلیتی اور وہاں پہنچ کر ایک بار رقم حاصل کرلیتی تو پھر آزاد ہوتی۔

مگر اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔ جب اس نے جیک سے شادی کی تو چالاکی سے اسے سان ڈیاگو چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے جان بوجھ کر اس بینک میں اکاؤنٹ کھلوایا جس کی ایک شاخ ہوانا میں بھی تھی۔ جب وہ جیک کی رقم لے کر فرار ہوئی تو اس نے ہوانا پہنچتے ہی ساری رقم اس بینک کے ذریعے سان ڈیاگو بھجوادی تھی۔ اس کا ارادہ رقم نکلوا کر سان فرانسسکو یا نیویارک جانے کا تھا۔ سرمایہ کاری کے نقطہ نظر سے یہ دونوں شہر بہترین تھے۔ ستائیس ہزار یا ونڈ اتنی بڑی رقم تھی کہ وہ اس سے حاصل ہونے والے نفع سے بھی آرام سے گزارا کرسکتی تھی۔ اس نے یہ سب جیک کو جیل سے نکلنے کے بعد ہوانا کی طرف جاتے ہوئے بتایا تھا۔

جیک شام کو آیا تو جین نے اس کے سامنے کھانا اور شراب کی بچی ہوئی بوتل رکھ دی۔

”اس کے بعد گھر میں نہ کھانے کو کچھ ہے اور نہ پینے کو۔“

جیک تلخی سے مسکرایا اور کھانے میں مصروف ہوگیا۔ اچانک جین نے چیخ ماری۔ ”چوہا..... میں ان چوہوں سے عاجز ہوں۔“

”میں ان کو مارنے والی دوا لاتا ہوں۔“ جیک نے کہا۔ ”ساتھ ہی صبح کے لیے کچھ کھانے کو لے آؤں گا۔“

”خدا کے لیے میری ان سے جان چھڑاؤ۔“ جین نے ایک موٹے چوہے کو چپل کھینچ کر مارا، وہ میز کے اوپر چڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔ چوہا اچھل کر بھاگا۔ جیک کھانا ختم کرکے باہر آیا، اس نے صبح ناشتے کے لیے ایک ڈبل روٹی اور چوہے مار زہر لیا۔ زہر سفید سفوف کی شکل میں تھا۔ دکاندار نے اسے خبردار کیا۔

”اسے کھانے پینے کی چیزوں سے دور رکھنا، یہ بہت زود اثر ہے۔ ایک گرام کی مقدار میں بھی مہلک ثابت ہوگا۔ اگر کوئی غلطی سے کھالے تو فوراً ڈاکٹر کے پاس جائے۔“

جیک گھر آیا اور دونوں چیزیں جین کے حوالے کیں۔ اس نے اسے زہر کے بارے میں خبردار کیا۔ جین نے زہر ان جگہوں کے آس پاس چھڑک دیا جہاں سے چوہے آتے تھے۔ وہ کچھ بے چین تھی۔ اس نے جیک سے کہا۔ ”تم نے میرا جیولری باکس دیکھا ہے۔“

”ہاں۔“ جیک نے کہا اور کمرے میں آیا جہاں جیولری باکس ایک شیلف میں اوپر رکھا تھا، وہ لے کر باہر آیا تو جین چادر اوڑھے کہیں جانے کو تیار تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے نو بجارہی تھی۔ ”تم اس وقت کہاں جارہی ہو؟“

”باہر۔“ وہ بولی۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے، میں ذرا تازہ ہوا لینے جارہی ہوں۔“

”اس وقت باہر جانا اکیلی عورت کے لیے بہت خطرناک ہوتا ہے۔ ہوانا اچھی جگہ نہیں ہے۔“

”میں زیادہ دور نہیں جاؤں گی۔“ جین نے کہا اور باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد جیک کچھ دیر سوچتا رہا پھر اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے وہ بھی باہر نکل گیا۔ جین گلی کے سرے پر مڑ رہی تھی۔ جیک کوٹ پہنتے ہوئے اسی طرف چل پڑا۔ آگے بڑی سڑک تھی اور اس پر خاصا ہجوم تھا اس لیے اسے جین کا پیچھا کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ ٹہل نہیں رہی تھی بلکہ تیز قدموں سے چل رہی تھی اور وہ جس طرح گلیاں مڑ رہی تھی اس سے لگ رہا تھا کہ اسے اپنی منزل کا بخوبی علم تھا۔ پھر وہ ایک گلی میں مڑی تو جیک چونکا۔ یہ جگہ قحبہ خانوں کے لیے مشہور تھی۔ گلیوں میں انفرادی پیشہ کرنے والی عورتیں کھڑی تھیں اور آتے جاتے لوگوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ چند ایک نے جیک کو بھی روکنا چاہا مگر وہ دھیمے لہجے میں ان سے معذرت کرتا ہوا اس مکان کی طرف بڑھا جس کے صدر دروازے پر جین کھڑی ایک آدمی سے بات کررہی تھی۔

پھر وہ اندر چلی گئی۔ مکان کے سامنے موجود آدمی بتانے کے لیے کافی تھا کہ اندر کیا ہورہا ہے؟ جیک پاس پہنچا تو اس نے جیک کے لباس اور معزز حلیے کی وجہ سے ادب سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔ باہر گلی میں بجنے والی موسیقی کا شور تھا۔ مگر یہاں شور نسبتاً کم تھا۔ جیک سیڑھیاں اتر کر ایک چھوٹے سے ہال میں آیا جس میں کئی طرف سے سیڑھیاں اوپری فلورز کی طرف جارہی تھیں اور وہاں جگہ جگہ نیم عریاں عورتیں گھوم رہی تھیں۔ آنے والے مرد ان کو ٹٹولتی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور جو عورت پسند آتی وہ اسے اپنے ساتھ اوپر لے جاتی تھی۔ جین شاید یہاں باہر

سے آنے والا اکلوتا مہمان ایک عورت تھی۔ شاید اسی لیے کچھ مرد اسے استہزائیہ انداز میں دیکھ رہے تھے اور ان کی نظروں سے جیک کو پتا چلا کہ وہ کہاں گئی۔ وہ ایک طرف سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہی تھی۔ جیک اس کے پیچھے لپکا کیونکہ اگر وہ اوپر کسی کمرے میں چلی جاتی تو جیک پتا نہیں چلا سکتا تھا کہ وہ کہاں گئی ہے؟ اسے نظروں میں رکھنا لازمی تھا۔

گول ستون کے ساتھ گھومتی سیڑھیاں اوپر ایک بالکونی میں کھل رہی تھیں۔ جیک بالکونی میں جانے لگا تھا کہ اس کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ رک گیا۔ پھر اس کی نظر بالکونی کی چھت سے لگے کرسٹل کے فانوس پر گئی۔ اس کے شیشوں میں اسے بالکونی کے آخری سرے اور راہداری کے آغاز پر کھڑی جین دکھائی دی وہ اسی سمت دیکھ رہی تھی۔ اگر جیک ذرا سا آگے نکلتا تو اس کی نظروں میں آجاتا۔ اچانک کسی نے جین کو پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا۔ جیک ایسا کرنے والے کو دیکھ نہیں سکا تھا۔ فانوس کے شیشوں میں عکس بہت چھوٹا سا نظر آ رہا تھا۔ اسے بس سنہرے بالوں والے مرد کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ راہداری کے سرے پر پہنچ کر اس نے دیکھا۔ دائیں طرف موجود ایک دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اوپر کا فلور چاروں طرف سے کھلا ہوا تھا اس لیے باہر ہونے والا شور اندر زیادہ سنائی دے رہا تھا۔ وہ دبے قدموں آگے آیا اور اس نے اندر جھانکا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

☆☆☆

جین تیز قدموں سے چل رہی تھی۔ وہ مکان تک پہنچی جو اصل میں ایک اونچے درجے کا قحبہ خانہ تھا جہاں صرف دولت مند مرد ہی جا سکتے تھے اور وہاں کسی عورت کی آمد حیرت انگیز ہی سمجھی جاتی۔ تبھی دروازے پر موجود آدمی نے اسے روک دیا۔ ''اندر کیوں جا رہی ہو؟''

''مجھے مسٹر گلبرٹ رائٹ سے ملنا ہے۔''

''کیا وہ یہاں مقیم ہے؟''

''بالکل اس نے مجھے یہیں کا پتا دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے تم اندر جا کر دیکھ سکتی ہو۔'' آدمی نے اسے اجازت دی اور پھر خبردار کیا۔ ''مگر اندر جا کر کسی کو گاہک بنانے کی کوشش مت کرنا یہاں باہر سے آنے والیوں کو دھندا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''میں صرف گلبرٹ رائٹ سے ملنے آئی ہوں۔''

جین نے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ کہا۔ ''میں ایک شریف عورت ہوں۔''

آدمی مشکوک انداز میں مسکرانے لگا مگر اس نے جین کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آئی جہاں بے شمار مرد اور عورتیں تھیں۔ مگر کوئی کسی کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ جین سیڑھیوں کی طرف آئی اور اوپر بڑھی۔ بالکونی میں آ کر اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر اندازے سے دائیں طرف بڑھی۔ بالکونی ایک راہداری پر ختم ہو رہی تھی اور اس کے دونوں طرف کمرے تھے۔ ایک لمحے کو جین کی نظر نیچے ہال کی طرف گئی تو اس نے ایک مرد کو ستون کے پیچھے جاتے دیکھا جہاں سے سیڑھیوں کا آغاز ہو رہا تھا۔ اسے لگا کہ مرد جیک جیسا کوٹ پہنا ہوا ہے، اس نے کوٹ کی جھلک دیکھی تھی۔ مرد اوپر آ رہا تھا اور جین سیڑھیوں کے آغاز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مرد ابھی تک نمودار نہیں ہوا اور پھر اچانک کسی نے اسے پکڑ کر کھینچا اور اس سے پہلے وہ سنبھلتی، گلبرٹ اسے کھینچتا ہوا ایک کمرے میں لے جا چکا تھا۔

''تم اب آ رہی ہو۔'' وہ غرایا۔ ''میں پورے ایک ہفتے سے انتظار کر رہا ہوں۔''

گلبرٹ نے اسے دیوار سے لگا لیا تھا اور پورے جسم سے دبا رہا تھا۔ اس کے چہرے اور انداز میں جارحیت نمایاں تھی۔ ''مجھے موقع نہیں ملا تھا۔'' جین کراہی۔ ''پلیز مجھے درد ہو رہا ہے۔''

''درد تو تمہیں ہوگا۔'' گلبرٹ نے تیز سانسوں کے ساتھ کہا۔ ''آخر تم کب اس شخص سے جان چھڑا کر میرے پاس آؤ گی۔''

''تم جانتے ہو ابھی میرا انتقام پورا نہیں ہوا ہے۔''

''بھاڑ میں گیا تمہارا انتقام۔'' گلبرٹ غرایا۔ ''میں یہاں اس قحبہ خانے میں پڑا ہوں۔ ستائیس ہزار پاؤنڈز کی خطیر رقم کے ہوتے ہوئے تم اس حلیے میں گھوم رہی ہو۔ اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔''

''ہم جائیں گے؟''

''کب..... آخر کب؟'' گلبرٹ نے کہتے ہوئے چاقو نکال لیا اور جین کی نازک گردن پر رکھ دیا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ تم مجھے دھوکا دے سکتی ہو۔ تمہاری زندگی کا پہلا اور آخری مرد میں ہی ہوں۔ جس دن تم نے مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔''

جین کسمسائی۔ ''تم جانتے ہو میں صرف انتقام کے لیے جیک کی طرف بڑھی اور اس کی بیوی بنی۔ مگر جب تک وہ زندہ ہے میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔''

''اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ جلد اس کی بیوہ

بن جاؤ۔'' گلبرٹ بولا۔'' آج ہی اس کا کام تمام کر دو۔ اگر تم اکیلے نہیں کر سکتیں تو میں آجاتا ہوں۔''

''تم......!'' جین گھبرا گئی۔'' تم نہیں آؤ گے۔''

''تب اسے خود مار دو مگر اب میں مزید اسے تمہارے نزدیک برداشت نہیں کر سکتا۔'' گلبرٹ کا لہجہ دہشت زدہ ہو گیا۔'' میں قسم کھا رہا ہوں میں اسے قتل کر دوں گا۔ اگر وہ کل صبح تک زندہ رہا تو میں اس چاقو سے اسے اور تمہیں دونوں کو قتل کر دوں گا۔''

''میں اسے آج رات ہی مار دوں گی۔'' جین نے کہا تو گلبرٹ کی دہشت کم ہوئی تھی، اس کا انداز بدل گیا۔

''تم جانتی ہو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''میں بھی صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔'' جین کا لہجہ سنجیدہ تھا۔'' ورنہ میرے لیے کیا مشکل تھا کہ میں جیک کے ساتھ سان ڈیاگو چلی جاتی۔''

اس کی بات پر گلبرٹ خوش ہوا تھا۔'' ہم امریکا جائیں گے اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں گے وہاں میری فنکاروں کی بہت قدر دانی ہوتی ہے۔''

''ہم ابھی بھی نکل سکتے ہیں۔'' جین نے کہا تو گلبرٹ مزید خوش ہو گیا۔

''ہاں جب دولت ہو تو آدمی ہر کام کر سکتا ہے۔''

جین نے ابھی گر جانے والی چادر اٹھائی۔'' اب مجھے جانا ہوگا۔ میں جیک سے کہہ کر آئی ہوں کہ میں ہوا خوری کے لیے جا رہی ہوں اور جلدی آجاؤں گی۔''

گلبرٹ نے اس کی چادر واپس کھینچ لی۔'' اب اس کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھو وہ ایک مردہ شخص ہے۔''

تب جین نے ذرا سے کھلے دروازے سے باہر کسی کی جھلک دیکھی۔

☆☆☆

جیک شور کی وجہ سے اندر ہونے والی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سن سکا تھا مگر اسے سننے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس نے جو دیکھ لیا تھا وہی کافی تھا اور اب سارا کھیل اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ اسے راجر کو شناخت کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ جب جین نے نیچے گر جانے والی چادر اٹھائی تو وہ جلدی سے پلٹ گیا تھا۔ نیچے آتے ہوئے اس نے پہلے بالکونی کی طرف دیکھا اور جب جین وہاں سے نمودار نہیں ہوئی تو وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔ اب سب کھل گیا تھا اس کے باوجود اس کے اندر خواہش تھی کہ جین اس کے تعاقب سے واقف نہ ہو۔ وہ گلیوں سے ہوتا ہوا گھر آگیا تو خود کو ٹوٹا ہوا اور بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ آج اس کی آخری آس بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر اسے پستول کا خیال آیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا اور پھر کنپٹی سے لگا لیا۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی، اس نے جلدی سے پستول ہٹاتے ہوئے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ جین اندر آئی اور اسے کوٹ میں دیکھ کر پوچھا۔

''تم بھی باہر گئے تھے؟''

''ہاں، میں نے سوچا کہ میں بھی ہوا کھا آؤں۔'' جیک نے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے دس بجا رہی تھی۔'' تم بہت دیر سے آئیں۔''

''ہاں دور نکل گئی تھی۔ واپس آنے میں دیر لگی۔''

''آدمی جب دور نکلتا ہے تو اسے آنے میں دیر لگتی ہے لیکن آدمی آنا ہی نہ چاہے......'' جیک بولتے بولتے رک گیا۔ جین نے چادر اتارتے ہوئے پوچھا۔

''چائے پیو گے؟''

''ہاں۔'' جیک نے بتایا تو جین نے چولھے پر چائے چڑھا دی اور پھر برتنوں کے خانے سے پرچ پیالیاں نکالنے لگی۔ وہ چولھے اور جیک کے درمیان میں تھی۔

''تم کہاں گئے تھے؟''

''جگہ کا تو نہیں معلوم لیکن مجھے وہاں جانا نہیں چاہیے تھا۔'' جیک نے جواب دیا۔'' یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔''

کیتلی سے بھاپ نکلنے لگی۔ جین پیالیوں میں چائے نکالنے لگی اور پھر اس نے لا کر میز پر رکھ دی۔ وہ دونوں ہی بغیر دودھ اور چینی کے چائے پیتے تھے۔ جیک نے الٹی پیالی کی طرف دیکھا اور پرچ سمیت اسے کھینچ لیا۔ جین اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنی پیالی نہیں اٹھائی تھی۔ اس نے پھر پوچھا۔'' تم کہاں گئے تھے؟''

''جہاں تم گئی تھیں۔''

جین کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔'' کیوں گئے تھے؟''

''تاکہ میں پوری طرح حقیقت دیکھ سکوں جو مجھ سے آج تک چھپا ہوا تھا وہ دیکھ سکوں۔''

''تم اوپر آئے تھے؟''

''ہاں اور میں نے اسے بھی دیکھا جسے میں اپنے ہاتھ سے مار چکا تھا۔''

جین نے گہری سانس لی۔ ''تو تم سب جان گئے ہو؟''

''نہیں، مجھے لگ رہا ہے میں ابھی بھی بہت کچھ نہیں جانتا۔ یہ سب جو میرے سامنے ایک اسٹیج شو کی طرح چل رہا ہے۔'' جیک نے ہاتھ لہرایا۔ ''اس پردے کے پیچھے کیا ہے میں نہیں جانتا۔''

''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''آخر تم نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا؟''

''کیونکہ تم دولت مند تھے۔''

''جھوٹ اگر میں دولت مند تھا تو اب نہیں ہوں تب بھی تم میرے ساتھ ہو آخر کیوں؟''

''اور کیا جاننا چاہتے ہو؟''

''یہ شخص کون ہے، یہ بھی تمہارے ڈرامے کا ایک حصہ ہے۔''

جین نے پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور پھر بولی۔ ''ہاں یہ شروع سے میرے ساتھ ہے۔ جب سے میرا باپ مرا میں اسی کے ساتھ ہوں کیونکہ میرا سہارا میرا باپ ہی تھا۔''

جیک نے اب تک اپنی پیالی نہیں اٹھائی تھی۔ اس نے رنجیدہ لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ ''کیوں آخر کیوں؟ میں ہی کیوں؟''

''تمہیں جان بٹلر ہونا ہے؟''

جیک چونکا۔ ''یہاں بٹلر جس کی خواہش تھی کہ جیکا کو اس کی جاگیر اسے دی جائے۔''

''وہ اس کا حق تھا۔'' جین نے کہا۔ ''اس نے بہت محنت اور ایمان داری سے تاج برطانیہ کی خدمت کی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے سنہری سال ان کو دیے جب کہ دوسرے سرکاری یا کمپنیوں کی ملازمت کر کے دولت کما رہے تھے۔ آخر وقت میں اس نے اپنی خدمت کا صلہ چاہا تھا مگر دربار میں موجود سازشیوں نے اس سے اس کا حق چھین لیا۔''

''میں کسی بھی سازش میں شامل نہیں تھا۔'' جیک نے صفائی پیش کی۔ ''شاید میں یہ جاگیر قبول نہ کرتا اگر مجھے خدشہ نہ ہوتا کہ اسے نافرمانی سمجھا جائے گا۔ میں لندن میں خوش تھا۔''

جین نے اس کی وضاحت پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ ''جب جان بٹلر کو اپنی خدمات کا صلہ صاف انکار کی صورت میں ملا تو اس نے ایک رات اپنے کمرے کی چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی۔ اس سے اگلی صبح تمہاری لندن سے روانگی تھی۔''

جیک نے گہری سانس لی۔ ''تو تم الزبتھ بٹلر ہو۔''

''ہاں میں الزبتھ بٹلر ہوں۔''

''لیکن تمہاری بہن سارہ بٹلر؟''

''میری کوئی بہن نہیں ہے، وہ صرف ایک اداکارہ تھی۔''

''اور بے آف ہوانا میں ملنے والی لاش۔''

''یہ گلبرٹ کا جھوٹ تھا۔''

''سارہ بٹلر کی لاش؟''

''وہ بھی اسی کا جھوٹ تھا۔ یہ ساری کہانی اسی نے بنائی ہے۔''

''اور تم نے اس پر عمل کیا؟''

الزبتھ نے سر ہلایا۔ ''ہاں کیونکہ مجھے انتقام لینا تھا۔''

''اور رقم؟''

''گلبرٹ کو اس معاملے میں شامل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔'' اس نے کہا۔ ''کسی لالچ کے بغیر وہ کہاں مانتا؟''

''کیا تمہارا لالچ کوئی نہیں تھا؟''

''نہیں۔'' الزبتھ نے تلخی سے کہا۔ ''مجھ پر تو وہ پہلے ہی تصرف رکھتا تھا۔ تم اوپر آئے تو کیا تم نے اس کا انداز نہیں دیکھا؟''

''پھر یہ ڈراما کیا تھا۔ جوئے سے رقم کمائی جائے اور ہم سان ڈیاگو جائیں۔''

''مقصد تمہیں ذلت اور بے بسی کا احساس دلانا تھا۔'' الزبتھ نے جواب دیا۔ ''وہاں کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں نے ان کی شراب میں پہلے ہی بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی اور جب تک وہ تمہیں مار پیٹ کر باہر پھینک کر میری طرف متوجہ ہوتے دوا اثر دکھانے لگی تھی۔ ان میں سے کوئی مجھے انگلی بھی نہیں لگا سکا تھا۔ اپنا حلیہ میں نے خود خراب کیا تھا۔ وہ سب ایک ایک کر کے بے ہوش ہو گئے اور میں ان کی رقم سمیٹ کر وہاں سے نکل آئی۔ تم سے شادی کے بعد کوئی دوسرا مرد میرے پاس نہیں آیا گلبرٹ بھی نہیں۔''

''تمہارے پاس کتنی رقم آئی؟''

''مجھے کل ساڑھے تین ہزار پاؤنڈز ملے۔''

''یعنی اب تم سان ڈیاگو جا سکتی ہو۔''

''سان ڈیاگو جانا کبھی بھی میرا اصل مقصد نہیں رہا۔'' اس دوران میں ایک چھ بار گہرا ہوا سنک کے نیچے

سے لٹکا اور کھلی جگہ آکر ڈھیر ہوگیا۔ اس نے یقیناً زہر کھالیا تھا۔ جیک نے چوہے کو دیکھا اور بولا۔ ''بہت زود اثر زہر ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے زہر جب جسم میں جاتا ہے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی، میں نے آج تک کبھی زہر نہیں کھایا۔'' الزبتھ کا لہجہ مرتعش تھا۔

''حالانکہ تم مجسم زہر ہو۔'' جیک نے طنزیہ لہجے میں کہا اور پستول نکال کر سامنے رکھ لیا۔ ''مگر ایسا زہر جسے آدمی ہنسی خوشی پی جائے اور جب مر رہا ہو تب بھی ناخوش نہ ہو۔ لیکن تم جانتی ہو بعض چیزیں زہر اور موت سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ایک آدمی جس کا کوئی محور نہ ہو وہ بس ایسے ہی زندگی گزار رہا ہو اور پھر اسے ایک محور مل جائے۔ اسے لگے کہ اس کی زندگی کا ایک مقصد آگیا ہے اور وہ اس میں مگن ہو پھر اچانک اسے پتا چلے کہ وہ جسے محور سمجھ رہا تھا وہ صرف ایک دھوکا تھا۔ کیا تم اس شخص کی اذیت کا اندازہ کرسکتی ہو؟''

الزبتھ کے رخسار پر آنسو ڈھلک آئے تھے۔

''نہیں۔''

''ایسا دھوکا دینے والے کی سزا کیا ہونی چاہیے۔''

''اسے قتل کردیا جائے۔''

جیک نے پستول اٹھا کر اس کی نال سے الزبتھ کی ایک لٹ جو رخسار تک آگئی ہوئی تھی اسے ہٹایا اور بولا۔ ''میں خدا کو حاظر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے جان بٹلر کے خلاف کوئی سازش نہیں کی۔ میں نہ تو کبھی اس سے ملا اور نہ ہی کبھی اسے دیکھا اور میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تم سے بے پناہ محبت کی۔ کوئی چیز بھی میرے دل سے تمہاری محبت ختم نہیں کرسکتی۔'' اس نے پستول کوٹ میں رکھ لیا اور چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ زہر بھی نہیں۔''

''نہیں۔'' الزبتھ چیخ مار کر جھپٹی اور اس نے پیالی پر ہاتھ مارا مگر اس دوران میں جیک چائے حلق میں انڈیل چکا تھا۔ ''یہ تم نے کیا کیا؟''

''وہی جو تم نے چاہا تھا۔'' جیک نے تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ اس کے منہ سے سفید سا جھاگ نکلنے لگا تھا۔

''میرے خدا..... میرے خدا۔'' الزبتھ چیخ رہی تھی۔ پھر اس نے سہارا دے کر جیک کو اٹھایا۔ ''میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔''

جیک کھڑا ہوگیا۔ ''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ... ہوگا۔ دکاندار نے کہا تھا کہ زہر کھالینے کی صورت میں ڈاکٹر کے پاس جانا۔ اس کا مطلب ہے ڈاکٹر اس کا

علاج کرسکتا ہے۔‘‘

الزبتھ نے اپنی چادر لی اور جیک کو سہارا دیا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں اور وہ ابکائی کرنے کی کوشش کررہا تھا مگر خالی پیٹ اسے ابکائی بھی نہیں آرہی تھی۔ الزبتھ اسے باہر لائی اور سڑک کی طرف مڑ گئی۔ جب وہ سڑک پر پہنچے تو اسی لمحے دوسری طرف سے گلبرٹ نمودار ہوا اور وہ تیزی سے اس مکان تک آیا۔ یہاں کا پتا اس نے الزبتھ سے حاصل کیا تھا۔ لوہے کا گیٹ کھلا پاکر اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آیا اور پھر کسی کو وہاں نہ پاکر اس نے دیوار پر مکا مارا۔ پھر اس کی نظر کچن میں ٹوٹی ہوئی پیالی اور گری ہوئی کچھ چائے پر گئی۔ اس نے چائے پر انگلی لگائی اور اسے سونگھا۔ پھر معنی خیز انداز سر ہلایا۔ وہ تیزی سے باہر آیا اور اس کا رخ اب گلی کے دوسرے سرے کی طرف تھا۔ وہ سڑک پر آیا اور اس نے آس پاس دیکھا۔ ہوا تو کا ریلوے اسٹیشن یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ کچھ سوچ کر گلبرٹ اس کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

جیک کی حالت ہر گزرتے لمحے خراب ہوتی جارہی تھی۔ زہر واقعی زود اثر تھا۔ جیک کے منہ سے جھاگ نکل نکل کر گررہا تھا اور چلتے ہوئے اس کے قدم بری طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ اسے اپنا ہوش نہیں تھا اور الزبتھ بہ مشکل اسے سہارا دیے ہوئے کھینچ رہی تھی۔ گلی سے نکلتے ہوئے اس نے مڑ کر دیکھا اور اسے گلبرٹ مخالف سمت سے آتا دکھائی دیا۔ جین نے گھبرا کر رفتار تیز کر دی تھی۔ ابھی وہ جیک کے لیے فکر مند تھی اور اب یہ مصیبت بھی آگئی۔ وہ جانتی تھی کہ گلبرٹ اس پر اپنا مکمل حق سمجھتا ہے اور اسے کسی صورت چین نہیں ملے گا جب تک وہ جیک کو چھوڑ کر اس کے پاس واپس نہیں آئے گی۔ وہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے اس کے پیچھے آیا تھا کہ اس نے جیک کا کام تمام کر دیا ہے۔ جین کو نہیں معلوم تھا کہ یہاں ڈاکٹر کہاں ملے گا۔ وہ آتے جاتے راہ گیروں سے ڈاکٹر کا پوچھ رہی تھی۔ ایک آدمی نے ریلوے اسٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔

’’شاید وہاں تمہیں ڈاکٹر مل جائے۔‘‘

وہ جیک کو گھسیٹتے ہوئے اسٹیشن کی طرف بڑھی۔ داخلی دروازے سے ایک ریلا اندر جارہا تھا۔ شاید کوئی ٹرین جانے والی تھی۔ الزبتھ یہاں بھی ڈاکٹر کا پوچھ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ گلبرٹ یہاں بھی نہ آجائے۔ جیک اب کسی قدر ہوش میں تھا۔ وہ ایک ستون سے ٹک گیا اور گہری سانس لیتا ہوا بولا۔ ’’میرا اب کچھ نہیں ہوسکتا، تم چلی جاؤ۔ تمہارے پاس رقم ہے، تم سان ڈیاگو جاسکتی ہو۔‘‘

’’نہیں، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔‘‘ الزبتھ نے کہا۔ ’’یہاں ڈاکٹر مل جائے گا۔‘‘ اس نے آس پاس دیکھتے ہوئے کہا اور اسی لمحے اسے اندر آنے والے مسافروں میں گلبرٹ کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے جلدی سے جیک کو سہارا دیا۔ ’’آؤ چلو یہاں سے۔‘‘

الزبتھ نے جیک کو سہارا دیا اور آگے بڑھی۔ ایک ٹرین تیار تھی اور اس میں مسافر سوار ہورہے تھے۔ الزبتھ بھی جیک کو لے کر آخری ڈبے کے پچھلے حصے سے اندر آئی اور خالی سیٹ کی تلاش میں آگے بڑھنے لگی۔ ایک جگہ خالی تھی۔ اس نے جیک کو بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ دعا کررہی تھی کہ ٹرین چل پڑے۔ پھر اس کی دعا قبول ہوئی اور ایک ہلکے سے جھٹکے سے ٹرین حرکت میں آگئی۔ مگر اسی لمحے کھڑکی کے پاس گلبرٹ نمودار ہوا۔ اس نے الزبتھ کو دیکھا اور ڈبے میں سوار ہونے کے لیے پیچھے کی طرف بھاگا۔ الزبتھ تیزی سے حرکت میں آئی اور تقریباً نیم بے ہوش جیک کو سہارا دیتے ہوئے اگلے دروازے کی طرف بڑھی۔ جب تک وہ دروازے تک آئی ٹرین کسی قدر رفتار پکڑ چکی تھی۔ ایک آدمی نے اسے روکا۔ ’’یہ کیا کررہی ہو؟ دروازے سے دور رہو۔‘‘

الزبتھ نے اسے دھکا دیا اور جیک سمیت پلیٹ فارم پر کود گئی۔ اس نے جان کی بازی لگائی تھی کیونکہ وہ گر کر ٹرین کے نیچے بھی آسکتے تھے۔ مگر وہ پلیٹ فارم پر گرے تھے اور کسی چوٹ سے محفوظ رہے۔ الزبتھ جلدی سے اٹھی اور جیک کو گھسیٹتے ہوئے پلیٹ فارم کے آگے برآمدے تک لائی۔ یہاں سے ایک سرنگ دوسرے پلیٹ فارم تک جارہی تھی۔ الزبتھ جیک کو لے کر اس سرنگ میں داخل ہوگئی۔ جیک کو اپنا ہوش نہیں تھا، اسے بھی الزبتھ نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بس پاؤں گھسیٹ رہا تھا۔ الزبتھ بڑی مشکل سے اسے دوسری طرف لائی اور اسے دیوار سے لگا کر بٹھا دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ پہلے گلبرٹ سے بچے یا جیک کے لیے ڈاکٹر تلاش کرے جس کی حالت اب قریب المرگ لگ رہی تھی۔ وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔ ’’جیک، پلیز ہوش میں آؤ۔ میرے ساتھ رہو، مجھے چھوڑ کر مت جانا۔‘‘

اتنا کہتے ہوئے وہ رونے لگی۔ اچانک ہی عقب سے گلبرٹ نے اسے پکڑ کر کھینچا اور جیک سے جدا کرتے ہوئے

ایک بازو سے جکڑ کر دوسرے ہاتھ میں دبا ہوا چاقو اس کی گردن سے لگا دیا۔ جیک نیم بے ہوشی حالت میں دیوار سے لگا پڑا تھا اور شاید اسے گلبرٹ کی آمد کی خبر بھی نہیں تھی۔ وہ کس وقت وہاں پہنچا، یہ تو الزبتھ کو بھی پتا نہیں چلا تھا۔ یقیناً اس نے انہیں زینے سے گرتے دیکھ لیا تھا۔ گلبرٹ کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس نے غراتی سرگوشی میں کہا۔ ''تم کیا سمجھتی تھیں، مجھ سے بچ کر بھاگ جاؤ گی۔''

''پلیز۔'' الزبتھ نے کہنا چاہا۔

''یہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ تم اسے چھوڑ کر جاؤ گی۔'' گلبرٹ نے کہتے ہوئے تیمن سے الگ ہو کر اسے گردن سے پکڑا اور چاقو والا ہاتھ بلند کر کے اس کے سینے میں اتارنا چاہا مگر اس کا ہاتھ مخالف سمت میں کھنچتا چلا گیا۔ یہ جیک تھا جس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ وہ کسی طرح اٹھ آیا تھا۔ گلبرٹ نے اسے دوسرے ہاتھ سے گھونسا مارا اور وہ پیچھے جا گرا تھا۔ اب الزبتھ کو موقع مل گیا کہ وہ گلبرٹ سے دور ہو سکے۔ وہ چاقو تولتا ہوا جیک کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے پستول نکال لیا۔ گلبرٹ ہنسا۔

''کیا تم ایک بار پھر مجھ پر نقلی گولیاں آزماؤ گے۔''

''اس بار نہیں۔'' جیک نے کہا اور نزدیک آتے گلبرٹ پر فائر کیا۔ گولی اس کے پیٹ میں اتر گئی اور وہ جھٹکے سے پیچھے گیا تھا۔ اس نے حیرت سے اپنے پیٹ کے سوراخ کو دیکھا جس سے تیزی سے خون ابل رہا تھا اور پھر وہ لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ الزبتھ جیسے ہی جیک کے پاس آئی۔ اس کا ہاتھ نیچے گر گیا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں اور آنکھیں اوپر چڑھ رہی تھیں۔ الزبتھ روتے ہوئے اسے پکار رہی تھی۔ اس دوران میں عقب سے کسی کی آواز آئی اور پولیس والے دوڑتے ہوئے آئے۔ الزبتھ نے جلدی سے جیک کے ہاتھ سے پستول لے لیا۔ آنے والے دو پولیس والوں میں سے ایک نے پوچھا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''یہ بیمار ہے، اسے ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔''

''اور یہ۔'' پولیس والے نے گلبرٹ کی طرف اشارہ کیا جو فرش پر پڑا ہوا تھا اور سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ الزبتھ اس کی طرف بڑھی اور یوں اس پر جھکی جیسے اسے آخری ہچکی لینے والی ہو۔ گلبرٹ کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی [illegible] الزبتھ نے [illegible] پستول رکھ کر فائر کیا تھا۔ گلبرٹ [illegible]

مڑ کر پولیس والے سے کہا۔ ''اب یہ مر چکا ہے۔ اس پر توجہ دو اور ڈاکٹر کو بلاؤ۔''

اس کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر پولیس والا پہلے ہی گھبرا گیا تھا۔ اس کے پاس قانون کے نفاذ کے لیے صرف ڈنڈا تھا۔ اس نے مڑ کر اپنے ساتھی کو دیکھا تو وہ فوراً ڈاکٹر بلانے چلا گیا۔ الزبتھ جیک کے پاس آئی جو اب ساکت تھا اور اس کی سانس بھی رکی ہوئی تھی۔ پولیس والا بھی پاس آیا اور اس نے پہلے الزبتھ سے پستول لیا اور پھر جیک کا معائنہ کیا۔ ''میرا خیال ہے یہ مر چکا ہے۔''

☆☆☆

عورت جو الزبتھ تھی خاموش ہوئی تو پادری نے آہستہ سے کہا۔ ''تو یہ تمہاری کہانی ہے۔''

''ہاں فادر، میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا ہے۔'' الزبتھ نے باہر کی طرف دیکھا۔ دور مشرق کے افق پر ہلکی سی سفیدی نمودار ہونے والی تھی۔ وقت قریب تھا۔ وہ مڑی اور پادری کو دیکھ کر [illegible] انداز میں مسکرائی۔ ''تمہارا شکریہ، تم بہت اچھے اور خیال کرنے والے انسان ہو۔''

''پادری ہونے کے ناتے یہ میرا فرض ہے۔''

''نہیں تم فرض سے قطع نظر بھی بہت اچھے انسان ہو۔'' الزبتھ نے اصرار کیا۔ وہ اس کے بہت پاس تھی۔ ''تمہارے خیال میں، میں کیسی عورت ہوں؟''

نوجوان پادری نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم اچھی عورت ہو۔''

''کیا میں اس سزا کی حق دار ہوں جو مجھے دی جا رہی ہے اور گلبرٹ جیسے آدمی کے قتل کے جرم میں دی جا رہی ہے۔''

پادری خاموش رہا، اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے اب ہمیں دعا کر لینی چاہیے۔''

الزبتھ نے گہری سانس لی۔ ''ہاں ہمیں دعا کر لینی چاہیے۔ کچھ دیر بعد میری زندگی کا آخری سورج نمودار ہوگا۔''

الزبتھ نے سفید چادر کو اب سر پر بھی لے لیا تھا اور وہ پوری طرح چھپ گئی تھی مگر اس چھپی حالت میں بھی اس کی کشش نمایاں تھی۔ پادری نے اس کے سامنے مقدس کتاب کھولی اور دعا پڑھنے لگا۔ الزبتھ دونوں ہاتھ جوڑے اور آنکھیں بند کیے ہوئے اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے عقب میں آسمان پر رفتہ رفتہ سفیدہ نمودار ہوتا جا رہا تھا۔

[illegible]

قلعے اور قید خانے کے کمانڈنٹ کرنل جارج کیسپر نے اپنے کمرے سے نکل کر قید خانے کا رخ کیا۔ فصیل پر اس کے آدمی موت کی کرسی کو تیار کر چکے تھے اور اب جلاد کو قیدی کا انتظار تھا۔ وہ اپنے نائب کیپٹن جوز میکائے کے ساتھ تھا۔ اس نے کرسی کا معائنہ کیا اور کیپٹن سے پوچھا۔ ''پادری چلا گیا؟''

''ہاں کچھ دیر پہلے ہی گیا ہے، وہ ساری رات ہی وہاں رہا۔''

کیپٹن کے جواب پر کرنل مسکرانے لگا۔ ''وہ ایسی ہی فتنہ عورت ہے، اس کے پاس جانے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا ہے۔ ورنہ پادری کا کام آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں تھا۔''

''اب اس فتنے کا آخری وقت آگیا ہے۔ اس سال وہ پہلی اور آخری عورت ہے جسے یہاں سزائے موت دی جائے گی۔''

''چلو وقت ہو گیا ہے۔''

وہ دو گارڈز کے ہمراہ کوٹھری تک آئے۔ اندر الزبتھ دوسری طرف منہ کرکے بیٹھی تھی۔ ایک گارڈ نے دروازے کا لاک کھولا اور کرنل کیسپر اندر آیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''خاتون، مجھے افسوس ہے لیکن وقت ہو گیا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو۔''

الزبتھ کے جسم میں حرکت نہیں ہوئی، وہ گھٹنوں کے بل ساکت کھڑی تھی۔ اس نے سر سے پاؤں تک خود کو سفید کپڑے سے ڈھک رکھا تھا۔ کرنل نے دوبارہ کہا اور اس بار بھی الزبتھ نے جنبش نہیں کی تو کرنل کے اشارے سے دونوں گارڈز آگے آئے اور وہ خود بھی آگے آیا۔ دونوں گارڈز نے الزبتھ کو بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور کرنل نے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ ایک لمحے کے لیے وہ دنگ رہ گیا۔ کیونکہ سفید کپڑوں اور چادر میں پادری لپٹا ہوا تھا۔ کرنل نے پوری قوت سے چلا کر کہا۔ ''الارم۔''

چند لمحے بعد قلعے میں الرٹ کا الارم بج رہا تھا مگر اسے بجنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ نکلنے والی نکل کر جا چکی تھی۔

☆☆☆

سان ڈیاگو کی وہ ایک سرد شام تھی۔ کار اس عالی شان ہوٹل اور کیسینو کے سامنے رکی اور ایک باوردی خادم نے ادب سے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور اس سے الزبتھ اتری تھی۔ قیمتی اور حسین لباس میں اس کا حسن مزید نکھر کر سامنے آیا تھا۔ قیمتی جڑاؤ جیولری کا حسن اور اس کی ڈیزائن کے نگینے اس کی تابناکی میں مزید اضافہ کررہے تھے۔ وہ کیسینو میں آئی اور وی آئی پی ایریا کی طرف بڑھی جہاں ایک میز کے گرد چار افراد تاش کی بازی لگا رہے تھے۔ الزبتھ دھیمے قدموں سے ان کی طرف بڑھی۔ چاروں خوش پوش اور دولت مند طبقے کے نمائندے نظر آرہے تھے۔ الزبتھ نے غیر محسوس انداز میں ان کے چاروں طرف ایک چکر لگایا اور پھر جیک کے عین سامنے آکر رکی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن پر انگلی پھیری اور آگے بڑھ گئی۔ الزبتھ نے ایک الگ میز منتخب کی تھی مگر اس نے کھیلنے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد جیک اس کی میز پر تھا۔ اس نے احترام سے الزبتھ کا ہاتھ چوما۔ وہ ظاہر کررہے تھے کہ ان کی آج پہلی ملاقات ہے۔

''تمہیں یہاں تک آنے میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟''

الزبتھ مسکرائی۔ ''سوائے سفر کے اور کوئی دشواری نہیں تھی۔ تم نے بہت اچھے انتظامات کیے تھے۔ مجھے ہوانا سے نکلنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ لیکن مجھے پادری کا خیال ہے، اس کا کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں، اسے صرف چرچ اور پادری کے منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔'' جیک نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے تمہارے آنے سے فائدہ ہوا۔ میں نے آٹھ سو ڈالرز داؤ پر لگائے تھے اور مجھے اس کے بدلے چھ ہزار ڈالرز ملے۔''

''میں ڈر رہی تھی کہ یہاں بھی کسی کو شک نہ ہو جائے۔''

انہوں نے ڈنر کیا اور پھر ساتھ روانہ ہوئے۔ جیک نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ڈیرا لیا تھا مگر یہ ہوانا کے اعلیٰ ترین ہوٹل سے بھی زیادہ شاندار تھا۔ الزبتھ کو پسند آیا۔ جیک نے کہا۔ ''یہاں ہمارا قیام عارضی ہے، جلد ہم اپنے گھر میں ہوں گے۔''

دو ہفتے بعد وہ شمالی فلوریڈا کے ایک نیم پہاڑی علاقے پہنچے۔ الزبتھ کوچ سے اتری تو اس کے سامنے ایک کشادہ دامن والی پہاڑی تھی۔ اس کے دامن میں اوپر تک نارنگی اور اسٹرابیری کے باغ پھیلے ہوئے تھے اور سب سے اوپر سفید رنگ کا خوب صورت ولا تھا۔ جیک نے اشارے سے کہا۔ ''وہ ہمارا گھر ہے۔ ابھی تم دیکھو گی اس کے عقب میں سمندر ہے۔''

مگر الزبتھ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر جیک کے شانے پر رکھ دیا۔ ''اب میرا گھر یہ ہے۔''

تعلقات میں رخنہ انداز ہونے والے نامعلوم محرکات کی حیلہ سازی۔

کبھی کبھی بات معمولی ہوتی ہے... اور کسی بڑے سانحے کا باعث بن جاتی ہے... ایک ایسے ہی خاندان کے گرد گھومتی کہانی... جو دولت و ثروت میں انتہا پر تھے... مگر خوشیوں... اطمینان... اور اپنائیت کے باوجود کچھ تھا جو اُن کے درمیان پروان چڑھ رہا تھا...

نامعلوم محرک

تنویر ریاض

ٹیڈ اس خاندان کو نہیں جانتا تھا لیکن اُن کے بارے میں کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کے درمیان کوئی غلط تعلق ہے۔ اس نے سر کو جھٹک کر سوچا کہ جو کچھ بھی ہے وہ بعد میں سامنے آجائے گا۔ شاید ٹینی لوپ ان کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ اس دوران اس نے نظریں گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید وہاں اس کی جان پہچان کے اور لوگ موجود ہوں لیکن ان [illegible] لوگوں میں ایسا کوئی نہیں تھا۔ عطیات [illegible] کی فلاحی تنظیم

نے مارتھازونی یارڈ میں واقع اوک بلفز کے وسیع و عریض لان میں ایک بڑا خیمہ لگایا تھا۔ سرسبز و شاداب لان کے ایک طرف خوب صورت وکٹورین طرز کے گھر نظر آرہے تھے۔ ان میں چند ایک میں کئی نسلوں سے ایک ہی خاندان آباد تھا۔ دوسری جانب سمندر تھا اور ساحل پر ان دولت مندوں کو نیویارک اور بوسٹن سے لانے والی خوب صورت کشتیاں اور بھاری فیری بوٹس کھڑی ہوئی تھیں۔

اس استقبالیہ میں شرکت کے لیے ایک بڑی رقم کا چیک لکھنا ضروری تھا اور ٹیڈ کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ تو کسی مہمان کا مہمان تھا۔ لہٰذا وہ صرف دوسرے لوگوں کو دیکھنے کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ چند منٹ بعد پینی لوپ بھی وہاں آگئی اور اس کے گال پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔

''معاف کرنا مجھے آنے میں دیر ہوگئی۔ وہ میری ایک بڑے چیک کے ساتھ تصویر بنانا چاہ رہے تھے۔ جہاں صرف عطیہ دینا ہی کافی نہیں بلکہ آپ کو اس بڑے چیک کے ساتھ تصویر بھی بنوانا ہوتی ہے۔''

ٹیڈ جانتا تھا کہ استقبالیہ میں شرکت کے لیے کم از کم پانچ ہزار ڈالر عطیہ دینا ضروری ہے اور پینی لوپ جیسے کئی لوگوں نے اس سے بھی کہیں زیادہ رقم دی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بات نہیں، میں مفت میں ملنے والے مشروبات سے دل بہلا رہا تھا۔''

''سستی شیمپین اور اورنج جوس تمہیں خوش کرنے کے لیے کافی ہے۔'' وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔ وہ وہاں سے روانہ ہونے کا ارادہ کررہے تھے کہ بلیزر میں ملبوس ایک شخص چہرے پر مسکراہٹ سجائے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتا ہوا ان کے پاس آیا۔ وہ مارتھازونی یارڈ چیمبر آف کامرس کا ڈائریکٹر تھا۔

''مس ٹولفورڈ۔'' اس نے پینی لوپ سے گرم جوش انداز میں مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس فیاضانہ عطیہ دینے پر تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں ذاتی طور پر تمام عطیہ دینے والوں سے ملنا چاہ رہا ہوں۔'' پھر وہ ٹیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری ٹیڈ سے ملاقات ہوگئی۔ کیا اس نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟ اس نے بوسٹن بزنس جرنل میں جزیرہ کی مارکیٹ کے بارے میں ایک زبردست مضمون لکھا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں ٹیڈ۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہوگیا۔ شاید یہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا ہو کہ ٹیڈ جیسا بزنس جرنلسٹ کس طرح اس استقبالیہ میں شرکت کرسکتا ہے۔

''دراصل میں اور ٹیڈ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔'' پینی لوپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس موسم گرما میں وہ میرے ساتھ ایسٹ چوپ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا ہے۔''

''اوہ۔'' ڈائریکٹر نے کہا۔ ''میں تم دونوں کو جانتا ہوں اور میں نے ہمیشہ تمہیں ایک جوڑا ہی سمجھا۔''

''نہیں، ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' پینی لوپ بولی۔

''یہ کچھ پیچیدہ معاملہ ہے۔'' ٹیڈ نے کہا۔

ڈائریکٹر نے مناسب سمجھا کہ ان کا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ اس نے ان دونوں کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پینی لوپ بولی۔ ''یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک کے سامنے اس تعلق کو واضح کرنے کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں۔''

''میں ایک صحافی ہوں اور سچ پر یقین رکھتا ہوں۔'' ٹیڈ نے کہا اور پینی لوپ اسے گھورنے لگی۔

''روانہ ہونے سے پہلے میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہ رہا ہوں۔'' ٹیڈ بولا۔ ''اس فیملی کو دیکھو۔ کیا تم انہیں جانتی ہو؟''

''نہیں، یہ جانے پہچانے لوگ نہیں ہیں۔ شاید کسی دوسری جگہ سے آئے ہیں۔''

''میں کسی معمے کی طرح ان کے رشتوں کو حل کرنے کی کوشش کررہا ہوں اور کوئی بات مجھے پریشان کررہی ہے۔'' وہ جانتا تھا کہ پینی اس کوشش کی مخالفت نہیں کرے گی۔

پینی نے اس گروپ کی طرف دیکھا۔ وہ پانچ افراد تھے۔ تین مرد اور دو عورتیں۔ ٹیڈ نے عمر رسیدہ شخص کو خاندان کا سربراہ قرار دے دیا۔ اس کی عمر ستر کے قریب تھی۔ مضبوط جسم اور چوڑا سرخ چہرہ، لگ رہا تھا کہ وہ ماحول سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہا ہے۔

''دوسرا مرد واضح طور پر اس کا بیٹا ہے۔'' پینی لوپ نے کہا۔ اس کی جسامت اور چہرے کے نقوش بوڑھے سے ملتے جلتے تھے۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا تھا اور کافی بور بلکہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ ''البتہ دونوں عورتوں کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔''

ریا کہ عمر رسیدہ عورت کو پہلے میں اس بوڑھے کی بیٹی

سمجھ رہا تھا۔'' ٹیڈ نے کہا۔'' وہ اس کے بیٹے سے عمر میں بڑی ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ البتہ وہ شکل صورت اور جسامت کے لحاظ سے بالکل مختلف ہے۔''

ٹیڈ نے اپنی رائے اس وقت تبدیل کر لی تھی جب اس نے دیکھا کہ وہ عورت بوڑھے کو بار بار والہانہ انداز میں چھو رہی تھی۔ کبھی اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتی۔ کبھی اس کی کمر کے گرد بازو ڈال دیتی۔ اس سے اس نے نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اس بوڑھے کی دوسری بیوی ہو سکتی ہے۔

وہ ایک خوش شکل عورت تھی جو جوانی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی متناسب جسم کی مالک اور بنی سنوری تھی۔ اس کے سیاہ چمک دار بال بڑے اچھے طریقے سے سنورے ہوئے تھے اور مشاق ہاتھوں نے اس کا میک اَپ کیا تھا۔

''اس نے قیمتی لباس پہن رکھا ہے جو اس کے جسم کے لیے مناسب ہے۔'' پینی لوپ نے کہا۔'' اسے لباس پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ اب نوجوان لڑکی کی بات کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم نے بھی یہاں موجود دوسرے مردوں کی طرح پہلے اسے ہی دیکھا ہوگا۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''بالکل۔ اس کے بال بھی دوسری عورت کی طرح سیاہ ہیں لیکن چہرے کے نقوش قدرے مختلف ہیں۔ سیاہ آنکھیں جن سے اجنبیت جھلکتی ہے اور گول چہرہ۔ وہ تھوڑی سی تنہائی پسند لگتی ہے۔'' ٹیڈ کا اندازہ تھا کہ شاید وہ اس عمر کو پہنچ گئی ہو کہ اسے ڈرنک کرنے کی اجازت مل سکے۔ اس کا لباس بھی پرانی اشیا کی دکان سے خریدا ہوا لگتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ بیس ڈالر کا ہوگا لیکن وہ اس میں بھی اچھی لگ رہی ہے۔'' پینی لوپ نے کہا۔

ٹیڈ ان دونوں عورتوں کے مابین تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن پینی لوپ نے اندازہ لگانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور بے ساختہ بول پڑی۔''ماں، بیٹی'' پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''اس طرح صرف ماں، بیٹی ہی بات کر سکتی ہیں۔ اب صرف نوجوان شخص باقی رہ گیا۔ کیا وہ بڑی عمر کی عورت کا بیٹا ہے۔ دیکھنے میں بہت فرمانبردار لگ رہا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' ٹیڈ نے متفق ہوتے ہوئے کہا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے دونوں کا تجزیہ کیا اور بولا۔'' وہ اس کی خدمت کر رہا ہے اور خندہ پیشانی سے اس کی مسکراہٹ وصول کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس کی بیٹی کا بوائے فرینڈ ہے اور بارن کو خوش کر کے اس کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

ایک منٹ بعد ہی ان کی بات درست ثابت ہو گئی جب اس لڑکے نے اپنا بازو لڑکی کی کمر کے گرد ڈال دیا لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب سب کچھ واضح ہو گیا تھا۔ اس فیملی میں وہ بوڑھا مرد، اس کی دوسری بیوی، بیٹا، اس عورت کی بیٹی اور اس کا بوائے فرینڈ شامل تھے۔

''یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم ان کے بارے میں اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے۔'' ٹیڈ نے کہا لیکن اب بھی کوئی بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے سر جھٹکا اور پینی لوپ کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر انہوں نے رات کے کھانے کے لیے چکن ٹکس اور سبز پھلیاں خریدیں۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ فیملی ان کے دماغ سے نکل چکی تھی۔ کھانے کے بعد کچھ دیر وہ ٹیرس پر بیٹھ کر ساحل کا نظارہ کرتے رہے پھر اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔

پینی لوپ صبح جلدی اٹھنے کی عادی تھی۔ آٹھ بجے جب ٹیڈ نیچے آیا تو کافی تیار ہو چکی تھی۔ ٹیڈ نے ہمیشہ کی طرح اس کے خوب صورت جسم، گہری سیاہ آنکھوں اور دلکش چہرے کی تعریف کی۔ جواب میں پینی نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا اور بولی۔''میں ابھی آج کا اخبار پڑھ رہی تھی اور اس سے مجھے اس فیملی کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئی ہیں جس کا تذکرہ ہم گزشتہ روز کر رہے تھے۔ ان کی تصویر بھی اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ اس بوڑھے کا نام رائے بارکن ہے اور وہ انتہا دولت مند ہے۔ گزشتہ شب اس کا مارتھاز ونی یارڈ کے اسپتال میں انتقال ہو گیا۔''

''وہ رائے بارکن تھا؟'' ٹیڈ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''خبر کے مطابق وہ انجینئر اور موجد تھا۔ اس حوالے سے اس کا نام جانا پہچانا ہے۔'' اس نے اخبار پر نظر ڈالی اور وضاحت کرتے ہوئے بولی۔''اس نے خصوصی طور پر الیکٹرانک سرکٹ ایجاد کیے تھے جن کے ذریعے ویب سائٹ کے سرور کو جوڑا جاتا ہے۔ خبر کے مطابق اس کی موت رات دس بجے الرجی کے شدید ردعمل سے ہوئی۔ اس بارے میں مزید تفصیلات نہیں بتائی گئیں لیکن پولیس کئی نامعلوم پہلوؤں کی بنیاد پر اس کی موت کی تحقیقات کر رہی ہے۔''

''انہیں دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے۔'' ٹیڈ نے کہا۔'' ہم ان کے بارے میں مذاق کر رہے تھے لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس خانے میں فٹ نہیں

ہو رہی تھی۔''

اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولتے ہوئے کہا۔ ''میرا ایک دوست دولت مند لوگوں کو کور کرتا ہے۔ وہ مجھے اس بارے میں تفصیل بتا سکتا ہے۔ ویسے بھی وہ میرا احسان مند ہے۔ میں نے بھی اس کی کئی مرتبہ مدد کی ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے دوست کو ای میل کر دی اور خود پر تگیز سویٹ رول گرم کرنے لگا جو وہ اور پینی لوپ گزشتہ شام لے کر آئے تھے۔ کچھ دیر بعد اسے ای میل کا جواب موصول ہو گیا۔ اس کے دوست نے ہمیشہ کی طرح شگفتہ انداز اختیار کرتے ہوئے لکھا تھا۔

''ٹیڈ، کاش میری بھی کوئی دولت مند گرل فرینڈ ہوتی جس کے ساتھ پورے جزیرے پر گھوما کرتا۔ اپنے طور پر کچھ نہیں بتا سکتا لیکن تم گزشتہ روز وہاں موجود تھے۔ میں نے ایک آرٹیکل لکھا ہے جو اس کے ہمراہ منسلک ہے۔ کیا تم اس میں کچھ اضافہ کر سکتے ہو۔ ابھی یہ شائع نہیں ہوا ہے۔ خوش رہو اور مزے کرو۔''

''کیا خبر ہے؟'' پینی لوپ نے پوچھا۔ اب اسے بھی کچھ تجسس ہو گیا تھا۔

''اس نے ایک آرٹیکل بھیجا ہے۔ وہ کھول رہا ہوں۔'' ٹیڈ نے کہا اور اسے پڑھنے کے بعد پینی لوپ کو بتایا۔

''فرائے ہارکن کی عمر اکہتر سال تھی۔ اس کی پہلی بیوی کئی سال قبل انتقال ہو چکا تھا اور اس نے گزشتہ برس ایلینا مارٹ سے دوسری شادی کر لی جو صرف چالیس سال کی ہے جبکہ ہارکن کا بیٹا تیس سال کا ہے۔ اس عورت کی پہلے شوہر سے ایک اکیس سالہ لڑکی بھی ہے۔ وہ گزر اوقات کے لیے مختلف کام کرتی رہی۔ وہ بوڑھے مردوں سے شادی کر لیتی اور ان کے مرنے کے بعد دوسرا شوہر تلاش کر لیتی۔ اس طرح اسے مرنے والے کے ترکہ میں سے اچھا خاصا حصہ مل جاتا تھا۔ ہارکن اس کا حالیہ شکار تھا اور ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ اس پر بری طرح فدا تھا۔

''گویا اس نے دولت کی خاطر اسے مار دیا؟'' پینی بولی۔ ''کیسی فضول بات ہے؟''

''اس کہانی کا دلچسپ حصہ آگے آئے گا۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''شادی سے پہلے ان کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ طلاق یا ہارکن کے مرنے کی صورت میں ایلینا کو دس لاکھ ڈالر ملیں گے اور ذاتی استعمال کی اشیا اس کی ملکیت تصور کی جائیں گی اور شادی کی دسویں سالگرہ پر ایک کروڑ ڈالر ہو جائیں گے۔''

''اس سے تو اسے یہ ترغیب ملتی ہے کہ اس کا شوہر زیادہ سے زیادہ دیر تک زندہ رہے۔ تاوقتیکہ شادی کو دس سال نہ ہو جائیں۔'' پینی لوپ نے کہا۔ ''صرف دس لاکھ ڈالر کے لیے وہ اپنے شوہر کو قتل نہیں کر سکتی۔ ویسے جب میں ڈسٹرکٹ اٹارنی کی اسسٹنٹ تھی تو میں نے بیس ڈالر کے لیے بھی لوگوں کو قتل کرتے دیکھا ہے لیکن اس جیسی عورت ایسا نہیں کر سکتی جبکہ وہ پہلے ہی پُرآسائش زندگی گزار رہی ہو۔''

پینی لوپ خود ایک اونچے درجے کی وکیل تھی لیکن اب وہ کبھی کبھار ہی کوئی کیس لیتی۔ اس کا زیادہ وقت اپنی سماجی تنظیم کو چلانے میں گزر جاتا تھا۔

''تم جانتی ہو کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟'' ٹیڈ نے پوچھا۔

''ہاں، میں حیران ہوں کہ تم لیفٹیننٹ نارتھم سے کیا معلوم کر سکو گے۔ یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں وہ تم سے نفرت کرتا ہے۔''

''وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتا البتہ شرمندہ ضرور ہے کیونکہ میں نے اسے گزشتہ بار صحیح سمت میں جانے کا اشارہ دیا تھا لیکن اس طرح وہ بعد میں ہونے والی شرمندگی سے بچ گیا۔ میں اسے غسل کرنے کے بعد فون کرتا ہوں۔''

پینی لوپ نے اپنی خوب صورت آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں اور بولی۔ ''میں منافق نہیں ہوں جو تم پر یہ ظاہر کروں کہ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن یہ بھی نہیں چاہوں گی کہ اپنا ایک دن نارتھم کو دے دو۔''

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔'' ٹیڈ نے کہا اور دونوں اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے لیکن جب اگلے روز بھی کوئی خبر نہیں آئی تو ٹیڈ نے کہا کہ اب لیفٹیننٹ سے ملنا ضروری ہو گیا ہے۔ چنانچہ ناشتا کرنے کے بعد وہ دونوں پینی کی سلور مرسیڈیز میں پولیس اسٹیشن کی جانب روانہ ہو گئے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر اوک بلفز کے بالکل باہر ایک خوب صورت عمارت میں واقع تھا اور پہلی نظر میں پولیس اسٹیشن کے بجائے کسی معزز شہری کی رہائش گاہ معلوم ہوتا تھا۔ انہوں نے ڈیوٹی آفیسر کو بتایا کہ ان کے پاس ہارکن کے کیس کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ اس نے فون اٹھایا اور بولا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ نارتھم تم سے مل سکتا ہے یا نہیں۔''

اس دوران پینی لوپ نے ٹیڈ سے سرگوشی میں کہا۔ ''تم نے ابتدا ہی جھوٹ سے کی ہے۔ بہت اچھے جا رہے ہو۔''

آفیسر نے انہیں بالائی منزل پر بھیج دیا جہاں لیفٹیننٹ نارتھم ان کا منتظر تھا۔ اس نے اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر ان کا

استقبال کیا۔ اس کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ ہوگی اور کنپٹی کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

''ٹیڈ، پینی لوپ تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کیس کے بعد ہم کبھی نہیں ملے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ بیٹھو، تمہارے پاس ہارکن کی موت کے حوالے سے کیا معلومات ہیں؟''

''ہاں۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''ہم نے انہیں اس ہفتہ کے شروع میں ایک فلاحی استقبالیہ میں دیکھا اور مجھے یوں لگا......''

''ایک منٹ۔'' نارتھم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، تم نے کہا تھا کہ تمہارے پاس کچھ معلومات ہیں لیکن جو کچھ تم بتانا چاہ رہے ہو وہ محض ایک مفروضہ ہے۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ تمہارے آنے کا شکریہ۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں بہت مصروف ہوں۔''

''تمہیں یہ اعتراف کر لینا چاہیے کہ گزشتہ بار میں نے تمہاری مدد کی تھی ورنہ تمہیں بہت زیادہ شرمندگی ہوتی۔ میں تم سے صرف ان کے پس منظر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا ہوں جو بالکل آف دا ریکارڈ ہوگا۔ اس سے تمہیں کوئی نقصان نہیں بلکہ شاید ہمیں کچھ مدد مل جائے۔''

''تمہیں بھی اس سے مدد مل سکتی ہے۔'' پینی لوپ نے کہا۔ ''ٹیڈ کی نکتہ چینی برداشت کرنے کے مقابلے میں اس کی مدد کرنا زیادہ آسان ہوگا۔''

لیفٹیننٹ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''تم کورٹ روم کا راستہ بھول گئی ہو پینی، کیا اسی طرح پولیس کے معاملات میں مداخلت کر کے تم اپنے تعلق کو سنسنی خیز بنانا چاہتی ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے لیفٹیننٹ۔'' پینی نے کہا۔

''بہرحال کچھ بھی ہو۔'' نارتھم نے ایک فائل کھول کر کیس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ ہارکن کا انتقال ماسٹر سوٹ کے باتھ روم میں ہوا۔ اس کی بیوی نے فون کر کے ایمبولینس بلائی اور اسپتال پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی اس کی موت کا اعلان کر دیا گیا۔ جو الرجی کے شدید ردعمل کی وجہ سے ہوئی تھی۔ کئی سال پہلے اسے اخروٹ سے شدید الرجی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے ہر قیمت پر اخروٹ سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ اس بارے میں خاصا محتاط تھا اور کہیں بھی کھانا نہیں کھاتا تھا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ اس میں اخروٹ کی بنی ہوئی کوئی چیز شامل نہیں ہے۔ اس روز بھی اس نے استقبالیہ میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ رات کا کھانا بھی معمول کے مطابق اس کے باورچی نے بنایا۔ اسی سے مجھے شبہ ہوا کہ جو شخص اپنی خوراک کے معاملے میں اتنا محتاط ہو، اسے کس طرح اخروٹ سے الرجی ہو سکتی ہے جس کے نتیجے میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ میں اس کے باتھ روم میں گیا وہاں میں نے دوا دیکھی جو ہائی کولیسٹرول کے مریضوں کے لیے عام دوا ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ اس نے شام کو گولی لے لی تھی۔ میں نے وہ گولیاں لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھجوائیں۔ اس کی رپورٹ چند گھنٹے پہلے ہی ملی ہے۔ اس کے مطابق کسی نے گولیوں کی شیشی میں چند قطرے اخروٹ کے تیل کے ڈال دیے تھے۔''

وہ پیچھے کی جانب جھکا اور اپنے مہمانوں کے چہروں پر حیرانی دیکھ کر مطمئن ہو گیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''سب لوگ اس الرجی کے بارے میں جانتے تھے

معمول

ایک خاتون نے انڈی کیٹر دیے بغیر ایک طرف کار موڑ دی اور پیچھے سے آتی ہوئی ایک کار ان کی کار سے ٹکرا گئی۔ پچھلی کار کا ڈرائیور اتر کر آیا اور غصے سے بولا۔

''اگر آپ کو اس طرف مڑنا تھا تو آپ نے انڈی کیٹر کیوں نہیں دیا؟''

وہ خاتون خفگی سے بولیں۔ ''اس میں انڈی کیٹر دینے کی کیا بات ہے؟ میں برسوں سے یہ موڑ مڑتی آ رہی ہوں۔''

نہانے کا بل

ملازم: (ہوٹل منیجر سے) ''جناب اوپر کا مسافر شکایت کر رہا تھا کہ رات میں چھت اس قدر ٹپکی کہ وہ [illegible] سے پاؤں تک نہا گیا۔''

منیجر: ''ٹھیک ہے اس کے بل میں نہانے کے پیسے بھی شامل کر لو۔''

سلوک

گڈو: ''ایک خاتون نے اپنے اکلوتے بیٹے سے سوال کیا۔ ''تمہاری نئی آیا تمہیں کیسی لگی؟''

گڈو میاں نے [illegible] جواب دیا ''آیا مجھے تو کوئی اچھی نہیں لگتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ میں ان کے ساتھ وہی سلوک کروں جو ڈیڈی ان کے ساتھ کرتے ہیں۔''

''تمہارے ڈیڈی ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟''

''ڈیڈی ان کا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔'' گڈو میاں نے جواب دیا۔ ''پھر اسے اٹھا [illegible] بیٹھ جاتے ہیں۔''

اٹک سے عبدالغفور خان [illegible] کا تحفہ

اور انہیں معلوم تھا کہ وہ کولیسٹرول کی دوا لیتا ہے۔ گھر کے کسی بھی فرد کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ دواؤں کا کیبنٹ کھول کر اس شیشی میں چند قطرے ڈال دے لیکن اس پر ہارکن کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات نہیں ہیں۔ اب یہ معلوم کرنا ہے کہ گھر کے کس فرد نے یہ کام کیا اور کیوں؟ اس چھوٹی سی فیملی کے لوگوں کے بیک گراؤنڈ کی بات ہے تو تم ایلینا ہارٹ کے بارے میں پہلے سے جانتے ہو اور تمہیں ان دونوں میاں بیوی کے بیچ شادی سے پہلے ہونے والے معاہدے کا بھی علم ہے لیکن ہم دوسرے لوگوں کے ماضی کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔'' اس نے فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔

''لارا ہارٹ سے شروع کرتے ہیں۔ اس کی عمر اکیس سال ہے لیکن اس نے سولہ سال کی عمر میں ہی کلب جوائن کر لیا تھا۔ اس کے ریکارڈ میں کچھ واقعات کم عمری میں شراب نوشی کے حوالے سے ہیں پھر اس نے میری جونا، پینا شروع کر دی۔ انیس سال کی عمر میں اس کے پاس سے منشیات برآمد ہوئی۔ کچھ عرصے حوالات میں رہی پھر اسے لازمی کونسلنگ کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اب اس کا ریکارڈ صاف ہے۔''

''مسٹر ہارکن کے اپنے مسائل تھے۔'' نارتھم اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دو سال قبل آئی آر ایس نے ان کے ساتھ کاروبار ختم کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ انہیں شکایت تھی کہ ہارکن کی کمپنی مناسب انداز میں مالی معاملات نہیں نمٹا رہی۔ اس کے نتیجے میں ہارکن کی کمپنی کو ڈھائی لاکھ ڈالر سود اور جرمانہ کی مد میں ادا کرنا پڑے۔''

''اتنی بڑی کمپنی کے لیے یہ رقم پارکنگ ٹکٹ کے برابر ہے۔'' ٹیڈ نے کہا۔

''لیکن مسٹر ہارکن سخت برہم اور پریشان تھے۔ یہاں تک کہ جب ان کے وکیلوں نے کہا کہ وہ خاموش ہو جائیں اور چیک لکھ دیں۔ اس وقت بھی وہ اپنے کانگریس مین کو خط لکھ رہے تھے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔''

نارتھم نے فائل کا ایک صفحہ پلٹا اور بولا۔ ''اور اس کے بیٹے کے ساتھ تو ٹیکس مسائل سے بھی زیادہ خطرناک کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ جونیئر ہارکن۔ عمر چھبیس سال، ایم آئی ٹی گریجویٹ، ایک ذہین کمپیوٹر سائنس داں، غیر شادی شدہ لیکن چار سال پہلے......'' لیفٹیننٹ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر بولا۔ ''کیا تمہیں لنڈی اور بلیا کا کیس یاد ہے؟''

ممی لوپ بولی۔ ''اسے کرڈ پٹی میڈم کہا جاتا تھا۔ بہت مہنگی کال گرل تھی اور اس کے گاہکوں میں امیر ترین لوگ شامل تھے۔''

''اٹارنی جنرل کے دفتر سے مجھے آف دا ریکارڈ معلوم ہوا ہے اور میں تم دونوں پر بھروسا کرتے ہوئے بتا رہا ہوں کہ جونیئر کا نام اس کے گاہکوں کی فہرست میں شامل تھا۔ دولت مند اور طاقت ور لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ایسی فہرست کبھی منظرِعام پر نہیں آئے گی لیکن وہ ایک اچھا گاہک تھا۔''

''اور آخر میں بات کرتے ہیں لارا کے بوائے فرینڈ پیٹر کیفرٹی کی۔ اس کی عمر تیئس سال ہے۔ جب میں نے اس سے بات کی تو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ ان کے درمیان اتنا گہرا تعلق ہے۔ اس کی ابتدا چھ ماہ قبل ہوئی۔ اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان کے خاندانی کاروبار کے لیے مارکیٹنگ منیجر کا کام کر رہا ہے اور ایم بی اے کا پارٹ ٹائم طالب علم بھی ہے لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لارا کے اردگرد منڈلانے میں صرف کرتا ہے اور وہ ایک بُرا لڑکا ہوا کرتا تھا۔''

لیفٹیننٹ نے کہانی کا بہترین حصہ آخر کے لیے بچا رکھا تھا۔ ''جب وہ کالج میں تھا تو اس پر ایک ایسی عورت کا پیچھا کرنے کا الزام تھا جو اس میں بالکل بھی دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی زیادہ تر تفصیلات کالج کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ مجھے وہ کافی بے ہودہ معلوم ہوئیں۔ اس کے نتیجے میں اسے ایک سیمسٹر پہلے کالج چھوڑنا پڑ گیا اور وہ سفر پر نکل پڑا لیکن اس کے بعد اس کی کوئی بات نہیں سنی گئی اور نہ ہی لارا سے کبھی کوئی جھگڑا ہوا۔''

لیفٹیننٹ نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے ٹکائی اور بولا۔ ''کسی نے کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی کچھ سنا۔ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو اور مجھے بتاؤ کہ یہ کس نے کیا ہے؟''

چند لمحے وہ سب خاموش رہے پھر ممی لوپ بولی۔ ''کیونکہ بیوہ کو شوہر کے مرنے سے کچھ زیادہ ملنے کا امکان نہیں تھا۔ اس لیے میرے اندازے کے مطابق بیٹا ہی سب سے زیادہ مشتبہ ہو سکتا ہے۔ اسے اندیشہ ہوگا کہ اس کا باپ اپنی دوسری بیوی پر بے تحاشا خرچ کرنا شروع کر دے گا۔ ویسے بھی اس کے باپ کو اس الرجی کے سوا کوئی بیماری نہیں تھی لہٰذا وہ اس کی طبعی موت کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔''

لیفٹیننٹ نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان حالات میں کوئی دیوانہ ہی اپنے باپ کو قتل کر سکتا ہے کیونکہ دونوں باپ بیٹے مل کر کام کر رہے تھے اور ان کی کمپنی کا بیشتر حصہ پہلے ہی جونیئر کے

کنٹرول میں تھا۔ اس کے علاوہ اگر ہارکن کے ریکارڈ پر نظر ڈالی جائے تو ایسی کوئی فضول خرچی نظر نہیں آئی جو بیٹے کے لیے پریشانی کا باعث ہو۔''

ٹیڈ کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ جب تم نے ہارکن ہاؤس کے مکینوں سے بات کی ہوگی تو ان کے سابقہ پس منظر کو بھی کھنگالا ہوگا۔''

لیفٹیننٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میں بھی تمہاری طرح اس بارے میں متجسس تھا اور یہ سب کچھ مجھے بہت دلچسپ لگا۔ لارا اپنے اوپر لگنے والے الزامات سے اکتا چکی تھی اور اس نے کوئی معذرت کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ بولی۔ کئی سال پہلے چند گولیاں لی تھیں لیکن بحالی پروگرام کے بعد منشیات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ جونیئر نے نکس معاملات پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور بولا کہ اس سلسلے میں اس کے وکیل سے بات کی جائے۔ جہاں تک غیر عورتوں سے تعلق کا الزام تھا تو اس نے بڑا حیران کن جواب دیا جسے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کی سختی سے تردید کر دے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے اور بعض اوقات اسے بھی کام کی زیادتی کے سبب سکون کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔''

پینی لوپ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''گویا وہ آوارہ مزاج ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ قاتل ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس لڑکے نے بھی اپنے اوپر لگنے والے الزام کی تردید کی ہوگی۔ کوئی بھی شخص ایسی باتوں کا اعتراف نہیں کیا کرتا۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' لارتھم بولا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی اس کی سابقہ گرل فرینڈ تھی جس سے اس نے تعلق ختم کر لیا تھا جس پر اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر انتقاماً مجھ پر تعاقب کرنے اور اسے تنگ کرنے کا الزام لگایا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر میں نے اس بات کا چرچا کیا تو وہ پولیس پر دعویٰ کر دے گا۔ اب ہم لوگ مسٹر ہارکن کے کاروباری تعلقات کا جائزہ لے رہے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہوگا کہ باہر کا کوئی فرد کسی کے علم میں آئے بغیر ہارکن کے مکان میں داخل ہوا اور اپنا کام کر کے چلا گیا جو بظاہر ناممکن بات ہے۔''

پینی لوپ نے کہا۔ ''ایک سابق سرکاری وکیل کے طور پر وہ اس کے بیٹے کو مجرم ٹھہرانے کی کوشش نہیں کر سکتی کیونکہ قتل کا کوئی محرک ہے اور نہ ہی کوئی ثبوت۔''

''میرا خیال ہے کہ تم اب تک کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہو گے۔'' ٹیڈ لیفٹیننٹ نے کہا۔

ٹیڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''پوری طرح نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ وہ شاید یہاں زیادہ لوگوں کو نہیں جانتے اور مجھے شبہ ہے کہ ان سے تعزیت کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ ایسی صورت میں ہم اگر وہاں جائیں تو وہ ہمارا خیر مقدم کریں گے۔''

لیفٹیننٹ نے قہقہہ لگاتے ہوئے ان کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا لیکن سیڑھیاں اترتے ہوئے پینی لوپ نے بحث شروع کر دی۔ ''ہم پہلے کبھی ان سے نہیں ملے۔ اس طرح کیسے وہاں جا سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ ہارکن کے اثاثوں کی مالیت نصف ارب ڈالر ہے۔ اس لحاظ سے وہ تمہارا خاندان ہی ہوا۔''

''گویا تم نے یہ فرض کر لیا کہ سارے کروڑپتی ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔''

''اگر نہیں تو انہیں جاننا چاہیے۔'' ٹیڈ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''تم جانتی ہو کہ ہارکن کی بیوہ اپنی دولت اور پوزیشن کے بارے میں پریشان ہوگی۔ میں نہیں سمجھتا کہ جونیئر اپنی سوتیلی ماں کی حمایت کرے گا۔ تم جیسی دولت مند عورت کے جانے سے اسے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔''

''تمہاری بات میں وزن ہے۔'' پینی لوپ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ تم گاڑی چلاؤ اب تک میں کوئی بہانہ سوچتی ہوں۔''

ہارکن فیملی، چل ہارکیٹ کے علاقے میں رہتی تھی جہاں دولت مند لوگوں کی رہائش تھی۔ ان کا مکان ایک پہاڑی سے متصل تھا اور وہاں سے ساحل چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ گیرج میں صرف دو کاریں کھڑی ہوئی تھیں جس سے ٹیڈ کا اندازہ درست ثابت ہوا کہ وہاں کوئی دوسرا مہمان موجود نہیں تھا۔ انہوں نے گھنٹی بجائی تو لارا نے دروازہ کھولا۔ اس وقت بھی اس نے پرانے کپڑوں کی دکان سے خریدا ہوا سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ ٹیڈ دل ہی دل میں اس کی خوب صورتی کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا رنگ صاف اور نقوش متناسب تھے۔ البتہ پینی لوپ اس سے زیادہ متاثر نہیں ہوئی۔ اس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

''میرا نام پینی لوپ ڈلفورڈ ہے اور میں اس فیملی کو مختلف سماجی حلقوں کے حوالے سے جانتی ہوں۔ یہ میرا دوست ٹیڈ جیلیک ہے۔ میں مسٹر ہارکن کی بیوی اور بیٹے

سے تعزیت کرنے آئی ہوں۔"

"اوہ۔" لارا کے انداز میں حیرانی تھی پھر وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔ "رائے میرا سوتیلا باپ تھا۔ میرا خیال ہے کہ مما اور جونیئر یہیں کہیں ہیں۔ بہرحال تم لوگ اندر آجاؤ۔"

گھر بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا جس سے مکینوں کے ذوق کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ لارا نے انہیں کاؤچ پر بٹھایا اور مشروب کی پیشکش کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔

"میں مام یا جونیئر کو دیکھتی ہوں۔" لارا نے کہا۔ اسی وقت پیٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے خاکی شارٹس اور سرخ رنگ کی پولو شرٹ پہن رکھی تھی اور اس حلیے میں بالکل لڑکا لگ رہا تھا۔

"پیٹر یہ مہمان خاندانی دوست ہیں اور اظہارِ تعزیت کے لیے آئے ہیں۔"

"تمہاری ماں اپنے کمرے میں ہے۔ میں نے ابھی اس سے پوچھا تھا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ جونیئر اسٹڈی میں ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔"

لارا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مام کو بتا دو کہ مس ٹولفورڈ اور مسٹر ٹیڈ آئے ہیں۔"

"ضرور۔" اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"گو کہ بہت کم عرصے کے لیے مسٹر ہارکن سے تمہارا تعلق رہا۔ اس کے باوجود مجھے تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔" ٹیڈ نے کہا۔

"تمہارا شکریہ۔ وہ ہمارے ساتھ بہت اچھے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ اس گھر اور بوسٹن کے ٹاؤن ہاؤس میں رہنا اچھا لگا۔ کیا تمہارا تعلق نیویارک سے ہے۔ ممکن ہے کہ ہم واپس وہیں چلے جائیں لیکن میں چاہ رہی ہوں کہ مما اسپین چلیں۔ وہ سستی جگہ ہے اور وہاں تفریح کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔"

"اسپین کے بارے میں پیٹر کی کیا رائے ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ اسے اپنے کام پر جلد ہی واپس جانا ہوگا۔"

اسی وقت پیٹر بھی ایلینا کو لے کر آگیا۔ وہ اس کے بازو پر جھکی ہوئی تھی اور وہ ایک دوسرے کے بے حد قریب تھے۔ ٹیڈ نے آپ کے باوجود اس کے چہرے سے عمر کا اندازہ لگایا تھا لیکن اس وقت وہ سوگ میں تھی اور اس نے چہرے پر میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ دونوں کھڑے ہوگئے اور پینی لوپ بولی۔ "تمہیں شاید یاد نہ ہو۔ میں تمہارے مرحوم شوہر اور تم سے بوسٹن کی ایک فنڈ ریزنگ تقریب میں مل چکی ہوں۔ میرا نام پینی لوپ ٹولفورڈ ہے اور یہ ٹیڈ جیلینک ہے۔"

"تمہارے آنے کا بہت بہت شکریہ۔" وہ ان سے مل کر واقعی شکر گزار لگ رہی تھی۔ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے جبکہ لارا اور پیٹر پہلے ہی وہاں سے جا چکے تھے۔

"ہمارے زیادہ تر دوست بوسٹن میں ہیں لیکن یہاں ایسے حالات..... اس کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے بیگ میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "امید ہے کہ تم کچھ خیال نہیں کرو گے۔ میں برسوں پہلے سگریٹ چھوڑ چکی ہوں لیکن اس وقت مجھے اس کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک طویل کش لے کر دھواں چھوڑ دیا۔ پینی لوپ کو سگریٹ نوشی پسند نہیں تھی لیکن وہ اس سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اپنے گھر میں سگریٹ نوشی نہ کرے۔ ایلینا نے ادھر ادھر دیکھا اور اچانک اس کی نظریں پینی لوپ پر جم گئیں۔ اس نے کہا۔ "تمہارے باپ کا نام بھی ٹولفورڈ تھا جو رئیل اسٹیٹ ڈیولپر اور بہت انسان دوست تھے۔"

"ہاں اب میں فیملی فاؤنڈیشن کی سربراہ ہوں۔" پینی لوپ نے کہا۔ "اس کے علاوہ دوسرے شہروں اور جزائر میں فلاحی کاموں میں حصہ لیتی ہوں۔ میں نے تمہیں اس ہفتے کے شروع میں ہونے والے استقبالیے میں دیکھا تھا لیکن بات کرنے کا موقع نہ مل سکا۔"

"شاید ہم بھی نیویارک واپس چلے جائیں گو کہ لارا اسپین جانے پر اصرار کر رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کا خیال درست ہو لیکن مجھے وہاں زبان کا مسئلہ ہو سکتا ہے۔ کیا مجھے وہاں اس سلسلے میں کوئی مدد مل سکے گی۔"

اس نے سگریٹ کا ایک اور طویل کش لیا اور بولی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم کیا سوچ رہی ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ دوسرے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ میں نے ایک مختلف زندگی گزاری ہے جس میں میرے فیصلے اور میری قسمت بھی شامل ہو لیکن جس مرد کے ساتھ رہی، اس سے ہمیشہ وفاداری کی۔ میں رائے کی اچھی اور محبت کرنے والی بیوی تھی۔"

"تمہارے حقیقی دوست سچائی کو جانتے ہیں۔" ٹیڈ نے کہا۔

اس نے تائید میں سر ہلایا اور مسکراتے ہوئے بولی۔

’’تمہارا شکریہ۔‘‘
’’میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں فیملی کا بھی سہارا ہوگا۔‘‘

’’بچے مجھ پر بہت مہربان ہیں۔‘‘ ایلینا نے کہا اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ’’لارا اور پیٹر آپس میں کافی گھل مل گئے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس طرح لارا کی زندگی میں کچھ ٹھہراؤ آجائے گا۔ طویل رفاقت سے کسی شخص کی زندگی بدل سکتی ہے۔‘‘ اس نے نیڈ اور بینی لوپ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’جس طرح تم دونوں نظر آرہے ہو۔‘‘

’’دراصل ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے۔‘‘ بینی بولی۔

’’ابھی یہ معاملہ الجھا ہوا ہے۔‘‘ حسب معمول نیڈ نے جملہ کسا۔

اس سے پہلے کہ بینی لوپ کچھ کہتی۔ جونیئر کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نیوی بلیو رنگ کی پتلون اور سفید قمیص پہن رکھی تھی۔ اس نے آتے ہی کہا۔ ’’معاف کرنا، مجھے کچھ دیر ہوگئی۔ کبھی کبھی کاروباری گفتگو زیادہ ہی طویل ہوجاتی ہے۔‘‘

ایلینا نے سگریٹ بجھایا اور بولی۔ ’’اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دیر آرام کرنا چاہوں گی۔‘‘

’’بالکل۔‘‘ جونیئر بولا۔ ’’اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا۔‘‘ اس کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ محض رسماً یہ کہہ رہا ہے۔ ایلینا کے جانے کے بعد وہ بولا۔ ’’تم لوگوں کے آنے کا شکریہ۔ دراصل ڈیڈی نے اسی سال یہ مکان خریدا تھا۔ لہٰذا ہماری یہاں زیادہ لوگوں سے واقفیت نہیں ہے۔ کیا میں تمہارے لیے کوئی مشروب منگواؤں؟‘‘

’’نہیں شکریہ۔‘‘ نیڈ نے کہا۔ ’’ہم زیادہ دیر نہیں رکیں گے۔ ہم تو صرف تمہاری سوتیلی ماں اور تم سے تعزیت کرنے آئے تھے۔‘‘

’’سوتیلی ماں!‘‘ اس نے مصنوعی انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ’’باپ کی زندگی تک وہ میری سوتیلی ماں تھی۔ اب ایسا کیوں ظاہر کررہی ہے۔ تم اس کے ماضی سے تو واقف ہوگے۔‘‘ ایلینا کی طرح وہ بھی اپنے دل کا غبار نکالنا چاہ رہا تھا۔ تاہم اس کے لہجے میں کوئی بغض نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

’’میں اسے الزام نہیں دیتا۔ اس نے ڈیڈی کی زندگی میں خوشیاں بکھیر دیں۔ اگر وہ آخری عمر میں ڈیڈی کی دوسری بیوی بننا چاہ رہی تھی تو مجھے کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مجھے بتاؤ کہ تم دونوں میں سے کس کا پولیس سے کوئی تعلق ہے؟‘‘

کیونکہ لگ رہا تھا کہ وہ لیفٹیننٹ مجھے اور ایلینا کو مشتبہ لوگوں کی فہرست میں شامل کرنا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کوئی نہیں ہوسکتی۔‘‘

جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ وہ اجنبیوں سے گفتگو کررہا ہے۔ وہ تھوڑا سا شرمندہ نظر آنے لگا۔ ان کی روانگی کا وقت قریب آگیا تھا۔ ویسے بھی نیڈ کا کام ختم ہوچکا تھا۔ وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

’’جانتا ہوں کہ تم بہت مصروف ہو۔ اس لیے اب ہمیں اجازت دو۔‘‘ انہوں نے ایک بار پھر اس سے تعزیت کی۔ جونیئر خاموش کھڑا انہیں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

نیڈ اور بینی لوپ نے آپس میں کوئی بات نہیں کی جب تک کہ وہ کار میں بیٹھ کر کافی دور نہیں آگئے۔ بینی لوپ نے پہل کرتے ہوئے کہا۔ ’’کیا رہا؟‘‘

’’بہت کچھ جان گیا ہوں لیکن ابھی اسے ثابت کرنا باقی ہے۔‘‘

’’کیا جان گئے ہو؟‘‘

’’یہ تمہیں اس وقت بتاؤں گا جب میرے پاس ثبوت ہوں گے۔‘‘ وہ چہرے پر ایک پُراسرار مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔

’’تم میرے ساتھ ذہنی آزمائش کا کھیل کھیل رہے ہو۔‘‘ وہ ناراض ہوتے ہوئے بولی۔

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ’’میرا خیال ہے کہ میرے پاس ثبوت ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ کیا پولیس فون اور پیغامات چیک نہیں کراتی۔‘‘

’’یہ ایک معیاری طریقہ ہے کہ مقتول کے فون کالز کا ریکارڈ چیک کیا جاتا ہے۔‘‘

’’اس کا فون چیک کرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس معاملے کا اس کے کاروبار یا دولت سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے تم مجھے لنچ کرواؤ۔ پھر ہم لیفٹیننٹ نارتھم کے پاس چلتے ہیں۔‘‘

انہیں سرکٹ ایونیو کے ایک ریسٹوران کے باہر پارکنگ میں جگہ مل گئی۔ وہاں کی مچھلی بہت اچھی ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ آلو کے چپس اور لیمن جوس نے لنچ کو پُرلطف بنا دیا۔ کھانے کے دوران انہوں نے اتوار کو ہونے والے بینڈ کنسرٹ، ساحلی تفریح گاہوں اور ٹاؤن کونسل سمیت مختلف موضوعات پر گفتگو کی لیکن ہارکن فیملی کے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

اس دوران وہی آفیسر ڈیوٹی پر تھا جس سے وہ پہلے مل

چکے تھے۔ وہ انہیں دوبارہ وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ٹیڈ نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا لیفٹیننٹ نارتھم موجود ہے۔ میرے پاس اسے بتانے کے لیے ایک بہت ہی دلچسپ کہانی ہے۔''

دوسری صبح کاروں کا ایک قافلہ جگمگاتی سرخ نیلی روشنیوں اور سائرن بجاتے ہوئے چل مارک کو جانے والی سڑکوں پر رواں دواں تھا۔ ان میں ریاستی پولیس، مقامی پولیس اور شیرف آفس کی گاڑیاں شامل تھیں۔ ٹیڈ اور چپی لوپ بھی سلور مرسیڈیز میں اس قافلے کے ہمراہ تھے۔ یہ ایک خصوصی عنایت تھی جو نارتھم نے انہیں عنایت کی۔ بارکن کے ڈرائیووے میں گاڑیاں رک گئیں اور تمام آفیسرز کاروں سے باہر آگئے لیکن صرف لیفٹیننٹ نارتھم ہی ٹیڈ اور چپی لوپ کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھا۔ انہیں دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' جونیئر نے پوچھا۔ اس کے عقب میں بقیہ افراد بھی موجود تھے۔ ایلینا کے ہاتھ میں سگریٹ تھا اور وہ خوفزدہ لگ رہی تھی جبکہ پیٹر کے چہرے پر حیرانی کے آثار تھے اور لارا خوش نظر آرہی تھی جیسے اس کی بوریت دور ہونے کا سامان ہو رہا ہو۔

''مسٹر بارکن جونیئر، میں یہاں وارنٹ گرفتاری لے کر آیا ہوں۔'' یہ کہہ کر نارتھم آگے بڑھا۔ ٹیڈ اور چپی لوپ نے بھی اس کی تقلید کی۔

وہ ایلینا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''مسز بارکن کیا میں تمہارا اسیل فون دیکھ سکتا ہوں؟''

یہ سنتے ہی اس کے چہرے کی رنگت اڑ گئی اور وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ ''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟ کیا تمہارے پاس عدالتی حکم ہے؟''

''ایلینا، انہیں فون دے دو۔'' جونیئر نے کہا۔

ایلینا نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اسے کوئی حمایتی نظر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ لارا نے بھی ایک لفظ نہیں کہا جبکہ پیٹر کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے میز پر رکھے ہوئے بیگ میں سے فون نکالا اور لیفٹیننٹ کے حوالے کر دیا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' وہ بولی۔ ''میری طرف سے پہل نہیں ہوئی۔ یہ میری غلطی نہیں ہے۔'' اس کی نظریں پیٹر پر گئیں جو اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر وہ تیزی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔

یہ لوگ ہمیشہ بھاگنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''ہم ایک جزیرے پر ہیں۔ یہ لوگ بچ کر کہاں جا سکتے ہیں؟''

باہر نکلتے ہی پیٹر کو دو پولیس والوں نے پکڑ لیا اور اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال کر اسے پولیس کار میں دھکیل دیا۔ لیفٹیننٹ بھی مکان سے باہر آگیا اور بولا۔ ''میں تمہیں رائے بارکن سینئر کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ تمہیں حق ہے کہ وکیل کے آنے تک تم خاموش رہو۔''

بارکن جونیئر، ایلینا اور لارا بھی باہر آگئے۔ لیفٹیننٹ نے ایلینا سے کہا۔ ''میں تمہارا فون ثبوت کے طور پر اپنے پاس رکھوں گا۔ تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔''

''تم مجھ پر الزام نہیں لگا رہے؟'' ایلینا نے پوچھا۔ وہ ابھی تک خوف زدہ نظر آرہی تھی۔

''تکنیکی طور پر ثبوت اپنے پاس رکھنے کا الزام لگ سکتا ہے لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ خدا حافظ۔''

یہ سن کر ایلینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور لارا ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ پولیس اپنے قیدی کو لے کر روانہ ہوگئی تو ٹیڈ اور چپی لوپ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ٹیڈ نے مڑ کر دیکھا۔ لارا نے اپنی ماں کو سہارا دے رکھا تھا پھر جونیئر نے اپنے بازو سوتیلی بہن کے گرد حمائل کیے اور انہیں گھر کے اندر لے گیا۔

''اوکے۔'' چپی لوپ نے کہا۔ ''اب بتاؤ کہ تم اصلی مجرم تک کیسے پہنچے؟''

ٹیڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کا آغاز استقبالیہ ڈنر سے ہوا۔ مجھے لگا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے اور واقعی ایسا ہی تھا۔ پہلے میں سمجھ رہا تھا کہ پیٹر اپنی گرل فرینڈ لارا کی ماں ہونے کی وجہ سے ایلینا پر مہربان ہے لیکن نہیں۔ وہ خود اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ اور یہ سمجھنا بہت آسان ہے۔ مانا کہ لارا پرکشش ہے لیکن پیٹر سے اس کی کوئی گہری وابستگی نہیں تھی جبکہ ایلینا کا ماضی ایک گرم جوش عورت کے طور پر ہمارے سامنے ہے۔ وہ جانتی ہے کہ خوب صورتی کسی مرد کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ لیکن آپ کے دل میں اس کے لیے ہمدردی کے جذبات بھی ہونے چاہئیں۔ مردوں پر مہربان ہونا اس کی فطرت میں شامل ہے اور پیٹر نے بھی جواب میں پیش قدمی کا مظاہرہ کیا۔''

''پھر میں نے اس کے بارے میں سنا کہ وہ ماضی میں سارجنٹ کا پیچھا کرتا رہا ہے تو میں سمجھ گیا کہ وہ غیر

مستقل مزاج ہے۔ ایلینا کے نرم لفظوں اور مہربان رویے پر اس نے بے ڈھنگے پن سے ردعمل ظاہر کیا اور اپنی گندی ذہنیت سے مجبور ہو کر میرے خیال میں شاید اس نے ایلینا کو پیغامات اور ای میل بھیجنا شروع کر دیے۔ اس نے ہارکن سینئر کو اس لیے قتل کیا کہ وہ اسے اپنا رقیب سمجھنے لگا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ایلینا آزاد ہو جاتی بلکہ اس کے حصے میں دس لاکھ ڈالر کی رقم بھی آتی۔ پیٹر کی نظر ان پیسوں پر بھی تھی۔"

"لیکن پیٹر اور ایلینا کے درمیان کوئی معاشقہ تو نہیں تھا؟" بینی نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے اپنی خوشامد اچھی لگی۔ ایک نوجوان شخص اس پر فریفتہ ہو رہا تھا لیکن ہے وہ یہ سمجھ رہی ہو کہ اس بہانے پیٹر اس کی بیٹی سے چپکا رہنا چاہتا ہے لیکن پھر اس کے پیغامات آنا شروع ہو گئے جن سے وہ خوف زدہ ہو گئی۔ اس نے ان پیغامات کو محفوظ کر لیا جس سے یوں لگا کہ وہ اس کی خوشامد انجوائے کر رہی تھی لیکن اسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں کسی کو معلوم نہ ہو جائے۔ اس لیے لگتا ہے کہ وہ بات کو چھپانا چاہ رہی تھی۔ میرے خیال میں اسے امید تھی کہ دوبارہ اپنی تو جہ لارا کی جانب کر لے گا اور وہ سیٹ ہو جائیں گے۔ جب اس کے شوہر کا قتل ہوا تو اسے یہی خوف تھا کہ اگر یہ پیغامات سامنے آ گئے تو اس کے رنگین ماضی کو دیکھتے ہوئے اس پر قتل کا الزام آ سکتا ہے۔"

"کیا تمہیں پہلی ہی نظر میں یہ اندازہ ہو گیا تھا؟"

"ہاں، میں لوگوں کو پڑھ سکتا ہوں۔ تمام واقعات و شواہد کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ پیٹر کے سوا خاندان کے کسی دوسرے فرد کے پاس ہارکن کو قتل کرنے کا کوئی محرک نہیں تھا۔"

"واقعی تم نے تو کمال کر دیا۔" بینی لوپ بولی۔ "میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔"

ٹیڈ شرما گیا۔ بینی بہت کم کسی کی تعریف کیا کرتی تھی۔

"لیکن ابھی اس ڈرامے کا ایک ایکٹ باقی ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔"

جب اس نے وہ بات بتائی تو بینی لوپ کو یقین نہیں آیا لیکن جب اس نے مزید غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ ٹیڈ کی بصیرت کو کم تر نہیں سمجھا جا سکتا۔ ٹیڈ کو ایک کام کے سلسلے میں نیبیس جانا پڑ گیا اور بینی لوپ بھی ایک مقدمے کی تیاری کے سلسلے میں نیویارک چلی گئی۔ ایک ماہ بعد وہ دونوں ایک

تجربہ کار

تعلیم بالغاں کے دوران استاد نے سوال کیا۔ "پرسکون اور آرام دہ زندگی گزارنے کے لیے شوہر کے پاس کس چیز کا ہونا ضروری ہے؟"

"بہرا پن!" ایک پچاس سالہ شخص نے ذرا تلخ لہجے میں جواب دیا۔

اشتہارات

ضرورت ہے ایک ایسے مولوی صاحب کی جو ہمارے خاندان بھر کی خوشیوں، مسرتوں اور کامیابیوں کے لیے دعا کر سکیں۔ بالخصوص بیرون ملک کے ویزے اور لو شادی کے لیے دعا کرنے کا جنہیں وسیع تجربہ ہو اور جن کی دعائیں تاثیر ہوں، ذیل کے پتے پر رجوع کریں۔ وظیفہ حسب قبول دعا دیا جائے گا۔

☆☆☆

اگر آپ دل پھینک واقع ہوئے ہیں تو آج ہی ہمارے شوروم میں تشریف لا کر اپنی پسند کے بہترین "دل" خریدئیے اور روزانہ کسی نہ کسی کو ایک دل دیجیے۔ ایک سے زیادہ سیٹ کے خریداروں کے لیے خصوصی رعایت۔ یاد رکھیے! ہمارے ہاں بہترین پلاسٹک کے "دل" بنائے جاتے ہیں۔

چٹکلے

☆......یہ فیصلہ کتنا بڑا ہو گا ڈاکٹر مجنوں گویا انجینئر، میرے والد صاحب نے اپنے بیٹے پر چھوڑ دیا ہے۔

☆......راولپنڈی میں ایک شام صبح کے وقت سنائی دی، کیونکہ اس شام کوئی اور شام سنائی جا رہی تھی۔

☆......ابھی ہم خواب دیکھ رہے تھے کہ بجلی چلی گئی۔

☆......دوست کے انتخاب سے دشمن کا انتخاب زیادہ مشکل ہے۔

☆......مرد کیا ہے، ایک زنانہ صنعت۔

☆......ریاست ہائے متحدہ امریکا میں لوگوں کو صارفین کہتے ہیں۔ روس میں مزدور، چین میں عوام، مشرق وسطیٰ میں پبلک، بھارت میں جنتا، انگلینڈ میں اکثریت اور جاپان میں قوم۔ پاکستان میں انہیں کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مثلاً سندھی، پنجابی، سرحدی، بلوچی، کشمیری، مہاجر وغیرہ۔

مطالعہ: طارق سلطان اعوان، حیدر آباد

بار پھر بارتھا زوفی یارڈ میں اکٹھے ہوئے۔ اس وقت بھی وہ اپنی واپسی کا جشن شہر کی سڑکوں پر چہل قدمی کر کے منا رہے تھے۔ اوک بلفز کو جانے والی مرکزی سڑک پر ایک ہارن کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو لارا ایک زرد رنگ کی جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی نظر آئی۔ اس نے بے حد خوب صورت سفید بلاؤز اور مختصر اسکرٹ پہن رکھا تھا جو یقیناً کسی پرانے کپڑوں کی دکان سے نہیں خریدا گیا تھا۔ اس کے برابر میں ہارکن جونیئر بیٹھا ہوا تھا۔

''ٹیڈ، پینی۔ ہم یہاں قیام کرنے آئے تھے۔ تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔''

پینی لوپ نے بھویں اٹھا کر دیکھا۔ وہ دونوں جیپ سے اتر کر اُن کے قریب آگئے۔ جونیئر مسکراتے ہوئے بولا۔

''مجھے لیفٹیننٹ نارتھم نے بعد میں بتایا کہ پیٹر کی جانب اس کی توجہ مبذول کرانے میں تمہارا کردار نمایاں تھا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔''

''میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' لارا نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ جونیئر نے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھا اور اسے اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

''یہ ہم سب کے لیے ایک صدمہ ہے لیکن ہم دونوں مل کر اسے برداشت کر رہے ہیں؟'' اس نے جس طرح مسکراتے ہوئے لارا کو دیکھا۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ ان کے درمیان کیا چل رہا ہے۔

''تمہاری ماں کا کیا حال ہے؟'' پینی لوپ نے پوچھا۔

''اوہ، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں ایک بہت اچھی جگہ ہے جہاں ایسے لوگوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے جو پریشانیوں سے گزرے ہوں۔ وہاں کا تمام عملہ انگریزی بولتا ہے۔ اس لیے زبان کا کوئی مسئلہ نہیں اور یہ جونیئر کی مہربانی ہے کہ وہ وہاں کے تمام اخراجات برداشت کر رہا ہے۔''

''ڈیڈی کی خواہش تھی کہ میں اس کا خیال رکھوں۔'' جونیئر نے کہا۔

''تم واقعی بہت پیارے ہو؟''

''تم یہیں ٹھہرو۔ میں تمہارے لیے رول لے کر آتا ہوں۔'' جونیئر نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد لارا نے کہا۔ ''یہ جیپ ہم نے ایک ہفتے کے لیے کرائے پر لی ہے۔ کل ہم بوسٹن جا رہے ہیں۔ ممکن ہے کچھ دنوں بعد واپس آجائیں لیکن یہاں سے بہت سی تلخ یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ میں جونیئر سے کہہ رہی ہوں کہ اس سال موسم سرما کسی اور جگہ گزاریں۔''

''یہ بتاؤ کہ تمہاری منگنی کب ہو رہی ہے؟'' پینی لوپ نے کہا۔ ''میں تحفہ بھیجنا چاہتی ہوں۔''

اس پر لارا نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اسی وقت جونیئر بھی آگیا۔ انہوں نے خدا حافظ کہا اور جیپ میں بیٹھ کر ساحل کی طرف روانہ ہوگئے۔

اُن کے جانے کے بعد ٹیڈ اور پینی لوپ کچھ دیر خاموش رہے پھر پینی نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ ہونے والا ہے؟''

ٹیڈ مسکرایا اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ان کا رویہ دیکھ لیا تھا اور مجھ میں لوگوں کو پڑھنے کی صلاحیت ہے۔''

''لارا ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔'' پینی لوپ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''واقعی آج کا دن رول کھانے کے لیے بہت اچھا ہے۔ میرے لیے بھی ایک لے کر آؤ۔''

ٹیڈ اس کے لیے رول لے کر آیا۔ ساتھ میں سوڈا اور فرنچ فرائز بھی تھے۔ انہوں نے وہیں پارک کی بینچ پر بیٹھ کر رول کھائے۔ پینی لوپ کو لارا اور جونیئر سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی اور اب وہ مزے لے لے کر رول کھا رہی تھی۔ اتنا اچھا وقت اس کی زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔

''میں لوگوں کے اندر کا حال پڑھ سکتا ہوں۔'' ٹیڈ نے کہا۔ ''اور میں نے تمہارے دل پر لکھی ہوئی تحریر بھی پڑھ لی ہے۔ تم اس کا اعتراف نہیں کرنا چاہتیں لیکن مجھ سے محبت کرتی ہو، بالکل اسی طرح جیسے میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم کب تک مجھے بے وقوف بناتی رہو گی۔ آخر اعتراف کیوں نہیں کر لیتیں؟''

پینی لوپ نے ایک ابرو اٹھائی لیکن فوراً ہی کچھ نہیں بولی۔ اس نے اطمینان سے اپنا رول ختم کیا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرے دل میں تمہارے لیے بڑے ہی مضبوط جذبات ہیں۔'' پھر وہ اپنے ہونٹ اس کے کان کے قریب لاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن وہ بہت ہی زیادہ پیچیدہ ہیں۔ امید ہے کہ تم سمجھ گئے ہو گے۔''

آخری لمحہ

عکسِ فاطمہ

کائنات کا تمام تر حسن زندگی کی تازگی اور تابندگی کی بدولت ہے۔ جب تک سانس کی ڈور بندھی ہوتی ہے اس وامید کا دیا بھی روشن رہتا ہے۔ وہ خوشگوار تبدیلی کا متمنی تھا۔ زندگی میں تمام رنگ بکھیرنے کی آرزو تھی۔۔۔ اور ان رنگوں کے لیے اسے انوکھا کارنامہ انجام دینا تھا۔۔ مگر ہمیشہ ایسا ہوتا کہ لبِ دریا پہنچ کے بھی وہ تشنہ ہی رہ جاتا۔۔۔

آخری [illegible] میں بدل جانے والی قسمت کا [illegible] طرفہ

احاطہ عدالت کے پورچ میں آیوان کافی دیر سے ٹہلتا ہوا ایک ہی بات ذہن میں دہرائے جا رہا تھا۔ اسے طویل عرصے سے اس دن کا انتظار تھا۔ آج وہ نہایت اہم بات کہنے جا رہا تھا لیکن گھبرا رہا تھا کہ کہیں کوئی غلطی نہ کر بیٹھے۔ وہ اپنی تقدیر سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس کی ہر کمند لبِ بام ٹوٹتی تھی۔ کوئی بھی کام ہو، وہ بہت اچھے طریقے سے کرتا لیکن عین وقت پر کوئی نہ کوئی ایسی گڑبڑ ہو جاتی کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھر جاتا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک ایک خیال

اس کے دماغ میں بجلی کی طرح کوندا۔ اس نے کوٹ کی جیبیں ٹٹولنا شروع کیں۔ وہ یہ یقینی بنانا چاہ رہا تھا کہ ڈبیا اس کی جیب میں ہی ہے، کہیں گر تو نہیں گئی۔ اس نے کوٹ کے اندر والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ آخر کوٹ کی باہری جیب میں ہاتھ ڈالا، چھوٹی سی مخملی ڈبیا سے انگلیاں مس ہوتے ہی وہ مطمئن ہوگیا۔ گہری سانس لی اور ایک بار پھر چند جملوں کو دل ہی دل میں دہرانے لگا۔

آئیوان اب امریکی شہری تھا لیکن کئی برس پہلے مشرقی یورپ کی کمیونزم سے آزادی کے بعد وہ ہنگری سے نیویارک پہنچا تھا۔ اس نے یہاں پناہ لی اور پھر کافی تگ و دو کے بعد شہریت حاصل کرلی لیکن برسوں گزر جانے کے باوجود اب تک اس کی زندگی غیر مستحکم تھی۔ مالی حالات خراب تھے، نوکری ڈھنگ کی نہیں تھی، اسی لیے شادی بھی نہ کرسکا لیکن جب سے روزا سے ملاقات ہوئی تھی تب سے وہ گھر بسانے کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوچکا تھا۔

وہ روزا پر بری طرح مرمٹا تھا لیکن شادی کے لیے پرپوز کرتے ہوئے ڈرتا تھا، کہیں انکار نہ کردے اور اگر اقرار کرلیا تو پھر وہ منگنی کے لیے انگوٹھی کہاں سے لائے گا۔ اس کے تو خود کھانے کے لالے پڑے رہتے تھے، انگوٹھی خریدنا تو جوئے شیر نکالنے کے برابر تھا۔ آخر کئی مہینوں کی تگ و دو کے بعد اس کے حالات میں بہتری آنا شروع ہوئی۔ اضافی آمدنی کے لیے پارٹ ٹائم ملازمت بھی شروع کردی تھی۔ اس کے بعد حالات کسی حد تک سازگار ہوتے چلے جارہے تھے۔ اس وجہ سے اس میں خود اعتمادی بھی بڑھ گئی تھی۔

آئیوان عدالت میں پلمبرنگ اور صفائی ستھرائی کے کام پر مامور تھا۔ وہ کئی برس سے یہاں کام کررہا تھا۔ اب تو وہ اس پرپیچ عمارت کے ہر خم سے اچھی طرح واقف ہوچکا تھا۔ ویسے بھی عمارت میں پلمبرنگ کرتے ہوئے اسے ایسی ایسی جگہوں پر جانا پڑتا کہ جہاں کوئی عام عدالتی اہلکار کبھی نہیں گیا ہوتا تھا لیکن اس کا جانا مجبوری تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار شادی کرلے، اس کے بعد وہ کوئی دوسرا کام دیکھے گا۔ اس کا خیال تھا کہ میاں بیوی کام کرتے ہوں تو کم آمدنی میں بھی گھر بن ہی جاتا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے زندگی کا ایک بہت بڑا فیصلہ کرلیا تھا۔

ٹہلتے ٹہلتے آئیوان اچانک رکا۔ ایک نظر کلائی پہ بندھی گھڑی پر ڈالی۔ وقت قریب آرہا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے آسمان پر نظر ڈالی۔ سردیوں کی ابتدا تھی لیکن آسمان بادلوں سے صاف تھا۔ چمکتے سورج سے موسم میں خوشگوار حدت موجود تھی۔ وہ کل رات سے دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ آج بارش نہ ہو۔ موسم دیکھتے ہوئے اسے یقین تھا کہ لوگ عدالت تک پہنچنے کے لیے پبلک گیٹ کے سامنے میٹل ڈیٹیکٹر سے گزرنے کے واسطے قطار بنائے کھڑے ہوں گے۔ اگر بارش ہوجاتی تو لوگ سیکیورٹی سے گزرنے کے لیے قطار بنانے کے بجائے لابی میں، بڑے بڑے ستونوں کی اوٹ، پورچ کی چھت تلے اور ادھر ادھر کھڑے رہنے کو زیادہ ترجیح دیتے۔ سردیوں میں بارش میں بھیگنے سے خود کو بچانا سب کی پہلی ترجیح ہوتی ہے۔ ایسا ہوتا تو جو بات وہ کہنے جارہا تھا، اس کے لیے تخلیہ ملنا مشکل ہوجاتا اور اگر ایسا ہوتا تو شاید معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا۔

آئیوان نے گہری سانس لی اور سامنے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک بوڑھا کئی سیڑھیاں چڑھ کر آرہا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرکے ایک بار پھر زیرِ لب اپنے جملے دہرانے لگا۔ اس نے گرینائٹ سے بنی عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف نظر ڈالی اور سگریٹ نکالا۔ انتظار کی اضطراری کیفیت کے دوران وہ کئی سگریٹ پی چکا تھا، جن کے ٹوٹے پورچ کے فرش پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔

کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ٹہلتے ہوئے ایک بار پھر اس کی نظر سامنے پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سانسیں تیز ہوگئیں۔ سامنے سے روزا سیڑھیاں چڑھتی ہوئی آرہی تھی۔ آئیوان نے جلدی سے سگریٹ پھینک کر جوتے تلے مسلا اور آگے بڑھا۔ روزا پورچ کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ”آئیے......“ اس نے خوش دلی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”تم......“ روزا اسے دیکھ کر حیران تھی۔ ”یہاں کیا کررہے ہو؟“

”تمہارا انتظار۔“ آئیوان نے بڑے رومانوی انداز سے کہا۔

روزا مسکرا دی اور اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے کچھ سمجھ نہ سکی ہو۔ ”مجھے اندر جانا ہوگا۔“ روزا نے نرم لہجے میں کہا۔ ”وکیل صاحبان میرے منتظر ہوں گے۔“ وہ قانونی خدمات فراہم کرنے والی ایک فرم میں ملازم تھی اور کمرۂ عدالت میں وکلا کی معاونت کرتی تھی۔ ”کہیں سماعت شروع نہ ہوجائے۔“ روزا نے بڑے پیار سے اس سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

”وہ سب تھوڑا انتظار کرسکتے ہیں، ویسے بھی ابھی سماعت شروع نہیں ہوئی ہے...... تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔“

آئیوان نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھاما اور ساتھ لے کر کورٹ ہاؤس کی لابی کے شمالی حصے کی طرف بڑھا۔ وہاں سفید گرینائٹ کا ایک خوبصورت مجسمہ بھی لگا ہوا تھا۔

''اور بتاؤ..... کیا چل رہا ہے؟'' روزا کا جملہ رکی تھا۔

''بہت کچھ.....'' آئیوان نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی پتا چل جائے گا سب کچھ۔''

روزا مسکرا دی۔ اس کی نگاہوں سے حیرانی جھلک رہی تھی۔

آئیوان اسے لے کر ایک خوبصورت اور سنسان گوشے میں آگیا۔ چاروں طرف نظر ڈالی، دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ اس نے روزا کا بایاں ہاتھ تھاما اور عین اس کے سامنے گھٹنوں کے بل پر کھڑا ہوگیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ڈبیا نکالی اور ڈھکن کھول کر ہیرے کی انگوٹھی اس کی نگاہوں کے سامنے کی۔

''اوہ میرے خدا.....'' روزا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

آئیوان نے بڑے پیار سے انگوٹھی پہنا دی۔

''مجھے یقین نہیں ہو رہا۔'' روزا نے انگوٹھی والے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات جھلک رہے تھے۔

''اب مجھ سے شادی کرو گی.....'' آئیوان نے انگوٹھی پہنانے کے بعد بڑے پیار سے پوچھا۔

''کروں گی..... ضرور کروں گی۔'' روزا نے تیزی سے کہا۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ ''میں تو خود تم سے ہی شادی کرنا چاہتی تھی بس تم ہی نے دیر کر دی۔'' وہ جذباتی ہو رہی تھی۔

آج صبح جب وہ کورٹ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے آرہا تھا، تب بھی اسے خدشہ تھا کہ نہ جانے کیا ہو جائے۔ کافی عرصے سے وہ اس لمحے کی تیاریاں کر رہا تھا لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ غلط ہو جاتا۔ وہ بہت خوش تھا کہ بنا کسی گڑبڑ کے جیسا سوچا تھا، سب کچھ ویسا ہی ہوگیا۔ پچھلے آٹھ مہینے سے وہ ایک پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرنے لگا تھا لیکن اس کے باوجود ہیرے کی انگوٹھی خریدنے کے لیے پیسے اکٹھے نہیں ہو پا رہے تھے۔

اگرچہ آئیوان نے انگوٹھی پہنانے سے لمحہ بھر پہلے تک روزا سے اپنے دل کی بات کبھی نہیں کی تھی مگر وہ اس کی خاموش محبت سے آگاہ تھی۔ کئی بار اظہار بھی کیا تھا لیکن وہ کہہ چکی تھی کہ ہر چیز کا وقت مقرر ہے اور جب وقت آجائے

کام ضرور ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اسے پسند کرتی تھی لیکن اندر سے ذرا مختلف قسم کی لڑکی تھی۔ چاہتی تھی کہ پہلے آئیوان اسے پرپوز کرے۔ آج وہ لمحہ آچکا تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اب ان کی زندگی ایک نئے راستے پر چل پڑے گی۔ سب کچھ پہلے جیسا نہیں رہنے والا۔ روزا کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔

''تم بھی بڑے بدھو ہو مسٹر.....''

''کیوں.....'' آئیوان نے حیرت سے پوچھا۔

''بھلا یہاں یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی، کہیں اور بھی تو.....'' روزا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ہر کام کا ایک وقت اور جگہ مقرر ہے۔''

روزا ہنس پڑی۔ ''میرا وار مجھ پر ہی۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، کسی نے عقب سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''مسٹر آئیوان.....''

وہ حیرانی سے پلٹا۔ ان دونوں کو دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ حیران رہ گیا۔ ''لعنت ہو..... یہ کہاں سے ٹپک پڑے۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''رنگ میں بھنگ ڈال دی کم بختوں نے۔''

''میرے پرانے دوست ہیں، نہ جانے کیسے برسوں بعد یہاں پہنچ گئے۔'' آئیوان روزا کی طرف پلٹا۔

روزا بھی ان دونوں کو دیکھ کر حیران تھی لیکن اسے کمرۂ عدالت میں بھی پہنچنا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر آئیوان کی طرف دیکھا۔ ''میں چلتی ہوں، بعد میں بات کرتے ہیں۔''

''ضرور..... یہ ہمارے کزن ہیں، ہمیں بھی ان سے کچھ خاص بات کرنی ہے اکیلے میں۔'' ان میں سے ایک نے روزا کو مخاطب کیا۔

''بہت بہتر ہے۔'' روزا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

آئیوان حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں کافی عرصے کے بعد نظر آئے تھے۔

''کہیں باہر تنہائی میں بیٹھ کر بات کرنی ہے.....'' نوواردوں میں سے ایک نے منہ کھولا۔

''اس وقت..... لیکن ابھی تو مجھے کام پر پہنچنا ہے۔'' آئیوان نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''کوئی بات نہیں، ذرا دیر سے پہنچ جانا۔'' یہ کہتے ہوئے دونوں نے دائیں بائیں ہو کر اس کے بازو تھامے اور زبردستی باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔ دونوں آئیوان کے محسن تھے لیکن اس وقت انہیں

دیکھ کر وہ ہر گز خوش نہیں تھا۔ اسے روز اسے اپنی اور بہت کچھ کہنا تھا لیکن ان دونوں نے عین وقت پر پہنچ کر سب کچھ چوپٹ کر دیا تھا۔

سوویت یونین کی تحلیل اور کمیونزم کے خاتمے سے پہلے وہ ہنگری میں یوگوسلاویہ کی سرحد سے متصل ایک چھوٹے سے شہر میں رہتا تھا۔ سرحد سے متصل گاؤں میں ہی کسی جگہ پر وہ دونوں بھائی بھی رہتے تھے۔

کمیونزم کے خاتمے کے بعد جب وہ مشرقی یورپ سے پناہ کی تلاش میں امریکا آیا تو نئی سرزمین پر اسے ہر روز ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ اجنبی زبان، اجنبی ثقافت، اجنبی لوگ..... نیویارک پہنچنے کے بعد وہ سخت پریشانیوں میں گھرا تھا کہ یہ دونوں بھائی اسے مل گئے۔ وہ اس سے کئی مہینے پہلے یہاں آچکے تھے۔ انہوں نے اس کی بہت مدد کی۔ مہینوں تک اسے کھانا کھلایا، سر چھپانے کا ٹھکانا دیا۔ اپنی کمیونٹی کے ان دوسرے لوگوں سے ملوایا، جنہیں یہاں 'ہنگری کے مہاجرین' کہا جاتا تھا اور پھر مناسب وقت پر اس کے لیے وکیل کا بندوبست کیا تاکہ امریکی شہریت کی درخواست دائر کر کے شہریت حاصل کر سکے۔

ایک مرتبہ آئیوان نے ان دونوں سے سوال کیا تھا کہ ''تم نے میری مدد کیوں کی؟''

''کیونکہ آج تمہاری مدد کریں گے تو کل تم ہماری مدد کر سکو گے۔'' ان میں سے چھوٹے بھائی اور پستہ قامت میناس نے ہنس کر جواب دیا تھا۔

تب آئیوان نے ان کی بات ہنسی میں اُڑا دی تھی لیکن اب دونوں اچانک سامنے آئے تو وہ سوچ رہا تھا کہ شاید احسان کا بدلہ چکانے کا وقت آگیا ہے۔

وہ دونوں اسے لے کر سامنے سڑک پر پہنچے اور اسے عبور کر کے سٹی پارک کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ تینوں خاموشی سے آگے بڑھے جا رہے تھے۔

صبح کے وقت پارک بالکل خالی تھا۔ وہ اسے لے کر ایک پُرسکون گوشے کی طرف بڑھے۔ ''بیٹھو......'' دوسرا بھائی اور دراز قامت پہلوان نما اینڈریاز ایک قدم آگے بڑھا اور آئیوان کے کندھے پر دباؤ ڈال کر بینچ پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ گنجا اور کرخت نقوش کا مالک اور طبیعت سے جھگڑالو تھا۔

آئیوان بیٹھا تو اینڈریاز اور میناس اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔

''اب بتاؤ...... کیا بات ہے؟'' آئیوان نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

میناس نے لحہ بھر کو اپنے بھائی اور اس کی طرف باری باری دیکھا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''ہمارے بڑے بھائی لُوکا کو یقین تھا کہ صدیوں پہلے رومن نے اپنے زوال کے وقت ہمارے گاؤں کے ساتھ واقع جنگل میں اپنا بھاری خزانہ زمین میں دفن کر دیا تھا۔''

''واہ...... یہ تو کوئی کہانی ہے۔''

''پوری بات سنو۔'' اینڈریاز نے ناگواری سے کہا۔

''تھا وہ ہمارا بڑا بھائی لیکن اس کی یہ باتیں سن کر ہم سب اسے پاگل سمجھنے لگے تھے۔'' میناس نے دوبارہ بات شروع کی۔ ''ہم آپس میں ایک دوسرے سے یہ کہتے تھے کہ شاید اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ لُوکا کو بھی ہمارے خیالات کا پتا چل گیا تھا مگر پھر بھی وہ اپنی رائے سے پھرا نہیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس کی بات سچ ثابت ہو گئی۔''

''واقعی......'' آئیوان نے حیرانی سے کہا۔

''چپ نہیں رہ سکتے۔'' اینڈریاز نے دھمکانے والے انداز میں کہا تو میناس نے اسے گھورا۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ ایک دن ٹول شیڈ ایریا میں زمین کھودتے ہوئے اسے کچھ ملا۔'' میناس نے دوبارہ بات وہیں سے شروع کی۔ ''لُوکا نے مزید کھدائی کی تو اسے کئی بڑے ظروف، صراحیاں اور اسی طرح کی دوسری چیزیں ملیں۔ کئی چیزوں پر عبارتیں بھی کندہ تھیں۔ اس نے ان چیزوں کو صاف کیا اور پھر بڑی کوششوں کے بعد ان پر لکھی عبارت کو ترجمہ کیا تو اسے بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ لُوکا نے بوڈاپسٹ کے نوادرات کی مارکیٹ میں معلومات کیں تو تصدیق ہو گئی کہ نوادرات رومن عہد کے ہیں اور ان کی مالیت لاکھوں ڈالر میں ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش ہو گیا۔

آئیوان کو یہ کہانی سن کر پہلے حیرت ہوئی لیکن پھر اس نے خود کو یقین دلایا کہ نوادرات کی دریافت کے پیچھے اکثر ایسے ہی قصے کہانیاں ہوتے ہیں۔ ''پھر کیا ہوا...... ان نوادرات کو بیچا؟'' اس نے تجسس سے پوچھا۔

میناس نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ''ایک رات لُوکا انہیں چھپانے کے لیے ٹول شیڈ گیا، جہاں اس نے نوادرات چھپا رکھے تھے لیکن دوسرے دن وہاں سے اس کی لاش ملی اور سارا خزانہ غائب تھا۔''

''سوری...... بہت افسوس ہوا۔'' آئیوان نے تعزیت کی۔

''اس بات کو کئی برس گزر چکے ہیں۔'' میناس نے کہنا شروع کیا۔ ''برسوں بعد اب وہ نوادرات ایک، ایک کر کے

مشرق وسطیٰ میں نوادرات کے چور بازار میں سامنے آرہے ہیں۔ اسے خریدنے والے سرمایہ کاروں نے بھاری رقم صرف کی ہے لیکن اس سے پہلے کہ وہ نیلامی کے لیے پیش کرتے یہ بات باہر نکل گئی اور اب ہنگری اور کروشیا... دونوں کی حکومتوں نے ان پر اپنا دعویٰ کر دیا ہے۔ اُن میں سے چاندی کا ایک نمونہ کل سماعت سے پہلے اسی عدالت میں دکھایا جائے گا، جہاں تم بھی کام کرتے ہو۔''

''وہ ہے کیا اور امریکی حکومت کے ہاتھ کیسے لگا۔'' آئیوان نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ آئیوان کچھ سمجھ نہیں پار ہا تھا۔

''وہ چاندی کی ایک مورتی ہے۔'' میتاس نے کہنا شروع کیا۔''اخبارات سے پتا چلا ہے کہ تین ماہ پہلے کسٹم حکام نے ڈاک پوسٹ پر نوادرات کے ایک تاجر کے سامان سے اسے برآمد کیا تھا۔ یہ خبر اخبارات میں آئی تو پہلے ہنگری نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اس کی دیکھا دیکھی کروشیا نے بھی مطالبہ کر دیا کہ مورتی اُن کے حوالے کی جائے۔''

''تو پھر......''

''اب کل نیویارک میں دونوں کے دائر دعوؤں کی سماعت شروع ہو رہی ہے۔'' میتاس نے وضاحت کی۔

''تو تمہیں قانونی مدد چاہیے۔'' آئیوان نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔ وہ سمجھا کہ شاید دونوں بھائی بھی اس میں فریق بننا چاہتے ہیں۔

''تمہاری مدد ضرور چاہیے لیکن قانونی نہیں......'' میتاس نے جواب دیا۔

''تو کیا چاہیے......''

''تم عدالتی تحویل میں موجود مورتی چرانے میں ہماری مدد کرو، کل وہ عدالت کے روبرو پیش کی جائے گی اور اس سے قبل ہم تمہاری مدد سے اُسے چوری کرنا چاہتے ہیں۔'' میتاس نے مدعا سامنے رکھ دیا۔

آئیوان محنت پر یقین رکھنے والا انسان تھا۔ اس نے کبھی دونمبری نہیں کی تھی۔ چوری میں مدد دینے کا سن کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے انکار کے لیے منہ کھولنا چاہا لیکن اینڈریاز نے اس کی گردن میں اپنا کسرتی بازو حمائل کر کے اس زور سے بھینچا کہ سانس رکنے لگی۔ اسے پھندا لگ گیا تھا۔ یہ دیکھ کر میتاس نے اشارہ کیا تو اس نے بازو گردن سے نکالا۔

''تمہیں یہ کام کرنا ہے کسی بھی صورت......'' میتاس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔''اگر بات مانی تو ٹھیک ورنہ......''

''ورنہ کیا......'' آئیوان نے خوفزدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم......'' یہ کہہ کر میتاس نے ایک نظر اپنے بھائی پر ڈالی اور پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''بہت بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے۔ زندگی اتنی آسان نہیں رہے گی جتنی اب ہے۔ ہماری مدد نہ کی تو وہی عورت تمہاری زندگی اجیرن کرنا شروع کر دے گی۔'' اس کا لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

''کون سی عورت......روزا؟''

''نہیں......وہی، جس کی وجہ سے تم امریکی بنے ہو۔'' اینڈریاز نے ہنستے ہوئے دھمکی دی۔

''اوہ......'' آئیوان سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اب مدد سے انکار ناممکن تھا۔

''لیکن وہ سب ایک کھیل تھا۔ اس کی بھاری فیس دی تھی میں نے......''

''کھیل تمہارے لیے تھا لیکن اب......اب قانون کی نظر میں وہ جرم ہے اور تم مجرم۔'' میتاس نے بڑے پیار سے کہا۔''لیکن پریشان مت ہو۔ ہمارا ساتھ دو گے تو تمہارا وہ جرم بھی سامنے نہیں آئے گا۔''

آئیوان نے گہری سانس لی۔ وہ اُن کے جال میں پھنس چکا تھا۔ ایک جرم کی پردہ پوشی کے لیے دوسرے جرم میں شراکت ناگزیر ہو رہی تھی۔''تو ٹھیک ہے......بتاؤ کرنا کیا ہے۔'' اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

''یہ ہوئی نا یاروں والی بات......'' اینڈریاز نے اس کے کندھے پر ہلکے سے ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''بات یہ ہے کہ وہ مورتی ہماری ہے لیکن عدالت میں ہے اور وہ چوری کرنا ہے......'' میتاس نے پھر پرانی بات دہرائی۔

''آگے بڑھو۔ یہ بتاؤ چوری کرنی تو ہے لیکن کیسے......'' آئیوان نے بات کاٹ کر تیزی سے کہا۔

اس کے بعد دونوں بھائی چوری کے لیے مختلف طریقے بیان کرنے لگے۔

کافی دیر بعد وہ دونوں خاموش ہوئے تو آئیوان سوچ میں پڑ گیا۔ ان کی باتیں سن کر وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ چکا تھا کہ دونوں کے پاس چوری کا کوئی مکمل اور قابل عمل منصوبہ نہیں تھا۔ عدالتی عمارت کوئی سادہ سی عمارت نہیں تھی۔ اٹھارویں صدی کے قدیم طرزِ تعمیر کا شاہکار وہ عمارت کافی بڑی تھی۔ تین منزلہ عمارت میں برجنما کمرے تھے، بڑے بڑے ستونوں اور چوڑے زینوں والی اس عمارت کے

بیرونی حصے سے تو بہت سارے لوگ واقف تھے لیکن اندر کے کمروں کا محل وقوع کیا تھا، عدالت میں پیش کی جانے والی اشیا کس کمرے میں رکھی جاتی تھیں، ان کی حفاظت کے لیے کیا بندوبست تھا، یہ سب کچھ اس کے علم میں دوسروں کی نسبت زیادہ تھا۔ وہ پلمبر بھی تھا۔ عمارت کے ہر حصے میں آتا جاتا رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جس مورتی کی ملکیت کے دو ملک دعوے دار ہوں وہ اسے اس طرح نہیں رکھا گیا ہوگا کہ گئے اور اٹھا کر نکل لیے۔ البتہ آئیوان کے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف مال خانے تک پہنچ سکتا تھا بلکہ بڑی آسانی سے مورتی نکال کر بہ آسانی اور بنا نظروں میں آئے فرار بھی ہوسکتا تھا۔ پھر بھی اس نے بات بنائی۔

''دیکھو...... معاملہ اتنا آسان نہیں جتنا تم دونوں سمجھ رہے ہو۔'' آئیوان نے کہنا شروع کیا۔ ''چوری تو دور کی بات وہاں تک پہنچنا بھی بظاہر آسان نہیں۔ فرض کریں کہ چوری کرنا ہے تو اس کے لیے پوری عمارت کے مکمل نقشے، تو اور اندر رکھنے والے مال خانے تک رسائی اور سیکیورٹی سسٹم...... ان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے فول پروف منصوبہ بنائے بغیر کام ممکن نہیں۔''

''تو تم کس مرض کی دوا ہو۔'' اینڈریاز نے غصے سے کہا۔

''صرف چوری نہیں کرنی، چوری کے بعد فرار، کیمروں کی نگاہوں اور ملازمین سے بچنا اور تحفظ رکھے بنا منصوبہ کامیاب نہ ہوگا۔'' آئیوان نے کہا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح وہ اتنے خوفزدہ ہوجائیں کہ چوری کا خیال ہی دل سے نکال دیں۔ وہ ان کی دھمکی سے ڈر کر اس مصیبت سے بچنے کے لیے دوسری ترکیب آزما رہا تھا۔

''تو پھر......'' وہ خاموش ہوا تو دونوں نے بیک زبان کہا۔

''میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں مگر......''

''مگر کیا......؟'' اینڈریاز نے اسے گھورا۔

''منصوبے پر عمل کے لیے خاصا وقت درکار ہوگا۔'' آئیوان نے کہا اور کچھ توقف کیا۔ ''لیکن اب اس کام کے لیے چوبیس گھنٹوں سے بھی کم وقت باقی بچا تھا۔ اتنے کم وقت میں یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟''

کچھ دیر تک تینوں خاموش رہے اور پھر میتاس نے بولنا شروع کیا۔ ''تمہاری باتیں اپنی جگہ...... ہمیں صرف مورتی چاہیے۔'' اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔

آئیوان سر جھکا کر کچھ سوچتا رہا اور پھر اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ''تم دونوں یہ کام کرنا چاہتے ہو لیکن میرے خیال میں اسے کچھ مختلف طریقے سے کرنا پڑے گا۔''

آئیوان نے جب دیکھا کہ جان چھڑانا ممکن نہیں تو پھر اس نے کچھ اور ہی سوچ لیا۔

''یہ کیا بکواس ہے؟'' پہلوان نما اینڈریاز نے جھلا کر کہا۔

آئیوان کو یقین ہوگیا کہ لمبے کی عقل گھٹنوں میں ہے اور دماغ بھی اس کے جثے کی طرح ہی موٹا ہوگا۔ اس نے میتاس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بھائی کے مقابلے میں ہمیشہ معقول لگا تھا۔

میتاس نے ہاتھ اٹھا کر بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''ہاں تو آئیوان...... تم کیا کہہ رہے تھے کہ ہم یہ کام کس طرح دوسرے انداز سے کرسکتے ہیں؟''

''چوری ضرور ہوگی لیکن یہ کام مجھ اکیلے کے بس کا نہیں۔'' آئیوان نے کہنا شروع کیا۔ ''تم دونوں کو بھی میری مدد کرنا ہوگی ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' دونوں نے بیک زبان پوچھا۔

''مورتی کو بھول جاؤ۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میتاس نے جواب دیا۔

''تو پھر میرا ساتھ دو۔''

''ہم تیار ہیں۔'' میتاس نے بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بتاؤ تمہارا منصوبہ کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہوگا۔''

آئیوان مسکرایا۔ ''تو پھر غور سے سنو......'' اس نے سارا منصوبہ سمجھانا شروع کیا۔

وہ دونوں دھیان سے اس کی بات سن رہے تھے۔

تقریباً آدھا گھنٹے بعد دونوں اٹھے۔ وہ دونوں یونین اسکوائر کی طرف بڑھ گئے اور آئیوان عدالت جانے کے لیے نکل گیا۔

سارا دن مصروف رہا۔ آئیوان کو بالکل فرصت نہ ملی۔ اس نے چوری کرنے کے منصوبے پر عمل کی ریہرسل کرلی تھی۔ شام کو فرصت ملی تو اس نے روزا سے فون پر بات کی۔

اسی رات روزا اور آئیوان دونوں اپنی منگنی کی خوشی منانے کے لیے 'للل اٹلی' نامی ریستوران میں اکٹھا ہوئے۔ روزا بہت پُرجوش اور خوش دکھائی دے رہی تھی۔ آئیوان اس کا ساتھ دے رہا تھا لیکن دماغ کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ اگرچہ اس نے لباس تو تبدیل کرلیا لیکن بھاگم دوڑی کی وجہ سے نہانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ وہ تروتازہ اور نئی منگیتر کے سامنے بھی اپنے اندر سے گندا محسوس کررہا تھا۔ دوبار ہاتھ روم

میں جا کر اپنے اوپر پرفیوم بھی چھڑک چکا تھا۔ وہ منگنی کا جشن منانے آیا تھا لیکن اس کے پاس ایک چھوٹا بیگ بھی تھا۔ یہ بیگ اس کی عادت بن چکا تھا۔ اس میں کام کے کپڑے، جوتے اور اسی طرح کی دو چار چیزیں ہمیشہ رہتی تھیں۔

روزا کو شادی کے لیے پروپوز کرنے، منگنی کی انگوٹھی پہنانے اور پھر اُن دونوں بھائیوں سے گفتگو کے درمیانی وقت میں آئیوان کئی ذہنی مصیبتوں سے گزر چکا تھا۔ اس نے انگوٹھی کریڈٹ کارڈ پر خریدی تھی، اس کا بل چکانا تھا، اوپر سے آنے والے دنوں میں شادی اور سب سے بڑھ کر چوری اور اس کے لیے منصوبہ بندی...... اس کا دماغ کئی مسائل میں اُلجھا ہوا تھا۔

یہ بات تو وہ شروع سے ہی جانتا تھا کہ میتاس اور اس کا بھائی جس طرح کی عسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے، اس میں ان کی کام چوری، سستی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں میں کمی کا عمل دخل زیادہ تھا۔ جس طرح وہ فوری چوری کرنا چاہتے تھے اور اس معاملے میں اُسے دھکیل رہے تھے، وہ کم خطرناک بات نہ تھی۔ کم وقت میں وہ بہت کچھ کر جانے کی سوچ رہے تھے اور اس کے لیے بھی وہ دونوں صرف آئیوان کو ہی آگے دھکیل رہے تھے۔ وہ خود کو شاید بچا لیتا لیکن ان بھائیوں کی دھمکی یاد تھی۔ امریکی شہریت کے لیے اس نے پیپر میرج کی تھی۔ میتاس کا کہنا تھا کہ اگر مدد نہ کی تو نہ صرف اُس کی سابقہ بیوی اُسے ملک سے نکلوا دے گی بلکہ روزا بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ وہ روزا کو کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔

آئیوان روزا کے ساتھ بہت سارا وقت گزارنا چاہتا تھا لیکن ریسٹوران تنگ اور بہت تھا، اوپر سے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی۔ بار بار آنے جانے والے ان کی کرسیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ آئیوان ان خوش گوار اور یادگار لمحوں کو محسوس تو کر رہا تھا لیکن اس کا پورا دھیان آنے والے کل پر تھا۔ روزا بھی مستقبل کے سپنے بُن رہی تھی۔ وہ ہنی مون کی باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ اس کی باتوں میں بظاہر حصہ لے رہا تھا لیکن دماغ کئی سوچوں میں اُلجھا تھا۔

اس دوران روزا آہستہ سے کچھ کہہ کر مسکرانے لگی۔

کسی بات پر تبصرہ تھا یا پھر کوئی سوال؟ آئیوان کچھ سمجھ نہ سکا۔ وہ اس سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کہیں غیر حاضر دماغی کا پول نہ کھل جائے۔ یہ بات اُسے بری لگتی کم از کم اس رات، جب کہ ان کی منگنی کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور نئے سفر کے ہمراہی بننے کے بعد یہ ان کے پیار کا پہلا ڈنر بھی تھا۔

ابھی وہ اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ روزا نے بڑے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ ایسے رکھا کہ موم بتی کی روشنی میں انگوٹھی کا چھوٹا سا ہیرا جگمگانے لگا۔ ”کیا خیال ہے، یہاں سے میرے گھر چلیں، اکٹھے کافی پئیں گے، میں کافی بہت عمدہ بناتی ہوں۔“ اس نے سرگوشی کی۔ وہ بھی اس کے پیار میں سرشار دکھائی دے رہی تھی۔

”کیوں نہیں...... “ آئیوان نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ ”بس تھوڑی دیر رکوں گا۔ مجھے ایک کام کی تیاری کرنی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے روزا کے انگوٹھی والے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ ”تمہارا ساتھ بہت پیارا ہے لیکن...... “ یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا ”مگر شادی کے لیے بھی تو پیسے جمع کرنے ہیں نا۔“

یہ سن کر روزا مسکرا دی۔ کچھ دیر بعد آئیوان نے بل ادا کیا، اچھی خاصی ٹپ دی اور دونوں ریسٹورانٹ سے نکل آئے۔

روزا بڑی نفیس اور شائستہ لڑکی تھی۔ اس نے گھر بڑے سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی کافی واقعی بہت عمدہ تھی کہ جیسا کہا تھا، اس سے کہیں اچھی ہے۔“ آئیوان نے آخری گھونٹ بھر کر کپ میز پر رکھا۔ ”کل ملتے ہیں، مجھے کل کچھ کام کی تیاری کرنی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا۔ ”تمہیں تو پتا ہی ہے مہنگائی کے اس دور میں ہنی مون پر کتنا خرچ آ جاتا ہے۔“

”وہ بھی زندگی میں صرف ایک بار...... “ روزا مسکرائی۔

”چلو...... “ آئیوان نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ”بہت جلد سب کچھ بدل جائے گا۔“ اس کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

روزا ہونے والے شوہر کو گراؤنڈ فلور کے داخلی دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ جب تک وہ سڑک کا موڑ مڑ کر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گیا، وہ وہیں کھڑی رہی۔ اس کے جاتے ہی روزا بھی پلٹ گئی۔

آئیوان اپنے اپارٹمنٹ پہنچا۔ واپس آتے آتے کافی رات ہو چکی تھی۔ لفٹ میں غائب تھا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیاں چڑھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ بھی جھول رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے بیگ ایک طرف پھینکا اور کپڑے جوتے اتارتے ہوئے سیدھا غسل خانے میں گھس گیا۔ اسے یقین نہ تھا کہ سارا دن اس قدر تھکن محسوس ہونے لگا۔ دن میں دو مرتبہ نہانے کی عادت تھی۔ صبح دیر سے جاگا تو نہانے کے بغیر ہی عدالت کو نکل گیا اور پھر سارا دن

اپنے محسنوں کے چکر میں پھنسا رہا، جانے کے بجائے چوری کے معاملے کو انجام تک پہنچانے کے لیے بھی بہت کچھ سوچنا تھا۔ کچھ خریداری بھی کرنی تھی چور بازار سے۔ امریکا میں موجودگی اور روزا سے شادی کے لیے یہ چوری ناگزیر ہو چکی تھی۔

اگلی صبح آئیوان پارک میں بیٹھا اُن دونوں بھائیوں کا منتظر تھا۔ اس کا ہینڈ بیگ ساتھ ہی رکھا تھا، اس میں لنچ، ایک شرٹ پینٹ اور کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ طے شدہ وقت پر وہ دونوں اسے سامنے سے آتے نظر آئے۔ آئیوان کو دیکھتے ہی اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ''گڈ مارننگ .....'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

''گڈ مارننگ .....'' آئیوان ایک طرف سمٹ گیا۔ بیگ اس نے گود میں رکھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے سب کچھ طے کرلیا ہوگا۔'' میناس نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

آئیوان نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سب کچھ ان کے گوش گزار کر دیا۔

دونوں بھائی اطمینان سے بات سنتے رہے۔ وہ چپ ہوا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تو پھر ٹھیک ہے .....'' آئیوان نے دونوں کی طرف دیکھا۔ ''مقدمے کی ساعت ڈھائی بجے دوپہر ہے۔ تم دونوں ٹھیک عدالت میں ٹھیک دو بج کر پانچ منٹ پر ملو گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیگ کھولا۔

اُن دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے .....'' آئیوان نے بیگ بند کرکے اپنی کلائی آگے بڑھائی۔ ''ہم گھڑیاں ملا لیتے ہیں تاکہ دیر نہ ہو۔''

تینوں نے گھڑیاں ملائیں اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

آئیوان نے بیگ اٹھایا۔ اب وہ تھوڑا بھاری ہو چکا تھا لیکن اس کی شولڈر بیلٹ پر لگا پیڈ بہت آرام دہ تھا، جس کی وجہ سے بیگ زیادہ بھاری نہیں لگ رہا تھا۔

وہ عدالت کے بڑے سے داخلی زینے سے اوپر جاکر کمرۂ عدالت کا رخ کرنے کے بجائے زینے کے برابر سے گزرنے والی راہداری پر مڑ کر اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جو عدالتی ملازمین کے داخلے کے لیے مخصوص تھا۔

اندر داخل ہوتے وقت اس نے اپنا ملازمین کے لیے مخصوص داخلی کارڈ سیکیورٹی افسر کی نگاہوں کے سامنے لہرایا۔ اس نے سر ہلا کر اندر جانے کی اجازت دے دی۔ وہ ایک کونے میں لگی پنچ مشین کی طرف بڑھا۔ کارڈ پنچ کرتے ہوئے اس نے دیوار پر لگے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ''بارہ گھنٹے..... صرف بارہ گھنٹے۔ اس کے بعد میں آزاد ہو جاؤں گا۔'' اس نے اردگرد دیکھتے ہوئے زیرِ لب خود کلامی کی۔

آئیوان کئی سالوں سے عدالت میں صفائی ستھرائی کا کام سرانجام دے رہا تھا۔ وہ اس کے کئی حصوں کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا لیکن صرف اپنے کام کی حد تک۔ عمارت پُرپیچ راہداریوں پر مشتمل تھی اور یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کی رسائی ہر حصے تک ہوتی لیکن پھر بھی وہ کئی خفیہ راستوں سے واقف تھا۔ وہ راستے جہاں سے اکثر نچلے درجے کے ملازمین باہر نکل جاتے اور چھٹی کے وقت واپس آکر کارڈ پنچ کرتے اور گھروں کا رخ کر لیتے تھے۔ کچھ ایسے راستے بھی اس کے علم میں تھے، جہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ دونوں بھائیوں کو چاندی کی قیمتی مورتی درکار تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس تک کیسے پہنچے گا لیکن کل رات وہ ایک اور منصوبہ بھی بنا چکا تھا۔ ساعت سے ذرا پہلے اس پر عمل بھی ہونا تھا۔ اسے اب کام سرانجام دینے کی تیاری کرنی تھی۔

اندر داخل ہو کر وہ سیدھا راہداری کی طرف گیا۔ وہ پلیٹ راہداری کے فرش کو ہفتے میں ایک بار اور اس سے ملحق باتھ روم کی روزانہ صفائی کرتا تھا۔ راہداری کے انتظام پر ملازمین کے لاکر تھے۔ اس نے جاکر بیگ کھولا۔ لنچ باکس اپنے لاکر میں رکھا اور کام کرنے والے کپڑے پہن لیے۔ معمول کا کام کاج کرتے ہوئے دوپہر ہوگئی۔ وقت قریب آرہا تھا۔ جیسے ہی لنچ بریک ہوا راہداری میں ہلچل مچ گئی۔

اسی دوران آئیوان نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور لوگوں سے بچتا بچاتا باتھ روم کی طرف نکل گیا۔ باتھ روم سے ایک خفیہ راہداری عمارت کے عقبی حصے میں کھلتی تھی۔ عدالتی اوقات کار کے دوران وہاں سے عملے کے کسی بھی فرد کے آنے جانے کا خدشہ رہتا تھا لیکن یہ لنچ بریک تھا۔ ایسے میں کسی کا خفیہ طور پر باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔

آئیوان نے باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے ایک سنک کے نیچے بھاری بیگ ٹھونسا اور دروازہ اندر سے لاک کرلیا۔ کچھ ہی دیر میں اسے کسی کے سیڑھیاں اترنے کی آواز سنائی دی۔ پتھر فرش پر قدموں کی چاپ سنائی دینے لگی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وقت آچکا تھا۔ گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج کر پانچ منٹ ہو رہے تھے۔

''آئیوان .....'' کسی نے سرگوشی میں اسے پکارا۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ وہاں میناس اور اینڈریو کھڑے تھے۔

وہ دونوں بھائی ٹی شرٹس اور جم شارٹس میں ملبوس تھے۔ انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ کوئی سیاح ہیں۔ مینا ان پر نظر پڑتے ہی آئیوان نے بینک کی طرف اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے دونوں بھائی بیگ کھول رہے تھے۔ انہوں نے اسکن ماسک سے چہرے ڈھانپے۔ ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹس کی فل آستینوں کے نیچے، کلائی پر موٹے ربر بینڈ سے پستول باندھے۔ یہ پستول اور گولیاں آج صبح اس نے چور بازار سے خریدی تھیں۔

عدالت کی بیضوی عمارت پر پیچ نٹ کی طرح تھی۔ ہر طرف راہداریاں، چوڑے زینے، راستے در راستے تھے۔ دوسری منزل پر عدالتی ہال واقع تھے۔ گراؤنڈ فلور کے مرکزی داخلی حصے سے چھ چوڑے زینے سیکنڈ فلور تک جاتے تھے۔ ان میں سے بعض راستے عدالت آنے جانے والے عام آدمیوں کے لیے اور ایک دو راستے عدالتی عملے کے واسطے مخصوص تھے۔ تقریباً دو تین راستے ایسے تھے جن پر بہت کم لوگوں کا آنا جانا تھا یا وہ اکثر خالی پڑے رہتے تھے۔

دو بج کر پندرہ منٹ پر آئیوان دوسری اور تیسری منزل کے درمیان واقع خالی زینے پر کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ عقب میں واقع بڑی کھڑکی سے سورج کی تیز روشنی اس پر پڑ رہی تھی۔ روشنی فرش تک جا رہی تھی۔ اس دوران وہ دونوں بھائی آتے دکھائی دیے۔ وہ ریلنگ تھام کر جلدی سے چند قدم نیچے اترے، آئیوان کے قریب پہنچا۔ زینے کے اس طرف میزانائن فلور کا ایک دھاتی دروازہ تھا۔ تینوں اس کے سامنے کھڑے تھے۔ دروازے میں بھاری تالا لٹک رہا تھا۔

اینڈریاز نے اپنی آستین سے لوہے کی ایک سلاخ نکالی اور چند لمحوں بعد ہی اس کے کسرتی بازوؤں کی طاقت سے مال خانے کا تالا ٹوٹ گیا۔

”تم دونوں نکلو اور اپنا کام کرو...... طے شدہ وقت پر تمہیں وہیں ملتا ہوں۔“ یہ کہہ کر آئیوان اندر داخل ہوا اور وہ دونوں جدھر سے آئے تھے، وہیں لوٹ گئے۔

آئیوان نے بے صبری سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے۔ اس نے سامنے کی کھڑکی سے نیچے کی طرف دیکھا۔ برابر والا ہال کمرۂ عدالت تھا۔ وہاں دو چار لوگ ہی بیٹھے تھے۔ آئیوان فوراً گردآلود کھڑکی سے ہٹ کر ایک طرف کو ہوا۔ کچھ ہی دیر میں مطلوبہ مورتی اس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس نے جلدی سے مورتی اپنی شرٹ کے اندر چھپائی اور کمرے سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ چوری ہو چکی تھی۔ فرار نامکمل تھا۔ وہ ایک نئی چال چل چکا تھا۔

آئیوان ایک راستے کی طرف کے مڑا جو نیچے کی طرف بڑھتے تھے

فٹ بال

ایک بڑا کھلاڑی چند شاگردوں کو فٹ بال کھیلنا سکھا رہا تھا۔ جب کھیل کے سب قاعدے ایک ایک کر کے سمجھا دیے تو آخر میں یہ گُر کی بات بتائی کہ ہمیشہ یاد رکھو، سارے کھیل کا دار و مدار فقط زور سے ٹھوکر لگانے پر ہے۔ اس سے کچھ نہ چوکو۔ اگر گیند تک نہ پہنچو تو پروا نہیں۔ اپنے مخالف ہی کو ٹھوکر لگا دو۔ اچھا اب کھیل شروع کرو۔ گیند کدھر ہے۔“

”گیند کی ایسی تیسی، آپ کھیل شروع کر دیں۔“

انتباہ

مشرقی جرمنی کے ایک قصبے میں ایک جوہڑ کے پانی کے چاروں طرف خاردار تار لگا کر اس میں ”کھڑے ہونا منع ہے“ لکھوا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بورڈ لگا دیا گیا جس پر یہ الفاظ تحریر کیے گئے۔

”جو اس جال کو چھوئے گا، اس کو گولی مار دی جائے گی۔“

اس تحریر کے نیچے یہ الفاظ بھی تحریر تھے۔

”خلاف ورزی کرنے والوں کو ایک ہفتہ قید کی سزا ہوگی۔“

امریکا سے آفتاب احمد کی سوغات

استعمال نہیں ہوا تھا۔ وہاں اوپر بنے غسل خانے سے پانی کا رساؤ ہو رہا تھا جس کی وجہ سے زینے پر جگہ جگہ پانی پڑا تھا۔ کناروں پر پرانے فرنیچر اور کباڑ پڑا تھا۔ صدی کی عمارت میں ائرکنڈیشن لگائے جانے کے باعث نکلنے والا ملبہ بھی صاف کرنے کے بجائے وہیں ڈھیر تھا۔ وہ بچتا بچاتا آگے بڑھا۔ تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ آگے بڑھا تو اچانک لگا کہ تاریکی بڑھ گئی ہے۔ ایک کھڑکی سے ہلکی سی روشنی اندر آ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد جب اس کی آنکھیں کم روشنی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک ہال میں تھا۔ اس نے دیدے پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ قریب میں ایک ڈائننگ ٹیبل نظر آئی۔ وہ آگے بڑھا اور تاریکی میں ٹیبل کے ساتھ کمر ٹکرا کر وہیں بیٹھ گیا۔ چاندی کی مورتی اسے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ اچانک اسے فضا میں گرد و غبار پھیلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ لوگوں کے بھاگنے دوڑنے، چلانے اور سائرن بجنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ بھاگنے کا یہی موقع تھا۔ قریب میں دروازہ

تھپتھپار ہا ہو۔

”ارے...... یہاں۔“

”اس نے گرم سوٹ پہنا ہوا تھا۔“

”تم اوپر جاؤ...... میں نیچے کی طرف جاتا ہوں۔“

آئیوان کو لگا کہ جیسے کوئی واکی ٹاکی پر باتیں کر رہا ہے۔

”پچھلا دروازہ...... پچھلا والا۔“

”مال خانہ...... وہاں جاؤ...... عدالتی عملہ وہیں ہے۔“

”کیا، ورثی چوری ہوگئی ہے۔“

لمحہ بھر بعد قدموں کی چاپ زینے کی سمت جاتی سنائی دی۔ کچھ دیر بعد کوئی لوہے کے دروازے کو آہستہ آہستہ پیٹ رہا تھا۔

”اسے چھوڑو......“ ایک آواز سنائی دی۔

قدموں کی آہٹ جاتی سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

آئیوان گھنٹے بھر تک دم سادھے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھا رہا۔ آخر ایک بار پھر ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور نہایت احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا زینے کی طرف جانے کے لیے پلٹا۔ جانتا تھا کہ اگر نیم تاریکی میں کسی چیز سے ٹکرایا تو ذرا سی آواز پوری عمارت میں گونج اٹھے گی۔ اس نے باہر نکلنے سے پہلے ارد گرد دیکھا۔ ایک چھوٹی سی گرد آلود الماری نظر آئی۔ اس نے احتیاط سے پٹ کھولے۔ وہ خالی پڑی تھی۔ اس نے ایک کونے میں مورتی کو اوندھا لٹا دیا۔ پٹ بند کیے اور ہال کے دروازے پر پہنچ کر سن گن لینے کی کوشش کی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا زینہ اترنے لگا۔ پر پیچ اور عقبی راستوں سے ہوتا ہوا وہ صفائی روم پہنچا۔ یہ اس کے کام کرنے کی جگہ تھی۔ یہیں اس کا لاکر بھی تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ محفوظ ہے۔

آئیوان نے بالٹی لے کر صفائی شروع کی اور آدھا گھنٹے تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ ہر طرف عجیب سی ہما ہمی دوڑ بھی ہوئی تھی لیکن کسی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ویسے بھی وہ عدالتی اسٹاف میں شامل تھا اور وہ بھی انتہائی نچلے عملے میں۔ اس پر کون توجہ دیتا۔

صفائی عملے میں شامل ہونے کی وجہ سے وہ جب اور جہاں دل چاہتا چلا جاتا، کسی کے لیے یہ حیرانی کی بات نہ تھی۔ اس کا یونیفارم ہی انٹری پاس تھا۔ وہ عدالت کا چکر بھی لگا آیا۔ کمرے میں سناٹا تھا البتہ عدالت کے ماتحت عملے میں سخت کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ ہر شخص تناؤ کا شکار دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بھاگ دوڑ اور چہروں کے تاثرات سے حقیقت کا اندازہ لگانا چاہتا تھا۔

باہر جانے والے دروازے بند تھے۔ عملے کے کئی دفاتر پر بھی تالے تھے۔ سامنے درجنوں افراد ایک قطار میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ پولیس والے بھی ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔

”کیا ہوا ہے؟“ بالٹی تھامے ہوئے آئیوان نے قریب کھڑے پولیس افسر سے پوچھا۔

پولیس افسر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ چند لمحوں تک بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ ”تم کیا کر رہے تھے؟“

”بیسمنٹ میں سیوریج کی لائن صاف کر رہا تھا۔“

آئیوان نے چہرے پر لاعلمی اور سادگی کے تاثرات طاری کرتے ہوئے معصومیت سے جواب دیا۔

”تین فائر ہوئے ہیں، دو عدالتی اہلکار زخمی ہیں۔ ایک کی حالت نازک ہے۔“ پولیس افسر نے اس پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے بتایا اور سامنے کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا کوئی پکڑا بھی گیا۔“

جواب ندارد۔

آئیوان مسکینوں جیسا منہ بناتے دو قدم آگے بڑھا۔ وہ عدالت کے خارجی دروازے کے بہت قریب تھا۔ اس نے صفائی کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے کن انکھیوں سے جائزہ لیا۔ لوگوں کو شناخت، چیک کرنے اور پھر جامہ تلاشی لینے کے بعد باہر جانے دیا جا رہا تھا۔

وہ واپس صفائی روم پہنچا۔ باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ لباس تبدیل کیا۔ اب وہ یونیفارم کی جگہ جینز شرٹس اور سیاہ جوتوں کے بجائے سفید جوگرز پہنے ہوئے تھا۔ اس کا بیگ کھونٹی سے خالی لٹک رہا تھا۔ اس نے لنچ باکس کھولا، سینڈوچ کھانے کے بعد یونیفارم اور باکس لاکر میں رکھا۔ کھونٹی سے لٹکا کینوس بیگ اتار کر تہ کیا اور بغل میں دبا کر باہر کی طرف چل دیا۔

آئیوان نے پرانا والا پر پیچ راستہ اختیار کیا اور ہال میں پہنچ کر الماری کھولی۔ مورتی اٹھا کر بیگ میں ڈالی اور عمارت سے باہر نکلنے کے لیے زینہ اترنے لگا۔ نیچے اترا تو ہر طرف سناٹا تھا۔ پولیس چیک پوسٹ خالی تھی۔ وہ عقبی حصے کی طرف پلٹا۔ باہر جانے والے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ویسے بھی اسے یہ راستہ اختیار نہیں کرنا تھا ورنہ سیکیورٹی گارڈ سے سامنا ہو جاتا۔ وہاں سی سی ٹی وی کیمرے بھی لگے ہوئے تھے۔ وہ پارکنگ روم کی طرف گیا۔ چھت پر صرف ایک لائٹ روشن تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ

بڑے سے ہال کو عبور کر کے ایک اور کمرے میں نکلا اور وہاں سے زینہ اتر کر ایک بغلی کمرے میں داخل ہوا۔ یہاں سے ایک راستہ باہر نکلتا تھا۔ استعمال کرنا دور کی بات، آئیوان کو یقین تھا کہ شاید ہی کوئی اس خفیہ راستے سے واقف ہوگا۔

راہداریوں، کمروں اور بغلی کمروں سے ہوتا ہوا وہ ایک کمرے میں داخل ہوا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ شام کے پانچ بج چکے تھے۔ اس نے اطمینان سے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں کئی کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ آگے بڑھا۔ کرسی گھسیٹی اور بیٹھ کر پاؤں دوسری کرسی پر پھیلا لیے۔ جو کچھ ہوا، وہ طے شدہ منصوبے کا حصہ تھا۔ اسے رات کا انتظار تھا۔

آئیوان کو لمحہ بھر کے لیے اُن دونوں بھائیوں کا خیال آیا لیکن جلد ہی اس نے سر جھٹک کر انہیں اپنے دماغ سے دور پھینک دیا۔ وہ اپنے قرضوں سے متعلق سوچ رہا تھا۔ خواہش تھی کہ قرض ادا کرتے ہی وہ شادی کر لے گا۔ چشم تصور میں وہ خود کو روزا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ٹہلتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اگلے دن کا سورج اس کی نئی زندگی لے کر آئے گا۔ وہ عدالت میں صفائی ستھرائی کے کام کو اب اپنا بھیانک ماضی تصور کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ میناں اور اینڈر یاز اب گم گشتہ ماضی بن چکے۔ آج کے بعد ان سے ملاقات کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا۔ اسے نیویارک پولیس پر یقین تھا کہ ملزمان جلد از جلد پکڑے جائیں گے اور سزا کے بعد ان کا مقدر امریکا بدری ہوگی۔ عدالت پر حملہ کوئی کم سنگین جرم نہ تھا۔ اس کی سزا بھی دہائیوں میں ہوگی۔ انہی خوش کن خیالوں میں گم آئیوان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ خراٹے بھر رہا تھا۔

آنکھ کھلی تو اس کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ اطمینان سے اٹھا اور انگڑائی لی۔ ٹھنڈ کی ایک لہر جسم میں داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن دولت ملنے کے جوش سے گرم آئیوان اس سرد لہر کو نظر انداز کر گیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور باہر نکل کر بغلی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ سامنے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اس نے بیگ بغل میں دبایا اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی اندرونی جیب سے پنسل ٹارچ نکالی۔ دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ کھڑکھڑاتا ہوا کھل گیا۔ سامنے پہاڑی پتھروں سے بنا زینہ نیچے اتر رہا تھا۔ یہ سرنگ کا ایسا خفیہ راستہ تھا، جسے اس نے خود ایک سال پہلے دریافت کیا تھا۔ اس کا نام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ عدالت کے سامنے اور عقب میں خفیہ کیمرے لگے تھے۔ اس لیے عمارت سے باہر نکلنے کے لیے اس نے سرنگ استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی۔

آئیوان نے زینے پر پہلا قدم رکھا تو سیلن کا احساس اور بدبو اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ وہ وہیں کھڑا ہو گیا اور کھلے دروازے سے منہ نکال کر چند گہری سانسیں لیں اور پھر دروازہ کھینچ کر بند کرتے ہوئے ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔

گزشتہ سال طوفانی بارشوں کے باعث شہر کے اس حصے میں سیوریج کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ پلمبر بھی تھا۔ اسے ہی پانی نکالنے کی ذمے داری ملی تھی۔ تب آئیوان نے یہ راستہ دریافت تو کر لیا لیکن کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی وجہ اُس کی بدنیتی نہیں بلکہ کام سے کام رکھنے کی عادت تھی۔ آج یہی عادت اس کے لیے مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ امریکا میں کئی برس کی خواری کے بعد اب نہ صرف اس کا مستقبل سنورنے جا رہا تھا بلکہ اسے یقین تھا وہ روزا اور اس کی آنے والی نسل کے لیے بھی یہ بہتر مستقبل کی نوید ہے۔

سرنگ میں بہت زیادہ سیلن اور عجیب سی ناخوشگوار بو تھی۔ کئی جگہ سے عمارت کے درجنوں غسل خانوں میں پرانا رساؤ تھا۔ جس کی وجہ سے سرنگ کی اندرونی پتھریلی دیواروں سے بھی پانی رس رہا تھا۔ یہ دراصل تقریباً آدم جتنا گہری اور دو ہاتھ جتنی چوڑی سرنگ تھی جسے نکاسی آب کے مقصد سے بنایا گیا تھا۔ فرش پر جگہ جگہ پانی جمع تھا جس سے وہ چھپ چھپ کرتے گزر رہا تھا۔ اس کے سفید جوگرز خراب ہو رہے تھے۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ سب کچھ صرف تھوڑی دیر کے لیے تھا۔ سرنگ سے باہر ایک نئی زندگی کی پہلی رات منتظر تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی قسمت بھی کیا خوب ہے۔ نئی زندگی کا راستہ سیوریج کی دو سو سال پرانی بدبودار سرنگ سے ہو کر جا رہا تھا۔ وہ مسکرایا اور زیر لب بڑبڑایا۔ ”کل ایک نئی زندگی کا سورج طلوع ہوگا۔“ اچانک ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ لرز کر رہ گیا لیکن پھر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ زندگی میں پہلی بار وہ کوئی کام بالکل ٹھیک طریقے سے کر پایا تھا ورنہ ہر بار عین وقت پر ہونے والی کوئی نہ کوئی گڑبڑ سب کچھ تلپٹ کر دیتی تھی۔ وہ خوش تھا۔ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوا تھا سوائے اُن دونوں بھائیوں کی بات کے۔ اسے یقین تھا کہ اس بار بھی تقدیر اس کا ساتھ دے گی۔ اس نے منہ سے کبھی کسی کے سامنے اس منصوبے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ تقدیر ہمیشہ کی رہنے والا اُس

وقت اپنی تقدیر پر رشک کر رہا تھا۔

تقریباً بیس پچیس منٹ تنگ سرنگ میں چلتے رہنے کے بعد ایک جگہ وہ رکا اور غور سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ لوہے کی ایک سیڑھی لٹک رہی تھی۔ اس نے بیگ کندھے سے لٹکایا اور ٹارچ منہ میں دبا کر اوپر چڑھنے لگا۔ چند لمحوں بعد گٹر کا ڈھکن نگاہوں کے سامنے تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سیڑھی تھامی اور دوسرے سے ٹارچ بند کر کے جیب میں ڈالی۔ وہ اندھیرے میں اندر کی طرف سے گٹر کا ڈھکن کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں کوشش کامیاب ہوگئی۔

آئیوان نے ذرا سا ڈھکن کھسکا کر سر اوپر اٹھایا اور جہاں تک دیکھ سکتا تھا، نگاہ ڈالی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ وہ کچھ دیر تک خاموشی سے اطراف کی ٹن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ وہاں کسی کی موجودگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ اس نے بڑی احتیاط سے بنا آواز پیدا کیے ڈھکن ایک طرف کھسکایا۔

تاروں بھرا آسمان سر پر تھا۔ وہ سٹی پارک کے ایک گوشے میں تھا۔ سردیوں کی رات میں اس وقت کسی کے پارک میں موجود ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ اس نے سر باہر نکالا اور اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد باہر نکل آیا۔ گٹر کا ڈھکن بند کیا اور نیم تاریک گوشے سے اطراف کا جائزہ لیا۔ حالات سازگار تھے۔ وہ بغلی دیوار اور درختوں کی قطار کے درمیان سے چھپتا چھپاتا آگے بڑھا۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے ایک سنسان حصے سے دیوار پھلانگی اور چند قدم چلنے کے بعد موڑ مڑا اور سڑک پر نکل آیا۔

وہ یونین اسکوائر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہاں سے میٹرو اسٹیشن کا رخ کرتا اور اپنے گھر کو چل دیتا۔ پھر آگے چل کر وہ ایک اسٹال پر رکا۔ شام کے تقریباً سبھی اخبارات میں ایک ہی جیسی سرخیاں لگی تھیں۔ ''سٹی کورٹ ہاؤس پر حملہ...... پولیس نے دونوں حملہ آوروں کو فرار ہوتے ہوئے پارک اسٹریٹ پر گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔'' اس نے ایک اخبار اٹھالیا۔

اگرچہ حالات خونی رخ اختیار کر گئے تھے لیکن یہ آئیوان کے منصوبے کا حصہ ہرگز نہ تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ میتاس اور اینڈریاز عدالت میں اسلحہ لہرائیں اور ایک دو ہوائی فائر کریں۔ اسے یقین تھا کہ یہی حرکت دونوں کو گرفتار کرانے کے لیے کافی ہوگی۔ اس نے دونوں سے کہا تھا کہ گولیاں چلنے سے خوف و ہراس پھیلے گا، بھگدڑ مچے گی۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ وہاں سے فرار ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں وہ مورتی نکال لے جائے گا۔ اس نے دونوں سے یہ بھی کہا تھا کہ

دونوں سے کہا تھا کہ ہم سب شام کو پارک میں شام پانچ بجے ملیں گے لیکن، وہ پولیس افسر سے سن چکا تھا کہ گولیاں چلنے سے لوگ زخمی بھی ہوئے اور ایک شخص موت و حیات کی کشمکش میں بھی مبتلا تھا۔

آئیوان صلح جُو قسم کا انسان تھا۔ خون خرابے سے سخت نفرت تھی۔ اسے دونوں بھائیوں کی موت پر سخت افسوس تھا۔ یقین تھا کہ عدالت میں فائرنگ ضرور اینڈریاز نے کی ہوگی۔ میتاس کی نسبت وہ سخت جھگڑالو، بددماغ اور غصیلا شخص تھا۔ اس وقت اسے اینڈریاز پر سخت طیش آرہا تھا۔ اگر وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتے تو چاہے دولت نہ ملتی لیکن وہ اس وقت کم از کم زندہ تو ہوتے، چاہے جیل میں ہی کیوں نہ ہوتے۔

اسے مورتی ملنے کی جتنی خوشی تھی، اس سے زیادہ افسوس برے وقت کے اپنے ہم وطن دوستوں کی موت کا ہو رہا تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے مورتی سے سخت نفرت محسوس ہونے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ مورتی نالے میں پھینک دے مگر اچانک روزنا کا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے سامنے آگیا۔ اس کے ساتھ ہی ماضی کی تکالیف اور اچھی زندگی کا خواب ایک سپنا بن کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور میٹرو اسٹیشن کی طرف بڑھنے لگا۔

ایک جگہ رک کر آئیوان نے کافی خریدی اور چسکیاں بھرتا ہوا چوراہا عبور کرنے لگا۔ وہ سڑک پر تین قدم ہی آگے بڑھا ہوگا کہ بغلی سڑک سے سائرن بجاتی ہوئی ایک تیز رفتار پولیس کار سگنل توڑتے ہوئے نمودار ہوئی۔ لگ رہا تھا کہ جیسے کسی مجرم کا تعاقب کر رہی ہو۔ آئیوان نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن نہ وہ سنبھل سکا اور نہ ہی کار ڈرائیور توازن برقرار رکھ سکا۔

آئیوان کو زوردار ٹکر لگی۔ وہ ہوا میں اچھلا اور اگلے ہی لمحے سڑک پر پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ کار رک چکی تھی۔ دو پولیس والے اس کے گرد کھڑے تھے۔ ایک وہی تھا، جس سے آئیوان نے عدالت میں بات کی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پولیس افسر زمین پر ساکت پڑے آئیوان کا چہرہ پہچان چکا تھا۔ ایمبولینس کے پہنچتے پہنچتے پولیس والے اس کی تلاشی لے چکے تھے۔ آئیوان کا عدالتی شناختی کارڈ پولیس والے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بیگ سے مورتی نکال چکے تھے۔ وہ دنیا سے جا چکا تھا...... خالی ہاتھ۔

آئیوان ساری زندگی عین وقت پر ہونے والی گڑبڑ سے ڈرتا تھا۔ ایک بار پھر آخری لمحے میں گڑبڑ ہوئی اور سب کچھ ختم ہو گیا۔

ہر شخص حالات کی سختیوں سے نجات چاہتا ہے... اور اس کے لیے اسے ایک چانس کی ضرورت ہوتی ہے... وہ بھی منتظر تھا کہ خوش قسمتی کے در وا ہوں... مگر ہمیشہ بے روزگاری اس کے ہمراہ رہی۔ کبھی کم اور کبھی زیادہ عرصہ... اب وہ تھک چکا تھا... چُور چُور تھا... کہ اچانک ہی قسمت کو اس پر رحم آگیا۔

چالِ مرگ

[illegible]

اُس صبح مارٹن مینز کو ایک بار پھر ملازمت سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ ایک سال کے دوران تیسری بار نکالا جانا اس کے لیے تو پریشانی کا سبب تھا ہی لیکن ایلینا کے لیے یہ خبر کسی بم سے کم نہ ہوتی۔ صبح سویرے دفتر سے نکلنے کے بعد اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ گھر جا کر بیوی کا سامنا کر سکے۔ اسے مزید پریشان کرنے سے تو بہتر تھا کہ گھر ہی نہ جایا جائے سو اس نے ایسا ہی کیا۔

مارٹن کی روکھی پھیکی زندگی میں کوئی رنگینی نہ تھی۔ بچپن میں ماں چھوڑ کر چلی گئی، باپ نے دوسری شادی کی اور وہ بے سہارا بچوں کے مرکز میں چلا آیا۔ یکسانیت بھری زندگی گزارنے کے باوجود اس کے لبوں پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ ایلینا سے شادی کر کے بہت خوش تھا۔ دونوں کی داستانِ حیات میں بڑی مماثلت تھی کہ مزاج بھی ایک جیسے تھے۔ قناعت اور انحصار کی دونوں میں ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

دونوں کا پچھلے پندرہ سال سے بہتر انداز میں نباہ ہو رہا تھا۔

ایلینا کے برعکس مارٹن کے دل کے کسی کونے میں پرتعیش زندگی گزارنے کی کمزور سی حسرت ضرور موجود تھی۔ کبھی کبھار یہ حسرت دبی چنگاری کی طرح سلگتی تو وہ اسے اپنے صبر سے بجھا دیا کرتا تھا۔ دولت کی خاطر جوانی کے دنوں میں وہ کافی تگ و دو بھی کر چکا تھا لیکن جب امیر بننے کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے تو اس نے بھی ہمت ہار دی۔ وہ اپنے حالات کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکا تھا۔ اگر اس کی ملازمت میں عدم استحکام نہ ہوتا تو شاید وہ انہی حالات میں زندگی کے دن پورے کر لیتا لیکن کیا کہیے کہ تقدیر نے کہیں ٹکنے ہی نہ دیا۔ وہ تو ہر جگہ یہی سوچ کر گیا تھا کہ بس ریٹائرمنٹ تک یہیں رہے گا مگر دو چار سال میں ہی کچھ نہ کچھ ایسا ہو جاتا کہ بے روزگاری اس کے گلے آ لگتی۔

تین چار سال میں ایک دفعہ آنے والی بے روزگاری کو تو وہ ہنسی خوشی کاٹ لیا کرتے تھے لیکن اس برس سے حالات کی گردش عجیب تھی۔ مارٹن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ تین مہینوں کے اندر وہ ایک بار پھر بے روزگار کیوں کر دیا جاتا ہے۔ خود ایلینا کے لیے بھی یہ صورت حال پریشانی کا سبب تھی۔ پچھلے دو برس سے ایلینا مارٹن کی محبت سے زیادہ اس کے معاش کی فکر میں گرفتار تھی۔ وہ چاہتا تو گھر جا کر یہ بری خبر سنا سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ صرف یہی کہے گی۔

”ایک بار پھر......“ اور ٹھنڈی سانس بھر کر کام دھندے میں لگ جائے گی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو ایک بار پھر نکالے جانے کی خبر سنتے ہی طعنوں کا ساتان کر شوہر پر پل پڑتی لیکن وہ ایسی نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس منحوس خبر کو سنا کر اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ ان کی جو کچھ جمع پونجی تھی، وہ بے روزگاری کے دن کاٹنے میں پہلے ہی صرف ہو چکی تھی، اب کیا ہوگا۔ یہی سوچ کر مارٹن نے گھر کے بجائے سڑک کی راہ لی۔

وہ کندھے پر پٹ سن سے بنا تھیلا لٹکائے یونین اسکوائر پر بے مقصد گھوم رہا تھا۔ صبح سویرے ہی مارٹن کے لیے ساتھ ہو جانے والی کمپنی کے لوگو والے تھیلے میں وہ سامان تھا جو فارغ کیے جانے کے بعد مارٹن نے اپنی میز سے سمیٹا تھا۔ اسے وقت گزاری کرنی تھی اور وقت کو گزرتے رہنا تھا، سو دونوں کا کام جاری و ساری تھا۔ وہ کام سے سیدھا گھر جانے کا عادی تھا۔ اس آوارہ گردی میں وقت کاٹے نہیں کٹ رہا تھا لیکن کیا کرتا، گھر جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ البتہ یونین اسکوائر پر بھی زیادہ دیر نظر انداز نہ کی جا سکی۔

بے مقصد گھومتے ہوئے وہ بدستور یہی سوچ رہا تھا کہ آخر تو آٹھ سالوں کے ساتھ ملازمتوں سے نکالے جانے کا سبب کیا ہے۔ وہ خود کو اس کا ذمے دار نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو کچھ ہوتا رہا ہے، اس میں دوسروں کا ہاتھ زیادہ ہے۔ وہ خود کو تسلی بھی دے رہا تھا کہ اس بار جو کچھ ہوا، وہ غیر یقینی نہ تھا۔ آج نہیں تو کل، ایسا ہونا ہی تھا مگر اتنی جلدی...... یہ بات اس کے لیے قابلِ برداشت ہرگز نہ تھی۔ یہ تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ اس کا باس بظاہر جتنا اچھا ہے، اندر سے اتنا ہی کمینہ۔ یہ بات اسے کمپنی کے دوسرے ملازمین کے ساتھ میل جول بڑھنے کے بعد اچھی طرح سمجھ آ چکی تھی۔ اس کی عادت تھی کہ اپنے ملازمین کو زیادہ دنوں تک ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اس طرح کے حالات پیدا کر دیے جاتے تھے کہ یا تو وہ خود ملازمت چھوڑ جاتے یا پھر نکال دیے جاتے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن جو بات مارٹن کو تکلیف دیے جا رہی تھی، وہ یہ کہ صرف سات مہینوں میں تیسری بار نوکری سے نکالا گیا تھا۔ اس کی مالی حالت اس قابل نہیں رہی تھی کہ بے روزگاری کے دن عزت سے بسر کر سکے۔

وہ ویک اینڈ تھا۔ مارٹن ایک بینچ پر بیٹھا مستقبل کی ہولناک پریشانیوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اسی دوران کم عمر لڑکے لڑکیوں کا ایک غول سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اگرچہ اس وقت اسکوائر پر کافی بھیڑ بھاڑ تھی لیکن جس طرح وہ شور مچاتے آ رہے تھے، اسے لگ رہا تھا کہ وہ ضرور کسی مذہبی یا ثقافتی رسم کو پورا کرنے نکلے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں وہ غول اس کے سامنے پہنچ گیا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ گاتے بجاتے آگے بڑھ جائیں گے لیکن وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر شور مچانے لگے۔ ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھا اوپر سے ان کا غل غپاڑا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر تنگ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے پہل تو وہ خاموش رہا، پھر بڑے پیار سے انہیں روکنے کی ہلکی پھلکی کوشش کی لیکن جب نہ مانے تو اس نے دُم دبا کر کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے ٹھہر کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے ایک بہت بڑا اسٹور تھا۔ دروازہ کھلا تھا اور ایک بہت خوبصورت عورت وہاں کھڑی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا کہ جیسے وہ کہہ رہی ہو ”آؤ...... مارٹن اندر آ جاؤ۔“ اسی دوران اس عورت نے ہاتھ سے اشارہ کیا [illegible] کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس نے [illegible] اس عورت کی

طرف متوجہ نہ تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بڑبڑایا۔''کون......''

عورت نے پھر اشارہ کیا۔ لگا کہ جیسے وہ اسی کو بلا رہی ہو۔ اس نے داہنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر اشارہ کیا جیسے پوچھ رہا ہو''کیا میں؟''

عورت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مارٹن اپنا تھیلا سنبھالتے ہوئے تیزی سے سڑک پار کرکے اسٹور کے گھومنے والے دروازے کی طرف بڑھا۔ مارٹن کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ چند قدم آگے بڑھی اور فٹ پاتھ کے کنارے کھڑی ہوگئی۔

''سوری...... مجھے لگا کہ شاید آپ مجھے ہی بلا رہی ہیں۔'' قریب پہنچتے ہی مارٹن نے نہایت مہذبانہ لہجے میں کہا۔ اتنا کہہ کر اس نے جلدی سے پیچھے کی جانب نظر دوڑائی۔ لڑکے لڑکیوں کا وہ غول اسی طرح شور مچاتے آگے بڑھ رہا تھا۔ ''شاید آپ ان میں سے کسی کو......'' اس کے لہجے سے بے یقینی صاف عیاں تھی۔

''شاید......'' اس عورت نے مارٹن کو بات مکمل ہی نہ کرنے دی۔ ''ان میں سے ہی کسی ایک کو۔'' عورت کا لہجہ خاصا مبہم تھا۔

مارٹن سمجھ نہ سکا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے، کسے بلا رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اطراف میں دیکھا۔ ہفتے کا آخری دن ہونے کی وجہ سے عام دنوں کی نسبت خاصی چہل پہل تھی۔ اس نے سامنے دیکھا لیکن کچھ سمجھ نہ سکا۔

وہ عورت کچھ دیر تک اسے غور سے دیکھتی رہی اور پھر آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''شکریہ......'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی۔ ''آخر تم سے ملاقات ہو ہی گئی۔'' اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ ''آؤ میرے ساتھ......'' وہ مارٹن کا ہاتھ تھام کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

مارٹن حیران تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ عورت کون تھی، کیوں اس سے ملنے پر شکر ادا کررہی ہے، وہ اس سے کیا چاہتی ہے۔ اس کے دماغ میں مختلف سوالوں کی آندھی اٹھنے لگی تھی۔ اسے یہ بھی خیال آرہا تھا کہ اتنے احترام سے ساتھ لے کر آگے بڑھنے والی یہ عورت کسی غلط فہمی کا تو شکار نہیں ہوئی۔ اس نے لاکھ ذہن پر زور ڈالا لیکن اسے یاد نہ آیا کہ وہ کبھی پہلے اس سے کہیں مل چکا ہے۔ وہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھی۔ اسی دوران وہ ریوالونگ دروازہ عبور کرکے ایک [illegible] میں داخل ہو چکے تھے۔

''سمجھ نہیں آتا کہ کیسے بتاؤں اس وقت تم سے مل کر مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے مارٹن کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ''اس وقت مجھے تمہاری اشد ضرورت محسوس ہورہی تھی اور دیکھو تم مجھے مل گئے۔''

کشمکش میں مبتلا مارٹن اس کے ساتھ ساتھ چل تو رہا تھا لیکن دماغ میں بہت سارے سوالات کلبلا رہے تھے مگر ان میں سے کسی ایک کا بھی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

''دفع کرو، جو بھی ہے خود پتا چل جائے۔ ہو جائے گی دور اس کی خوش فہمی۔'' یہ سوچ کر مارٹن نے تمام سوالوں کو ذہن سے جھٹکا اور عورت کے سراپا پر نظر ڈالی۔

درمیانہ قد، سنہرے بال، ستواں ناک، کتابی چہرہ، بھرے بھرے ہونٹ، گالوں میں پڑتے ڈمپل، مسکراتی سیاہ بڑی بڑی آنکھیں، عمدہ لباس زیب تن، سلیقے سے بنے بال، مہکتے پرفیوم کی بھینی بھینی خوشبو...... یہ سب مل کر اس عورت کے حسن کو چار چاند لگارہے تھے۔ مارٹن کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایسے وقت میں کہ جب وہ شدید پریشانی کا شکار ہے، کوئی حسین عورت یوں بے تابی سے اس کی منتظر ہوسکتی ہے۔ اسی دوران وہ کیش کاؤنٹر کے قریب سے گزرے۔ اس عورت نے بدستور مارٹن کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی تو اس نے مارٹن پر نظر ڈالی۔ ''میں جینی ہوں، یہاں کی منیجر......'' یہ کہہ کر لمحہ بھر توقف کیا اور دو چار قدم آگے بڑھائے۔ ''سچ پوچھو تو میں تمہاری بہت بڑی پرستار ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لبوں پر کھلتی مسکراہٹ اور آنکھوں سے جھلکتی مسرت صاف عیاں تھی۔

جینی کی بات سن کر تو جیسے مارٹن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اسے سمجھ نہیں آیا کہ تقدیر کیا کھیل شروع کرچکی ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک ملازمت سے نکال باہر کیے جانے تک، اس نے ایسا کوئی بھی کام نہیں کیا تھا کہ جس پر کسی دوسرے کو تو چھوڑیے، وہ خود اس پر فخر کرسکے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ضرور کوئی غلط فہمی پیدا ہوچکی ہے ورنہ کہاں جینی جیسی حسین عورت اور کہاں میں۔ وہ اپنی سوچ میں ڈوبا اس کے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا آگے بڑھتا جارہا تھا۔

[illegible] ابھی وہ انہی سوچ میں ڈوبے

ہوئے تھے۔" جینی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے ایک قدم پیچھے تھا۔ لگتا تھا کہ اگر جینی نے ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ جہاں ہوگا، وہیں تھم جائے گا۔

مارٹن نے آہستہ سے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ "آئی ایم سوری، لیکن......"

"لیکن ویکن چھوڑیے، ہماری خوش قسمتی دیکھیے کہ آپ ہمارے درمیان اس طرح غیر متوقع طور پر آ گئے ہیں۔ ہمیں آپ کی آمد کا تو پتا تھا لیکن آپ یوں پہنچیں گے، ایسا سوچا نہ تھا۔"

جب سے وہ اسٹور کے اندر داخل ہوا، تب سے وہ خاموش رہ کر ساری صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن اب لگا کہ بس بہت ہو چکی۔ "اصل بات یہ ہے مس جینی کہ......" اس نے معاملہ صاف کرنے کی ایک اور کوشش کی۔

ایک بار پھر اس نے مارٹن کی بات تیزی سے کاٹی۔ "میرے خیال میں آج آپ اس ملاقات کے لیے تیار نہیں ہوں گے مگر چھوڑیے ساری باتیں۔ اب آپ آ گئے ہیں تو سمجھیں آج کے دن کا پلان یہی تھا۔ ویسے بھی جو پلان ہے، وہ پبلشر کی طرف سے آپ کو ای میل کیا جا چکا تھا۔"

مارٹن ہکا بکا رہ گیا۔ "یہ بیچ میں اب پبلشر، پلان اور ای میل کہاں سے آ گئے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

اس دوران وہ زینے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ "اوپر چلیں۔" پہلی بار اس نے مارٹن کا ہاتھ چھوڑ کر اسے سیڑھیوں پر قدم رکھنے کا اشارہ کیا۔ مارٹن نے نظریں گھمائیں۔ یہ مین ہٹن کے مشہور ڈیپارٹمنٹل اسٹورز میں سے ایک تھا۔ وہ پہلی بار یہاں آیا تھا۔ اس سے پہلے اگر آنے کی سوچتا، تب بھی نہ آتا۔ یہاں دستیاب سامان اس جیسے کی ضرورتوں اور قوتِ خرید، دونوں کی پہنچ سے باہر تھا۔

"چلیے نا......" جینی نے اسے آہستگی سے زینے کی طرف دھکیلا۔ "لوگ پیچھے کھڑے اپنی باری کے منتظر ہیں۔"

"سوری......" اس نے مڑ کر عقب میں کھڑے دو تین گاہکوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور تیزی سے زینہ چڑھنے لگا۔ جینی بھی اس کے ساتھ ساتھ قدم اٹھا رہی تھی۔

مارٹن جیسے ہی اس وسیع و عریض اسٹور کی پہلی منزل پر پہنچا، دم بخود رہ گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ ناولوں کے عین سامنے ایک قدِ آدم تصویر کا بہت بڑا پوسٹر لگا تھا۔ تصویر میں جو خوش باش اور خوش پوش شخص کھڑا تھا، وہ ہو بہو مارٹن کا ہم شکل تھا۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا، مارٹن تو صرف اس کا خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ پہلی بار وہ سخت پریشان ہوا۔ اسے لگا کہ بات صرف غلط فہمی تک محدود نہیں بلکہ اس سے کہیں آگے کی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ وہ چکرا کر رہ گیا تھا۔ پاؤں جیسے فرش میں پیوست ہو گئے ہوں۔ وہ ہونقوں کی طرح پوسٹر دیکھے جا رہا تھا۔

مارٹن کے ہم شکل نے خاصا مہنگا اور جدید تراش خراش کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے ہاتھ میں نہایت قیمتی سن گلاسز پکڑے ہوئے تھے، جب کہ کلائی میں نہایت مہنگے برانڈ کی ہیرے جڑی سنہری گھڑی تھی۔ سیاہ جوتے بھی بہت مہنگے لگ رہے تھے۔ سنہرے بالوں والے اس شخص کی شکل ہی نہیں بلکہ عمر، بالوں، آنکھوں کا رنگ، چہرہ مہرہ...... مارٹن اور اس میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر یہ تصویر اس کی سادہ لوح بیوی دیکھ لے تو وہ بھی پہلی نظر میں شاید اپنے شوہر اور اس شخص کے درمیان کوئی فرق تلاش نہیں کر سکے گی۔

مارٹن کی نظریں قدِ آدم پوسٹر پر تیزی سے بھٹک رہی تھیں۔ اچانک اس کی نظریں پوسٹر پر سب سے نیچے پڑیں۔ "مارٹن کرسٹائنز......" اس نے تصویر کے نیچے لکھے نام کو زیرِ لب دہرایا۔

مارٹن کرسٹائنز ڈنمارک سے تعلق رکھنے والا ایک ادیب تھا، جس کے تحریر کردہ تینوں ناولوں نے پورے اسکینڈے نیویا میں دھوم مچا دی تھی۔ فروخت کا ملکی ریکارڈ بنانے والے تینوں ناول دراصل ایک ہی موضوع کا تسلسل تھے۔ سیاست، سازش، اختیار، طاقت اور عورت کے کرداروں پر مبنی ناولوں کے اس سلسلے پر کئی ڈرامے بھی بن چکے تھے۔ ان ڈراموں سے نہ صرف مصنف بلکہ اس کے کرداروں کو بھی خوب شہرت حاصل ہوئی تھی۔ تینوں ناولوں کے کردار ایک ہی تھے: سازشی ذہن کا مالک مشہور اور طاقتور سیاستدان اسٹیگ لارسن، سازش کے تانے بانے بننے والا جینیفر ے ڈیور، ان سب کی غیر قانونی سرگرمیوں کو قانون کی ڈھال فراہم کرنے والا وکیل اینڈریو اور حسن کے جلوے دکھا کر سب کو تباہی کے منہ میں دھکیلنے والی فتنہ گر حسینہ سینڈرا ابرانڈز۔ ان سب کو ملا کر جو تصویر بنتی ہے وہ ہے مارٹن کرسٹائنز کے ناول۔ یہ وہی تھا جس کی تصویر کے سامنے اس کا ہم شکل مارٹن مینز حیرت کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ جینی نے مسکراتے ہوئے پیار سے اس کا بازو تھام رکھا تھا۔

مارٹن کرسٹائنز نے امریکا میں تعلیم و تربیت حاصل کی

تھی۔ اس کا لب ولہجہ، انگریزی زبان کی روانی اور اٹھنے بیٹھنے کا انداز بالکل امریکیوں کا سا تھا۔ اسکینڈے نیویا میں دھوم مچانے کے بعد، ان دنوں وہ چند معروف امریکی ناشرین کی دعوت پر ادبی دورہ کررہا تھا۔ مارٹن جس تصویر کے سامنے کھڑا تھا، دراصل وہ اسی دورے کی تشہیری مہم کا حصہ تھی۔

اگرچہ امریکا میں اس کا ناول پہلی بار شائع ہونے جارہا تھا لیکن ڈنمارک میں شائع ہونے والے اس کے ناولوں نے تہلکہ مچادیا تھا۔ پوری اشرافیہ اس کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑی تھی۔ اگرچہ اس نے صاف صاف اظہار لاتعلقی کرتے ہوئے اپنے ناولوں کو سو فیصد فکشن قرار دیا تھا لیکن پڑھنے والے جانتے تھے کہ وہ خالص حقیقت پر مبنی تھے اور فرضی کرداروں کے پیچھے چھپائے گئے لوگ اس بات سے سخت پریشان تھے۔ خود وہ بھی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر امریکا میں پذیرائی ملی تو وہ جان بچانے کے لیے واپس جانے کا سوچے گا بھی نہیں۔

''کیا ہوا.....'' مارٹن کو تصویر میں کافی دیر تک کھویا دیکھ کر جینی نے آہستہ سے کہا۔ اس کا انہماک دیکھ کر وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہوکر کھڑی ہوگئی تھی۔

مارٹن نے گردن گھما کر جینی کی طرف دیکھا۔ اس کے برابر دو اور نوجوان لڑکیاں کھڑی تھیں۔ دونوں بلا کی خوبصورت تھیں۔ اسے اپنی طرف متوجہ پاکر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔ مارٹن بھی اخلاقاً مسکرادیا۔ انہوں نے ایک جیسے منی اسکرٹ اور سرخ ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔

''میں کلاٹش..... اور میں لنگی.....'' دونوں نے ایک ساتھ اپنا تعارف کرایا اور پھر زور سے ہنس پڑیں۔ حیرت انگیز طور پر ہنسنے کے دوران ان کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپل بھی ایک جیسے ہی تھے۔

مارٹن نے جینی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مسکرارہی تھی۔ اسی دوران کلاٹش نے بے تکلفی سے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ''مسٹر مصنف.....''

وہ مڑا اور سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

کلاٹش کبھی تصویر اور کبھی اس کے سراپا کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھے جارہی تھی۔ ''خوبصورت تصویر.....'' چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے کہا اور ایک نظر پھر مارٹن کے سراپا پر ڈالی۔ ''لیکن تم اپنی تصویر کے مقابلے میں کچھ زیادہ مختلف نظر آرہے ہو۔'' اس کے لہجے میں شک نہیں تھا، لگتا تھا کہ اس نے بر سبیل تذکرہ یہ بات کہہ دی ہو۔

مارٹن مسکرایا اور پہلے تصویر کی طرف، پھر اپنے اوپر نظر ڈالی۔ واقعی صاحب تصویر کے مقابلے میں تو اس کا لباس دو کوڑی کا بھی نہ تھا۔ اس نے نہایت عام جینز، شرٹ اور بے استری کا کوٹ پہن رکھا تھا۔ کندھے سے لٹکتا پٹ سن کا تھیلا بھی ایسا ہی تھا جسے اکثر سودا سلف لانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے لبوں پر کھسیانی سی مسکراہٹ طاری ہوگئی۔

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا۔'' کلاٹش نے تیزی سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ شاید وہ اس کے تاثرات بھانپ چکی تھی۔ ''دراصل تم تصویر کے مقابلے میں زیادہ اچھے نظر آتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

''دیکھیے.....'' مارٹن نے ان کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے کچھ کہنا شروع ہی کیا تھا کہ اس کی جینی پر نظر پڑی اور پھر اس کا ارادہ بدل گیا۔ ''تصویر نظر کا دھوکا ہے۔'' اس نے زیر لب فلسفیانہ لہجے میں کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جینی کی غلط فہمی دور کرنے کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن ان لڑکیوں کے سامنے یہ بات کہی تو ان کا دل بھی ٹوٹ سکتا ہے اور کسی کا دل توڑنے کی ہمت اس کے اندر نہ تھی۔

اسی دوران کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ ان میں مرد و عورت، دونوں ہی تھے۔ انہی میں ایک سرخ بالوں والا ڈھلتی عمر کا ایک مرد بھی تھا۔ مارٹن خاموش ہوا تو وہ آگے بڑھا اور اپنے ساتھ موجود دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ہم آپ کے ناولوں کے امریکن پبلشر کی طرف سے آئے ہیں۔ اس دورے میں ہم ہر جگہ آپ کے ساتھ ہوں گے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔

مارٹن بدستور خاموش رہا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''تو اب بتائیے کہ آپ کو کیا کیا چاہیے، کچھ بھی.....'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ''آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، بس بات منہ سے نکالیے۔ ہر فرمائش پلک جھپکتے پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔'' اس کا لہجہ تابعدارانہ تھا۔

کلاٹش بڑے غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو اس نے مسکرا کر پہلے مارٹن اور پھر اس شخص پر نظر ڈالی۔ ''ابھی ابھی آپ نے مسٹر مارٹن سے کیا کہا تھا..... کچھ بھی..... ''منچلی سی لب و لہجے میں یہ کہہ کر وہ حسب عادت زور سے ہنس پڑی۔

مارٹن گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی دوران اسپیکر کی تیز آواز اس کے کانوں میں پڑی، جس سے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے نگاہیں اٹھائیں تو جینی میگا فون ہاتھ میں لیے کھڑی تھی۔

"ہم آپ سب کو بخوشی اطلاع دیتے ہیں کہ ڈنمارک کی مقامی زبان میں لکھے گئے اسکینڈے نیویا کے تین ناولوں پر مشتمل سیریز اب انگریزی میں شائع کی جارہی ہے اور اس سلسلے کا پہلا ناول آج سے مارکیٹ میں دستیاب ہوگا۔ ہم سب سے پہلے اس ناول کو اپنے اسٹور سے فروخت کے لیے پیش کررہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔

اس اعلان کے بعد لوگوں کی ایک چھوٹی سی بھیڑ جینی کے گرد جمع ہوچکی تھی۔ اس نے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور کسی ماہرانہ ٹی وی میزبان کی طرح اس کی طرف اشارہ کیا۔ "تو ملیے بیسٹ سیلرز ناولوں کے مصنف اور اسکینڈے نیویا کے مشہور ترین ادیب مسٹر مارٹن کرسٹائنز سے۔ ہم انہیں آج یہاں دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتے ہیں۔"

مارٹن نے سامنے نظر ڈالی۔ وہاں ایک چھوٹا سا آڈیٹوریم بنا ہوا تھا۔ کافی سارے لوگ آکر اپنی نشستیں سنبھال رہے تھے۔ وہ خالی نگاہوں سے کبھی جینی اور کبھی ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ ان کی زبانی ناول کے اقتباسات سن سکیں گے، سوالات پوچھ سکیں گے اور ان کے دستخطوں والی کتاب خریدنے کا بھی یہ سنہری موقع ہے۔" جینی کہہ رہی تھی۔

وہ خاموش ہوئی تو کلاشن کی کھلکھلاتی ہنسی ایک بار پھر سنائی دی۔ مارٹن نے اسٹور کے شیشے کی دیوار سے سامنے سڑک پر نظر ڈالی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کہیں سے اصلی مارٹن دوڑتا ہوا اندر آئے گا اور حقیقت سب پر آشکار ہوجائے گی لیکن کوئی نہ آیا۔ جسے وہ غلط فہمی سمجھ رہا تھا، اب مصیبت بن کر اس کے گلے میں ڈھول کی طرح پڑ چکی تھی۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ وہ جینی سے میگا فون لے کر لوگوں کو حقیقت بتانا چاہتا تھا۔

مجمع خاموش تھا۔ انہوں نے پہلی بار اس ادیب کا نام سنا تھا۔ جینی کے گرم جوش اعلان کے بعد وہاں موجود لوگوں کا تجسس بڑھ گیا تھا۔ اب وہ اسے سننا چاہتے تھے۔ وہ آگے بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میگا فون تھام کر کچھ کہتا جینی نے ایک کتاب اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ مارٹن نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ یہ مارٹن کرسٹائنز کے پہلے ناول کا تازہ ترین شائع شدہ نسخہ تھا۔

"اب مسٹر مارٹن آپ کو اپنے ناول کے پہلے باب میں سے چند اقتباسات پڑھ کر سنائیں گے۔"

مجمع نے تالیاں بجائیں۔

"بہتر ہے کہ آپ نشستوں پر تشریف رکھیں۔" جینی کے اس اعلان کے بعد وہاں کھڑے باقی لوگ بھی نشستوں پر براجمان ہوگئے۔

مارٹن سخت کشمکش میں تھا۔ جب وہ آگے بڑھ کر ڈائس تک پہنچنے کے بجائے کچھ دیر تک کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں ہی منہمک رہا تو جینی آگے بڑھی اور مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "لوگ آپ کے منتظر ہیں مسٹر مارٹن کرسٹائنز......"

"لیکن میں وہ......" اس نے ایک بار پھر حقیقت بیان کرنے کی ناکام کوشش کی۔

"آپ نہایت پُراعتماد شخصیت ہیں تو پھر یہ شرمانا کیسا۔" جینی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈائس کی طرف کھینچا۔

ڈائس پر پہنچ کر مارٹن نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی۔ لوگ اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ شادی کے شروع شروع کے سالوں میں وہ اکثر رات کو اپنی بیوی کو بلند آواز سے کتابیں پڑھ کر سناتا تھا لیکن اب برسوں ہوئے یہ عادت تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ کتابیں تو وہ اب بھی پڑھتا تھا مگر یہ اس کا بیڈروم نہ تھا۔ اب اس کا سارا اعتماد [illegible] ہوچکا تھا۔

"پلیز سر...... پڑھنا شروع کیجیے۔" جینی نے ایک بار پھر مداخلت کی۔

وہ جان چکا تھا کہ اقتباسات پڑھے بغیر جان چھڑانا ممکن نہیں۔ گلے پڑے ڈھول کو آخر اسے ہی بجانا تھا۔ سو اس نے بڑی ہمت کر کے کتاب کے ورق الٹے پلٹے اور پھر ایک باب پر رک گیا۔ اس نے حاضرین پر گہری نظر ڈالی۔ "تو یہ باب کچھ اس طرح شروع ہوتا ہے کہ......" اس نے ہمت کر کے پاٹ دار آواز میں پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ دوسری صف میں بیٹھی ایک عورت نے ہاتھ اٹھایا۔

"کہیے، کیا کہنا چاہتی ہیں آپ......" جینی نے اس عورت کو مخاطب کیا۔

"مسٹر کرسٹائنز...... میں نے واشنگٹن پوسٹ کی ایک رپورٹ میں پڑھا تھا کہ آپ نے اپنے ناول میں بدکردار شیطان نما وکیل کا کردار پیش کیا ہے۔ بدعنوان سیاستدانوں کو [illegible] کے شیطان وکیلوں سے کس طرح

بچایا جاسکتا ہے۔'' سوال پوچھنے والی عورت کی آواز ہلکی سی کپکپا رہی تھی۔

مارٹن کو ایڈونچرز اور جاسوسی کے موضوعات پر مشتمل ناولوں کے مطالعے کا تو شوق تھا لیکن وہ مارٹن کرسٹائنز کے نام سے بالکل ہی ناواقف تھا۔ اسے علم ہی نہیں تھا کہ مصنف اپنے وکیل کردار کو کس طرح پیش کرتا رہا ہے۔ وہ ڈائس پر مائیکروفون کے سامنے بالکل خالی الذہن کھڑا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ آخر اس نے سرگوشیاں کرتے مجمع پر طائرانہ نظر ڈالی اور ہلکے سے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

''بہت سادہ سی بات ہے۔ خدا نے رویوں کے ذریعے دوسروں کو شناخت کرنے کی صلاحیت ہمیں دی ہے۔'' اس نے بڑے اعتماد سے اندر کے خوف پر قابو پاتے ہوئے جواب دینا شروع کیا۔ ''نیکی اور بدی لاکھ چھپائیں مگر چھپ نہیں سکتی ہیں۔ انسان اپنے رویے کے ذریعے اندر کے اصل انسان کی خصلت چھپانے کی لاکھ کوشش کرے لیکن پھر بھی ہم پہچان لیتے ہیں۔ اس حس کو پہچانیں، استعمال کریں۔ آپ میرے بدکردار وکیل جیسے لوگوں کو خود بخود پہچانتے چلیں جائیں گے۔ یوں وہ بے نقاب ہو کر دنیا کے سامنے آتے جائیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے گہری سانس لی اور ہلکی سی مسکراہٹ سے جینی کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن دکھائی دے رہی تھی۔

یہ سنتے ہی بلیک ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس شخص نے فوراً تالی بجائیں اور اسکے ہی لمحے وہاں موجود سارے لوگ اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ جینی ستائشی نظروں سے مارٹن کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد جب تالیاں تھمیں تو اس شخص نے کچھ پوچھنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

مارٹن نے اسے بولنے کا اشارہ کیا۔ ''سنا ہے کہ اب آپ واپس ڈنمارک نہیں جاسکتے۔ افواہیں ہیں کہ وہاں کے طاقت ور سیاستدانوں نے آپ کو قتل کرانے کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔''

مجمع خاموش تھا اور مارٹن اس شخص کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ کچھ دیر تک وہاں سناٹا رہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ خاموش کھڑا نہیں رہ سکتا، لوگ اس کا جواب سننا چاہتے ہیں اور اسے بہرحال میں کچھ تو کہنا ہی تھا۔ آخر اس نے بولنا شروع کیا۔ ''فی الحال تو میرا امریکا سے واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ویسے بھی میں یہاں زیادہ محفوظ ہوں۔'' اس کی آواز کچھ بلند تھی اور لہجے سے اعتماد صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ ''بڑے لوگ ہر جگہ ہیں۔ وہ کہیں بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ یہاں بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بعض اوقات مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ سیاست کا چلن ہے ہر جگہ، ہر ملک میں۔''

مجمع نے ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ جینی خوش نظر آ رہی تھی۔ مارٹن خوش تھا کہ وہ اپنا اتفاقی کردار بخوبی ادا کر رہا تھا۔ مجمع میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مارٹن نے اس امید سے ایک بار پھر سامنے کی طرف دیکھا کہ کہیں اصلی مارٹن کرسٹائنز تو نہیں آ گیا۔

شیشے کی دیوار کے پار سے سامنے کی سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ یکا یک وہ چونکا۔ سڑک پر چلتے راہگیروں کو چیرتا ہوا ایک شخص تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کا رخ اسٹور کی طرف تھا۔ مارٹن کو اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اس کی دور کی نظر بہت تیز تھی۔ لمحہ بھر میں پہچان گیا۔ وہ مارٹن کرسٹائنز تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا ہے اور وہ اس سے بچنے کی کوشش میں ہے۔ اس کا چہرہ پسینے میں شرابور اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ایک دم گاڑیوں کا ریلا آگیا۔ وہ بچتا بچاتا دوڑ رہا تھا۔ اسی دوران ایک بس سائڈ سے ٹکرائی۔ وہ سڑک پر منہ کے بل گرا، اچھل کر کھڑا ہوا لیکن خود کو زیادہ نہ سنبھال سکا۔ اگرچہ اس کے ٹکرانے کی آواز مارٹن سن نہ سکا تھا لیکن جس انداز سے اسے ٹکر لگی تھی، اس سے بخوبی سمجھ گیا کہ چوٹ شدید ہوگی۔ اس دوران مارٹن کرسٹائنز نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور لنگڑاتا ہوا اسٹور کی طرف بڑھنے لگا لیکن سڑک کے ایک کنارے پر گرگیا۔ مارٹن کی آنکھیں دہیں ٹکی تھیں۔ وہاں موجود لوگ سب خاموش تھے۔ کسی کو کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کیا دیکھ رہا ہے۔ شاید لوگ سمجھ رہے ہوں کہ وہ خیالوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایسا نہ تھا۔ وہ ایک کردار ادا کررہا تھا لیکن جیسے ہی اصلی شخص نظر آیا، وہ اپنے اس کردار سے علیحدہ ہوگیا۔ اس سے بھی بڑھ کر تشویش کی بات یہ تھی کہ ایک مشہور ادیب جس حالت کا شکار تھا، اس سے مارٹن کے رونگٹے کھڑے ہوچکے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے اور خود اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اچانک مارٹن نے ڈائس چھوڑا اور اسٹور کے داخلی دروازے کی طرف دوڑا۔ ان لمحوں میں اپنا پورا منصوبہ بنا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کی شناخت کے ڈھول کا پول کھلتا، اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب کیا کرنا ہوگا۔

مارٹن ٹریفک کی پروا کیے بغیر لوگوں کو چیرتا ہوا بڑی تیزی سے سڑک پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ دوسرے لوگ سڑک پر پڑے مارٹن کرسٹائنز کی مدد کو آتے، وہ اس تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ بس کی ٹکر سے وہ منہ کے بل سڑک پر گرا تھا۔ چہرے کا گوشت کئی جگہ سے بری طرح پھٹ چکا تھا۔ اس کا چہرہ بظاہر ناقابلِ شناخت لگ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ لباس بھی اس کے لہو سے تر ہوتا جارہا تھا۔ جائے وقوع پر لوگ جمع ہوتے جارہے تھے۔ ٹریفک بھی تقریباً رک چکا تھا۔

مارٹن نے زخمی ادیب کو گود میں لٹا کر فٹ پاتھ پر لٹایا اور اس کی ٹائی ڈھیلی کرکے کالر کے بٹن کھولنے لگا۔ اردگرد مجمع لگ چکا تھا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑ چلی تھیں۔

اس دوران مارٹن چلایا۔ ''ایمبولینس کو فون کرو۔''

فون تھامے کئی ہاتھ اس کی طرف بڑھے لیکن وہ انہیں نظر انداز کرکے زخمی مارٹن کی سانسیں بحال کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ اب ہجوم کی نظریں فون کرنے والے پر تھیں۔ اسی دوران مارٹن نے کمال ہوشیاری سے اپنا بٹوا اس کے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور غیر محسوس انداز میں اس کا بٹوا نکال کر اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ اس کی یہ حرکت کوئی نہ دیکھ سکا۔ سب کو زخمی شخص سے ہمدردی تھی اور وہ مارٹن کے کردار کو مستحسن نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

زخمی مارٹن فٹ پاتھ پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ وہ اس کے سینے کو دبا رہا تھا۔ اسی دوران ایمبولینس کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور افسوس سے گردن ہلائی۔ ''اب کچھ نہیں ہوسکتا، یہ مرگیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی پتلون جھاڑی، لباس درست کیا اور ہاتھ ملتا ہوا واپس بک اسٹور کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے کئی لوگ بھی تھے جو تھوڑی دیر پہلے اس کی باتیں سننے کے لیے بک اسٹور میں موجود تھے۔

چہرے پر افسوس، چال میں اعتماد اور سر فخر سے بلند کیے ہوئے اسٹور میں داخل ہوا۔ جینی اس سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی۔ وہاں موجود لوگوں کے لیے ایک مشہور ادیب کا یہ انسان دوست کردار بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ ایک بار پھر ڈائس پر تھا۔ لوگوں کو سوالات کرنے کی اجازت دے رہا تھا۔ اس بار مارٹن کا لہجہ بہت پراعتماد تھا۔ اس کی شخصیت بہت مضبوط نظر آرہی تھی۔ اب سوالات کرنے والے شرکاء کے لہجوں میں بھی اس کے لیے احترام نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

تقریباً بیس منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور پھر جینی اپنی نشست سے اٹھی۔ ''خواتین و حضرات...... آپ سب کی آمد کا شکریہ۔ اس سیشن کا وقت ختم ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھی اور مارٹن کا ہاتھ تھام کر زینہ اترنے لگی۔ وہ اس حصے میں پہنچی جہاں تازہ شائع شدہ ناول کے نسخوں کا ایک بڑا سا ڈھیر میز پر رکھا تھا۔ ''پلیز......'' جینی نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

مارٹن نے گردن گھمائی۔ اس کے دستخطوں والی کتاب کے خریداروں کی لمبی قطار لگی تھی۔ سب سے آگے کھڑی نیلی آنکھوں والی خوبصورت لڑکی نے ایک کتاب اٹھائی اور

مارٹن کے سامنے رکھی۔ ”ایک یادگاری نوٹ کے ساتھ۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

اس نے کتاب کی پرنٹ لائن والا صفحہ کھولا اور ایک سوالیہ نظر لڑکی پر ڈالی۔

”میری......“ اس نے جلدی سے نام بتایا۔

”نیلی آنکھوں اور سنہری بالوں والی میری کے لیے بصد خلوص...... مارٹن۔“ اس نے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔

یہ خاصا صبر آزما اور محنت طلب کام تھا۔ وہ ایک ایک کر کے کتاب پر دستخط کرتا رہا۔ کبھی کوئی فرمائش کر دیتا تو ایک آدھ فقرہ بھی لکھ دیتا۔ اس کام میں ایک گھنٹا مزید گزر گیا۔ وہ سر جھکائے اپنا کام کرتا رہا۔

”اب کوئی باقی نہیں بچا۔“

مارٹن نے بنا دیکھے کتاب تھامنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو جینی نے حسب عادت مسکراتے ہوئے اس کا انہماک توڑا۔

”اور......“ مارٹن نے مسکرا کر سر اٹھایا اور دائیں جانب دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ میز پر رکھی کتابوں کا ڈھیر بھی بہت کم او نچا رہ گیا تھا۔ ”تھک گیا ہوں۔“ وہ جینی کی نگاہوں میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ”میری تو انگلیاں ہی سن ہو چکی ہیں۔“

”ابھی جان چھٹنے والی نہیں......“ یہ کہتے ہوئے اس نے وہاں رکھا انٹرکام اٹھایا۔ ”دو بلیک کافی۔“

”بلیک لیکن دودھ بھی ساتھ ہو۔“ مارٹن نے اضافہ کیا۔

جینی نے انٹرکام رکھا اور باقی بچی کتابیں اس کے سامنے رکھیں۔ ”اگر آپ برا نہ منائیں تو ان پر بھی دستخط کر دیں۔ یہ اسٹاک میں رہیں گی اور خاص قارئین کو بطور اعزاز پیش کی جائیں گی۔“

”کوئی بات نہیں......“ یہ کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر کتاب کے پرنٹ لائن والے صفحے پر اپنا نام لکھنے لگا...... مارٹن کرسٹائنز۔

”لگتا ہے آپ کی انگلیوں کو مساج کی ضرورت پڑنے والی ہے۔“ مارٹن فارغ ہوا تو جینی نے مسکراہٹ کے ساتھ بڑے پیار سے کہا۔

مارٹن مسکرا کر رہ گیا اور سامنے شیشے کی دیوار سے باہر کی طرف دیکھا۔ سڑک پر معمول کا ٹریفک بحال ہو چکا تھا۔ صرف چند پولیس والے جائے وقوع پر کھڑے تھے۔ جہاں

گدھا

کرائے دار نے مالک مکان سے کہا۔ ”یہ بہت ہی عالی شان مکان ہے، جناب! اس کا ماہانہ کرایہ دس ہزار روپے ہے اور ایک سال کا کرایہ پیشگی ادا کرنا ہوگا۔“

”لیکن اس میں اصطبل نہیں ہے۔“ کرائے دار نے کہا۔

”اصطبل...... وہ کس لیے؟“ مالک مکان نے کہا۔

کرائے دار نے کہا۔ ”اس گدھے کے لیے جو یہ ایڈوانس کی شرط پر یہ مکان لے گا۔“

انتخاب، خالد اقبال راؤ، L-2/1 ون ایل

مارٹن کرسٹائنز نے دم توڑا تھا، وہاں زرد ربن سے کرائم سین کو محفوظ بنا کر تفتیش کی جا رہی تھی۔

کافی پینے کے دوران امریکی پبلشر کی طرف سے متعین کردہ منیجر بھی آ گیا۔ وہ خاموشی سے جینی کے برابر کی کرسی پر بیٹھا تھا۔

”تو اب آگے کا کیا پلان ہے؟“ مارٹن نے خالی کپ میز پر رکھا تو جینی نے پوچھا۔

”میرا خیال ہے مسٹر مارٹن بہت تھک چکے، بہتر ہے اب ہم انہیں ان کے لگژری ہوٹل پہنچا دیں، جہاں پہلے سے ہی ان کے لیے ایک بہترین سوئٹ بک کیا جا چکا ہے۔“ اس سے پہلے کہ مارٹن کچھ کہتا، وہ شخص جلدی سے بولا۔

مارٹن بالکل خاموش تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ غلط فہمی سے شروع ہونے والا کھیل نو ایک نئے موڑ میں داخل ہو چکا لیکن آگے کیا ہوگا، اس بارے میں اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جیسے منیجر نے کہا، وہ ہوٹل کی راہ لے اور اپنی اب تک کی پرانی زندگی کو بھول کر ایک نئی پرتعیش اور مصنوعی زندگی شروع کرے یا پھر سب کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھر کی راہ لے اور جو کچھ ہوا، اسے خواب یا کھیل سمجھ کر بھول جائے۔ وہ ان دونوں میں سے کس کو اپنائے، اب تک وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے ہو۔“ جینی نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔

مارٹن ادھیڑ عمر اور شادی شدہ شخص تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کی مالی حالت دیکھتے ہوئے جینی جیسی کوئی حسینہ اس پر نظر التفات ڈال سکتی ہے لیکن یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اب وہ معروف ادیب تھا۔ اس نے جینی کی نگاہوں میں جھانکا۔ ”آپ ہوں تو پھر کس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔“ مارٹن رومینٹک ہو رہا تھا۔

[illegible] اس کے اعزاز میں ہوٹل کے اندر ہی

ایک تقریب کا اہتمام ہے۔'' سرخ بالوں والے منیجر جیمز نے مداخلت کی۔ ''بہتر ہے کہ مسٹر مارٹن اب ہوٹل جا کر آرام کر لیں تاکہ رات کی تقریب کے لیے تازہ دم ہو سکیں۔''

''تو پھر مسٹر مارٹن ہوٹل جانے کے بجائے کیوں نہ کہیں باہر لنچ پر چلیں۔'' جینی نے جلدی سے کہا۔ ''یہ ذاتی طور پر میری طرف سے ہوگا۔''

مارٹن سوچ میں پڑ گیا۔

جینی نے گردن موڑی۔ منیجر کے ساتھ دو خوبصورت لڑکیاں بھی تھیں۔ ''تم دونوں کو مسٹر مارٹن کے دورے کے دوران ان کے ساتھ رہنا ہے لیکن بہتر ہوگا کہ فی الحال اس دوپہر انہیں کچھ وقت کے لیے تنہا چھوڑ دیں۔'' اس کا لہجہ حاکمانہ تھا۔

''اوکے......'' ان میں سے لمبے سنہرے بالوں والی لڑکی نے مسکرا کر بات مان لی۔ اس نے ایک چٹ اس کی طرف بڑھائی۔ ساتھ ہی ہوٹل کا کارڈ اور سوئٹ کی چابی بھی تھی۔

مارٹن نے چابی کوٹ کی جیب میں رکھی اور چٹ پر نظر ڈالی۔ ''آپ کی دوپہر خوش گوار گزرے، شام کو ملتے ہیں۔'' اس نے کاغذ کوٹ کی جیب میں اڑسا اور ایک لمحے کے لیے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ وہ قدرت کے کھیل پر غور کر رہا تھا۔ آج صبح دس بجے اسے ملازمت سے نکالا گیا۔ گیارہ بجے وہ اسٹور میں داخل ہو رہا تھا۔ بارہ بجے ایک زخمی شخص کی زندگی بچانے کی کوشش نے اسے لوگوں کی نظر میں ہیرو بھی بنا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی شناخت بھی تبدیل کر چکا تھا۔ پرانی شناخت کا حامل اب مردہ خانے میں تھا اور وہ اب ایک حسینہ کے ساتھ زندگی کا پہلا اور مہنگا رومینٹک لنچ کرنے جا رہا تھا۔ آج صبح جب وہ دفتر پہنچا تو حکم کا بندہ تھا اور دوپہر ہوتے ہوتے لوگ اس کے حکم کا انتظار کرنے لگے تھے۔ وہ آفت خیز جینی کو اپنی بانہوں میں بھرنے کا سپنا دیکھ رہا تھا۔ ''واہ رے اوپر والے، تیرے کھیل نرالے ہیں۔'' وہ دل ہی دل میں تقدیر کے حسین کھیل پر مسکرایا اور گردن سیدھی کی۔ جینی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ سنہری بالوں والی لڑکی کی نگاہیں بھی اسی پر مرکوز تھیں۔

کچھ دیر بعد جینی اور وہ اٹھے۔ پبلشر کا اسٹاف جا چکا تھا۔ جینی اس کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر پلٹی۔ ''ایکسکیوز می...... ایک منٹ......'' کہہ کر وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھی اور وہاں کھڑی لڑکی سے کچھ کہنے لگی۔ کہیں۔ وہ اتنی نیچی آواز میں بات کر رہی تھی کہ مارٹن سن نہ سکا۔ وہ پلٹی تو اس کے پاس ایک خوبصورت براؤن کلر کا چرمی ہینڈ بیگ تھا۔ ''پلیز...... یہ لیں۔ اپنی چیزیں اس میں ڈال لیں اور اس تھیلے کو کچرے کے ڈبے میں پھینک دیں۔'' اس نے پٹ سن کے تھیلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... شکریہ اس تکلف کا۔'' مارٹن نے ہینڈ بیگ لیا اور ایک طرف ہو کر اپنی چیزیں بیگ میں اس طرح ڈالنے لگا کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ ''اب چلیں۔'' وہ پلٹا اور جینی سے کہا۔

''یہ اچھا لگ رہا ہے، تمہاری حیثیت کے مطابق ہے۔'' جینی نے پیار سے اس کے کندھے سے لٹکتے بیگ پر ہاتھ پھیرا۔ اگلے ہی لمحے وہ اسٹور سے باہر تھے۔

دونوں خاموشی سے کچھ دوری پر دائمی ہوٹل ڈیلو کے شاندار ریستوران کی طرف جا رہے تھے۔ اس بار مارٹن نے بڑے پیار سے جینی کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ چلتے ہوئے ان کے شانے ٹکرا رہے تھے لیکن جینی کو یہ بُرا نہیں لگتا تھا کہ اسے اس طرح چلنا کچھ بُرا محسوس ہو رہا ہو۔ وہ دونوں خاموشی سے چھوٹا چال چلتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

مارٹن اب مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس صبح جو بات اسے غلط فہمی لگی تھی، اب وہ ایک حقیقت ہے۔ وہ حقیقت کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگلے تین برسوں میں تین ناول شائع ہونے ہیں۔ ایک ہو چکا اور اگلے دو سالوں میں کے بعد دیگرے شائع ہونے والے ناولوں کے مسودے تیار تھے جن سے اسے کروڑوں ڈالرز کی آمدنی حاصل ہوتی اور وقت گزاری کے لیے ان کے پاس تقریبات کا آپشن بھی تھا۔ وہ خوش تھا کہ کرنے کو کچھ نہیں البتہ اچھا وقت گزارنے کے لیے ڈھیروں مواقع موجود ہیں۔ اب اسے زندگی سے لطف لینا تھا۔ اس نے پوری زندگی کسمپرسی میں گزاری تھی مگر اب کھل کر جینے کا مزہ آنے والا تھا وہ بھی جینی کی ہمراہی میں۔ خوش کن مستقبل اس کے ذہن کے پردے پر بار بار منظر تبدیل کر رہا تھا۔ ہر منظر پہلے سے زیادہ شاندار اور جاندار تھا۔

اس کی غیر متوقع خوش نصیبی مارٹن کرسٹائنز کی بے وقت موت سے جڑی تھی ورنہ اسٹور میں پیش آنے والے تمام واقعات ایک خواب ثابت ہوتے اور آنکھ کھلنے پر مارٹن وہی بے روزگار شخص ہوتا مگر تقدیر پلٹا کھا چکی تھی۔ وہ تقدیر کا تہ دل سے شکر گزار تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ خود کو بھی اس کا کریڈٹ دے رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ

کر اسٹور سے نہ نکلتا اور دم توڑتے مارٹن کرسٹائنز کے بجائے
سے اپنا بوانہ بدلتا تو شاید اس کی چال اتنی پُراعتماد نہ ہوتی۔
اس نے تقدیر کی چال کا بروقت ساتھ دیا اور اب اپنی اس
پھرتی اور چالاکی پر خود کو دل ہی دل میں شاباشی بھی دے رہا
تھا۔ وہ خوش تھا کہ نہ تو پبلشنگ ہاؤس میں اور نہ ہی اسٹور میں
کوئی ایسا شخص تھا جو اس سے پہلے مارٹن کرسٹائنز سے مل چکا
ہو۔ وہ سب اسے صرف خط و کتابت کی حد تک یا ڈنمارک
میں پھیلی شہرت کے حوالے سے ہی جانتے پہچانتے تھے۔
ریستوران بہت خوبصورت تھا اور جس طرح وہاں کے
عملے نے انہیں خوش آمدید کہا، اس سے لگتا تھا کہ جینی اکثر و
بیشتر وہاں آتی جاتی رہتی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے تو مارٹن
ششدر رہ گیا۔ ہال کے اندر ہلکی زرد خوابناک روشنی پھیلی
تھی۔ ہر میز پر موم بتیاں رکھی تھیں، جس سے لنچ بھی کینڈل
لائٹ ڈنر کے احساس میں بدل جاتا تھا۔ ڈائننگ ہال
پھولوں کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ کھانے کی میزیں اس
طرح سیٹ کی گئی تھیں کہ ہر دو میزوں کے درمیان پھولوں کی ایک باڑ تھی۔ اس سے پرائیویسی کے ساتھ ساتھ
ذہن کو بھی خوش گوار احساس ہو رہا تھا۔ جینی اس کا ہاتھ تھام
کر پیچھے آگے بڑھتی اور نسبتاً ایک کونے میں لگی میز پر جا پہنچی۔
اس سے پہلے کہ وہ اپنی کرسیوں پر بیٹھتے، ایک ویٹر آگے
بڑھا اور باری باری دونوں کی کرسیاں گھسیٹ کر انہیں بیٹھنے کا
اشارہ کیا۔ مارٹن کے لیے یہ سب کچھ نیا تھا۔ پوری زندگی
محنت مزدوری میں گزر گئی تھی۔ ایسے شاندار ریستوران میں
لنچ یا ڈنر کا تو وہ صرف خواب ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جینی پر
نظر ڈالی۔ اسے شاید ہر وقت مسکراتے رہنے کی عادت تھی۔
اس کے لبوں پہ بکھرا ہلکا تبسم جیسے مارٹن کی جان ہی لے گیا۔
یکایک اس کے ذہن میں اپنی بیوی کا ہنستا ہوا چہرہ ابھرا مگر
اگلے ہی لمحے وہ سر جھٹک کر اس تصور کو کہیں دور پھینک چکا
تھا۔ اب وہ مارٹن میز کے بجائے مسٹر مارٹن کرسٹائنز تھا......
ڈنمارک کا مشہور و معروف ادیب و ڈراما نگار۔ وہ اپنی نئی
زندگی کی ان اولین سہولتوں اور جینی کو اپنی آغوش میں
بھر لینے کے سپنے میں اس قدر گم تھا کہ اسے ذرا بھی احساس
نہ ہوا کہ اسٹور سے نکلنے کے بعد سے متواتر دو آنکھیں ان کا
تعاقب کر رہی ہیں۔ اسے فی الحال جینی کے سوا کچھ اور
دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ شناخت بدل کر وہ یہ بھول کر بیٹھا
تھا کہ بس! اب سب ختم ہو گیا لیکن کھیل ابھی جاری تھا۔
''میری خوش نصیبی کہ ہم اکٹھے لنچ کر رہے ہیں۔'' جینی
نے ادائے دلربائی سے کہا تو وہ مسکرا کر رہ گیا [illegible]

''شاید یہ میری بھی خوش نصیبی ہے۔'' مارٹن نے ہاتھ
اس کے ہاتھ پر بڑے پیار سے رکھا۔
''اگر آپ امریکا میں ہی رہ گئے تو پھر خوش نصیبی کا یہ
سفر آگے بڑھتا رہے گا۔'' جینی نے پیار بھرے لہجے میں
کہا۔ اس کے لہجے سے لگتا ہے کہ جو کچھ مارٹن سوچ رہا تھا، وہ
بھی وہی سوچ رہی تھی۔
''میں اب امریکا کے سوا کہیں اور نہیں رہ سکتا مگر ایک
شرط ہے۔''
''وہ کیا......'' جینی نے پوچھا۔
''میں یہاں بالکل تنہا ہوں، اگر تم وعدہ کرو کہ ہر پل
ساتھ رہو گی تو پھر......'' مارٹن نے جان بوجھ کر بات ادھوری
چھوڑ دی۔
''تم چاہو تو پھر ایسا ہی ہوگا۔'' جینی کے لہجے سے محسوس
ہو رہا تھا کہ اسے مارٹن کی قربت بہت زیادہ پسند آ رہی ہے۔
''تو پھر سمجھو میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔''
مارٹن کی بات سن کر جینی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور پھر یکدم
اس کی ہنسی کو بریک لگ گئے۔ ''ذرا اپنا چہرہ قریب لاؤ۔''
مارٹن دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر آگے جھکا۔
''ذرا باتھ روم جا کر ہاتھ منہ دھو کر فریش ہو جاؤ۔
تمہارے چہرے پر دھبے لگ رہے ہیں۔ لگتا ہے یہ بس
والے حادثے......''
''اوہ ہاں......'' مارٹن چونک کر پیچھے ہٹا اور چہرے پر
ہاتھ پھیرنے لگا۔
''ٹھیک ہے تم فریش ہو کر آؤ، میں آرڈر دیتی ہوں۔''
ویٹر مینیو کارڈ لیے برابر میں کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں مارٹن پر
تھیں۔ ''ویسے تم کیا لینا پسند کرو گے؟'' جینی نے پوچھا۔
''تم یہاں تو آتی رہتی ہو گی۔ بس! جو اچھا ہو وہ
منگوا لو۔'' مارٹن نے بات بنائی ورنہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا
تھا کہ مینیو کارڈ میں جو کچھ لکھا ہوگا، کھانے میں ان کا ذائقہ
کیسا ہوگا۔ زندگی میں پہلی بار وہ اتنے مہنگے ریستوران میں
مفت کا لنچ توڑنے آیا تھا۔ وہ یہاں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر جیسے کیا جانے۔
''ٹھیک ہے، تم باتھ روم ہو کر آؤ، میں آرڈر کرتی ہوں۔''
وہ اٹھا تو ایک ویٹر سامنے آ گیا۔ اس کی نگاہیں سوالیہ تھیں۔
''باتھ روم کس طرف ہے۔'' مارٹن نے پوچھا۔
''آئیے! میں آپ کو لے کر چلتا ہوں۔'' ویٹر نے
پیشکش کی۔
مارٹن اندر داخل ہوا تو وہاں دو تین لوگ پہلے سے
موجود تھے۔ [illegible] ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوا لیکن

دوسرے لوگوں کو دیکھ کر فوراً پلٹا اور باہر چلا گیا۔ مارٹن بہت دیر تک اپنا چہرہ آئینے میں دیکھتا رہا۔ وہ ادھیڑ عمر مرد تھا۔ چہرے پر زمانے کی سختی گری کے آثار بھی نمایاں تھے۔ اس نے کوٹ اتارا اور منہ دھونے لگا۔ فریش ہو کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر تھوڑی سی توجہ دوں اور خوشحالی کے مزید چند ہفتے مل جائیں تو اس کا چہرہ بھی برسوں پہلے کے نوجوان مارٹن کے روپ میں واپس آسکتا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے سوئٹ میں جانے سے پہلے ہوٹل کے بیوٹی پارلر میں جا کر پہلے فیشل اور مساج کرائے گا، اس کے بعد بھاپ سے غسل کر کے کئی گھنٹوں کی نیند لے گا۔

وہ باتھ روم سے باہر نکلا تو سیدھا اپنی میز پر گیا۔ اسے اب بھی احساس نہیں ہوا کہ دو نگاہیں بدستور اس کے تعاقب میں ہیں۔

"واقعی لنچ شان دار تھا۔" کھانا ختم کر کے ہاتھ صاف کرتے ہوئے مارٹن نے کہا۔

"واقعی..." جینی نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ "ویسے یہاں کا کھانا بہت مشہور ہے۔"

"یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے۔" مارٹن نے شرارت سے کہا۔

"کیا مطلب، کیسا فیصلہ۔" جینی نے چونک کر پوچھا۔

"یہی کہ کھانا عمدہ تھا یا پھر تمہارے ساتھ کی وجہ سے زیادہ اچھا لگا۔"

یہ سن کر جینی ذرا سی شرمائی۔ "بات بنانا تو کوئی لکھنے والوں سے سیکھے۔"

"اور شرما کر جھینپ جانا سیکھنا ہو تو تمہارے ساتھ پیچ کیا جائے۔" مارٹن کہاں نچلا بیٹھنے والا تھا۔ اس نے بھی ترنت جواب دیا۔

"خیر اب یہ باتیں رہنے دیں پھر کبھی سہی۔" یہ کہتے ہوئے جینی نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "تین بجنے والے ہیں، اب چلتے ہیں۔ آپ کو آرام بھی کرنا ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑی ہوگئی۔

مارٹن بھی کھڑا ہو کر بیگ کندھے سے لٹکانے لگا۔

"چلیں......"

جینی مارٹن کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس ہوٹل میں پہنچی، جہاں اس کے لیے سوئٹ بک تھا۔ سیون اسٹارز ہوٹل ریستوران کے برابر ہی واقع تھا۔ جینی اسے لابی میں چھوڑ کر شام کو تقریب میں ملنے کا وعدہ کر کے واپسی کے لیے چلی تو وہ لفٹ کی طرف بڑھنا۔ اچانک اسے پیچھے ا... گیا ہے۔ وہ پلٹ کر استقبالیے کی طرف بڑھنے لگا کہ بیچ میں ایک

ویٹر اس کے سامنے آ گیا۔ "سنو..." مارٹن نے اسے روکا۔

"جی سر......"

"بیوٹی پارلر اور مساج سینٹر کہاں ہے؟" مارٹن نے پوچھا۔

"آیئے...... میں آپ کو لے چلتا ہوں۔ بس ایک منٹ مجھے دے دیں۔" اس نے اپنی پیشکش کے ساتھ بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"او کے......"

یہ سنتے ہی ویٹر تیزی سے ایک طرف گیا۔ وہ بہت جلد لوٹ آیا۔ "انتظار کی زحمت کے لیے معذرت۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "چلیے سر!"

وہ لفٹ کی طرف بڑھے۔ ویٹر نے آٹھویں منزل کا بٹن دبا دیا۔ جب وہ باہر نکلے تو مارٹن حیران رہ گیا۔ لگتا تھا کہ وہ ہوٹل کا کوئی فلور نہیں بلکہ ایک چھوٹی سوق مارکیٹ ہو۔ چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ ویٹر اسے ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا۔ اب وہ ایک الگ تھلگ سی جگہ پر تھے۔ اس نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور مارٹن کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

وہ اندر داخل ہوا تو اس کے پیچھے پیچھے ویٹر بھی اندر آ گیا اور آتے ہی کمرا لاک کر دیا۔ مارٹن نے چاروں طرف نگاہیں ڈالیں لیکن وہ کہیں سے بھی بیوٹی پارلر یا مساج سینٹر نہیں لگتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا ایک آواز سنائی دی۔

"خوش آمدید مسٹر مارٹن......"

یہ سن کر وہ حیران رہ گیا۔ وہ یہ سوچ کر پریشان تھا کہ یہ آواز کیسی ہے اور وہ اس کا نام کیسے جانتا ہے؟ کیا وہ صبح اسٹور میں تھا یا پھر حادثے کے مقام پر۔ یا یہ کہ وہ اس کی پرانی زندگی سے اسے جانتا ہے۔ ابھی مارٹن کی الجھن دور نہیں ہوئی تھی کہ سامنے دیوار کی اوٹ سے ایک شخص باہر نکلا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بڑے اعتماد سے چلتا ہوا اس کے سامنے پہنچا۔ "آج آپ نے ہمیں بہت پریشان کیا اور یہ ذرہ بھر بھی خوشی کی بات نہیں۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"تم میرا نام کیسے جانتے ہو۔" مارٹن نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ بھلا آپ کو کوئی کیسے نہیں پہچانے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ کے اندر ہاتھ ڈالا۔ جب ہاتھ باہر آیا تو اس میں سائلنسر لگا پستول تھا۔

"یہ کیا؟" پستول دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مارٹن چونک کر دو قدم پیچھے ہٹا تو اس ویٹر سے

ٹکرایا جو اسے لے کر یہاں تک پہنچا تھا۔ ''تم......'' مارٹن نے بوکھلاہٹ میں کہا تو وہ ہنس پڑا۔

''ادھر مسٹر مارٹن......'' پستول بردار شخص ایک قدم آگے بڑھا۔ ''ڈنمارک تمہیں بہت یاد کر رہا ہے۔'' اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

مارٹن کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ٹانگیں کپکپا رہی تھیں، اس نے گرنے سے بچنے کے لیے میز کا سہارا لیا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھا۔ ان دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے بخشنے والے نہیں۔ اس کے ذہن میں رقص کرتے پُرآسائش زندگی کے حسین خواب کب کے ہوا ہو چکے تھے۔ اب اس کی آنکھوں میں سامنے کھڑی موت کی پرچھائیاں تھیں۔

پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا تو وہ چلایا۔ ''ایک منٹ، پلیز ایک منٹ...... میری بات سنو۔'' اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

''کیا بات......'' پستول بردار شخص نے سفاکی سے کہا۔

''سن لو...... مرنے والے کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ اب یہ کون سا کہیں بھاگے گا۔'' عقب سے ویٹر نے کہا۔

''تم لوگوں کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' مارٹن نے جان بچانے کے لیے سچ کا سہارا لیا۔ ''میں وہ نہیں جس کی تمہیں تلاش ہے، میں تو......''

''جانتے ہیں مسٹر مارٹن......'' پستول بردار نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں نہیں...... تم کچھ نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں وہ مارٹن نہیں۔''

''اوکے...... تو پھر تمہیں چھوڑ دیں۔''

''بالکل...... یہی میں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔''

مارٹن کو پہلی بار جان بچنے کی موہوم سی امید نظر آئی۔

''بکواس بند کرو۔'' پستول بردار نے نہایت غصے سے ڈانٹا۔ ''تم پہلے ہی ہمیں بہت پریشان کر چکے ہو۔ اپنا منہ بند کرو ورنہ مارنے سے پہلے تمہاری زبان کاٹ ڈالوں گا۔'' وہ شدید غصے میں نظر آ رہا تھا۔

مارٹن کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ چہرہ پسینے میں شرابور تھا۔ اگر میز کا سہارا نہ ہوتا تو اس کی کانپتی ٹانگیں مزید بوجھ اٹھانے سے کب کا انکار کر چکی ہوتیں۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مارٹن کرسٹائنز وہ تھا جو سڑک پر مرا۔'' مارٹن اپنی جان بچانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

''جانتا ہوں......'' اس نے پستول لہرایا اور زوردار قہقہہ لگایا۔

''جانتے ہو تو پھر......'' مارٹن کو کچھ حوصلہ ملا تھا۔

''لیکن مجبوری ہے۔''

''کیسی مجبوری......'' مارٹن نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے مارٹن کرسٹائنز کو ختم کرنے کے لیے بھاری رقم ملی ہے اور میں یہ کام ختم کیے بغیر واپس ڈنمارک نہیں جا سکتا۔''

''مگر میں تو وہ نہیں۔''

''لیکن دنیا کی نظروں میں تو ہو۔''

''وہ میری غلطی تھی......'' مارٹن رو دیا۔

''میں نے فٹ پاتھ پر تمہاری مہارت دیکھی تھی۔ کس تیزی سے تم نے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ اگر تم اس کا بٹوا پار نہ کرتے تو میرا مشن مکمل ہو چکا ہوتا۔ مجھے پیسا دینے والوں کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ مارٹن کرسٹائنز کیسے مرا۔ انہیں صرف اس سے دلچسپی تھی کہ وہ مر گیا۔'' یہ کہہ کر پستول بردار نے طنزیہ نگاہوں سے اسے دیکھا اور کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''لیکن تم نے اسے نئی زندگی دے دی۔ اب کوئی کیسے یقین کرے کہ اصل میں وہ مر چکا ہے۔''

''وہ میرا ہم شکل تھا اور اس کی شناخت لے کر مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی۔'' مارٹن نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

''جوا، جوا ہے، چاہے داؤ پر رقم لگے یا زندگی، چال تو چلنا پڑتی ہے۔ تم اپنی چال چل چکے۔''

''اگر مجھے چھوڑ دو تو میں کہیں دور چلا جاؤں گا۔''

مارٹن سمجھ چکا تھا کہ بٹوے کی ادلی بدلی کی غلط فہمی سے شروع ہونے والے کھیل کو موت کے میدان میں پہنچا دیا ہے۔ پھر بھی وہ بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ لاش کا چہرہ بس کی ٹکر سے ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔ اس کے بٹوے سے ملنے والے ڈرائیونگ لائسنس سے شناخت مارٹن مینز کے نام سے ہوئی ہے۔ اب بتاؤ مارٹن کرسٹائنز کہاں مرا ہے۔ وہ زندہ ہے اور میں اسے مارنے جا رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے پستول سیدھا کیا۔ اگلے لمحے ہلکی سی کلک سنائی دی۔ مارٹن کٹے پیڑ کی طرح فرش پر ڈھے گیا۔ اس کی پیشانی میں سوراخ ہو چکا تھا۔

''چلو یار......'' اس نے ویٹر کو اشارہ کیا۔ ''ابھی ہمیں کوپن ہیگن کی فلائٹ بھی پکڑنی ہے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔''

مارٹن کی پیشانی سے بہنے والا خون اب فرش پر پھیل رہا تھا۔

انگارے

طاہر جاوید مغل

پندرھویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی گردن میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیلوں اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثرورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان آیا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کر دیا۔ میں نے سرِ راہ ایک زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرغنہ تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کر رہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کر سکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کر دیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پا کر جیل پہنچ گیا۔ انسپکٹر قیصر اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ میں MMA کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کر دیا۔ انسپکٹر قیصر شدید زخمی ہو کر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ”غلطی“ کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ میں یہاں بیزار ہو چکا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کر چکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آ گئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہو گیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا منگیتر اصفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کو تنگ کر رہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آ جائے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ تاجور کے گھر میں آئی مہمان نمبردارنی کو کسی نے زخمی کر دیا تھا۔ اس کا الزام بھی تاجور کو دیا جا رہا تھا۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہو گئے۔ پہلے تو مجھے بھی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آ گئی۔ مولوی فدا ایک خدا ترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلا بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ پی پی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہندوؤں کے ڈھاٹے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ یہ کام مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا تھا۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہو رہے تھے۔ طارق سے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بیٹی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ”بلیک میلنگ“ سے نکالنے کا عہد کیا مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کر دیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ میں نے ان کا تعاقب کیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عالمگیر، سجاول کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا۔ میں نے چھپ کر ان کی تصاویر کھینچ لیں۔ پھر میں اقبال کا تعاقب کرتا ہوا یاسر تک جا پہنچا اور چھپ کر ان کی باتیں سنیں۔ وہ بے بس و مظلوم شخص تھا اور چھپ کر ایک قبرستان میں اپنے دن گزار رہا تھا۔ ایک دن میں اور انیق پیر ولایت کے والد پیر سائیں نامی کے اس ڈیرے پر جا پہنچے جو کسی زمانے میں جل کر خاکستر ہو چکا تھا اور اس سے متعلق متعدد کہانیاں منسوب تھیں۔ اس ڈیرے پر لوگ دم درود وغیرہ کرانے آتے تھے۔ تاجور کی قریبی دوست ریشمی شادی کے بعد دوسرے گاؤں چلی گئی تھی۔ اس کا شوہر شکی مزاج اور تشدد پسند شخص تھا۔ اس نے ریشمی کی زندگی عذاب بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ اسی غائب ہوئی کہ اس کا شوہر ڈھونڈتا رہ گیا۔ میں تاجور کی خاطر ریشمی کا کھوج لگانے کا بیڑا اٹھا بیٹھا اور ایک الگ ہی دنیا میں جا پہنچا۔ ریشمی ایک ملنگ کا روپ دھار چکی تھی اور آستانے پر اپنی دلکش و سریلی آواز کے باعث پاک بی بی کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ درگاہ پر ہم سب قید تھے لیکن قسمت نے ساتھ دیا اور حالات نے اس تیزی سے کروٹ لی کہ درگاہ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔ میرے ہاتھوں پردے والی سرکار کا خون ہو گیا۔ آگ و خون کا دریا عبور کر کے ہم بالآخر پہاڑوں کے درمیان تک جا پہنچے۔ یہاں بھی ملنگی محافظوں سے ہمارا مقابلہ ہوا۔ اس دوران انیق وغیرہ ہم سے بچھڑ گئے۔ میں اور تاجور بھاگتے ہوئے ایک جنگل میں پہنچے۔ لیکن ہماری جان ابھی چھوٹی نہیں تھی۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا کے مصداق ہم سیالکوٹی سجاول ڈکیت کے ڈیرے پر جا پہنچے تھے۔ یہاں سجاول کی ماں (ماں جی) مجھے اپنا ہونے والا جوائی سمجھی۔ جس کی ہونے والی بہو ماہ زعفران نامی سے میری بات طے تھی۔ یوں سجاول نے ہماری جان بخش دی۔ یہاں سجاول نے میرا مقابلہ باقر سے کرا دیا۔ سخت مقابلے کے بعد میں نے باقر سے ... سجاول سمیت سب کو پریشان کر دیا تھا۔

اس دوران ایک خط میرے ہاتھ آگیا جسے پڑھ کر چاند گرجی کے عالمگیر کا مکروہ چہرہ سامنے آگیا۔ اس خط کے ذریعے میں سجاول اور عالمگیر میں دراڑ ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ متوقع مقابلے کے بارے میں سوچتے سوچتے میرا ذہن ایک بار پھر ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ جب میں ڈنمارک میں تھا اور ایک کمزور پاکستانی کو گورے اور انڈین غنڈوں سے بچاتے ہوئے خود ایک طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ وہ غنڈے نیکساری گینگ کے لوگ تھے جس کا سرغنہ جان ڈیرک تھا۔ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے انہوں نے میری یونیورسٹی دوست ڈیزی کے ساتھ اجتماعی کھیل کھیلا، پھر ڈیزی غائب ہوگئی۔ اس واقعے کے بعد میری زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ مجھے چھ ماہ جیل ہوئی۔ پھر میرا رجحان مکس مارشل آرٹ کی طرف ہوگیا اور ایسٹرن کنگ کی حیثیت سے MMA کی فائٹس میں جھلکا مچاتا رہا اور دوسری طرف سکائی ماسک کی اوٹ میں نیکساری گینگ کے غنڈوں سے برسرِپیکار رہا۔ اسی مارشل آرٹ کی بدولت میں نے سجاول سے مقابلہ کیا اور سخت مقابلے کے بعد برابری کی بنیاد پر میں نے ہار مان لی لیکن سجاول کا دل جیت لیا۔ سجاول سے کہہ کر میں نے انیق کو بلوالیا۔ سجاول ایک حسین دوشیزہ شمسی کو نوبیاہتا دلہن کی طرح سجاسنوار کر ریان فردوس (وڈے صاحب) کی خدمت میں تحفے کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ میں، انیق اور جاناں ساتھ تھے۔ ہم وڈے صاحب کے محل نما بنگلے پارا ہاؤس پہنچے۔ وڈا صاحب اپنے دو بیٹوں کے ہمراہ بردبائی سے پاکستان شفٹ ہوا تھا۔ بردبائی میں اس کی خاندانی دشمنی تھی۔ سب ٹھیک تھا کہ اچانک چند نقاب پوشوں نے پارا ہاؤس پر حملہ کردیا جن کا سرغنہ تاقب تھا۔ سخت مقابلہ ہوا۔ سجاول نے جان جوکھوں میں ڈال کر بڑی بیگم صاحبہ کی جان بچائی لیکن سرغنہ تاقب نے اس کے بیٹے ابراہیم اور ایک مہمان کو یرغمال بنالیا۔ مہمان کا نام سن کر میں چونک گیا یعنی شکیل داراب! پھر میں نے اور سجاول نے چھوٹے صاحب کو اغواکاروں کے چنگل سے نجات دلائی۔ اس معرکے میں کچھ اغواکار مارے گئے اور کچھ پکڑے گئے۔ سجاول کو پارا ہاؤس میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ پارا ہاؤس میں کوئی بڑا اسکینڈل رہا تھا۔ کھوج لگانے پر پتا چلا کہ بڑے صاحب کے دونوں بیٹوں میں زہریلا عنصر پایا جاتا ہے۔ زینب والا معاملہ بھی اسی طرف اشارہ کررہا تھا۔ اسی وجہ سے زینب کو بھی اغوا کرلیا گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ہم سیر کرنے والے انداز میں آگے بڑھتے رہے اور جھنڈ میں پہنچ گئے۔ جھنڈ کے عقب میں آج کا کچرا پڑا تھا۔ چھوٹے بڑے کئی شاپرز تھے۔ ان میں سے نیلے رنگ کے تین بڑے شاپرز علیحدہ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہ کچرا تھا جو پارا ہاؤس کے اندرونی رہائشی حصے میں سے آتا تھا۔

ہم نے دیکھا، ارد گرد کافی فاصلے تک کوئی نہیں تھا۔ یہ دن کا پہلا پہر تھا۔ دھوپ کا سنہری رنگ نمایاں ہوتا جارہا تھا اور پارا ہاؤس کی بلند و بالا برجیاں اس چمکیلے دن کی خوشگوار حرارت سے لطف اندوز محسوس ہوتی تھیں۔ انیق نیچے بیٹھ گیا اور اس نے دو نیلے شاپرز کرید کر کھول دیں۔ میرے ہاتھ میں ایک درخت کی چھڑی نما شاخ تھی۔ میں نے اس شاخ کے ذریعے کچرے کو کھنگالنا شروع کیا۔ انیق بھی اپنے پاؤں کی مدد سے میرا ساتھ دینے لگا۔ یہ صاف ستھرا کچرا تھا۔ دودھ اور جوس کے خالی ڈبے، سگریٹس اور سگار وغیرہ کے ٹکڑے، وائن کی خالی بوتلیں، خالی ٹن پیکس، پھلوں کے چھلکے اور کچی سبزی کی باقیات، پلیٹوں میں بچ جانے والا سالن اور چاول وغیرہ۔ اور پھر ہمیں ایک شاپر میں سبزی پلاؤ کی باقیات نظر آگئیں۔ یقیناً یہ پلیٹوں میں بچ جانے والے چاول ہی تھے۔ انیق کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ پہلے سے انتظام کرکے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا پاؤچ نما شاپر موجود تھا۔ ادھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ عام سے انداز میں نیچے جھکا اور اس نے پلک جھپکنے میں تھوڑے سے چاول شاپر میں ڈال کر اپنا جراب میں گھسالیے۔

اس کے بعد ہمارا وہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ ہم ایک بار پھر چہل قدمی کے انداز میں ٹیلوں کے درمیان چکرانے لگے۔

میں نے کہا۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی چاول ہیں جو دونوں بھائیوں نے استعمال کیے ہوں گے؟“

”اس میں شک کی گنجائش کم ہی ہے۔“ انیق نے جواب دیا۔ ”یہ سبزی پلاؤ ہے اور کل یہ پلاؤ صرف دونوں بھائیوں کے لیے ہی بنا تھا۔ جو ہم نے لیا ہے وہ استعمال شدہ چاول ہی ہے۔ آپ نے دیکھا ہی ہے ان میں دہی وغیرہ مکس ہے۔“

ہم باتیں کرتے ہوئے واپس پارا ہاؤس کی سمت چل دیے۔ ہمیں اِکا دُکا پہرے دار دکھائی دینے لگے پھر وہ پہرے دار بھی نظر آئے جو کچھ دیر پہلے ہمارے ساتھ ہی روانہ ہوئے تھے۔ جونہی ہم پارا ہاؤس کے مین گیٹ کے سامنے پہنچے، ہمیں آقا جان کی کرخت صورت نظر آئی۔ اس کے ساتھ تین چار گارڈز بھی تھے جن میں انچارج گارڈ رفاقت بھی تھا۔

آقا جان نے ہمیں کڑی نظروں سے گھورا اور پوچھا۔ ”کہاں گھوم رہے ہو تم دونوں؟“

”ذرا سیر کے لیے نکلے تھے۔ بڑی بیگم سے اجازت لی تھی۔“

”سیر کی اجازت لی تھی ناں، لیکن تم تو کچھ اور گڑبڑ بھی کررہے تھے۔“ آقا جان نے کہا اور ابرو کی ناک کا ٹیلا لائی

کل کچھ اور سوا ہو گیا۔ میرے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ کچرے کے پاس اور دور دور تک کوئی نہیں تھا پھر آقا جان کو کیسے خبر ہوئی تھی۔ یکایک بات سمجھ میں آ گئی۔ ہماری بھول تھی کہ کوئی ہمیں دیکھ نہیں رہا تھا۔ یقیناً آس پاس کوئی سی سی ٹی وی کیمرا موجود تھا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' میں نے آقا جان سے پوچھا۔

''تم لوگ کچرے کے پاس کیا کرنے گئے تھے اور وہاں کیا ڈھونڈ رہے تھے؟''

''اتنی سی بات پر آپ اتنا پریشان ہو رہے ہیں؟''

''یہ تمہارے لیے اتنی سی بات ہو گی۔ یہ سیکیورٹی کا سنگین مسئلہ ہے۔ وہاں سے کیا اٹھایا ہے تمہارے ساتھی نے؟''

''لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

''یہ غلط فہمی آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔'' سیکنڈ انچارج گارڈ رفاقت نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

آقا جان کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے مسلسل شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے تحکمانہ انداز میں ہمیں ساتھ چلنے کو کہا۔ مین گیٹ کے پاس ہی ایک ''سرویلینس روم'' تھا۔ یہاں مانیٹرز وغیرہ موجود تھے۔ ہم اندر پہنچے تو رفاقت نے فوراً ایک مانیٹر آن کر دیا۔ اس نے ریکارڈنگ چلائی۔ اسکرین پر میرا اور انیق کا ہیولا نمودار ہوا۔ ہم کچرے والے شاپرز کے نزدیک کھڑے تھے۔ کیمرا یقیناً جھنڈ کے کسی درخت پر ہی نصب تھا۔ عین ممکن تھا کہ کچرے کو کیموفلاج کر دیا گیا ہو۔ فاصلہ زیادہ تھا، تصویر واضح نہیں تھی مگر چہرے پہچانے جا رہے تھے۔ فوٹیج میں نظر آیا کہ انیق اکڑوں بیٹھ کر شاپرز کی گرہیں کھول رہا ہے اور پھر میں چھڑی کے ساتھ کوڑے کو ادھر اُدھر کر رہا ہوں۔ کیمرا ہمارے ایک پہلو کو دکھا رہا تھا۔ اس فوٹیج میں یہ تو نظر آیا کہ انیق نے کچرے میں سے کچھ اٹھایا ہے لیکن یہ بالکل پتا نہیں چلا کہ یہ کیا تھا اور انیق نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ یہ صورتِ حال حوصلہ افزا تھی۔ ہم نے جو احتیاطی تدبیر کی تھی وہ کام دے سکتی تھی۔

جس دوران میں فوٹیج چلے ہو رہی تھی اسی دوران میں آقا جان نے فون کر کے حلمی کو بھی بلا لیا تھا۔ فوٹیج ختم ہوتے ہوتے حلمی وہاں آن پہنچا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے آقا جان کو دیکھا۔ آقا جان پھٹ کر بولا۔ ''حلمی آخر تم لوگ مسلسل کچھ باوردی گارڈ لوگوں کی طرف سے ہوشیار ہو مگر میری بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالی جا رہی ہے۔''

''اب کیا ہوا ہے؟'' حلمی نے ملائیشین لہجے کی اردو میں پوچھا۔

''یہ لوگ کچھ گڑبڑ کر رہے ہیں۔ میرا شک پختہ ہوتا جا رہا ہے۔'' آقا جان نے کہا اور اس کے ساتھ ہی فوٹیج ری پلے کر دی۔

فوٹیج ختم ہوئی تو حلمی کی سوالیہ نظریں بھی ہم پر مرکوز ہو گئیں۔ ''یہ سب کیا ہے مسٹر شاہ زیب؟''

''کیا آپ کو آقا جان صاحب کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ہم یہاں مشکوک سرگرمیوں میں معروف ہیں اور عنقریب کوئی بڑی گڑبڑ کرنے والے ہیں۔ پہلے تو آپ ہمیں غیر مسلح کر کے کسی کمرے میں بند کریں۔ اس کے بعد سوال و جواب کریں تو شاید آقا جان صاحب کو تسلی ہو۔''

میرے طنزیہ لہجے نے آقا جان کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ پھنکارا۔ ''تم زیادہ ٹرٹر نہ کرو۔ سیدھی بات کا سیدھا جواب دو۔ وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''اس بات کا جواب میرے پاس ہے لیکن میں صرف حلمی صاحب کو دوں گا۔''

''یعنی ہم سب ایرے غیرے ہیں۔'' آقا جان نے دانت پیسے۔

''میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا لیکن یہ ایک اہم بات ہے۔''

''تم بھی اس دلال کی وجہ سے سر پر چڑھتے جا رہے ہو۔ لیکن تم جیسے لوگوں کو سیدھا کرنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔'' وہ پھنکارا۔

دلال کا لفظ اس نے سجاول کے لیے اس تناظر میں استعمال کیا تھا کہ وہ پری چہرہ سنبل کو آقا جان کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لایا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آقا صاحب، آپ ذرا زبان سنبھال کر بات کریں۔ ورنہ پھر بات آگے تک جائے گی۔''

''اوئے تو مجھے دھمکی دیتا ہے۔ اوئے دو ٹکے کے ملازم......'' آقا جان چنگھاڑا اور اچھل کر میری طرف آیا۔ حلمی نے اسے راستے میں ہی روک لیا اور دھکیل کر پیچھے لے گیا۔ آقا جان لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ بدکلامی کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ گارڈز کو حکم دے رہا تھا کہ ہمیں گن پوائنٹ پر رکھیں اور ہماری تلاشی لیں۔ گارڈ اس کے حکم کو بجا لانے کے لیے آگے بڑھ آئے۔

ریڈیو انٹینے کا مظاہرہ تھا۔ حلمی نے اسے بمشکل سنبھالا اور ٹھنڈا کیا۔ آقا جان بلتا جھلتا دوسرے کمرے میں چلا گیا تو حلمی ہمیں لے کر یارا ہاؤس کے مہمان خانے میں آگیا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے جیکٹ کی جیب سے سنبل کے ہار کی ٹوٹی ہوئی لڑی نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''یہ کیا ہے؟'' حلمی نے پوچھا۔

''وہی، جس کی تلاش میں ہم وہاں کچرے کے ڈھیر پر گئے تھے۔ یہ سنبل صاحبہ کے ہار کا ٹکڑا ہے۔ یہ پرسوں سے گم تھا۔ ڈر کی وجہ سے انہوں نے کسی کو بتایا نہیں، صرف سجاول صاحب کو آگاہ کیا کہ ہار کی ایک قیمتی لڑی نہیں مل رہی۔''

حلمی کی فراخ پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھریں۔ وہ جیسے بات کی گہرائی تک پہنچ رہا تھا۔ آخر اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم ان موتیوں کی تلاش میں کچرے کی طرف گئے تھے...... اور یہ کام تمہارے ذمے مسٹر سجاول نے لگایا تھا۔''

''جی ہاں، سنبل صاحبہ کا خیال تھا کہ اگر یہ لڑی کسی نے چرائی نہیں تو پھر صفائی کے دوران میں کوڑے کے ساتھ ہی کہیں چلی گئی ہوگی۔ امید تو کم تھی لیکن ہم نے کوشش کی اور خدا کا شکر ہے کہ یہ ہمیں نالے والے کچرے کے اندر سے مل گئی۔''

میں نے مکمل تفصیل بتائی تو حلمی خاصی حد تک مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ذرا سی بات کی وجہ سے زبردست قسم کی غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے۔ دراصل تم جانتے ہی ہو چند دن پہلے یہاں جو کچھ ہوا ہے، کئی جانیں گئی ہیں۔ کتنے ہی زخمی ابھی اسپتال میں پڑے ہیں۔ عزت مآب کے حکم پر سیکورٹی ریڈ الرٹ ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیز کو نظر میں رکھا جا رہا ہے۔ آپ لوگوں کو بھی بہت احتیاط کرنی چاہیے۔''

اس کے بعد اس نے آقا جان کا نمبر ملایا اور اس سے بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

انیق نے میری طرف دیکھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا...... جان بچی سو لاکھوں پائے۔ درحقیقت ہماری پلاننگ کام کر گئی تھی ورنہ آقا جان کی خباثت اس معاملے کو خطرناک رنگ دے سکتی تھی۔ اسی دوران میں سجاول بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ اسے صورت حال کا علم ہو گیا ہے اور یہ پتا بھی چل گیا ہے کہ ہم نے معاملے کو سنبھال لیا ہے۔

میں نے موتیوں والی لڑی سجاول کے ہاتھ پر رکھ دی اور یہ بھی بتایا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کیا معاملہ پیش آیا ہے۔ میں نے آقا جان کی بدزبانی کا بھی تھوڑا سا ذکر کر دیا۔ پھر دیر بعد ہم مہمان خانے کے اس رہائشی پورشن میں آگئے جو آج کل ہمارے استعمال میں تھا۔ ہم اچھی طرح جائزہ لے چکے تھے یہاں جاسوسی کے لیے کسی طرح کا آڈیو/ویڈیو سسٹم موجود نہیں تھا۔ یہاں ہم ذرا احتیاط سے ہر طرح کی گفتگو کر سکتے تھے۔ سبزی پاؤڈر والا پاؤچ انیق کی جراب میں موجود تھا اور یہ ہماری ایک اہم کامیابی تھی۔

سجاول آدھ دوڑے صاحب اور سنبل سے ملاقات کے لیے چلا گیا تا کہ سنبل کو اس کے ''گمشدہ ہار'' کی لڑی واپس کی جا سکے اور ہم سوچ بچار میں مصروف ہو گئے کہ کچرے میں سے اٹھائے گئے سبزی پاؤڈر کے نمونے کا کیا کیا جائے۔ اس کا کیمیکل انالیسز کرانے کے لیے اسے فیصل آباد یا لاہور وغیرہ میں پہنچایا جانا ضروری تھا اور فی الحال اس کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا مگر اسی روز شام کے بعد جو کچھ ہوا اس نے ہماری مشکل کسی حد تک آسان کر دی۔ کم از کم اتنا پتا تو ضرور چل گیا کہ یہ سبزی پاؤڈر ایک زہر آلود ہے۔

تقریباً آٹھ بجے کا وقت تھا۔ میں اور انیق ٹی وی پر نیوز دیکھ رہے تھے۔ اتنے میں ساتھ والے کمرے میں کھٹکا ہوا۔ یہ خانساماں انور طیب کی پالتو بندریا تھی جو یارا ہاؤس کے بیرونی حصے میں ادھر ادھر چہل قدمی کرتی رہتی تھی۔ وہ ایک چھوٹی کھڑکی سے کود کر اندر آئی اور پھر انیق کو پہچان کر سیدھی اس کے کندھوں پر آن چڑھی۔ وہ اپنی نہایت شرارتی آنکھوں سے پورے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس نے باقاعدہ ننھی سی سویٹر اور ٹراؤزر پہنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔ ''انیق! مجھے تو سردار سجاول کی وہ بات بالکل ٹھیک ہی لگتی ہے۔ یہ بندریا واقعی تمہاری کوئی بچھڑی ہوئی رشتے دار ہے۔''

''خدا کا خوف کریں شاہ زیب بھائی، یہ سردار سجاول آپ ہی کا فرزند ہے۔ آپ کیوں جہنم میں اس کے پڑوسی بننا چاہ رہے ہیں۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور سجاول ایک انسان کو بندر کا رشتے دار بتا رہا ہے۔''

''اچھا اشرف المخلوقات صاحب، اس خبیث کو باہر نکالو ورنہ کوئی نقصان کر دے گی۔''

بندریا نے بھی جیسے یہ بات سن لی تھی۔ اس نے انیق کے سر پر ایک چپت لگائی اور جست لگا کر ریفریجریٹر پر چڑھ بیٹھی۔ ریفریجریٹر کے اوپر بسکٹ کا ایک ڈبا پڑا تھا۔ وہ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

جھٹ پٹ بسکٹ کھانے لگی۔ پھر اس نے بسکٹ کا خالی ڈبا
میرے سر پر مارا اور جمپ لگا کر ٹی وی پر چڑھ گئی۔ اچانک
انیق کے ذہن میں کوئی بات آئی اور اس کا چہرہ چمک گیا۔
اس نے بڑے دلار سے بندریا کو اپنے پاس بلایا۔ وہ جست
لگا کر اس کی گود میں آ گئی اور اس کی ٹھوڑی پر یوں ہاتھ
چلانے لگی جیسے اس کی شیو کر رہی ہو۔ شاید اس نے کسی حجام کو
ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

انیق نے مجھے اشارہ کیا۔ میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔
سبزی پلاؤ کا وہ چھوٹا سا پاؤچ فریج کے اندر رکھا تھا۔ میں
نے لاک میں چابی گھما کر فریج کا دروازہ کھولا اور وہ پاؤچ
انیق کو تھمایا۔ کارروائی تھوڑی سی ظالمانہ لگ رہی تھی مگر
ہمارے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔ انیق نے پاؤچ میں
سے مٹھی بھر چاول اپنے ہاتھ میں لیے۔ دائیں ہاتھ سے وہ
بندریا کی گردن سہلاتا رہا اور بائیں ہاتھ سے چاول اس کی
طرف بڑھائے۔ وہ بڑی رغبت سے کھا گئی۔ وہ مزید مانگ
رہی تھی۔ انیق نے تھوڑے سے مزید دیے اور باقی بچا
لیے۔

''اگر واقعی چاولوں میں کچھ ہوا اور یہ مر گئی تو؟''
انیق نے کہا۔

''تم خود ہی تو بتا رہے تھے کہ اس کی شادی کی عمر نکلی
جا رہی ہے اور کوئی اچھا رشتہ نہیں مل رہا۔ ہو سکتا ہے کہ بندر
برادری یہ سمجھے کہ اس نے مایوس ہو کر خودکشی کی کوشش کی
ہے۔ یوں کوئی اچھا صاحبِ بندر اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے
تیار ہو جائے۔''

''لیکن یہ تو تب ہوگا جب یہ بچے گی۔''

''تم جیسے بھائی جب صدقِ دل کے ساتھ اپنی بہنوں
کے لیے دعا مانگتے ہیں تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔'' میں نے
مسکراتے ہوئے کہا۔

''دیکھیں آپ پھر اس امریش پوری سجاول کی زبان
بول رہے ہیں۔ اگر یہی کچھ ہوتا رہا تو پھر ایک دن مجھے اس
کے لیے امیتابھ بچن یا سنی دیول وغیرہ بننا پڑے گا۔''

امیتابھ بچن تو نہ ہی بنو تو اچھا ہے۔ سنا ہے، قلی فلم کی
شوٹنگ کے دوران میں امریش پوری نے اس کا برا حال کر
ڈالا تھا۔ امیتابھ تو پھر بچ گیا تھا لیکن تم بچو گے نہیں۔ بڑی
ظالم مار ہے اس بندے کی۔''

ہم باتیں کرتے رہے۔ بندریا کو چاول کھائے قریباً
دس منٹ ہو گئے لیکن وہ اسی طرح ہشاش بشاش تھی پھر اس
نے ایک ایکی جست لگائی اور کھڑکی سے نکل کر کہیں اوجھل ہو
گئی۔

''اب کیسے پتا چلے گا؟'' میں نے کہا۔

''میں ابھی تھوڑی دیر میں ازمیر کی طرف چکر لگاتا
ہوں۔'' انیق نے کہا۔

ازمیر کی طرف جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔
آٹھ دس منٹ مزید گزرے ہوں گے کہ لان کی طرف سے
کچھ عجیب سی آوازیں آئیں، جیسے دو بلیاں آپس میں لڑ رہی
ہوں۔ ''یہ اسی کی آواز ہے۔'' انیق چونک کر بولا۔

ہم نے اٹھ کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ وسیع گراسی لان
میں ہلکی دودھیا روشنی تھی۔ پھولوں کی ایک وسیع و عریض
کیاری کے پاس بجلی کے پول کے نیچے کوئی جاندار چیز گھاس
پر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی پھر ہم نے فربہ اندام خانساماں
ازمیر کو دیکھا۔ وہ اپنے بھاری جسم کو جھلاتا بڑی تیزی سے
بجلی کے پول کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے نیچے جھک کر
بندریا کو اٹھایا اور بدحواسی میں چلانے لگا۔ ''لوسی......
لوسی۔''

بند کھڑکی کے باوجود اس کی آواز ہمارے کانوں تک
پہنچ رہی تھی۔ ایک دو افراد اور بھی موقع پر نظر آئے۔ ہم بھی
کمرے سے نکلے اور گراسی لان میں پہنچ گئے۔ بندریا ازمیر
کے ہاتھوں میں بل کھا رہی تھی اور سر کو بے قراری سے دائیں
بائیں حرکت دے رہی تھی پھر اس نے بالکل انسانوں کے
سے انداز میں ایک بڑی قے کی اور ہاتھ پاؤں پھینکنے لگی۔

''کیا ہوا اسے؟'' دوسرے خانساماں نے انگریزی
میں ازمیر طیب سے پوچھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس نے کوئی زہریلی چیز کھا لی
ہے۔'' ازمیر نے جواب دیا۔

''اسے اسپتال لے چلیں۔'' ازمیر کے ساتھی
خانساماں نے عجلت میں کہا۔

وہ لوگ اپنی لوسی نامی بندریا کو لے کر پارا ہاؤس کے
نجی اسپتال کی طرف بھاگے۔ قے کرنے کے بعد لوسی کے
چلانے میں کچھ کمی واقع ہو گئی تھی۔

میں اور انیق واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ انیق کی
آنکھوں میں تیز چمک تھی۔ ''ہمارا شک سو فیصد درست نکلا
ہے۔'' وہ سرسراتے لہجے میں بولا۔

''لیکن ایسا ہو کیوں رہا ہے؟ مطلب تو یہی ہوا نا
کہ اگر کمال اور ابراہیم کے خون میں زہر ہے تو یہ زہر ان
تک باہر سے ہی پہنچایا گیا ہے۔''
انیق نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''اور اب اس زہر کی

وجہ سے ان کے لیے...... زہریلی بیویاں ڈھونڈی جارہی ہیں۔''

''زہریلی نہیں...... ایسی بیویاں جن کو زہر دے دے کر زہریلاپن برداشت کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔''میں نے تصحیح کی۔

بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ماں باپ اپنی اولاد کے لیے ایسا کیونکر چاہ سکتے ہیں اور پھر ایک ایسی ماں جو اپنے بچوں پر جان چھڑکتی ہو، انہیں کھانے میں زہر کی ڈوز کیسے دے سکتی ہے؟ اور کیا بچے اس صورتِ حال سے آگاہ تھے؟ کیا انہیں معلوم تھا کہ ان کا کھانا روزانہ علیحدہ سے کیونکر بنتا ہے؟''

سجاول تو شام سے ہی سویا پڑا تھا۔ میں اور انیق اس سچویشن کے بارے میں اکیلے ہی سر دھنتے رہے۔ تھوڑا سا ''زہریلا پلاؤ'' ابھی تک انیق کے پاس موجود تھا۔ اسے کیمیائی تجزیے کے لیے استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ازمیر کی پالتو لوسی کے بارے میں پتا چل گیا۔ وہ جانبر ہوگئی تھی۔ اس کا معدہ صاف ہوگیا تھا اور اب اسے ڈرپ کے ذریعے دوا وغیرہ دی جارہی تھی۔ غالباً اسپتال میں موجود کسی انسانی ڈاکٹر نے ہی مویشی ڈاکٹر کا کردار ادا کیا تھا۔

لوسی کے بچ جانے سے یہ اندازہ بھی ہورہا تھا کہ چاولوں میں موجود زہر کی مقدار ایک خاص حد کے اندر ہی تھی۔

اسی دوران میں سردار سجاول بھی بیدار ہوکر موقعے پر پہنچ گیا۔ وہ بندریا لوسی والے واقعے سے بے خبر تھا۔ ہم نے اسے بتایا کہ کس طرح اس جانور نے ہمارے لیے لیبارٹری کا کام کیا ہے اور چاولوں کے زہریلے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ یہ سب کچھ سجاول کے لیے بھی بے حد حیران کن تھا۔ یقیناً ہماری طرح اس کے ذہن میں بھی پہلا سوال یہی ابھرا تھا کہ وڈا صاحب اور بڑی بیگم اپنے دونوں بچوں کے ساتھ ایسا کیوں کررہے ہیں؟

میں نے سجاول سے پوچھا کہ سنبل کے ہار والے معاملے کا کیا بنا؟

وہ بولا۔''سنبل نے وڈے صاحب کو یہی بتایا ہے کہ وہ لڑی گم ہونے کے بعد ڈر گئی تھی۔ اس لیے کسی کو بتایا نہیں۔ وڈا صاحب بس مسکراتا رہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر تھپک تھپک کر بہلاتا رہا۔ وہ بڈھا کھوسٹ پوری طرح اس کی خوب صورتی کے نشے میں غرق ہے لیکن وہ آتا جان ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا؟''

''لگتا ہے کہ یہاں یارا ہاؤس میں اس کی بہت سنی جاتی ہے۔ وڈا صاحب بھی اس پر اندھا بھروسا کرتا ہے۔ وہ سنبل کو یوں سمجھا رہا تھا جیسے سنبل وڈے صاحب کی نہیں اس کی رکھیل ہے۔ سنبل کو بتا رہا تھا کہ وہ اپنی قیمتی چیزوں کے بارے میں بہت دھیان سے رہے۔ نوکروں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں پھر اس نے ان نوکرانیوں کی کلاس لی جو وہاں صفائی وغیرہ کا کام کرتی ہیں۔ انہیں بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کی کہ انہیں صفائی کے وقت موتیوں کی لڑی نظر کیوں نہیں آئی۔ ایک ملازمہ کو اس نے وڈے صاحب کے سامنے ہی تھپڑ مارا اور گالی دی۔''

انیق نے کہا۔''مجھے بھی لگتا ہے کہ یہ آقا جان یہاں شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بنا ہوا ہے۔ ہر معاملے میں سر گھسیڑتا ہے اور اس کے سر گھسیڑنے کو خوش دلی سے برداشت بھی کیا جاتا ہے۔''

''مگر دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ یہ جناب کتاب بین اور دوسرے معاملوں میں بہت زیادہ کھیلے کررہا ہے۔'' سجاول نے نکتہ اٹھایا۔

میں نے کہا۔''یہ بھی کہتے ہیں ناں کہ جو بہت منہ چڑھے ہوتے ہیں...... مالک ان کے گھپلوں کو نظرانداز بھی کرتے ہیں۔''

''ایک اور خبر ہے۔'' سجاول بولا۔

ہم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''پرسوں رات وہ دونوں لڑکیاں یہاں پہنچ چکی ہیں جنہیں کمال اور ابراہیم کی دلہنیں بننا ہے۔''

میں نے سنسنی محسوس کی۔''یعنی زینب بھی یہاں آچکی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس کا تو ٹھیک سے پتا نہیں چلا مگر سنبل نے بتایا ہے کہ وہ دونوں لڑکیاں دو دن سے یہاں یارا ہاؤس میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ذرا دبلی پتلی اور تیکھے نقوش والی ہے۔ دوسری ذرا صحت مند اور بھورے بالوں والی ہے۔ دونوں لڑکیوں کی خوب آؤ بھگت کی جارہی ہے۔ دونوں لڑکوں سے ان کی ملاقات بھی کرائی گئی ہے اور کوشش کی جارہی ہے کہ ان کی جھجک دور ہو۔''

میں نے سجاول سے کہا۔''سنبل سے کہو کہ لڑکیوں کے نام معلوم کرے۔ میرا خیال ہے کہ وہ دبلی پتلی لڑکی زینب ہی ہوگی۔''

سجاول بولا۔ ”سنبل سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کل رات تک تم خود بھی انہیں دیکھ سکو گے۔ یہاں کوئی منگنی کی طرح کی رسم ادا ہو رہی ہے۔ لڑکیوں کو انگوٹھیاں پہنائی جائیں گی۔ میرا خیال ہے کہ اس رسم میں ہمیں بھی دعوت دی جائے گی۔“

”اور اگر ایسا نہ ہوا تو؟ میرا مطلب ہے کہ ہمیں دعوت نہ دی گئی تو؟“

”پھر ہم جانکاری کے لیے سنبل کو استعمال کریں گے۔“

میں آج کل انیق والے کمرے میں ہی سو رہا تھا۔ جاناں میرے کمرے میں سوتی تھی۔ وہ بلائے بے اماں کی طرح مجھ سے چپٹی ہوئی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس پر عشق کا بھوت سوار تھا۔ وہ رومان پسند لڑکی تھی۔ موسیقی اور شاعری وغیرہ اس کے اندر تک اتری ہوئی تھی۔ اس نے ”تابر بھائی“ کا ایک بت بنایا تھا اور اس کی پوجا کی تھی اور جب اسے معلوم ہوا تھا کہ اس بت کے اندر دراصل میں ہی موجود ہوں تو اس کے جذبات کے سارے تند و تیز دھارے کسی طرح میری طرف مڑ گیا تھا۔ بہرحال ایک بات ہوئی تھی، اس رات بری طرح میری ڈانٹ کھانے کے بعد وہ اپنی حدود سمجھ گئی تھی اور وقت بے وقت میرے سر پر سوار نہیں ہوتی تھی۔ (ماؤ کی پوتی ممتاز عرف مانی بھی ان لڑکیوں میں سے تھی جو ازخود صنفِ مخالف کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں لیکن آفت کی پرکالہ مانی اور جاناں میں ایک نمایاں فرق تھا۔ جاناں روکنے سے رک جاتی تھی لیکن مانی ہر طرح کی ”من مانی“ کرتی تھی اور خودسر تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ ایک آنسو گرائے گی تو اس کی دادی کو غش آنا شروع ہو جائیں گے اور پورے ڈیرے کا نظام تہ و بالا ہو جائے گا۔ سجاول سے مجھے جو اطلاعات ملی تھیں ان سے پتا چلتا تھا کہ ماؤ جی میرے بارے میں ازحد فکرمند ہے اور ایک جوائی کی حیثیت سے جلد از جلد ڈیرے پر میری واپسی چاہتی ہے، بہرحال مستقبل قریب میں اس کی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی)

اگلے روز جاناں کے سلسلے میں میرے لیے مزید آسانی پیدا ہو گئی۔ آقا جان پارا ہاؤس آیا تو اس نے جاناں کے لیے حکم جاری کیا کہ اسے واپس بنگلے میں جانا ہے کیونکہ اس کی بیگم میڈم لورین کو اس کی ضرورت ہے۔ آقا جان نے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں اس نے وڈے صاحب سے اجازت لے لی ہے۔

یہ صورتِ حال جاناں کے لیے پریشان کن لیکن میرے لیے اطمینان بخش تھی۔ میں نے رات کے کھانے کے بعد تنہائی میں اسے سمجھایا، ایسا کرنا ہمارے لیے فائدہ مند ہے یہاں اس پارا ہاؤس میں تو ہم موجود ہیں، لیکن وہاں بنگلے میں کیا کچھ ہو رہا ہے ہمیں پتا نہیں۔ تم وہاں ہوگی تو بہت کچھ جان لوگی۔“

”لیکن شاہ زیب! وہ موٹی میرا تیل نکال دیتی ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں سے دس گھنٹے تو میں اس کی ٹانگیں دباتی ہوں۔ باقی وقت اسے ناول سنانے میں گزر جاتا ہے۔ دماغ پلپلا اور بازو لکڑی ہو جاتے ہیں۔“

”تو پھر؟“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”آپ سردار سجاول سے کہیں، یہ لوگ اس کی بات بہت مانتے ہیں۔ سردار، وڈے صاحب سے بات کرے تو شاید مجھے وہاں نہ بھیجا جائے۔“

میں نے گہری نظروں سے اسے دیکھا اور کہا۔ ”میں کہوں کہ تم وہاں جاؤ تو پھر؟“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک میری آنکھوں میں نگاہیں گاڑے رہی، پھر میرے ساتھ لگ گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”آپ کے لیے تو مرنا بھی قبول ہے۔“

میں نے اسے بانہوں میں لے لیا۔ اس نے اگلی صبح چلے جانا تھا لہٰذا وہ رات کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار پھر وہی چکر تھا۔ پھر وہی بھنور تھا۔ آنچل کی سنسناہٹ، سانسوں کی سرسراہٹ، جسم کی حرارت۔

اور صبح دم اس بھنور سے نکلنے کے بعد پھر وہی ندامت، پھر وہی دکھی کر دینے والا احساس...... پھر وہی چہرہ...... وہی دو لٹیں۔ وہ گم صم سی ایک پگڈنڈی پر میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔ خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ آپ تو کہتے تھے...... تاجور! میں نے تم سے پیار کیا ہے، اتنا پیار جو تمہارے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ کیا پیار ایسا ہوتا ہے؟ کیا، اتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے؟ ہمت ہار جاتا ہے؟ پیار تو ایک ہلکی سی امید کے سہارے، برسوں کاٹ دیتا ہے۔ زمانے بتا دیتا ہے۔

ہاں، وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تھی اور میں خود کو اس کے سامنے جواب دہ سمجھتا تھا، کیوں سمجھتا تھا؟ وہ تو منہ پھیر کر چلی گئی تھی۔ اس ٹھٹھری ہوئی صبح میں اس سرخ رنگ کے ریکٹری کی طرف بڑھتی چلی گئی تھی جس پر دین محمد صاحب بیٹھے تھے۔ اس نے تو مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ ایک بار

بھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں گمنرا ہوں یا جا چکا ہوں۔ وہ سارے دروازے بند کر گئی تھی۔ اس نے کوئی چھوٹے سے چھوٹا در بھی کھلا نہیں رکھا تھا۔ میں نے سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر اپنے سیل فون کی اسکرین پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

دکھ کی ایک بلند لہر میرے اندر سے اٹھی۔ میں نے فون کو فرش پر پٹخ کر چکنا چور کر دیا۔

انیق آواز سن کر اٹھ بیٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے فرش پر بکھرے ہوئے سیل فون کو دیکھا اور سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ ''اسے کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''گر گیا تھا۔'' میں نے بیزاری سے جواب دیا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ...... آپ بھی ساتھ ہی گرے ہیں۔'' اس نے بظاہر عام سے لہجے میں کہا اور فون کو سمیٹنے لگا۔ اس نے اس میں سے ''سم'' نکالی اور احتیاط سے جیب میں رکھ لی۔

''اسے کیوں رکھ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسرے فون سیٹ میں ڈال کر آپ کو دوں گا۔ کل از میر طیب نے مجھے ایک ماڈرن فون سیٹ دیا ہے۔'' وہ بولا۔

''شاید مجھے ضرورت نہیں۔''

''شاید آپ کو ضرورت ہے۔ اس وقت آپ غصے میں ہیں لیکن کل نہیں ہوں گے۔'' اس نے کہا اور باہر چلا گیا۔

وہ میرا راز شاں بنا جا رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ میری نگاہ دن میں درجنوں بار سیل فون کی اسکرین کی طرف اٹھتی ہے اور یہ بھی پتا تھا کہ کیوں اٹھتی ہے اور شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے پھر اس فون کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس سم کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہ وہی نمبر تھا جو میں نے وقتِ رخصت تاجور کو دیا تھا۔ آسیں اتنی آسانی سے تو نہیں ٹوٹتیں۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر پھر جڑ جاتی ہیں۔ دل میں انہونیوں کی امید رہتی ہے۔ گہرے پانیوں کے اندر دیے جلانے کی کوشش جاری رکھنا، محبت کرنے والوں کی مجبوری ہوتی ہے۔

میرا اندیشہ درست تھا۔ مجھے اور انیق کو پارا ہاؤس کی اس نجی تقریب میں نہیں بلایا گیا۔ ہاں سجاول کو تھوڑی سی تاخیر کے ساتھ دعوت دے دی گئی۔ بڑی بیگم نے اپنے ''بھائی'' کا بھاری دے ڈالا تھا اور اسے خاص اہمیت دی گئی تھی۔

عنایت کی گئی تھی۔ سجاول نے حیران کن تیزی سے پارا ہاؤس میں جگہ بنائی تھی۔

ہم تقریب میں تو نہیں گئے لیکن اس کا ازالہ اس طرح ہو گیا کہ ہم نے پارا ہاؤس کے شارٹ سرکٹ ٹی وی پر اس تقریب کی جھلکیاں دیکھیں۔ یہ تقریب پارا ہاؤس کے رہائشی حصے کے اندر ایک وسیع ہال کمرے میں منعقد ہوئی۔ اس میں خاندان کے افراد کے علاوہ وڈے صاحب کے چند قریبی دوست بھی شامل تھے۔ یہ سب پاکستانی تھے اور ان میں شکیل داراب سرِفہرست تھا۔ ایک نہایت شاندار اسٹیج تیار کیا گیا تھا جو تقریباً سارے کا سارا سرخ، سفید اور کالے گلابوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ معزز مہمانوں کے علاوہ وڈے صاحب کے دونوں فرزند بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ وہ اسلامی طرز کے لباس میں تھے۔ لمبے چغے، سروں پر ٹوپیاں، چھوٹی چھوٹی خوب صورت داڑھیاں اور چہرے پر شرافت کی روشنی۔ ان کی والدہ بڑی بیگم نے حجاب کیا ہوا تھا اور وہ بھی ایک کھلے لیکن نہایت قیمتی لبادے میں تھیں۔ خاندان کی کچھ دیگر خواتین رنگین حجاب میں نظر آتی تھیں۔ کچھ لڑکیوں نے زرق برق لباس پہن رکھے تھے اور لمبے لمبے گھونگھٹ نکال رکھے تھے۔ وہ ہاتھوں میں ہاتھ پکڑے ایک دائرے کی شکل میں چکرا رہی تھیں۔ اس دائرے کے درمیان میں ایک چھوٹا سا حجلۂ عروسی تھا جس میں سے کبھی سبز اور کبھی سرخ روشنی پھوٹتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں باری باری حجلۂ عروسی پر ہاتھ رکھتی تھیں اور مسکراتی تھیں۔ یہ کوئی غیر ملکی رسم تھی۔ اسٹیج پر موجود مہمانوں میں گورا چٹا شکیل داراب بھی بڑی شان سے براجمان تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح گارڈ تھے۔ یہ سارا احاطہ ہی سخت سیکیورٹی کے نرغے میں تھا۔ باقی مرد و زن اسٹیج کے سامنے آرام دہ نشستوں پر بیٹھے تھے اور پارا ہاؤس کی شاہانہ میزبانی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ سجاول بھی انہی مہمانوں میں موجود تھا۔ اسے ایک عقبی نشست دی گئی تھی۔

اسی دوران میں کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ کیمرے حرکت میں آئے۔ فلش لائٹس چمکیں اور دونوں لڑکیاں ہال کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے نصف چہرے نقاب میں تھے۔ وہ بیش قیمت سنہری کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ میں نے زینب کو پہچان لیا۔ لیکن یہ شناخت آسانی سے نہیں ہوئی۔ وہ کافی بدل گئی تھی۔ اس کا وزن بھی معقول حد تک بڑھ گیا تھا۔ رنگت اجلی اور نقوش میں جاذبیت دکھائی دے رہی تھی مگر اسے دیکھتے ہی پتا چل جاتا تھا کہ وہ غم کے ایک ان دیکھے بوجھ تلے دبی ہے۔ سر اور نظر جھکائے وہ درجنوں

مہمانوں کے درمیان سے گزرتی بڑی آہستگی کے ساتھ اسٹیج پر پہنچی اور دوسری لڑکی کے ہمراہ نشست پر جا بیٹھی۔ دونوں لڑکیاں درمیان میں تھیں، لڑکے دائیں بائیں تھے۔ زینب کے ساتھ ابراہیم تھا اور دوسری لڑکی کے ساتھ کمال احمد۔

ابراہیم کے بازو کے زخم پر ابھی تک یقیناً پٹی موجود تھی مگر اس پٹی کو کھلی آستین والے لبادے میں چھپالیا گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا زینب کی طرف جھکا اور مسکرا کر اس سے کچھ کہا۔

وہ بھی زبردستی مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

انیق نے مجھ سے کہا۔ ''لگتا ہے دونوں میں کچھ انڈر اسٹینڈنگ ہوچکی ہے۔''

''مجھے تو یہ وہی انڈر اسٹینڈنگ لگتی ہے شہزادے جو پالتو جانور کی سرکس کے رنگ ماسٹر کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس انڈر اسٹینڈنگ کے پیچھے زبردست سختی، دباؤ اور مجبوری ہوتی ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے، زینب کو ڈرایا دھمکایا گیا ہوگا؟''

''اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تم دیکھو اس کی گود میں رکھے ہوئے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔''

وہ واقعی خود کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھی۔ کسی ڈری سہمی چڑیا کی طرح بیٹھی تھی جس کے اردگرد بڑے بڑے پروں والے عقاب پھڑپھڑا رہے ہوں اور یہ چاند گڑھی کے ایک سادہ سے گھر میں رہنے والی ایک سادہ سی لڑکی تھی جو کچھ عرصہ پہلے تک اپنے مرحوم والد مولوی فدا کے سینے پر سر رکھ کر سوتی تھی اور شاید گڈے گڑیوں سے بھی کھیلتی ہوگی، ابھی تو اس کے لاڈ دکھانے کے دن تھے، ماں باپ سے فرمائشیں کرنے اور ہم عمر سہیلیوں کے ساتھ قلانچیں بھرنے کا زمانہ تھا اور اس بے چاری کو اپنوں سے سیکڑوں میل دور اس اونچی دیواروں والے پارا ہاؤس میں بھاری بھرکم کپڑوں اور زیوروں سے لاد کر بٹھا دیا گیا تھا۔ یہاں کوئی اس کا اپنا نہیں تھا، کوئی شناسا نہیں تھا۔ وہ تو ان لوگوں کی زبان تک نہیں سمجھتی تھی۔ شاید ان کے نام تک نہ جانتی ہو۔ ہاں وہ پھڑپھڑاتے ہوئے دیوہیکل عقابوں کے درمیان ایک تنہا چڑیا تھی۔

میں نے دل ہی دل میں کہا...... گھبراؤ نہ اے سہمی ہوئی چڑیا۔ خود کو تنہا نہ سمجھو، ہم تمہارے ساتھ ہیں، تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔ تم دردِ دل رکھنے والے مولوی فدا کی یتیم بچی ہو...... اور تم اس چاند گڑھی کی رہنے والی بھی ہو جس میں میرا کوئی اپنا رہتا تھا...... میرا بہت زیادہ اپنا۔ اس ''دوسری نسبت'' سے بھی تمہاری مدد کرنا میرا فرض ہے۔ میں تمہیں اس طرح طاقت اور دولت کی سولی پر نہیں چڑھنے دوں گا۔

ہال کمرے میں وڈے صاحب کی خواصیں بھی موجود تھیں اور ان میں مجھے سنبل کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ بہت بنی ٹھنی تھی اور یوں لگتا تھا کہ وڈے صاحب کی رکھیل نہیں بلکہ نوبیاہتا بیوی ہے۔ عورتوں اور لڑکیوں کے اس جھرمٹ میں روحی نامی لڑکی بھی دکھائی دی جس سے آج کل سنبل کی زبردست رقابت چل رہی تھی۔ وڈیو میں بھی دکھائی دیا کہ وہ کینہ توز نظروں سے خوبرو سنبل کو تاک رہی ہے۔ تقریب میں کئی طرح کی چھوٹی چھوٹی رسمیں تھیں جن میں ایک گڑیا گڈے کو دودھ میں نہلانا، ہاتھوں اور چہرے پر مہندی لگانا اور نہایت تیز مرچوں والے چاول کسی نوبیاہتا عورت کو کھلانا اور اسے پانی نہ پینے دینا، وغیرہ شامل تھیں۔

☆☆☆

سنبل اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہی تھی۔ وہ وڈے صاحب کو اپنی اداؤں کے جال میں جکڑے ہوئے تھی۔ کبھی لگتا ہے وہ اسے زبردست نخرے دکھاتی تھی اور آنسو بہاتی تھی۔ غالباً اس کی محبت کا جواب محبت سے دینے سے بھی انکار کرتی یا بہانہ بناتی تھی۔ سجاول نے وڈے صاحب کو سمجھا رکھا تھا کہ لڑکی جب بھی سرکش گھوڑی والے تیور دکھائے تو وہ اس کی لگام کچھ دیر کے لیے اس کے ہاتھ میں تھما دے۔ وہ اسے بات چیت کے ذریعے بالکل رام کرے گا۔ اگلے روز بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ سنبل، سجاول سے ملاقات کے لیے چلی آئی۔ سفید مینا اس نے گلے سے لگا رکھا تھا۔ وہ جب بھی آتی تھی بڑی شان سے آتی تھی۔ ایک دو ملازمائیں، ایک دو مشاطائیں، دو تین گارڈز اس کے جلو میں ہوتے تھے۔ جب وہ سجاول کے پاس پہنچتی تھی تو سب لوگ باہر کھڑے رہ جاتے تھے۔ اب کی دفعہ بھی سنبل اور سجاول کے درمیان تقریباً ایک گھنٹا گفت وشنید ہوئی۔

اس گفت وشنید کا خلاصہ ہمیں بعدازاں سجاول سے معلوم ہوا۔ اس نے بتایا۔ ''زینب اور دوسری لڑکی شائستہ کو بری طرح ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ خاص طور سے زینب کو۔ کیونکہ وہ زیادہ مزاحمت کر رہی تھی۔ اس سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ اڑیل پن دکھائے گی تو اس کے وارثوں کے ساتھ برا سلوک ہوگا۔ ان کی جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔''

''کس نے دھمکایا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دھمکانے ڈرانے والے کام یہاں ایک ہی خبیث آ کرتا ہے..... آقا جان، سمجھو کہ وہ یہاں کا ایس ایچ او ہے، جج بھی اور جلاد بھی۔ وڈا صاحب کسی حد تک نرم طبیعت کا مالک ہے مگر اس کی کمی اس کے اس وفادار ہرکارے نے پوری کر رکھی ہے۔''

''ابراہیم اور زینب کا معاملہ کیسا چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ان چند دنوں میں ابراہیم بالکل لٹو ہو گیا ہے زینب پر۔ سنا ہے کہ اس نے ماں سے کہا ہے کہ وہ بالکل ایسی ہی لڑکی چاہتا تھا۔ یہ زینب جس طرح نماز روزے کی پابندی کرتی ہے وہ بھی ابراہیم کے دل کو بہت بھایا ہے۔ ویسے تو دونوں ہی لڑکیاں مذہبی گھروں سے ہیں، پردہ وغیرہ بھی کرتی ہیں۔ شادی کی تیاری کے طور پر دونوں لڑکوں نے اور خاص طور سے ابراہیم نے اردو کے کچھ لفظ سیکھ رکھے ہیں۔ لڑکیوں کو بھی اس قابل بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ وہ اپنے خاوندوں سے بات کر سکیں۔''

''تمہاری بات سے تو یہی مطلب نکلتا ہے کہ زینب اس شادی پر راضی نہیں ہے۔''

''یار! وہ تو بالڑی ہے۔ اس کے راضی ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہاں تو وہی کچھ ہوتا ہے جو ان لوگوں نے چاہنا ہے۔''

''اور ہم یہ سب کچھ ہونے دیں گے؟''

''ہم کیوں ٹانگ اڑائیں۔'' سجاول بولا۔ ''ہم ان لڑکیوں کو یہاں نہیں لائے۔ نہ ہم ان کو شادی پر مجبور کر رہے ہیں۔ ویسے بھی ان کے ساتھ کوئی ایسا برا تو نہیں ہو رہا۔ یہ عام سے گھروں کی دیہاتی کڑیاں ہیں، اتنے بڑے خاندان کی بہو بن جائیں گی۔ کروڑوں، اربوں میں کھیلیں گی۔''

''لیکن تب ہی کھیلیں گی ناں جب زندہ رہیں گی۔ شاید تم بھول رہے ہو کہ یہاں اندر خانے اور معاملہ چل رہا ہے۔''

سجاول نے ذرا توقف کیا، پھر سگریٹ کا طویل کش لے کر بولا۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ وڈے صاحب کے یہ دونوں لڑکے زہریلے ہیں..... لیکن یہ بھی تو دیکھو کہ لڑکیاں بھی زہریلی ہیں۔ وہ پنجابی کی کیا مثال ہے..... سپ نوں سپ لڑے سپتے وڑیں تے نوں اپج لکھے۔''

''تم اس معاملے کو ایزی لے رہے ہو سجاول! لیکن میں ایزی نہیں لے سکتا۔ میں خاص طور سے مولوی فدا کی بیٹی زینب کے لیے پریشان ہوں۔''

''وہ کیوں؟ وہ تمہاری ''اُس'' کی پنڈ کی ہے اس لیے؟'' سجاول نے طنز کیا۔ اس کا اشارہ تاجور کی طرف تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل چاہا کہ اس پر پل پڑوں مگر پھر خود کو سنبھالا۔ بزدلی کی وجہ سے نہیں، اس حقیقت کی وجہ سے کہ وہ ایک منفرد فائٹر تھا۔ اگر اس سے مارا ماری شروع ہو جاتی تو سارا کھیل ہی بگڑ جاتا اور جو کچھ بھی تھا، مجھے یہ ماننے میں بھی باک نہیں تھا کہ سجاول کے پُراسرار گھونسے کا مقابلہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ دیکھنے میں تو ایک عام ہاتھ ہی نظر آتا تھا لیکن جاننے والے جانتے تھے کہ یہ عام نہیں ہے۔ سجاول طیش کے عالم میں اس ہاتھ کے ذریعے کسی کو بھی موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا اور جب وہ اس خاص حالت میں ہوتا تھا جس میں اس نے ہاتھ کا نشانہ جگر چنا ہوا تھا اور مجھ سے ہتھ جوڑی کی تھی تو اس کا دایاں مکا ناگہانی موت کا دوسرا نام تھا۔

میرے چہرے پر چمکنے والی سرخی دیکھ کر سجاول تاڑ گیا کہ اس کی بات مجھے بہت بری لگ گئی ہے۔ اس نے جلدی سے وسکی سے بھرا گلاس میری طرف بڑھایا اور بولا۔ ''دیکھو، میں نے کسی کا نام نہیں لیا۔ بس یونہی ایک بات کی ہے..... تم بڑی جلدی برا مان جاتے ہو۔''

میں نے گلاس تھام لیا اور سگریٹ کے چند کش لے کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کی۔ سجاول میرے لیے نیا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا، تم زینب کے لیے فالتو طور پر پریشان کیوں ہو؟''

میں نے گلاس ایک طرف ہٹا دیا۔ ''دیکھو سجاول! یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں کہ تم ایک ڈکیت ہو۔ تمہارا مسئلہ صرف مال اکٹھا کرنا ہے۔ تم یہاں پارا ہاؤس میں بھی بس اپنے اسی کام کے لیے ہو۔ تمہارا دماغ بھی بس اپنے اسی کام کے بارے میں سوچ رہا ہے لیکن میں دوسری باتیں بھی دیکھتا اور سوچتا ہوں۔ جہاں تک میں جان پایا ہوں، کمال احمد والی لڑکی کو تو جسمانی طور پر اس ازدواجی بندھن کے لیے تیار کر دیا گیا ہے، مگر زینب تیار نہیں ہے۔ یعنی وہ پوری طرح محفوظ ...... نہیں ہو سکی ہے۔ اس بات کا ثبوت خط سے بھی ملتا ہے اور وہ کمینہ عالمگیر بھی یہ سب اچھی طرح جانتا ہوگا۔ اس نے صرف اپنی کھال بچانے کے لیے اور اپنی بقایا رقم کھری کرنے کے لیے اس بیچاری کو یہاں ''ڈلیور'' کر دیا ہے۔

”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پوری طرح تیار نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ......“

”میں سب کچھ جانتا ہوں۔“ میں نے سجادل کی بات کاٹی۔ ”میں نے خود اسے عالمگیر اور پیر ولایت کے پنجے سے چھڑایا تھا۔ خود اسے اسلام آباد کے اسپتال میں پہنچایا تھا۔ اب اسے اس اسپتال سے اغوا کر کے یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بالکل تیار نہیں ہے۔ وہ بہت زیادہ نقصان اٹھا سکتی ہے۔“

سجادل کی پیشانی پر سوچ کی سلوٹیں ابھر آئیں۔

اگلے روز دوپہر کے وقت اتیق اپنے خانساماں دوست ازمیر طیب کے ساتھ اس کے رہائشی پورشن کی چھت پر کھڑا دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے بھی اوپر بلا لیا۔ ازمیر سرخ و سپید گول چہرے والا ایک صحت مند اور کم سخن تھا۔ اس کی بندریا لوسی کی صحت اب بہتر تھی اور وہ ازمیر کے کندھے پر بیٹھی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔ کسی لاڈلے بچے کی طرح وہ ہر وقت زرق برق لباس میں نظر آتی تھی۔ انگریزی کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں، میں نے ازمیر کے ساتھ چند جملوں کا تبادلہ کیا اور لوسی کی صحت یابی پر اسے مبارک باد دی۔ ازمیر طیب کی بات سے پتا چلا کہ لوسی کے خون میں NEUROTOXI نامی زہریلا مواد پایا گیا ہے۔ شاید اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے مگر جسم پر کوئی خاص نشان نہیں ہے۔ اتیق نے مجھے اشارے سے دور بنگلے کا منظر دکھایا۔ درمیانی فاصلہ کم و بیش تین فرلانگ کا تھا۔ بنگلے کے سامنے لوگوں کی دو طویل قطاریں نظر آرہی تھیں۔ ان میں بچے، بوڑھے اور عورتیں سب شامل تھے۔ اتنے فاصلے سے بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ علاقے کے مفلوک الحال لوگ اور کھیت مزدور وغیرہ ہیں۔

”لگتا ہے کہ وہاں کچھ تقسیم کیا جا رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں شاید آقا جان کچھ بانٹ رہا ہے۔“

”وہ خسیس تو کسی کو دمڑی دینے والا بھی نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ پارا ہاؤس والے ہی کچھ تقسیم کر رہے ہوں، تم ازمیر سے پوچھو شاید اسے کچھ پتا ہو۔“

”نہیں، ازمیر صاحب نے بھی یہ سین ابھی دیکھا ہے۔“

بے شمار لوگ موجود تھے اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں مزید بھی آرہے تھے۔ کچھ پیدل تھے، کچھ سائیکلوں پر، کچھ گدھا گاڑیوں وغیرہ پر۔

اندر خانے کی باتیں ہمیں سنبل یا جاناں کے ذریعے ہی معلوم ہوتی تھیں، ورنہ عام ملازمین تو کسی کے بارے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ جاناں اب بنگلے میں موجود تھی اور وہ بتا سکتی تھی کہ وہاں کیا ماجرا ہے۔ شام کو میں نے حلیمی سے اجازت لی کہ میں ایک آدھ گھنٹے کے لیے بنگلے جانا چاہتا ہوں تاکہ اپنی بیوی سے ملاقات کر سکوں۔ حلیمی نے اجازت دے دی۔ ایک گاڑی جو پارا ہاؤس میں سامان خورونوش اتار کر واپس جا رہی تھی مجھے بھی لے گئی۔ تین چار سیکیورٹی گارڈز اس میں موجود تھے۔

جاناں یہ جان کر نہال ہوگئی کہ میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ میرا آنا بے مقصد نہیں ہوگا۔ تنہائی میں ملاقات ہوئی تو دوسری باتیں ہوئیں۔ جاناں کے ویلوٹ کے کڑھائی دار کرتے میں سے بڑی دلربا قسم کی خوشبو آرہی تھی۔ وہ ہر وقت میڈم اورین کے ساتھ رہتی تھی اور یہ خوشبو غالباً وہیں سے اس کے کپڑوں میں منتقل ہوئی تھی۔

”آج دوپہر سے میرا دل کہہ رہا تھا کہ آپ جناب کا دیدار ہوگا۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔

”کیوں، دوپہر میں کیا خاص بات ہوئی تھی؟“

”دوپہر میں یہ خاص بات ہوئی تھی کہ آپ کی یہ بندی نیند سے جاگی تھی۔ میڈم نے رات کوئی ڈھائی بجے تک مجھ سے ٹانگیں دبوائی تھیں۔ لگتا ہے کہ دونوں بازو پھوڑا بن جاتے ہیں...... ویسے ایک بات ہے، اب میں نے خود کو کچھ کچھ سمجھا لیا ہے۔ اب یہ مشقت بہت زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔“

”کیا مطلب؟“

”سچی سچی بتاؤں؟“ اس نے ذرا شوخ نظر آنے کی کوشش کی۔

”فرماؤ۔“

”جب میں میڈم کی ٹانگیں دباتی ہوں تو آنکھیں بند کر لیتی ہوں اور یہ سوچتی ہوں کہ میرے سامنے میڈم نہیں...... آپ لیٹے ہیں اور میں آپ کی ٹانگیں دبا رہی ہوں، پھر پتا ہی نہیں چلتا، وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔“ اس نے کہا اور اس کا چہرہ گلابی گلابی سا نظر آنے لگا۔

”تم مجھے زیادہ بانس پر نہ چڑھایا کرو تو بہتر ہے۔ اس طرح تم میرے ساتھ ساتھ خود کو بھی دھوکا دیتی ہو۔“

”دھوکا نہیں ہے جناب، سچ ہی نہیں ہے اور یہ محبت ہے جناب۔ لیکن آپ کو کسی وقت آزما کر دیکھیے گا۔“

''اچھا، زیادہ مت کالے بار کی نہ کرو۔ میں کچھ پوچھنے آیا ہوں تم سے۔ آج دوپہر یہاں کیا شور شرابا تھا۔ بہت سے لوگ قطاروں میں لگے ہوئے تھے؟''

''میرا خیال تھا کہ آپ پارا ہاؤس میں ہیں، آپ کو سب پتا ہوگا۔''

''نہیں، وہاں سب کی زبانوں پر تالے ہیں۔''

اس نے ایک ادھ کھلی کھڑکی کو بند کیا اور پھر میرے سامنے بیٹھتے ہوئے قدرے دھیمی آواز میں بولی۔ ''بڑے صاحب کے چھوٹے بیٹے ابراہیم نے اپنی ہونے والی دلہن کے نام پر صدقہ خیرات کیا ہے۔ لگتا ہے کہ کافی موٹی رقم آقا جان کے حوالے کی گئی تھی تاکہ وہ علاقے کے مستحق لوگوں میں بانٹ دے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ابراہیم اپنی ہونے والی دلہن زینب پر بری طرح فریفتہ ہو چکا ہے۔''

''بانٹا کیا گیا ہے؟''

''بہت سی چیزیں تو راشن کی شکل میں تھیں۔ آٹا، چاول، گھی وغیرہ۔ باقی نقد رقم بھی تھی لیکن یہ نقد رقم تو لوگوں تک ساری نہیں پہنچی ہوگی۔ ہاں راشن کے تین چار ٹرک ضرور تقسیم ہوئے ہیں۔''

''تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ نقد رقم ساری نہیں پہنچی ہوگی؟''

وہ رازداری کے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کچھ دیر پہلے آقا جان اور میڈم کی تھوڑی سی چخ چخ سنی ہے۔ میڈم کہہ رہی تھی...... کچھ خدا کا خوف کرو، غریبوں کا پیسا بھی پیٹ میں ڈال لیتے ہو۔ کوئی بہت بری بیماری لگ جائی ہے تمہیں۔''

وہ بولا۔ ''بری بیماری لگی تو ہوئی ہے تمہاری شکل میں۔''

اس کے بعد دونوں طرف سے کافی تابڑ توڑ انگریزی بولی گئی۔ لیکن دروازہ بند کرلیا گیا تھا اس لیے سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

میں نے کہا۔ ''جو صدقہ خیرات کیا گیا ہے، وہ صرف ابراہیم کی طرف سے تھا؟''

''ہاں، لگتا ہے کہ بڑے بھائی کمال کو شادی کا زیادہ شوق نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی دوسری شادی ہے۔ پہلی بیوی فوت ہو چکی ہے۔''

''اور کوئی خاص بات، جس کا پتا چلا ہو؟''

''ابھی تو بس محبت اور انتظار کا ہی پتا چل رہا ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانک کر ادا سے بولی لیکن پھر میرے چہرے پر سنجیدگی دیکھی تو فوراً بات بدلی۔ ''لگتا ہے کہ چھوٹا شہزادہ ابراہیم ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا ہے۔ اس نے اپنے رہائشی حصے میں سے سارے کیلنڈر اتروا دیے ہیں۔ یہ بات پارا ہاؤس سے آنے والی ایک ملازمہ نے مجھے بتائی ہے۔''

''کیلنڈر اتروانے کا کیا مقصد؟''

''شاید وہ تاریخیں گننا نہیں چاہتا۔ ملازمہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ وہ باقاعدہ صبح اور شام زینب کے لیے گلدستہ بھجواتا ہے اور اس کی خیر خیریت دریافت کرتا ہے۔ دو چار ملاقات بھی کی ہیں لیکن یہ ملاقات ان لوگوں کے رواج کے مطابق پردے کی اوٹ میں ہوتی ہے۔''

میں جاناں کے پاس قریباً ڈیڑھ گھنٹا رکا۔ اس دوران میں ایک بار میڈم نورین کی جھلک بھی نظر آئی۔ غالباً وہ جاناں کو جلد از جلد پھر اپنے پاس دیکھنا چاہتی تھی۔ میں شام چھ بجے کے قریب پارا ہاؤس واپس آگیا مگر وہاں بدستور الجھا ہوا تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ بالکل ٹھیک تھا یا اسے روکے جانے کی ضرورت تھی۔ دوسری طرف پارا ہاؤس میں شادی کی تیاریاں نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھیں۔ رات کے وقت رہائشی حصے کے اندر سے کبھی گیت اور دف وغیرہ کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ پارا ہاؤس کے جن حصوں کو خونی ہنگامے کے دوران میں نقصان پہنچا تھا ان کو ٹھیک کرلیا گیا تھا اور وہاں تیز روشنیوں میں رات کے وقت بھی رنگ و روغن کا کام کیا جا رہا تھا۔

میں نے انیق سے مشورہ کیا اور سجاول سے بھی۔ میرا خیال تھا کہ ابراہیم سے ملاقات کر کے اسے صورتِ حال سے آگاہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سجاول اس خیال کا حامی نہیں تھا۔ انیق اس کے سامنے تو چپ رہا لیکن بعد میں بھنائے لہجے میں بولا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ سجاول کا اوریجنل پوری کہہ کر ہم اس کی خباثت کا حق ادا نہیں کر رہے۔ اس میں تو برصغیر کے تمام بڑے بڑے سائڈ ہیروز کی خصوصیات جمع ہیں۔ مظہر شاہ، مصطفیٰ قریشی، اسد بخاری اور انڈیا کے پران، رنجیت اور ڈینی وغیرہ کی ساری بدکاریوں کو جمع کرلیا جائے تو وہ اس اکیلے سجاول میں موجود ہیں۔''

''اپنی چونچ بند رکھا کرو۔ کسی دن اس نے سن لیا ناں تو تمہارے سارے تخمینوں کو درست ثابت کر کے دکھا دے گا۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ کہ ہمیں ابراہیم سے بات کرنی چاہیے یا نہیں؟''

انیق نے ہاتھ سے سر کھجایا۔ یہ اس بات کی نشانی تھی کہ وہ سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔ ذرا توقف سے

بولا۔ ''جہاں تک مجھ ناچیز کی رائے ہے یہ کمال احمد اور ابراہیم بری خصلت کے نہیں ہیں۔ خدا خوفی بھی ان میں موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم زینت کے سلسلے میں ابراہیم کو طریقے سے آگاہ کریں تو وہ ہماری بات پر غور کرے۔''

''لیکن بات کی کس طرح جائے؟''

''منہ سے، جس طرح سارے لوگ کرتے ہیں۔''

''میں تھپانپڑ ماردوں گا۔ تم مسخری کررہے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''حلمی صاحب سے مدد مانگ کر دیکھ لیں۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ سجاول کی منظوری کے بغیر مدد کرے گا۔''

''آپ ہی کو شوق چڑھا ہوا ہے سجاول کو آگے بڑھانے کا اور اس کی عزت میں اضافہ فرمانے کا۔ آپ کی ڈھیل ہی کی وجہ سے ابراہیم کو ناتب وغیرہ سے چھڑانے کا تقریباً سارا کریڈٹ سجاول نے اپنے کھاتے میں ڈال لیا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ پائیں باغ کی طرف جاگنگ ٹریک بنا ہوا ہے۔ شام کے وقت ابراہیم اور کبھی کبھی کمال احمد وہاں جاگنگ کرتے ہیں۔ اگر وہاں ابراہیم سے ''اتفاقاً'' ملاقات ہوجائے تو بات چیت کی راہ نکل سکتی ہے۔''

یہ بات انیق کے دل کو بھی لگی۔

اسی شام میں چہل قدمی کے انداز میں بارہ اوس کے انتہائی خوب صورت اور وسیع باغ کی طرف چلا گیا۔ مجھے پتا تھا کہ یہاں قدم قدم پر سی سی ٹی وی کیمرے موجود ہیں۔ اس لیے میں بہت محتاط تھا۔ میں بالکل نارمل انداز میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور پھر جاگنگ ٹریک کے قریب چلا گیا۔ یہ وہی وقت تھا جب ابراہیم جاگنگ کرتا ہوا گزرتا تھا۔ اچانک درختوں کی اوٹ سے دو مسلح گارڈز نکلے اور میرے سامنے آگئے۔ یہ وہی اسپیشل گارڈز تھے جو ہنگامے کے بعد کسی ہائی فائی ایجنسی سے منگوائے گئے تھے۔

''آپ کدھر جارہے ہیں؟'' ایک مونچھیل گارڈ نے تند لہجے میں پوچھا۔

''جا تو کہیں نہیں رہا صرف گھوم پھر رہا ہوں۔''

''آپ کی حرکات شک میں ڈالنے والی ہیں۔ آپ ادھر ہمارے ساتھ تشریف لائیں۔'' گارڈ نے بدتمیز زکاٹ دار لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں مجھے یم گنجا آغا جان بھی نظر آگیا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا آرہا تھا۔ غالباً اسے بھی ان نگران گارڈز نے کال کر کے ہی بلایا تھا۔ اس کی ناک کی سلوٹ بہت نمایاں نظر آرہی تھی۔ اس نے مجھے کڑی نظروں سے گھورنے کے بعد کہا۔ ''تمہارے یہاں جاگنگ ٹریک کے پاس منڈلانے کا کیا مطلب ہے؟''

''میں آپ کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔'' اس کے لب و لہجے نے میرا پارا بھی چڑھا دیا۔

''جواب تو تمہیں دینا پڑے گا بچہ جی۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''اس سے پہلے تم نے کچرا کنڈی کی طرف چہل قدمی کی تھی۔ لگتا ہے چہل قدمی کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے تمہیں۔''

''آپ..... اپنا لہجہ ٹھیک کریں جان صاحب۔'' میں نے کہا۔

وہ تو جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ جھپٹ کر میری طرف آیا اور میرا گریبان پکڑنا چاہا۔ میں نے دفاعی انداز میں اس کی کلائی تھامی۔ میرا ایک گھٹنا پیچھے مارا.. شانے کو آگے دھکا گیا۔ گارڈز مجھ پر پل پڑے... مجھ پر غالب آنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے ایک گارڈ کے چہرے پر اپنے سر کی ٹکر رسید کی اور دوسرے کو لات مار کر دور پھینک دیا۔ ایک دم چاروں طرف دھما چوکڑی مچ گئی۔ صورتِ حال کو نازک دیکھا تو ایک گارڈ نے رائفل سیدھی کرلی۔ میں نے جھپٹ کر رائفل کا بیرل اوپر اٹھادیا اور گارڈ کی ٹانگوں کے درمیان گھٹنے کی ضرب لگائی۔ وہ تڑپ کر زمین پر گر گیا، اب رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ دونوں گارڈز نے بھی رائفلیں تان لیں لیکن ٹریگر دبانے کی ہمت مجھ سمیت کسی کو نہیں ہوئی۔ بے حد تناؤ والا منظر تھا۔ آغا جان غصے میں چلا رہا تھا۔ ''رائفلیں نیچے کرو۔ میں کہتا ہوں نیچے کرو۔''

یہی وقت تھا جب میری نگاہ جاگنگ ٹریک کی طرف اٹھ گئی۔ میں نے ابراہیم کو دیکھا۔ وہ ٹریک سوٹ میں تھا۔ اس کے ساتھ ایک باڈی گارڈ بھی ٹریک سوٹ میں تھا۔ ابراہیم ٹریک سے اتر آیا تھا اور میری طرف آرہا تھا۔ وہ انگریزی میں پکار کر بولا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے، کیا بے وقوفی ہے؟''

اسے دیکھ کر میں نے رائفل فوراً نیچے کرلی۔ ایک گارڈ نے جھپٹ کر مجھ سے رائفل لے لی۔ یہ وہی تھا جس کے چہرے پر میری ٹکر لگی تھی۔ اس کے نتھنے خون سے رنگین تھے اور [illegible] سے بھی خون رس رہا تھا۔ اس کے ساتھی

گارڈز نے بدستور رائفلیں تانے رکھیں۔ ابراہیم نے انہیں حکم دیا کہ وہ رائفلیں نیچے کرلیں اور پیچھے ہٹ جائیں۔
گارڈز مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ کئی اور لوگ بھی موقع پر جمع ہو گئے تھے۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے جی؟'' ابراہیم نے انگلش میں آقا جان سے دریافت کیا۔
آقا جان پھٹ پڑا۔ ''یہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ یہ ڈرامے کررہا ہے۔ یہ جاگنگ ٹریک کے پاس منڈلا رہا تھا۔ کل بھی یہ اسی وقت یہاں گھومتا رہا ہے۔''
جواب میں ابراہیم نے جو کچھ کہا، اس نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ بولا۔ ''آقا جان! آپ اس پر کسی طرح کا شک نہ کریں۔ مجھے اس پر اور سجاول صاحب پر پورا بھروسا ہے۔''
آقا جان نے کہا۔ ''بیٹا! آپ کو پتا نہیں، آپ کے آس پاس کتنے خطرے ہیں۔ ہم آپ کو اس طرح غیر محفوظ نہیں چھوڑ سکتے۔ آپ اس سے پوچھیں کہ یہ یہاں کیوں موجود ہے؟''
ابراہیم نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اس طرف آنا اتنی سختی کے ساتھ منع ہے تو میں نہ آتا۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ گارڈز نے بہت برا رویہ اختیار کیا ہے اور ایسا آقا جان صاحب کے یہاں پہنچنے کے بعد ہوا ہے۔''
آقا جان ایک بار پھر تلملا کر رہ گیا۔ وہ کچھ بہت سخت الفاظ بولنا چاہ رہا تھا لیکن ابراہیم نے اسے اشارے سے روک دیا۔ وہ سخت غصیلے انداز میں پاؤں پٹختا ہوا دوسری جانب چلا گیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں گئے۔
ابراہیم نے زخمی گارڈ کی فوری مرہم پٹی کا حکم دیا پھر اردگرد جمع ہونے والے لوگوں کو بتایا گیا کہ یہ سب کچھ غلط فہمی کی وجہ سے ہوا ہے۔
ابراہیم نے مجھ سے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟''
''نہیں چھوٹے صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔''
ابراہیم مجھے لے کر پارا ہاؤس کے رہائشی حصے کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ جاگنگ کرنے والا اس کا باڈی گارڈ بھی ساتھ ہی تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ ابراہیم مجھے عمارت کے اس حصے میں لے آیا ہے جو اہل خانہ کے استعمال میں رہتا تھا۔ یہاں کی سج دھج اور آرائش دیکھنے کے قابل تھی۔ یہاں خوش انداز آرائش کے علاوہ چھتوں پر بیل بوٹے بھی موجود تھیں۔ بڑے بڑے محرابی دروازے، چھتوں پر بیش قیمت فانوس اور دیواروں پر غالیچے۔ کہیں کہیں مصوری کے شاہکار بھی آویزاں تھے لیکن جس حصے میں ابراہیم رہائش پذیر تھا، وہاں مجھے کوئی تصویر نظر نہیں آئی۔ ابراہیم جہاں جہاں سے گزرتا تھا، ملازمین مؤدب انداز میں رک جاتے تھے یا پھر سلام کرتے تھے۔
ایک وسیع آراستہ کمرے میں جہاں گیس ہیٹر کی خوشگوار حرارت موجود تھی۔ ابراہیم نے مجھے ایک اطالین صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ کسرتی جسم والا باڈی گارڈ ہمیں چھوڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اگلے تقریباً آدھ گھنٹے میں میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی بے تکلفی پیدا ہوگئی۔ اس نے دوستانہ ماحول میں میرے ساتھ چائے پی اور خشک میوہ جات کھائے۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ کسی بہت امیر کبیر گھرانے کا فرد ہے۔ ان لوگوں کے پرائیویٹ جہاز ہیں اور یہ لوگ بے شمار سیال سونے یعنی تیل کے مالک ہیں۔ وہ ایک بالکل عام اور سادہ سا نوجوان لگتا تھا اور یہ یقیناً اس کی ماں کی تربیت کا اثر تھا۔
ابراہیم نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! میں شاید بہت عرصے تک ان لمحوں کو بھلا نہ سکوں جب پل کی ایک طرف ہم اور دوسری طرف وہ تب کے لوگ تھے۔ گولیاں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ تم نے ان لوگوں کو روکا تھا اور مسٹر سجاول مجھے وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔''
میں نے کہا۔ ''میں نے تو ایک کوشش کی۔ شکر ہے کہ پروردگار نے کامیابی دی۔''
''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کام کا جتنا کریڈٹ مسٹر سجاول کو جاتا ہے اتنا ہی تم کو بھی جاتا ہے۔ مسٹر سجاول کی طرح تمہارے لیے بھی میں احسان مندی کے جذبات محسوس کرتا ہوں۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔
میں نے شکریہ ادا کیا۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو انگریزی میں ہورہی تھی۔ ابراہیم ٹھیک انگلش بول لیتا تھا۔ اپنے بارے میں، میں نے اسے بتایا کہ چونکہ میں ایک عرصہ اسلام آباد میں ایک آرٹش سفارت کار کا ملازم رہا ہوں اس لیے ''ٹوٹی پھوٹی'' انگلش بول لیتا ہوں۔
ابراہیم نے کہا۔ ''مسٹر شاہ زیب! ابھی جو واقعہ ہوا مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔ میں ''چچا آقا جان'' کی طرف سے تم سے معذرت کرتا ہوں۔ انہیں جلدی غصہ آجاتا ہے لیکن ... حقیقت یہی ہے کہ یہاں

پارا باڈی گارڈز یا۔ تر انتظام چچا آغا جان اور علی صاحب نے ہی سنبھال رکھا ہے...... بلکہ بیشتر ذمے داریاں چچا پر ہی ہیں۔''

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ابراہیم آغا جان کو چچا کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ روز بروز ہمارا یہ احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ آغا جان کے پنجے یہاں بہت مضبوطی سے گڑے ہوئے ہیں اور وڈے صاحب کی وجہ سے پارا ہاؤس والے آغا جان کی بہت سی غلطیوں کو نظرانداز بھی کرتے ہیں۔ ابراہیم کی گفتگو میں بھی یہ تنبیہ موجود تھی کہ ہم چچا آغا جان کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کریں۔ ابراہیم کو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہونے والی جھڑپ کا بھی افسوس تھا۔

ابراہیم نے اپنی چھدری داڑھی کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگتا ہے مسٹر شاہ زیب کہ تمہاری طبیعت میں تجسس زیادہ ہے۔ تم گھومتے پھرتے رہتے ہو اور کبھی کبھی گارڈز کو شک میں مبتلا کر دیتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ سے سچی بات کہوں، آپ برا نہ مانیے گا۔ اس مرتبہ گارڈز کا شک غلط نہیں تھا۔''

''کیا مطلب؟'' جواں سال ابراہیم نے حیرت سے آنکھیں پٹ پٹائیں۔

''میں واقعی پلاننگ کے ساتھ جاگنگ ٹریک کی طرف آیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری اور آپ کی ملاقات ہو جائے۔''

ابراہیم کی حیرت بڑھ گئی۔ وہ ابھی تک ٹریکنگ سوٹ میں تھا اور صوفے میں دھنس کر بیٹھا ہوا بالکل نوعمر لڑکا لگ رہا تھا۔ ایک بارلیش کا نج بوائے۔ ''ایسی کیا فوری ضرورت پڑ گئی تھی، مجھ سے ملاقات کی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''ضرورت فوری بھی ہے اور بہت اہم بھی۔'' میں نے کہا پھر قریب رکھے رائٹنگ پیڈ پر چند الفاظ لکھ کر ابراہیم کی طرف بڑھا دیے۔ میں نے لکھا تھا۔ ''ابراہیم اس کمرے میں نگرانی کے لیے کوئی آڈیو، وڈیو سسٹم تو موجود نہیں؟''

ابراہیم نے مزید حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، یہاں ایسا کچھ نہیں ہے، تم تسلی سے بات کر سکتے ہو۔''

اس سے پہلے میں کچھ کہتا دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ ابراہیم کی اجازت ملنے پر ایک خوش پوش سرد قد ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ پھولوں کا ایک نہایت خوب صورت گلدستہ تھا۔ اس نے ذرا شوخ نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور ابراہیم کے آگے گلدستہ کی طرف بڑھا دیا۔ ابراہیم نے گلدستہ میز پر رکھا اور ایک ننھے سے کارڈ پر کچھ لکھ کر گلدستے میں رکھ دیا۔ بعدازاں اس نے یہ گلدستہ درمیانی عمر کی خوش پوش ملازمہ کو واپس دے دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی گلدستہ ہے جس کے بارے میں مجھے جاناں نے بتایا تھا۔ یہ گلدستہ زینب کو بھیجا جا رہا تھا۔ ابراہیم نے مالے زبان میں ملازمہ سے کچھ کہا بھی۔ شاید زینب کی خیر خیریت دریافت کی تھی۔

ملازمہ لچکتی جھجکتی واپس چلی گئی۔ ابراہیم کے دبلے پتلے چہرے پر عجیب سی محبت بھری روشنی تھی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ لیکن ڈرتا ہوں کہ آپ برا نہ مان جائیں۔''

وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''برا نہیں مانوں گا... پوچھو۔''

''یہ خوب صورت گلدستہ آپ نے کس کو بھیجا ہے؟''

''یہ ذاتی سوال ہے، مگر اب تم نے پوچھ ہی لیا ہے تو بتا دیتا ہوں... یہ میری ہونے والی دلہن کے لیے تھا۔''

''لگتا ہے کہ آپ بہت پیار کرنے لگے ہیں اس سے۔''

''مسٹر شاہ زیب! تم کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ابراہیم کی پیشانی پر ہلکا سا بل آ گیا۔

''ایک بار پھر گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ آپ اپنی ہونے والی دلہن سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپ یہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ اسے آپ کی ذات کی وجہ سے کوئی شدید نقصان پہنچے، کیا آپ چاہیں گے؟''

''مسٹر شاہ زیب! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں وہی باتیں کر رہا ہوں، جو مجھے کرنی چاہئیں۔ اس لیے کہ میں وہ کچھ جانتا ہوں جو ابھی آپ نہیں جانتے۔ آپ کی ہونے والی دلہن شاید ویسا ہی نقصان اٹھا سکتی ہے جیسا آپ کے بڑے بھائی کی دلہن نے تین سال پہلے اٹھایا تھا......''

''پلیز، شٹ اپ۔'' ابراہیم کا چہرہ تمتما گیا۔

وال کلاک کی مدھر موسیقی نے شام کے سات بجے کا وقت بتایا۔ اس کمرے میں ہم اکیلے تھے۔ کمرے کا اکلوتا دروازہ بند تھا۔ میں نے کہا۔ ''ابراہیم! میں آپ سے جو کچھ کہوں گا ایک سچے ہمدرد کی حیثیت سے کہوں گا اور آپ سے بھی یہ توقع رکھوں گا کہ آپ میری یہ باتیں اپنے تک ہی محدود رکھیں۔ ابراہیم! چند ہفتے پہلے میرے ہاتھ ایک ایسا کاغذ لگا جو ابراہیم کے لیے اپنے حرفوں میں لکھا گیا تھا۔

اس خط کے ذریعے مجھے آپ دونوں بھائیوں کی دلہنوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ مجھے پتا چلا کہ ان لڑکیوں کو روزانہ کی خوراک میں ایک خاص زہر کی ڈوز دی جا رہی ہے۔ یہ کام ایک عرصے سے جاری تھا اور اس ڈوز کا مقصد ان لڑکیوں میں زہر کی امیونٹی پیدا کرنا تھا۔ اس ڈوز میں استعمال ہونے والا زہریلا عنصر سانپوں سے حاصل کیا گیا تھا اور یہ سانپ ایک پیر ولایت نامی شخص کی ملکیت تھے۔ مجھے مزید جستجو ہوئی...... شروع میں میرا خیال تھا کہ شاید ان لڑکیوں کے ذریعے کسی کو نقصان پہنچانا مقصود ہے لیکن پھر پتا چلا کہ لڑکیوں کے خون میں شامل کیا جانے والا زہر کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے نہیں بلکہ خود لڑکیوں کو نقصان سے بچانے کے لیے ہے۔''

میں خاموش ہو کر ابراہیم کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہاں کئی رنگ آ جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ''لڑکیوں کو کس سے نقصان پہنچ سکتا ہے؟''

''آپ دونوں بھائیوں سے۔ اور آپ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ کے جسموں میں زہر موجود ہے اور یہ کوئی قدرتی عارضہ نہیں ہے۔ یہ زہر ایک طویل عرصے سے آپ کے جسموں میں داخل کیا جا رہا ہے اور میں پھر کہوں گا کہ آپ اس صورت حال سے لاعلم نہیں ہیں۔''

ابراہیم کی پیشانی پر پسینے کی نمی نمودار ہو گئی۔ وہ تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں نے اتنے تھوڑے عرصے میں اتنی زیادہ معلومات حاصل کر لی ہیں۔ ''تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں دوبارہ عرض کروں گا، آپ اس سارے معاملے کو صرف اس طرح دیکھیں کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میں اپنی بساط کے مطابق آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میرے ہاتھ ایک خط لگا تھا۔ اس خط کی وجہ سے میرے اندر تجسس پیدا ہوا۔ یہ اسی تجسس کا نتیجہ تھا کہ میں یہاں تک پہنچا اور مجھے آپ دونوں بھائیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔''

''تم جو باتیں بیان کر رہے ہو، ان کا پتا تمہارے سوا اور کس کو ہے؟''

''آپ سمجھیں کہ ابھی یہ باتیں صرف مجھ تک ہیں۔''

اگلے دس پندرہ منٹ میں میرے اور ابراہیم کے درمیان کافی اہم بات چیت ہوئی۔ میرے ذہن میں اہم سوال یہی تھے کہ دونوں بھائیوں کو زہر کیوں اور کب سے دیا جا رہا ہے۔ اگر والدین کی مرضی سے یہ زہر دیا جا رہا ہے تو کس لیے؟ کیا اس فیملی کے کچھ اور لوگ بھی اس قسم کی زہر خورانی کا شکار رہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

ابراہیم نے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ نہ ہی وہ یہ بات ماننے کو تیار تھا کہ اس کے کھانے میں کسی طرح کا زہر شامل ہوتا ہے۔ وہ میری معلومات کو ناقص قرار دے رہا تھا مگر اپنی بات کا کھوکھلا پن خود اسے بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آخر وہ بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! اگر ہم کچھ دیر کے لیے فرض کر لیں کہ واقعی ہماری خوراک میں زہر شامل کیا جاتا ہے..... اور یہ بھی فرض کر لیں کہ ہمارے والدین نے ہمارے لیے جن دلہنوں کا انتظام کیا ہے ان میں بھی زہر کے خلاف قوتِ مدافعت پیدا کی گئی ہے تو پھر تم یہ بات کیوں کہہ رہے ہو کہ میری ہونے والی دلہن میری ذات سے نقصان اٹھا سکتی ہے؟''

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے پتا ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ دھوکا کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ لوگوں کا بالکل کوئی قصور نہیں۔ قصور ان لوگوں کا ہے جن کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا۔ انہوں نے فی دلہن آپ سے ایک کروڑ سے زیادہ معاوضہ حاصل کیا ہے مگر ان میں سے کم از کم ایک دلہن ایسی ہے جو وعدے کے مطابق پوری طرح محفوظ نہیں ہے اور وہ دلہن آپ والی ہے۔''

''کیا تم دلہن کو جانتے ہو؟'' ابراہیم نے لرزاں لہجے میں پوچھا۔

''جی ہاں! آج سے چند ماہ پہلے میں اسی گاؤں میں تھا جہاں یہ رہائش پذیر تھی اور مجھے یقین ہے کہ جب میں آپ کو اس زینب نامی لڑکی کے دیگر حالات بتاؤں گا تو آپ کو مزید حیرانی ہوگی۔''

''تم حیران کرنے پر تلے ہوئے ہو تو کرتے جاؤ۔ میں تمہیں روکوں گا نہیں۔''

میں نے ابراہیم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ آپ دونوں بھائی نیک اور خدا ترس ہیں۔ آپ کسی کے ساتھ زبردستی اور ناانصافی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ مجھے صرف اتنی بات بتا دیں کہ آپ دونوں بھائیوں تک یہ دلہنیں کس طرح پہنچی ہیں؟''

''اس میں کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہمارے والدین نے چچا آغا جان کے ذمے یہ کام لگایا تھا۔ ہمیں

نیک، دین دار گھرانوں سے تعلق رکھنے والی ایسی لڑکیاں چاہیے تھیں جو بے آسرا ہوں۔ وہ ایک بار ہمارے خاندان کا حصہ بن جائیں تو پھر یہی خاندان ان کا سب کچھ ہو جائے۔ ہمارے کچھ ایسے مسائل ہیں جن کی وجہ سے ہم رشتے داریاں اور میل ملاقات وغیرہ افورڈ نہیں کر سکتے۔''

آپ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کے لیے ایسی لڑکیاں ڈھونڈی گئی ہیں جن کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ اگر کوئی ہے تو اسے معقول رقم دے دی گئی ہے اور اب یہ لڑکیاں اپنے ماضی سے بالکل علیحدہ ہیں؟''

''ہاں علیحدہ ہیں مگر اپنی رضامندی سے۔''

میں نے ایک لمبی سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں چھوٹے صاحب! مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی دونوں باتیں درست نہیں ہیں۔ کم از کم زینب کے بارے میں تو یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ بے شک اس کے والدین حیات نہیں ہیں لیکن وہ اپنے ماضی سے بالکل علیحدہ نہیں ہے۔ اس کے اپنے ہیں جن سے وہ محبت کرتی ہے۔ جنہیں کا ہے لگا ہے دیکھنے اور ملنے کی خواہش مند ہے اور آپ کی ''رضامندی'' والی بات بھی غلط ہے۔ زینب اپنی رضامندی سے یہاں نہیں ہے۔ اس پر جو بیت رہی ہے، وہی جانتی ہوگی۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو، اسے یہاں پہنچنے کے بعد بہت ڈرایا دھمکایا گیا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹ سی لیے ہیں لیکن ظاہر ہے یہ ہونٹ ہمیشہ سلے تو نہیں رہیں گے۔ بہت جلد آپ کو سب معلوم ہو جائے گا لیکن تب تک دیر ہو چکی ہوگی۔''

''کس نے ڈرایا دھمکایا ہے اسے؟''

''میں نام لینا نہیں چاہتا لیکن مجھے اندازہ ہے کہ آپ بھی اس پارا ہاؤس کے کرتا دھرتا کو اچھی طرح جانتے ہیں۔''

نوعمر ابراہیم کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ وہ مزید بے چین نظر آنے لگا۔ وہ بمشکل اٹھارہ انیس سال کا ہوگا۔ میری اور اس کی عمر میں کئی سال کا فرق تھا لیکن میں اسے احترام سے ہی مخاطب کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! گستاخی معاف کریں۔ یہاں صورتِ حال آپ کی سوچ سے زیادہ سنگین ہے۔ میں آپ سے اس معاملے میں کھل کر بات کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ بات تب ہی ہو سکتی ہے جب آپ بھی مجھ پر اعتماد کریں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں...... پہلوانی لڑائی کی طرح آپ مجھے ہر مقام پر اپنا ہمدرد اور جاں نثار پائیں گے۔

نوعمر ابراہیم شدید ترین کشمکش کا شکار نظر آ رہا تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ مجھ سے گھبرا بھی رہا تھا اور مجھ پر بھروسا کرنا بھی چاہ رہا تھا۔ جب میں نے اسے یہاں تک بتا دیا کہ تین دن پہلے میں اس کھانے کا نمونہ بھی حاصل کر چکا ہوں جو ان دونوں بھائیوں نے کھایا تھا تو وہ ایک دم ہارا ہوا سا دکھائی دینے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں معاملے کی خاصی گہرائی ناپ چکا ہوں...... اس کے ساتھ ساتھ اس کا یہ یقین بھی پختہ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ میں سچے دل سے اس کی بھلائی چاہ رہا ہوں۔

اس نے مجھ سے کہا کہ ہم کل صبح اس بارے میں پھر بات کریں گے۔ تب تک میں اپنی زبان بالکل بند رکھوں اور یہاں ہونے والی گفتگو کی بھنک بھی کسی کو نہ پڑنے دوں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

اگلے روز صبح سویرے ابراہیم نے مجھے طلب کر لیا۔ لگتا تھا کہ پوری طرح رات کو وہ بھی مکمل نیند نہیں لے سکا ہے۔ اس کی آنکھیں متورم اور چہرہ کھنچا ہوا سا تھا۔ آج گفتگو کے آغاز ہی میں ابراہیم نے تسلیم کیا کہ زہر خورانی کی حد تک میری معلومات درست ہیں لیکن اس نے یہ ہرگز نہیں بتایا کہ اسے اور کمال کو یہ زہر کب سے اور کیوں دیا جا رہا ہے۔ نہ ہی اس امر پر روشنی ڈالی کہ والدین اپنے ہاتھوں سے انہیں زہر خورانی کا شکار کیوں بنا رہے ہیں۔

اس کی گفتگو سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''چھوٹے صاحب! اب گویا یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ آپ کے لیے ایسی دلہنیں یہاں لائی گئی ہیں جن کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان میں زہر کے لیے قوتِ مدافعت موجود ہے اور وہ آپ کے ساتھ نارمل ازدواجی زندگی گزار سکتی ہیں۔''

نوعمر ابراہیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن چھوٹے صاحب! میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ ان میں کم از کم ایک لڑکی تو یہ مدافعت نہیں رکھتی۔ اور وہ وہی آپ کی ہونے والی دلہن ہے۔''

''میں تمہاری اس رائے کو نہیں مانتا۔ ہم پورا اطمینان کر چکے ہیں۔''

''کس طرح؟''

''میں تفصیل نہیں بتا سکتا لیکن یہ سمجھ لو کہ دونوں لڑکیوں کے ''بلڈ ٹیسٹ'' ہمارے نجی اسپتال میں باریک بینی سے ٹیسٹ ہوئے ہیں...... اور ان کا نتیجہ تسلی بخش ہے۔''

''یہاں کچھ بھی تسلی بخش نہیں ہے چھوٹے صاحب، آپ لوگوں کو جھوٹے میں رکھا جا رہا ہے اور میں یہ ثابت کر

دوں گا۔"

"تم بار بار دھوکا...... دھوکا کیوں کہہ رہے ہو؟" تحمل مزاج ابراہیم چیخ گیا۔ "کیا ثبوت ہے تمہارے پاس، کس بنیاد پر یہ الزام لگا رہے ہو؟"

"میں خود ثبوت ہوں چھوٹے صاحب!" میں نے بھی تیکھے لہجے میں کہا۔ "میں چشم دید گواہ ہوں۔ سب کچھ میرے سامنے ہوا ہے۔ اس لڑکی زینب کو حاصل کرنے کے لیے اس پر ظلم کی انتہا کی گئی ہے۔ اس کو عرصے تک اندھا دھند زہریلے کشتے کی ڈوز دی گئی ہے۔ یہ بستر سے جا لگی تھی۔ اس کے بارے میں مشہور کر دیا گیا تھا کہ اسے کوئی خطرناک بیماری ہے اور جب اس کے والد امام مسجد مولوی فدا کو حقیقت کا علم ہوا تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا گیا جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔ انہیں جان سے مار دیا گیا۔ میرے پاس ثبوت ہیں اس کے۔ یہ میں ہی تھا جس نے زینب کو ان درندوں کے چنگل سے چھڑایا اور اسلام آباد کے اسپتال تک پہنچایا۔ وہاں ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں اس کا علاج ہو رہا تھا۔ پچھلی جمعرات کو اسے اس اسپتال سے اغوا کیا گیا ہے اور سیدھا آپ کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ آپ انگلش اخبار تو پڑھتے ہی ہوں گے۔ اس تاریخ کے اخبار منگوا لیں۔ آپ کو اس اغوا کا ثبوت مل جائے گا۔"

میں نے دیکھا ابراہیم کے ہاتھوں پر رعشہ سا نمودار ہو رہا تھا۔ وہ بہت الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"یہ بہت ہمت والی لڑکی ہے چھوٹے صاحب، اور شاید لڑکیاں ہوتی ہی ہمت والی ہیں۔ ان کے نازک جسموں میں شاید لوہے کا جگر ہوتا ہے۔ سب کچھ سہہ کر بھی چہرے پر مسکراہٹ رکھتی ہیں۔ ان کے خمیدہ سر، ان کے کرتے ہوئے گھونگھٹ، ان کی جھکی ہوئی پلکیں، اپنے اندر بہت سی قیامتیں چھپا لیتی ہیں۔"

"تم جذباتی تقریر کر رہے ہو۔ میں تمہیں ٹھوس بات بتا رہا ہوں۔ دونوں لڑکیوں کا بلڈ ٹیسٹ ہوا ہے...... اور نتیجہ ہماری مرضی کے مطابق نکلا ہے۔"

"لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نتیجہ مرضی کے مطابق نکالا گیا ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے بتائیں کہ ٹیسٹ کس ڈاکٹر نے کیا ہے؟"

"ہمارے ذاتی اسپتال میں ڈاکٹر خان ہیں۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر خان ... عورت ہو ..."

بندریا ہوئی۔ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔"

"مسٹر شاہ زیب! تم ہر کسی پر الزام دھر رہے ہو۔ کیا تمہیں یہاں صرف جھوٹے اور مکار ہی نظر آ رہے ہیں؟"

"میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو وفادار ہونے کے باوجود وفادار نہیں ہیں۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں، آپ اپنی ہونے والی شریکِ حیات کا بلڈ ٹیسٹ ایک دفعہ پھر کرا لیں۔"

"تم میری الجھنیں بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے ہو مسٹر شاہ زیب......" شاید ابراہیم کچھ اور بھی کہتا لیکن اسی دوران میں اس کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اس نے اسکرین کی طرف دیکھا اور ذرا مؤدب نظر آنے لگا۔

"جی چچا جان!" اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ میں اب جا سکتا ہوں۔

میں باہر نکل آیا، وہ فون سننے میں مصروف ہو گیا۔ یقیناً اس نے چچا جان کا لفظ اسی نیم گنجے کرخت صورت آقا جان کے لیے استعمال کیا تھا۔ آقا جان کے پاس پتا نہیں کیا گیدڑ سنگی تھی کہ اس کی کئی نمایاں خامیوں کے باوجود پارا ہاؤس والے اس پر اعتماد رکھتے تھے اور اس کے مشوروں کو اہم ترین حیثیت دیتے تھے۔

واپس کمرے میں آ کر میں نے انیق سے کہا کہ وہ پارا ہاؤس کے پرائیویٹ اسپتال میں کام کرنے والے کسی ڈاکٹر خان کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ ایسے کاموں کے لیے انیق ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ فوراً اپنے بندریا والے دوست ازمیر طیب کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "اگر پہلوان حشمت یہاں ہوتا تو ضرور آپ کے لیے اپنا کوئی اچھا سا شعر منتخب کرتا جس میں آپ کی آنکھوں کو 'کول ڈوڈے' قرار دیا جاتا اور آپ کی ذہنی صحت کے بارے میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا۔"

"میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟"

"آج کل آپ کو اکثر مؤنث چیزیں مذکر اور مذکر، مؤنث نظر آ رہی ہیں۔ پہلے آپ نے ازمیر کی بندریا کو بندر سمجھا اور اب ڈاکٹر خان کو فی میل کے بجائے میل سمجھ رہے ہیں۔ کل کلاں آپ مجھے بھی انیقہ قرار دے دیں گے۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"ڈاکٹر خان عورت ہیں۔ ابھی پورا نام معلوم نہیں ہوا۔ اسپتال ہی میں یا پارا ہاؤس کے اسپتال میں بطور

پیچھا لو جسٹ علازم ہوئی ہیں۔ دیکھیے ان کے پاس گائنی کی ڈگری بھی ہے۔ یہ پارا باؤس میں ہی رہتی ہیں۔ ان کا شوہر بھی ان کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ منشیات کا عادی ہے اور سارا دن گھر میں پڑا رہتا ہے۔''

''اچھی ڈاکٹر ہے۔ اپنے شوہر کو منشیات سے نہیں بچا سکی۔ کچھ مزید معلوم ہوا اُس کے بارے میں؟''

''کام پائپ لائن کے اندر ہے۔ میرا مطلب ہے کوشش کر رہا ہوں۔ کل دوپہر تک آپ کو مزید کچھ بتاؤں گا۔ اس کے علاوہ آپ کے لیے اچھی اطلاع بھی ہے۔ اسپتال میں قادر خان کی حالت اب بہتر ہے۔ میں ابھی اس سے بھی مل کر آرہا ہوں۔ وہ آپ کا بے حد مشکور ہے اور جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

سانپ کا ڈنک کھانے کے بعد قادر خان ایک بار تو قبر کے کنارے پر پہنچ گیا تھا مگر ڈاکٹروں کی بھرپور کوشش رنگ لائی تھی اور اب وہ سنبھل رہا تھا۔

انیق نے کہا تھا کہ وہ مجھے کل دوپہر تک مزید معلومات فراہم کرے گا لیکن وہ صبح دس بجے ہی تیز قدموں سے میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ گواہی دے رہا تھا کہ کوئی بہت اہم اطلاع ہے۔ اس وقت سردار سجاول میرے پاس بیٹھا تھا اور مجھ سے میری اور ابراہیم کی ملاقات کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ سردار سجاول کو دیکھ کر انیق ذرا ٹھٹک گیا۔ اس نے بس آنکھوں کے اشارے سے مجھے بتایا کہ ایک اہم اطلاع ہے۔

سجاول کی موجودگی میں وہ اکثر اشارے کنائے میں کوئی بات کر جاتا تھا، لیکن اس مرتبہ سجاول کی عقابی نگاہوں سے یہ صورتِ حال پوشیدہ نہیں رہی۔ وہ انیق سے مخاطب ہو کر زہرخند لہجے میں بولا۔ ''کھڑکی میں بیٹھی ہوئی کنجریوں کی طرح اشارے مت کیا کرو۔ اگر زیادہ شوق ہے تو زنانہ کپڑے پہن کر بیٹھ جاؤ کسی چوبارے چھجے پر۔ وہاں ہر طرح کے گاہک آتے ہیں۔''

انیق کا رنگ پھیکا پڑ گیا، بولا۔ ''میں نے تو... کچھ... نہیں... کہا۔''

''یہی تو بول رہا ہوں کہ کچھ کہا کرو۔ اشارے بازی نہ چلایا کرو۔ لنڈی کوتل کے ایک سرکس میں، میں نے ایک ڈانسر لڑکے کو اس طرح اشارے کرتے دیکھا تھا۔''

شاید سجاول ابھی انیق کی مزید کلاس لیتا لیکن میں نے مداخلت کی اور بات کو گھما کر دوسری طرف لے گیا۔ سجاول تاڑ چکا تھا کہ انیق مجھے کوئی اہم اطلاع دینے آیا

ہے۔ اب اگر انیق اطلاع نہ دیتا تو سجاول کے دل میں گرہ بیٹھتی۔ صورتِ حال اب نارمل ہو چکی تھی۔ میں نے انیق سے پوچھا۔ ''ہاں، کوئی نئی بات معلوم ہوئی ڈاکٹر خان کے بارے میں؟''

انیق انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''ہمارے لیے ایک بڑی دھماکا خیز اطلاع ہے جی... ڈاکٹر خان کا پورا نام ڈاکٹر ارم خان ہے اور ہم اس سے پہلے بھی شرفِ ملاقات رکھتے ہیں۔''

میرے ذہن میں زوردار دھماکا ہوا اور میں حیرت سے انیق کا منہ تکنے لگا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میری نگاہوں کے سامنے ملنگی ڈیرے کے مناظر آگئے۔ چوڑے ماتھے اور ذرا بھاری کندھوں والی ڈاکٹر ارم جو اپنے معاون رضوان ٹی پر جان چھڑکتی تھی۔ ملنگی ڈیرے کے پُراسرار خانوں میں اس نے نہایت خوبرو رضوان کو اپنا پابند کر رکھا تھا۔ وہ جنون کی حد تک اس سے وابستہ تھی۔ ایک رات تو اس کو اس سے گرہاتی بھی اور اس پر توازشوں کی بارش رکھتی تھی مگر اس کو اپنے حکم کے خلاف چلتا نہیں دیکھ سکتی تھی اور جب وہ خلاف چلتا تھا تو وہ آگ بگولا ہوئی تھی۔ اس نے رضوان کے ساتھ ملنگی ڈیرا چھوڑنے سے انکار کیا اور مجبوراً رضوان نے اسے زخمی کر کے کلینک کے باتھ روم میں بند کر دیا۔ بعدازاں جب ہم ملنگی ڈیرے سے نکل گئے اور رضوان، انیق کے ساتھ چاند گڑھی پہنچ گیا تو یہ جنونی ڈاکٹر اسے تلاش کرتے ہوئے چاند گڑھی جا پہنچی تھی۔ خوش قسمتی سے رضوان پہلے ہی وہاں سے نکل چکا تھا اور اب وہی ڈاکٹر ارم یہاں پارا باؤس کے نجی اسپتال میں پائی جا رہی تھی۔

میں نے انیق سے کہا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ یہ وہی ہے؟''

''ایک سو ایک فیصد جی... اور مجھے تو یہ شک بھی پڑ رہا ہے کہ جس کو ڈاکٹر ارم کا نشئی شوہر بتایا جا رہا ہے، وہ کہیں رضوان ہی نہ ہو۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو سنا ہے کہ واپس کراچی کی طرف نکل گیا تھا۔''

''تو پھر کوئی اور مرغا پھانسا ہو گا اُس نے۔ وہ جس طرح کی عورت ہے، ہم نے دیکھ ہی لیا تھا...''

سجاول سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں سجاول کو اس معاملے کی تفصیل سے آگاہ کرتا، انیق پھر بول پڑا۔ ''ایک بنگلا کی فلم عورت راج دیکھی تھی آپ نے؟ اس میں بھی عورت ظالم جابر تھی اور مرد

بے چارہ مجبور ہے۔

میں نے کہا۔ ''تم پھر پٹری سے اترنا چاہ رہے ہو تم نے ایک نہایت خاص اطلاع لا کر دی ہے، میں نہیں چاہتا کہ اس موقع پر تمہیں کسی بدمزگی کا سامنا ہو۔''

اس نے ایک اچٹتی سی نگاہ سردار سجاول پر ڈالی اور مغموم صورت بنا کر بیٹھ گیا۔ اس کی اداکاری بے داغ ہوتی تھی۔

میں نے سجاول کو بتایا کہ یہ ڈاکٹر ارم کون ہے اور ملنگی ڈیرے پر اس کے کیا کرتوت ہمارے سامنے آئے تھے۔ وہ ایک طرح ملنگوں کی میڈیکل دستِ راست تھی۔ بے شک وہ ایک قابل ڈاکٹر بھی اور اس کے پاس ڈگریاں تھیں لیکن وہ اپنی قابلیت کو منفی اور غیر قانونی کاموں میں استعمال کر رہی تھی۔ وہ پردے والی سرکار کے مریضوں کو ایلوپیتھک دوائیاں، راکھ، سفوف اور مٹی وغیرہ میں ملا کر دے دیتی تھی۔ یہ سب کچھ بغیر کسی ٹیسٹ وغیرہ کے ہوتا تھا اور اندھا دھند ''سٹی رائیڈز'' بھی استعمال کیے جاتے تھے۔

رات کو میں نے براہِ راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ انیق نے مجھے مکمل معلومات فراہم کر دی تھیں۔ اسپتال کے ملازمین اور ڈاکٹرز کے لیے اسپتال کے عقب میں ہی ایک شاندار رہائشی بلاک موجود تھا۔ اس تین منزلہ عمارت کے سیکنڈ فلور پر اپارٹمنٹ نمبر دس میں ڈاکٹر ارم کی رہائش تھی۔

میں نے قادر خان کے ساتھی سیکنڈ انچارج رفاقت کو اعتماد میں لیا اور اسے بتایا کہ میں ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ میں داخل ہو کر کچھ چھان بین کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے قادر خان کی جان بچائی تھی اور اس حوالے سے رفاقت بھی میرا احسان مند تھا۔ پارا ہاؤس میں چپے چپے پر سخت سیکیورٹی تھی۔ تاہم رفاقت نے میری درخواست پر رات ساڑھے نو بجے کے لگ بھگ اس رہائشی بلاک کی لائٹس آف کرا دیں جہاں ارم رہائش پذیر تھی۔ لائٹس کے ساتھ ہی سیکیورٹی کیمرے پانچ منٹ کے لیے بند ہو گئے۔ یہ پانچ منٹ میرے لیے کافی تھے۔ میں باہر ہی سے سیکنڈ فلور کے چھوٹے سے چھجے پر پہنچا اور جما جما کر پاؤں رکھتا اپارٹمنٹ نمبر دس کی بیرونی کھڑکیوں تک پہنچ گیا۔ اس کا اندازہ میں نے نیچے سے ہی لگا لیا تھا کہ کم از کم ایک کھڑکی ایسی ہے جو اندر سے بند نہیں ہے۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ میں نے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا تو کھڑکی اندر کی طرف کھل گئی۔ میں نے آہستگی سے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جہاں لکڑی کرسیاں اور ایک اسٹائلش تپائی رکھی تھی۔ ایک دروازہ اپارٹمنٹ کے مین پورشن کی طرف کھلتا تھا۔ اس وقت میری امیدوں پر اوس پڑ گئی جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ دروازہ دوسری طرف سے مقفل ہے۔ یہاں ایک دوسرا چھوٹا دروازہ بھی تھا جو شاید کچن کی طرف کھلتا تھا، یہ بھی باہر سے بند تھا۔ اسی دوران میں لائٹ آ گئی۔

پہلے دروازے کے ''کی ہول'' میں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی موجود ہے۔ میں نے نیچے جھک کر کی ہول سے آنکھ لگائی۔ مجھے ایک حیران کن منظر دکھائی دیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ بلاشبہ انیق کی اطلاع درست تھی۔ سامنے بیڈ پر جو عورت نیم دراز تھی وہ واقعی ڈاکٹر ارم تھی۔ اس نے ایک کھلا ریشمی لبادہ پہن رکھا تھا۔ بال کھینچ کر پیچھے کی طرف باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے ماتھا مزید چوڑا نظر آ رہا تھا۔ وہ پہلے بھی کوئی ایسی خوش شکل نہیں تھی لیکن لگتا تھا کہ پچھلے دو تین ماہ میں اس کے چہرے پر مزید پھٹکار برس گئی ہے۔ کنپٹی کے پاس ایک زخم کا نشان بھی تھا۔ یہ نشان غالباً اسی واقعے کی نشاندہی کرتا تھا جب رضوان نے مشتعل ہو کر اس کے سر پر لوہے کے راڈ سے ضرب لگائی تھی اور اسے نیم بے ہوش کر کے واش روم میں بند کیا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے اپنے سیل فون کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ ساتھ ساتھ شاید میوزک بھی سن رہی تھی کیونکہ کانوں پر ہیڈ فون تھے۔ ششدر کر دینے والا منظر یہ تھا کہ ایک نوجوان نے اس کے دونوں پاؤں تھام رکھے تھے اور چہرہ اس کے تلووں میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ اپنے چہرے کو اوپر نیچے حرکت دے رہا تھا۔ شاید اپنی زبان کی نوک سے اس کے تلووں کو گدگدا رہا تھا۔

اس نے چہرہ اٹھایا تو میرے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔ میرے سامنے رضوان تھا۔ اس کے چہرے پر چوٹوں کے کئی نشان تھے، اس کے گلے میں ایک ریشمی رسی تھی جس کا دوسرا سرا ارم کے پیٹ پر رکھا تھا۔

ارم نے اس کی طرف دیکھے بغیر پُرتحکم انداز میں کچھ کہا اور رضوان جیسے لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہی کسرتی جسم، وہی یونانی دیوتا جیسے خدوخال۔ اس کے جسم پر باریک کپڑے کی نہایت چست پتلون تھی جو جسم کو چھپانے کے بجائے مزید نمایاں کرتی تھی۔ اس کا بالائی دھڑ عریاں تھا اور اس پر بھی چوٹوں کے نشان اور نیلگوں ابھار تھے۔

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ شکار پھر شکاری کے

جال میں تھا اور اس مرتبہ یہ جال کہیں زیادہ سخت تھا۔ پہلے تو شاید کچھ محبت اور لگاوٹ بھی تھی لیکن اب صرف قہر ہی قہر تھا۔ ملنگی ڈیرے میں اپنی زنجیروں کو توڑ کر رضوان نے جو دلیری دکھائی تھی، وہ اسے مہنگی پڑی تھی۔ جنونی ڈاکٹر ارم نے اسے پھر ڈھونڈ لیا تھا اور اب وہ ایک نشئی بیمار شوہر کی حیثیت سے پھر اس کے ساتھ تھا۔

وہ واقعی نشے میں دکھائی دے رہا تھا۔ سوئی سوئی آنکھیں، بکھرے بکھرے بے حواس۔ پتا نہیں کہ ارم اس کے ساتھ یہاں کیا کچھ کر رہی تھی اور پتا نہیں کہ وہ یہ سب کچھ کیسے سہہ رہا تھا۔ اس کے اندر بغاوت کی جو چنگاریاں پیدا ہوئی تھیں وہ کہاں دب گئی تھیں اور کیوں؟

ارم اپنی جگہ سے اٹھی تو رضوان کسی چوپائے کی طرح اپنے ہاتھوں اور گھٹنوں پر جھک گیا، ارم نے اس کے گلے کی رسی پکڑی اور کسی جانور ہی کی طرح اسے چلاتی ہوئی میری نگاہ کے دائرے سے نکل گئی۔ اب بستر خالی تھا۔ قریب رکھی شیشے کی ایک تپائی پر دو تین سرنجیں اور انجکشن وغیرہ رکھے تھے۔ غالباً یہ کوئی سکون آور ..... قسم کے انجکشن تھے۔ ان کے اثر سے خوبرو رضوان کا دماغ ماؤف نظر آتا تھا۔

اب اردگرد خاموشی تھی۔ بس ٹی وی کی مدھم آواز سنائی دیتی تھی۔ میں ایک مختصر سی جگہ پر موجود تھا۔ میں نے اچھی طرح در و دیوار کا جائزہ لیا۔ یہاں کوئی خفیہ کیمرا یا آڈیو سسٹم موجود نہیں تھا۔

قریباً پانچ منٹ اسی طرح گزرے۔ مزید کوئی آہٹ، آواز سنائی نہیں دی، پھر ساتھ والے چھوٹے دروازے کے "کی ہول" میں روشنی نظر آنے لگی اور کھٹ پٹ بھی سنائی دینے لگی۔ میں نے اس کی ہول سے آنکھ لگائی لیکن اس سے پہلے یہ بھی دیکھ لیا کہ اگر کوئی دروازے کو غیر مقفل کر کے اس چھوٹے کمرے میں آ گیا تو مجھے کہاں چھپنا ہوگا۔ کی ہول سے جھانکنے پر میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ اس اپارٹمنٹ کا کچن ہی تھا۔ مجھے یہاں جو ہیولا دکھائی دیا وہ رضوان کا ہی تھا۔ رسی بدستور اس کے گلے میں تھی لیکن اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور آٹے کے پیڑے کو روٹی کی شکل دے کر توے پر ڈالنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ساتھ ساتھ ہانڈی گرم ہو رہی تھی اور وہ اس میں بھی چمچ چلا لیتا تھا۔ یہ سب کچھ حیران کن تھا اور ڈاکٹر ارم کی نفسیاتی کج روی کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ مجھے کچن کے کچھ مناظر نظر نہیں آئے تھے۔ تاہم صورتِ حال ساری سمجھ میں آ رہی تھی۔ رضوان نے کھانا تیار کر کے ٹرے میں رکھا سلاد، پانی کا جگ، جوس کا ڈبا اور گلاس وغیرہ۔ پھر وہ ٹرے لے کر اس دوسرے کمرے میں پہنچ گیا جہاں کچھ دیر پہلے ڈاکٹر ارم نیم دراز ہو کر موسیقی سن رہی تھی۔ اب وہ بیڈ پر ہی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ سامنے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ رضوان نے جھک کر احتیاط سے ارم کے سامنے کھانا رکھا اور مؤدب کھڑا ہو گیا۔ ارم نے پہلا لقمہ لیا..... جب تک ارم نے تسلی بخش انداز میں رضوان کی طرف دیکھ نہیں لیا، وہ اسی طرح ساکت جامد کھڑا رہا جیسے خوف زدہ ہو کہ کہیں کھانے میں سے کوئی نقص نہ نکل آئے۔

ارم کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ رضوان سے مخاطب ہو کر کہہ رہی تھی۔ "تمہیں یہ سب کچھ عجیب لگ رہا ہوگا کہ جو کچھ یہاں عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے وہ یہاں تمہارے ساتھ ہو رہا ہے لیکن اس میں سارا قصور تمہارا اپنا ہے۔ ہے یا نہیں؟ بولو ہے یا نہیں؟"

رضوان نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ دانت پیس کر بولی۔ "زبان سے جواب دو۔ ہے یا نہیں؟"

"ہے....." رضوان کی مری ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

مجھے تعجب ہو رہا تھا، بے شک وہ لڑائی بھڑائی والا بندہ نہیں تھا لیکن اتنا بھی گیا گزرا نہیں تھا، وہ اس صورتِ حال کی مزاحمت کیوں نہیں کر پا رہا تھا۔ کیا نیکوں نے اس کا ذہن ماؤف کر رکھا تھا یا پھر کسی اور نادیدہ مجبوری نے اسے جکڑ لیا تھا۔ کھانا شاید اچھا بنا تھا۔ ڈاکٹر ارم کا موڈ پہلے سے بہتر نظر آیا۔ اس نے تحکم سے کہا۔ "چلو، بیٹھ جاؤ تم بھی۔"

وہ ذرا ہچکچایا پھر ارم کے سامنے پائنتی کی طرف بیٹھ گیا۔ وہ نروس نظر آ رہا تھا۔ بیٹھتے وقت اس کا گھٹنا سالن کے ڈونگے سے ٹکرا گیا۔ ڈونگا الٹا تو گرم گرم سالن بچھونے میں گرا اور کچھ ارم کی ٹانگ پر۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی، اس کے چہرے پر تکلیف تھی۔ "حرامزادے، الو کے پٹھے، ڈنگر" وہ پھٹ پڑی۔ اس نے رضوان کو زور سے ٹانگ رسید کی۔ وہ دونوں کی ہول کے سامنے سے ہٹ کر میری نظروں سے اوجھل ہوئے لیکن دونوں تھے کمرے کے اندر ہی۔ آوازوں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ رضوان کو کسی چیز سے پیٹ رہی ہے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک بیلٹ تھی۔ زوردار آواز کے ساتھ ضرب رضوان کے جسم پر لگتی تھی اور وہ بلند آواز سے کراہ اٹھتا تھا۔ یقیناً وہ کسی سنگین مجبوری کے شکنجے میں تھا جو بالکل مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ

عورت ہونے کے باوجود اس کے مضبوط سراپے پر پوری طرح حاوی تھی۔

یہ ایک اپارٹمنٹ تھا اور یہاں پیدا ہونے والی آوازیں یقیناً اردگرد کے اپارٹمنٹس تک بھی پہنچ رہی تھیں۔

''پلیز۔'' رضوان کی کراہتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔

چند سیکنڈ بعد وہ اڑتا ہوا سا بستر پر آن گرا۔ جنونی ارم نے یقیناً اسے زوردار دھکا دیا تھا۔ اس کے خوب صورت ورزشی جسم کے مختلف حصوں پر چمڑے کی بیلٹ کے خونی نشان تھے۔ ایک دم کمرے کی لائٹ آف ہوگئی۔

میں الٹے قدموں پیچھے ہٹ آیا۔ بیرونی کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے پلاننگ کے مطابق سیکنڈ انچارج یاقوت کو ایک ''مسڈ کال'' دی۔ چند سیکنڈ بعد اس سارے رہائشی پورشن کی لائٹس ایک بار پھر آف ہوگئیں۔ میں جس کھڑکی کے راستے آیا تھا، اسی طرح واپس نیچے اتر آیا اور پھر اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ ڈاکٹر ارم کا کردار پہلے بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ اب بالکل واضح ہوگیا تھا کہ وہ ہر لحاظ سے ایک بداخلاق عورت تھی اور کسی بھی طرح کا گرا ہوا کام کرسکتی تھی۔ یہ اسی نے زینب اور دوسری لڑکی شائستہ کے کیس کا تجزیہ کیا تھا اور اس تجزیے کی بنیاد پر ابراہیم کہہ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے۔ سب سے اہم سوال یہ تھا کہ کیا اس سارے معاملے میں آقا جان بھی ملوث ہے؟

میں واپس پہنچا تو انیق بے قراری سے میرا انتظار کررہا تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر خان واقعی ڈاکٹر ارم نازان ہے اور اس کا نجی شوہر کون ہے؟ میں نے انیق کو بتایا۔ ''ہمارے سارے اندیشے درست نکلے ہیں۔ وہ ارم ہی ہے اور جس کو شوہر ظاہر کررہی ہے وہ رضوان ہے۔''

انیق کی حیرت میں اضافہ ہوا۔ میں نے جو سنسنی خیز مناظر وہاں دیکھے تھے ان کا مختصر احوال انیق کو سنایا۔ ارم کے حوالے سے اس کی نفرت میں بھی یقیناً اضافہ ہی ہوا ہوگا۔ وہ ڈاکٹری جیسے مقدس پیشے پر ایک بدنما داغ تھی۔

''اب کیا کرنا چاہیے؟'' انیق نے مجھ سے دریافت کیا۔

''ابراہیم کو بتانا چاہیے کہ وہ لوگ جس ڈاکٹر کی ٹیسٹ رپورٹ پر بھروسا کررہے ہیں وہ تو خود مریضہ ہے، اس کا علاج بلکہ سدباب کرنے کی ضرورت ہے۔''

''مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں اس نیم گنجے آقا جان کی بہت چلتی ہے۔ وہ کوے کو بھی سفید کہہ دیتا ہے تو یہ لوگ ماننا شروع کردیتے ہیں۔ نجانے کیا گھول کر پلا رکھا ہے اس آقا نے ان کو...

ڈاکٹر یہ سیدھا کل انشو ہے یار اور مجھے تو اس رضوان بی پر بھی ترس آرہا ہے۔ وہ کچھ دن اور اس جنونی کے پاس رہا تو شاید جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

انیق نے سر کھجا کر کہا۔ ''آپ غلط محاورہ بول گئے ہیں۔ کم از کم پہلوان حشمت کے نزدیک تو یہ غلط ہی ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھا'' نہیں کہتے...... کہتے ہیں، جان سے ہاتھ دھولیا۔ کیونکہ جو مرجاتا ہے وہ بیٹھ تو سکتا ہی نا ہیں۔''

''بس تم پہلوان کا سیاپا کرتے رہو، میں ذرا ابراہیم کو فون کرلوں۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں آگیا۔

میں نے ابراہیم سے رابطہ کرنے کی کئی کوششیں کیں مگر ناکامی ہوئی۔ پہلے تو اس کا فون انگیج جا رہا تھا۔ پھر ویسے ہی بند ہوگیا۔ میرے سینے میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ میں ابراہیم کو جلد از جلد بتانا چاہتا تھا کہ صورت حال تشویش ناک ہے...... اگلے روز بھی میں نے ابراہیم سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ لگتا تھا کہ وہ بہت مصروف ہے۔ جو فون نمبر اس نے مجھے دیا تھا وہ بند جا رہا تھا۔ میرے کہنے پر سجاول نے حلقی کے ذریعے بھی کوشش کی کہ ابراہیم سے رابطہ ہوسکے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ یارا ہاؤس میں شادیوں کی تیاری جاری تھی۔ شام کے وقت زنانہ حصے کی طرف سے گاہے بگاہے ڈھولک اور دف وغیرہ بجنے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔

رات کے قریباً دس بجے تھے جب میں نے ایک بار پھر ابراہیم کا نمبر ملانے کی کوشش کی لیکن میری ٹرائی سے پہلے ہی کال کا میوزک بج اٹھا۔ یہ ابراہیم کی کال تھی۔ میں نے فوراً ریسیو کی۔ ''ہیلو مسٹر شاہ زیب! کہاں ہو؟'' ابراہیم نے گمبھیر آواز میں پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہی ہوں جی۔''

''ذرا میرے پاس آجاؤ۔ میں اپنے گارڈ کو بھیج رہا ہوں۔'' ابراہیم نے کہا۔ اس کی آواز میں موجود ہلکی سی لرزش نے مجھے بتادیا کہ کوئی اہم معاملہ ہے۔

دو تین منٹ بعد ابراہیم کا ورزشی جسم والا باڈی گارڈ میرے پاس پہنچ گیا۔ وہ برونائی کا باشندہ تھا۔ اس کا نام ناران معلوم ہوا تھا۔ مجھے شروع میں ہی شک ہوا تھا۔ اب ثابت بھی ہوچکا تھا کہ وہ گونگا بہرا ہے۔ میں اس کے ساتھ چلتا یارا ہاؤس کی ایئرکنڈیشنڈ راہداریوں سے گزرا اور اس جگہ پہنچ گیا جہاں اس خاندان کا ''چھوٹا شہزادہ''

ابراہیم دربار میں بیٹھا تھا۔ گارڈ نازان باہر کھڑا رہا۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ ابراہیم بالکل گم صم سا ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ شبہ ہوتا تھا کہ شاید وہ کچھ دیر پہلے تک روتا بھی رہا ہے۔

اس کے ہاتھ میں چند کاغذ تھے۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر نہایت گمبھیر آواز میں بولا۔ ''مسٹر شاہ زیب! تمہارا اندازہ درست تھا۔ پہلی ٹیسٹ رپورٹ شاید درست نہیں ہے۔'' اس نے رپورٹس میری طرف بڑھائیں۔

یہ خون کی دراصل چار رپورٹس تھیں۔ دو زینب کی اور دو دوسری دلہن شائستہ کی۔ زینب کی دوسری رپورٹ پہلی رپورٹ سے بالکل مختلف تھی۔ میں زیادہ ''میڈیکل ٹرمز'' تو نہیں جانتا تھا تاہم اندازہ ہو رہا تھا کہ زینب کی پہلی رپورٹ میں جن کئی عناصر کو نیگیٹو قرار دیا گیا تھا، وہ دوسری رپورٹ میں پازیٹو تھے۔ اور یہ خون میں کچھ کیمیائی اجزاء کی غیر موجودگی کو ظاہر کرتے تھے۔ شائستہ کی دونوں رپورٹس تقریباً یکساں تھیں اور ان سے پتا چلتا تھا کہ کم از کم اس کے معاملے میں عالمگیر وغیرہ نے جعل سازی نہیں ہوا۔

ابراہیم نے اپنی چھوٹی سی نوخیز داڑھی میں مایوسی کے عالم میں انگلیاں چلائیں اور بولا۔ ''ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیوں کیا جا رہا ہے؟ یہ عالمگیر کون بندہ ہے؟ اتنا سنگین دھوکا...... کیا چچا آقا جان کو بھی کچھ پتا نہیں چل سکا؟''

''ہوسکتا ہے کہ پتا چل سکا ہو؟'' میں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''یقیناً نہیں چلا ہوگا۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایکشن نہ لیتے۔''

''میرا خیال ہے کہ سب سے پہلے اس ڈاکٹر خان سے پوچھ گچھ کی جائے۔ اس نے یہ غلط رپورٹ کس کے کہنے پر تیار کی ہے۔''

ابراہیم نے آنکھیں بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری۔ اس کے دبلے پتلے چہرے پر جیسے دنیا جہان کا دکھ سمٹ آیا۔ وہ نیک دل اور باکردار لڑکا تھا مگر سینے میں دل بھی رکھتا تھا۔ اس نے اپنی ہونے والی دلہن کو دیکھا تھا اور اس پر مرمٹا تھا۔ وہ اپنی شادی کے لیے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہا تھا اور اب اسے معلوم ہوا تھا کہ لب بام پہنچ کر کمند ٹوٹ گئی ہے۔ یہ شادی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ انتہائی غم کے نیچے دبا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم! آپ مزید تسلی کے لیے کسی اور جگہ سے بھی رپورٹ کرا لیں مگر مجھے یقین ہے کہ نتیجہ دوسری رپورٹ والا ہی ہوتا ہے۔''

وہ جیسے سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے حلمی سے رابطہ کیا اور بولا۔ ''حلمی صاحب! ڈاکٹر خان کہاں ہے؟''

دوسری طرف سے کوئی جواب دیا گیا جو مجھ تک نہیں پہنچا۔ ابراہیم نے کہا۔ ''ڈاکٹر کو فوراً یہاں میرے پاس لایا جائے۔''

میں نے پہلی بار ابراہیم کو طیش میں بات کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے ماتھے کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''ابراہیم بہتر یہی ہے کہ ابھی آپ ڈاکٹر سے اکیلے میں بات کریں۔ میں ابھی اس کے سامنے آنا نہیں چاہتا۔''

ابراہیم چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر تیز دستک ہوئی۔ پھر ایک گارڈ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے ابراہیم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''سر! ...... ڈاکٹر خان کو کسی نے مار دیا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے فرش پر پڑی ہیں۔''

ہم ہکا بکا رہ گئے۔ اتنے میں ابراہیم کا پرسنل گارڈ نازان بھی آ گیا۔ اس کے چہرے پر بھی تلاطم تھا۔ ہم تیزی سے باہر نکلے۔ تقریباً تین منٹ بعد ہم ابراہاؤس کے اس رہائشی پورشن میں تھے جہاں اسپتال کے ڈاکٹرز اور دیگر ملازمین رہائش رکھتے تھے۔ ارم والے اپارٹمنٹ کے سامنے کئی افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سیکیورٹی گارڈز بھی تھے۔ سب کے چہروں سے سنسنی اور گھبراہٹ ظاہر ہوتی تھی۔ چھوٹے صاحب ابراہیم کو دیکھ کر مسلح گارڈز نے راستہ دیا اور ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہو گئے۔ یہاں بھی باوردی گارڈز موجود تھے۔ سیکنڈ انچارج رفاقت خود بھی دکھائی دے رہا تھا۔ ہم لیونگ روم میں پہنچے۔ یہیں پر کل شب ارم نے رضوان سے مارپیٹ کی تھی اور اسے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اب وہ تشدد کرنے والی بیڈ سے نیچے قالین پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا نارنجی رنگ کا سلیپنگ سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ عریاں ہو رہی تھی۔ پیٹ پر کم از کم چار جگہ تیز دھار آلے کے زخم تھے۔ قالین پر بہنے والے خون میں ارم کے بال بھی لتھڑ چکے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' ابراہیم نے سرسراتے لہجے میں

اس نے شکستہ انگلش میں جواب دیا۔ "اندازہ ہو رہا ہے چھوٹے صاحب کہ یہ کوئی ایک گھنٹا پہلے کا واقعہ ہے۔ ابھی جب آپ نے ڈاکٹر کو طلب کیا تو میں ایک گارڈ کے ساتھ یہاں پہنچا، یہ اسی جگہ پر لت پت پڑی تھیں۔"

"اس کا شوہر کدھر ہے؟" ابراہیم نے پوچھا۔

"وہ نہیں ہے۔ ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہوگا لیکن اڑوس پڑوس والے یہی کہہ رہے ہیں کہ کل رات بھی میاں بیوی میں سخت جھگڑا ہوا تھا اور مار پیٹ کی آوازیں آئی تھیں۔"

"کیا مطلب؟"

رفاقت مؤدب لہجے میں بولا۔ "پتا چلتا ہے جناب کہ ڈاکٹر ارم شوہر کو نشے سے منع کرتی تھی۔ وہ نشے کی ڈیمانڈ کرتا تھا تو یہ اسے مارتی پیٹتی بھی تھی۔"

ایک سعودی بولا۔ "میرا نام ڈاکٹر معاذ ہے جناب! میں ان کا پڑوسی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ارم اپنے شوہر کو صرف نشے کے مطالبے پر ہی نہیں مارتی تھی، وہ ویسے بھی کچھ تشدد پسند تھی۔ شوہر کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ کئی بار اسے رسیوں سے بھی باندھ دیتی تھی۔ بہرحال اس موقعے پر ہمیں یہ ساری باتیں زیب نہیں دیتیں، ہم سب ڈاکٹر ارم کی موت پر سکتے کی سی حالت میں ہیں۔ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس گھر میں صورت حال اتنی سنگین ہو چکی ہے۔"

ابراہیم کے چہرے پر بر[illegible] تھی۔ اس نے ارم کی لاش پر چادر ڈالنے کا حکم دیا پھر رفاقت سے مخاطب ہو کر بولا۔ "اگر یہ واقعی اس کے شوہر کا کام ہے اور وہ اسے مار کر بھاگا ہے تو پھر پارا ہاؤس سے باہر نہیں گیا ہوگا۔ یہیں کہیں چھپا ہوگا۔"

"آپ درست فرما رہے ہیں جناب! ہم نے اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ سیکیورٹی پہلے ہی ہائی الرٹ ہے۔ وہ یہاں سے نکل نہیں سکتا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن آپ لوگوں کو دوسرے پہلو سے بھی دیکھنا چاہیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ کسی نے ان دونوں کو ہی ٹھکانے لگا دیا ہو۔"

"جی..... آپ..... درست کہہ رہے ہیں۔ ہم ہر زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں موقعے سے بھی شہادتیں اکٹھی کر رہے ہیں۔"

ڈاکٹر ارم کی موت کی خبر تیزی سے پارا ہاؤس میں پھیل گئی تھی۔ نیچے سڑک پر بھی کافی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ اڑوس پڑوس والے جو بیان دے رہے تھے ان کے مطابق اپارٹمنٹ سے اکثر ڈاکٹر ارم کی بلند غصیلی آواز سنائی دیتی رہتی تھی۔ وہ اکثر اپنے نشئی شوہر کے ساتھ مار پیٹ بھی کرتی تھی مگر کچھ لوگوں کو شک تھا کہ اپنے مبینہ شوہر کو نشے کے انجکشن بھی وہ خود ہی لگاتی ہے۔ کل رات بھی ان کے اپارٹمنٹ سے مار پیٹ کی بلند آوازیں سنائی دی تھیں لیکن آج ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا۔

دس پندرہ منٹ بعد میں اور ابراہیم واپس کمرے میں پہنچ گئے۔ تنہائی ملتے ہی میں نے ابراہیم سے کہا۔ "ابراہیم! مجھے شبہ ہے کہ ارم کو اس کے شوہر نے نہیں مارا۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جنہوں نے ارم کو استعمال کیا ہے اور اس سے خون کی غلط رپورٹ لی ہے۔ وہ جان چکے ہیں کہ اب آپ نے دونوں دلہنوں کے خون کا ٹیسٹ دوبارہ کرایا ہے۔ اپنا پول کھلنے کے اندیشے سے انہوں نے اپنی آلۂ کار ارم کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔"

"اور اس کا شوہر؟"

"ہوسکتا ہے کہ وہ بھی مارا گیا ہو یا پھر جان بچا کر موقع سے بھاگ گیا ہو۔ اگر وہ بھاگا ہے تو پھر پارا ہاؤس کے اندر ہی ہوگا اور اس کی جان بھی سخت خطرے میں ہوگی۔ آپ اپنے ذاتی محافظوں کو بھی حرکت میں لائیں، اور ان سے کہیں کہ وہ رضوان کی تلاش میں شریک ہوں۔"

نوجوان ابراہیم اب میری رائے کو اہمیت دے رہا تھا۔ اس نے پریشانی کے عالم میں اپنا سیل فون اٹھایا اور اپنے ذاتی گارڈز کو مالے زبان میں ہدایات دینے لگا۔ اس کی پیشانی پر بار بار پسینے کے قطرے نمودار ہو رہے تھے۔

مجھے رضوان کے معاملے میں واقعی سخت تشویش تھی۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اسی نے ارم کو بے دردی سے قتل کیا ہے (حالانکہ اگر وہ کرتا تو حق بجانب تھا) یہ غالباً انہی لوگوں کا کام تھا جنہوں نے ڈاکٹر ارم سے غلط کام کروایا تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سیل فون پر انیق اور سردار سجاول سے بھی بات کی اور انہیں بتایا کہ پارا ہاؤس میں ابھی کچھ دیر پہلے کیا واقعہ ہوا ہے۔ انیق بھی ارم کی ہلاکت کا سن کر ششدر رہ گیا۔ میں نے سردار سجاول سے کہا کہ رضوان کی زندگی خطرے میں ہوسکتی ہے۔ ہمیں اس سلسلے میں جلدی سے بھی رابطہ کرنا چاہیے اور اس سے کہنا چاہیے کہ اگر وہ زندہ ہے تو اسے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

میں نے فون بند کرنے کے بعد ابراہیم سے بات کرتے ہوئے کہا۔ "چھوٹے صاحب! مجھے ڈر ہے کہ ان

لوگوں نے رضوان کو بھی قتل کر دیا ہے اور اگر نہیں کیا تو یقیناً کر دیں گے۔ اس کا زندہ رہنا ہمارے لیے بہت فائدہ مند ہوگا۔ وہ اصل قاتل کے چہرے سے نقاب ہٹا سکتا ہے۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' ابراہیم نے کہا۔ ان لمحوں میں وہ ایک نوعمر لڑکا ہی دکھائی دیا۔

میں نے کہا۔ ''آپ آقا جان اور حلمی صاحب سے رابطہ کر کے انہیں حکم دیں کہ رضوان کو ہر صورت زندہ حالت میں گرفتار ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں کوئی کوتاہی سامنے آئی تو سخت کارروائی ہوگی۔''

ابراہیم نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ یہ بات یقیناً اس کی سمجھ میں بھی آرہی تھی کہ رضوان اگر زندہ رہا تو فائدہ مند ثابت ہوگا۔

اس نے میرے سامنے ہی حلمی اور آقا جان کو مالے زبان میں ہدایات دیں اور پھر بے دم سا ہو کر صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کے بادل گہرے ہو رہے تھے۔ اسی دوران میں درمیانی عمر کی ملازمہ دستک دینے کے بعد کمرے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ یہ وہی گلدستے والی ملازمہ تھی۔ آج بھی اس کے ہاتھ میں ایک تر و تازہ گلدستہ تھا جس میں گلاب، رات کی رانی اور گیندے کے پھول نمایاں تھے۔

گلدستے والی کو دیکھ کر ابراہیم کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نظر آئے۔ وہ کچھ دیر ستم زدہ سا گلدستے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک سرد آہ کھینچی اور ہاتھ کے اشارے سے گلدستے والی کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بھی حیران ہوئی۔ وہ ابھی تک ابراہیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے تصدیق چاہ رہی تھی کہ اسے گلدستہ واپس لے جانا ہے یا آگے پہنچانا ہے۔

ابراہیم از خود اپنی جگہ سے اٹھا اور ملازمہ کے ہاتھ سے گلدستہ لے کر اسے واپس بھیج دیا۔ تب اس نے حسرت بھری نظروں سے گلدستے کو دیکھنے کے بعد اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ صوفے پر ڈھیر ہو کر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور اپنے آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''مسٹر شاد زیب! ابھی آپ جائیں۔ میں پھر بات کروں گا۔''

اس کے کہنے کے باوجود میں وہیں بیٹھا رہا۔ ایک آنسو اس کے ہاتھ کے نیچے سے نکل کر اس کے رخسار کی طرف سرک رہا تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''ابراہیم! آپ خود کو سنبھالیں۔ سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے۔ آپ خود کو سنبھالیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔''

''مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ پلیز...... آپ فی الحال چلے جائیں۔'' اس کی آواز جیسے کرب کے بوجھ سے ٹوٹ رہی تھی۔

''آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔ اور یہ مدد ہو بھی سکتی ہے لیکن آپ کو سچائی پر سے پردہ اٹھانا پڑے گا۔ آپ کے والدین آپ کو زہر دینے پر کیوں مجبور ہیں؟''

''میں نے کہا ہے ناں، میں فی الحال اس بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔'' وہ تیز، پُرطیش سرگوشی میں بولا۔

میں نے فی الوقت اس کے پاس سے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔

ڈاکٹر ارم کے قتل اور اس کے شوہر (رضوان) کی گمشدگی کی خبر سارے پارا باؤ میں گردش کر رہی تھی۔ جتنے منہ اتنی ہی باتیں تھیں۔ بیشتر لوگوں کا خیال یہی تھا کہ شوہر رضوان نے برداشت کھو کر اپنی جنونی بیوی کو قتل کر ڈالا ہے اور پارا باؤ سے اندر ہی کہیں روپوش ہے۔

اطلاعات کے مطابق اپارٹمنٹ کے کچن سے گوشت کاٹنے والی ایک چھری غائب تھی۔ تیز دھار آلے سے قدرے قریب سے ارم کے پیٹ پر چار وار کیے گئے تھے اور وہ موقع پر ہی دم توڑ گئی تھی۔ اس کے رخساروں پر مضبوط گرفت کے نشان موجود تھے جس سے پتا چلتا تھا کہ حملے کے وقت اس کا منہ سختی سے ڈھانپ لیا گیا تھا تاکہ وہ آواز پیدا نہ کر سکے۔

کچن میں کئی ٹوٹے ہوئے برتن بھی موجود تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ شاید وقوعہ سے پہلے میاں بیوی میں جھگڑا بھی ہوا ہے۔

مگر اڑوس پڑوس والوں کے بیانات کچھ اور ظاہر کر رہے تھے کہ انہیں قتل کی رات اپارٹمنٹ سے کسی طرح کا شور شرابا سنائی نہیں دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کچن سے چھری کا غائب ہونا اور ٹوٹے ہوئے کپ، پلیٹیں وغیرہ ملنا، ڈراما بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ایسا ناٹک جس کے ذریعے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ یہ قتل شوہر نے کیا ہے۔

شام کے وقت انیق نے مجھے اطلاع دی کہ سنبل آج پھر سردار سجاول سے ملاقات کے لیے آئی ہوئی ہے۔ موقع غنیمت تھا۔ میں بھی وہاں جا پہنچا۔ اسپیشل فورس کے چوکس گارڈ کو کچھ دے دلا کر باہر کھڑے سنبل کی واپسی کا انتظار

کر رہے تھے۔ زرق برق پیرہن والی، وہ نشاط آگیں بھی [illegible] سنبل کے عملے میں شامل تھیں اور اس کی واپسی کی منتظر تھیں۔ میں دخل در معقولات کرتے ہوئے اندر جا پہنچا۔ وہ شہزادیوں کی طرح بنی ٹھنی ایک صوفے پر براجمان تھی۔ کشادہ ریشمی لبادے نے سارا صوفا ہی ڈھانپ رکھا تھا۔ سولہ سنگھار، قیمتی گہنے اور گلاب کی مہک میں بسی ہوئی وہ نوخیز حسینہ ایک رنگین مزاج سرمایہ دار کی عیش کوشی کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ آج کل پارا ہاؤس اس کے قدموں تلے بچھا ہوا تھا اور وہ جیسے خاتونِ اوّل بنی پھرتی تھی، لیکن سب جانتے تھے اور شاید وہ بھی جانتی تھی کہ چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے، بہت جلد وہ بھی وڈے صاحب کے دل سے اتر کر یہاں سے چلی جائے گی یا پھر خواص پور کی زینت بن جائے گی۔

سردار سجاول نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''لو سنو، ایک تازہ خبر ہے۔ ابراہیم کی دلہن بننے کے لیے اور ایک لڑکی یہاں پہنچائی جارہی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ابراہیم کے لیے فٹ ہے۔''

''فٹ سے کیا مطلب ہے۔'' میں نے سنبل سے پوچھا۔

''اس کا تو مجھے پتا نہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ پہلی لڑکی زینب شاید بیمار ہے۔ اس کا کوئی ٹیسٹ وغیرہ ہوا ہے۔'' سنبل نے جواب دیا۔

سنبل کو بات کی گہرائی معلوم نہیں تھی۔ وہ زینب [illegible] والے معاملے کے متعلق کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس لیے [illegible] تھی کہ شاید لڑکی زینب کسی مرض کا شکار ہے جس کی وجہ سے اب وہ ابراہیم کی دلہن نہیں بن رہی اور ایک دوسری لڑکی یہاں لائی جارہی ہے۔

''ابراہیم اس تبدیلی کے لیے راضی ہو گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی تو خاص بات ہے۔'' سنبل بولی۔ ''وہ راضی نہیں ہے۔ وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ابھی یہ شادی نہیں کرے گا۔ وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہے۔ دوسری طرف تمام تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ کارڈ تک بھیجے جا چکے ہیں۔ وڈے صاحب بہت غصے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شادی وقت پر ہی ہوگی۔ کافی پھڈا پڑا ہوا ہے۔''

اچانک میری نظر سنبل کی ریشمی اوڑھنی کے نیچے اس کی شفاف گردن کے نچلے حصے پر پڑی۔ وہاں ایک بھورن خراش نظر آئی جس کے ارد گرد نیل سا پڑ چکا تھا۔ [illegible]

[illegible] نیل پیچے تک جاتا ہو مگر نیل کی وجہ سے نظر نہ آرہا ہو۔ سنبل آج کل وڈے صاحب کی تحویل میں تھی۔ وہ اپنا زیادہ وقت اسی کے ساتھ گزار رہی تھی۔ لیکن اس جسمانی چوٹ کے لیے وڈے صاحب پر تو شبہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ہماری اب تک کی معلومات کے مطابق وہ جیسا بھی تھا لیکن عورتوں کے لیے کافی مہربان تھا۔ وہ جن خواتین کے ساتھ تعلق رکھتا تھا، وہ اس کی نرم مزاجی و شائستگی کی گواہی دیتی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''سنبل! یہ تمہاری گردن پر نشان کیسا ہے؟''

اس نے جیسے ٹھٹک کر اپنی کامدار اوڑھنی اپنی گردن پر درست کر لی۔ بہرحال یہ تو میں جان گیا تھا کہ وہ اس چوٹ سے آگاہ ہے اور وہ بھی یہ جان گئی تھی کہ میں نے گردن کا نشان دیکھ لیا ہے۔ سجاول بھی ذرا چونک گیا تھا۔ اس نے خود اوڑھنی ہٹا کر سنبل کی گردن ملاحظہ کی۔ نشان بہت گہرا نہیں تھا لیکن اس کی دودھیا رنگت کی وجہ سے نمایاں نظر آرہا تھا۔

''وہ...... مجھے کا پاؤں...... لگ گیا تھا۔'' وہ جیسے کوسا اب کر بولی تھی۔

سجاول نے بے تکلفی سے اس کی چکیلی گردن پر انگلی چلا کر دیکھی۔ ''یہ میمنے کا پاؤں تو نہیں لگتا۔ کوئی سینگ وغیرہ تو نہیں لگ گیا کسی کا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... میری گود میں اچھل رہا تھا۔ پاؤں لگ گیا ہے۔''

جرح کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس انداز سے تو میں اور سجاول دونوں لگ گئے تھے کہ سنبل کچھ چھپا رہی ہے۔ شاید وہ کہیں گری تھی یا پھر یہ بھی ہو سکتا تھا کہ روبی نامی لڑکی، جو یہاں اس کی رقیب بنی ہوئی تھی، کوئی جھگڑا وغیرہ کر بیٹھی ہو۔

سنبل کا وہ بیش قیمت ہار جس کی ایک سفید لڑی ہم نے جان بوجھ کر گم کی تھی، اب پھر اس کے گلے میں جھلملا رہا تھا۔ ہار نے سنبل کی خوب صورتی میں اضافہ کیا تھا اور سنبل نے شاید اس ہار کی خوب صورتی بڑھائی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھی اپنی ننھی سی ناک کی جڑاؤ نتھلی کو انگلی سے ہلاتی کوئی نوخیز اپسرا ہی لگ رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ اکثر بہت زیادہ حسین لڑکیاں زیادہ ذہین نہیں ہوتیں۔ سنبل پر بھی یہ بات صادق آتی تھی۔ اس کی سوچیں زیادہ گہری نہیں تھیں۔ اس کا سب کچھ اس کا حسن اور مرمریں جسم ہی تھا جس کو استعمال کر کے وہ اپنے لیے آسائشیں اکٹھا کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے اپنے والدین کی طرف سے بچپن سے یہی سکھایا گیا تھا۔

میں نے اس کے بیش قیمت ہار کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کی لڑی ٹھیک سے اپنی جگہ بیٹھی ہے یا نہیں...... کہیں سچ مچ ہی نہ گر جائے۔''

میں نے اسے ہار اتارنے کو کہا اور موتیوں والی سفید لڑی کے تار کے دونوں سروں کو اچھی طرح موڑ دیا کہ لڑی کے گرنے کا امکان ختم ہو جائے۔ میں نے ہار کی ''چین'' کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگایا۔ سنبل جیسی غافل لڑکی کسی بھی وقت اپنی کسی قیمتی چیز سے محروم ہو سکتی تھی۔ سنبل نے ہار دوبارہ پہن لیا۔ سجاول نے بھی اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی قیمتی اشیا کے بارے میں بہت محتاط رہے، کیونکہ یہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسے وڈے صاحب کی نظروں سے گرانا چاہیں گے۔

''اب میں جاؤں؟'' اس نے سجاول سے دریافت کیا۔

''لیکن آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ یہ جاننے کی کوشش کرو کہ باپ بیٹے میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔''

سنبل نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''لیڈی ڈاکٹر والے واقعے کا کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟''

اس کے چہرے پر خوف کا سایہ سا لہرایا۔ ''ہاں جی، کہتے ہیں کہ ڈاکٹر کو کسی نے مار دیا ہے۔ شاید اس کے شوہر نے......''

''ہاں کچھ اس طرح کی بات ہوئی ہے۔ اس بارے میں بھی سن گن لینے کی کوشش کرو لیکن جو کچھ بھی کرو، بچ بچا کر۔''

اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ آج وہ اپنا سفید میمنا ساتھ نہیں لائی تھی۔ خالی ہاتھ ہلاتی ہوئی اپنے گارڈز اور مشاطاؤں کے ساتھ واپس چلی گئی۔

سجاول نے سگریٹ سلگا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ ''لگتا ہے کہ یہ کچھ چھپا رہی ہے۔ گردن پر نشان تو تم نے بھی دیکھا ہوگا۔''

''یہ بڈھے ککڑ کی کارستانی تو نہیں لگتی۔ شاید واقعی میمنے کا پاؤں لگا ہو۔ ہر وقت تو اسے گود میں لیے پھرتی ہے...... یا پھر کہیں گر گئی ہو۔'' سجاول نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''اور یہ تم نے کیا کارستانی کی ہے؟''

میں سمجھ گیا کہ سجاول اس ''حرکت'' کو جان گیا ہے جو میں نے سنبل کے ہار کے ساتھ کی ہے۔ یقیناً وہ عقابی نگاہ کا مالک تھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس کارستانی کا فائدہ ہمیں پہنچے گا۔ اگر سنبل کچھ چھپا رہی تھی تو ہمیں جاننے کی کوشش کرنی چاہیے......''

میرے پاس ایک نہایت جدید پن ہول کیمرا تھا۔ چنے کی دال کے دانے کا سائز ہوگا۔ میں نے اسے سنبل کے جڑاؤ ہار کے اندر کی جانب چپکا دیا تھا۔ چونکہ وہ ہار کے اندر کی طرف تھا، اس لیے فوٹیج تو نہیں دے سکتا تھا، ہاں آڈیو بڑی صاف ریکارڈ کر سکتا تھا۔ اس کیمرے کو ایک بال جیسے باریک تار کے ذریعے میں اپنے موبائل سے کنیکٹ کر کے اس کی ریکارڈنگ دیکھ اور سن سکتا تھا۔ چند دن پہلے میں نے غصے میں موبائل فون پھینک دیا تھا جس سے اسے نقصان پہنچا تھا مگر انیق نے اسے خود ہی ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا اور سم ڈال کر واپس میرے حوالے کر دیا تھا۔

مجھے اور انیق کو رضوان کے سلسلے میں سخت پریشانی تھی۔ خاص طور سے میں بہت فکرمند تھا۔ میں نے دو دن پہلے رات کے وقت اسے ارم کے اپارٹمنٹ میں جس بے بسی کے عالم میں دیکھا تھا، وہ مناظر میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئے تھے۔ اس خوبرو کے گلے میں رسی تھی اور ارم اس کے جانوروں سے بدتر سلوک کر رہی تھی۔ ہائے یہ کس مجبوری کے گھیرے میں تھا کہ کچھ کر نہیں پا رہا تھا۔

رضوان کے ساتھ میرا اور انیق کا زیادہ ساتھ نہیں رہا تھا۔ ہم ملنگی ڈیرے پر بس دو تین روز کے لیے ملے تھے۔ ہم ملنگی ڈیرے سے اکٹھے فرار ہوئے تھے اور پھر دو دن سفر میں ساتھ رہے تھے۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک وابستگی سی پیدا ہو گئی تھی۔ میں اسے زندہ دیکھنا چاہتا تھا مگر حالات خدوش تھے۔ یقیناً اس کے ساتھ کچھ ہو چکا تھا یا پھر ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر دل چاہا کہ ہم راست اقدام کریں اور کسی طرح پارا ہاؤس کے گنجے کرتا دھرتا آقا جان کی گردن ناپ لیں مگر یہ زبردست رسک کی بات تھی۔ وہ افلاطون وڈے صاحب کی ناک کا بال تھا۔ اس کے ایک اشارے پر پارا ہاؤس کی فورس ہمارے خلاف حرکت میں آ سکتی تھی۔

شام کو انیق نے مجھے بتایا۔ ''ڈاکٹر ارم کے قتل کی ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہو گیا ہے اور اس کی لاش کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کر دی گئی ہے۔''

''پولیس نے کس پر شک کیا ہے؟''

''پولیس تو اسی پر شک کرے گی جس پر پارا ہاؤس والے چاہیں گے۔ شکیل واراثت کے ہوتے ہوئے پولیس اپنا مرضی تھوڑی چلا سکتی ہے۔''

"یعنی ارم کے مفرور شوہر پر شبہ کیا جا رہا ہے؟"

"بالکل۔ یہ لوگ تو اسے مفرور شوہر ہی کہہ رہے ہیں جبکہ ہمارے خیال میں وہ نہ مفرور ہے اور نہ شوہر ہے۔" ایتق ذرا افسردگی سے بولا۔

"اس کا امکان تو بہت کم ہے کہ وہ پارا ہاؤس سے نکل پایا ہوگا۔ لگتا یہی ہے کہ وہ زندہ یا مردہ، جس حالت میں بھی ہے، پارا ہاؤس کے اندر ہی ہے۔"

اگلے قریباً چوبیس گھنٹے ہم نے پریشانی کے عالم میں ہی گزارے۔ اب رضوان کے علاوہ مجھے زینب کی فکر بھی لاحق ہو گئی تھی۔ ابراہیم اس سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس چیز نے پارا ہاؤس والوں میں تناؤ پیدا کر دیا تھا۔ ایک طرح سے باپ بیٹے میں ٹھن گئی تھی۔ اس امر کا ڈر موجود تھا کہ کہیں زینب کو راستے سے ہٹانے کی کوشش نہ کی جائے۔ آغا جان جیسے خبیث مشیر کے ہوتے ہوئے یہاں پارا ہاؤس میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

اگلے روز شام کے بعد میں نے سجاول سے کہا کہ وہ سنبل کو دوبارہ ملاقات کے لیے بلائے۔ سجاول بولا۔ "یہ بار بار کی ملاقاتیں ان لوگوں کو شک میں نہ ڈال دیں۔ تم ایک آدھ دن صبر کر لو۔"

"نہیں سجاول! میں نے تمہیں بتایا ہے ناں کہ رضوان کی جان کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ اس کا کھوج لگانے کے لیے ہمیں ہر ذریعہ استعمال کرنا ہوگا اور جلد سے جلد۔"

"تمہارا خیال ہے کہ تمہارے ننھے کیمرے میں رضوان کی فوٹو آ گئی ہوگی اور وہ سب کچھ اپنی زبان سے بتا دے گا۔" سجاول نے طنز سے کہا۔

"یار فوٹو نہ آئی ہو گی مگر ہو سکتا ہے کہ ریکارڈ ہونے والی آوازوں سے ہمیں کوئی کلیو مل جائے یا پھر ویسے ہی سنبل نے کوئی اہم انفارمیشن حاصل کی ہو۔"

میرے اصرار پر سجاول نے ایک بار پھر وڈے صاحب سے رابطہ کیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ سنبل سے چند منٹ کے لیے بات کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ لیڈی ڈاکٹر والے واقعے کے بعد اندر سے ڈری ہوئی ہے۔

وڈے صاحب نے ذرا جزبز ہونے کے بعد اجازت دے دی۔ قریباً ایک گھنٹے کے بعد سنبل اپنے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ سجاول کے پاس آ گئی۔ حسب معمول چوکس گارڈز اور ذاتی ملازمائیں کمرے سے باہر کھڑے رہے۔ سنبل اپنے قیمتی لبادے کو ٹانکوں کے نفیس فرشی ارے ردی ہوئی کمرے میں آ گئی۔ میری نگاہ سب سے پہلے اس کے گلے پر ہی پڑی اور یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ ہار پہنے ہوئے ہے۔

یہ زیادہ طویل ملاقات نہیں تھی۔ میرا اصل مقصد ہار کے نیچے اپنا پن ہول اسپائی کیمرا جدا کرنا تھا۔ چوڑا چکلا ہار سنبل کے اوپرے سینے پر پھیلا ہوا تھا۔ ہم سنبل پر بھی کیمرے کی موجودگی کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس مرتبہ سجاول نے سنبل کا ہار اتروایا اور اس کی زنجیریں اور لڑیاں وغیرہ چیک کیں۔ اس کے کلپ کو کھینچ تان کر دیکھا۔ اسی دوران میں، میں نے صفائی سے کیمرا ہار کی ایک طلائی پتی کے نیچے سے جدا کر لیا۔

وہ بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ آپ دونوں کو مجھ سے زیادہ اس ہار کی فکر ہے؟"

"تمہاری فکر بھی ہے۔" سجاول نے پُررعب دار آواز میں کہا۔

"اسی لیے تو پوچھ رہے تھے کہ گردن پر چوٹ کیسی ہے؟" میں نے لقمہ دیا۔

وہ ہنس کر چپ ہو گئی۔ میں نے کہا۔ "وڈے صاحب سمیت اگر کسی سے بھی کسی طرح کی شکایت ہے تو بتاؤ۔ اس کا سدباب کریں گے۔"

اس نے تیوری چڑھا کر کہا۔ "اور کسی سے تو نہیں لیکن اس پرکٹی کبوتری پر بہت غصہ آتا ہے۔ ایسے ایسے کپڑے پہن کر وڈے صاحب کے سامنے آتی ہے کہ شاید وڈے صاحب کو بھی شرم آ جاتی ہوگی۔" وہ روحی کا ذکر کر رہی تھی۔

سجاول نے کہا۔ "اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہر طرح سے ہوشیار رہو۔ یہاں کئی طرح کی سازشیں چل رہی ہیں۔"

سنبل کے جانے کے فوراً بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا اور دروازہ لاک کر کے کیمرے کا "کنکشن" اپنے سیل فون سے کرنے میں مصروف ہو گیا۔ کافی دشواری ہوئی مگر کام ہو گیا۔ مجھے توقع تھی کہ آواز ریکارڈ ہو جائے گی۔ یہ توقع پوری ہوئی بلکہ وہ توقع بھی پوری ہوئی جو میں نے ہرگز نہیں کی تھی۔ کیمرے نے چار پانچ منٹ کی ایک وڈیو بھی بنا ڈالی۔ دراصل رات کے وقت جب اپنے بیڈروم میں سنبل نے اپنے جھمکے اور ہار وغیرہ اتار کر سائڈ ٹیبل پر رکھے تو اتفاقاً ہار کا رخ کچھ ایسا ہو گیا کہ پن ہول کیمرا کمرے کے ایک حصے کا منظر دکھانے لگا۔ لائٹس روشن تھیں۔ یہ پارا ہاؤس کے ارب پتی مالک کا بیڈروم تھا جو کسی بادشاہ کی آرام گاہ سے کم حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ بہترین آرائشی فرنیچر، عجیب و

قریب شکلوں کے جہازی سائز صوفے، فانوس، غالیچے اور انوکھی طرز کا انالین بیڈ۔ پورا کمرا تو نظر نہیں آ رہا تھا لیکن جتنا بھی آ رہا تھا، بے مثال تھا۔ یہ کافی صاف وڈیو تھی۔

میں نے وڈے صاحب عزت مآب ریان فردوس صاحب کو صرف ایک لنگی نما لباس میں دیکھا۔ بالائی دھڑ عریاں تھا۔ جسم قدرے ڈھلکا ہوا اور چربی دار تھا۔ سارے جسم اور چہرے پر وہی سرخ داغ تھے جن کی وجہ کوئی پرانی بیماری بتائی جاتی تھی۔ وڈا صاحب ریان فردوس خوشگوار موڈ میں لیٹا ہوا تھا۔ نوخیز حسینہ سنبل ایک گلابی رنگ کے سلیپنگ گاؤن میں تھی اور ریان فردوس کے سرہانے بیٹھی اس کے سر کے چھدرے بالوں میں انگلیاں چلا رہی تھی۔ لیکن غور سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ اور بھی کر رہی ہے۔ وہ اس کے ماتھے پر بھی اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہی تھی۔ دراصل اس کے ہاتھ میں ایک لپ اسٹک تھی اور وہ غیر محسوس طریقے سے ریان فردوس کے ماتھے پر لکیریں بنا رہی تھی، جیسے کسی ہندو نے سرخ قشقہ لگا رکھا ہو۔

ریان فردوس کو جیسے شک ہوا۔ اس نے سنبل کی کلائی پکڑی اور اس کی انگلیوں میں لپ اسٹک دیکھ کر حیران ہوا۔ پھر اس نے جلدی سے بیڈ پر لگے ہوئے ایک آئینے میں اپنی صورت دیکھی۔ سنبل کھلکھلا کر ہنسی۔ وہ اس کے پیچھے لپکا، وہ تیزی سے بستر کے گرد ایک چکر کاٹ گئی۔ ریان فردوس نے اسے دوسری جانب سے پکڑنے کی کوشش کی تو وہ شوخی سے چلاتی ہوئی الٹا چکر کاٹ گئی۔ وہ دونوں بستر کے گرد چکر لگانے لگے۔ ان لمحوں میں عزت مآب وڈا صاحب نہ تو عزت والا نظر آ رہا تھا اور نہ ہی وڈا...... وہ اپنی عمر سے قریباً چھتیس سال چھوٹی لڑکی کے پیچھے لپکتے ہوئے انداز میں دوڑ رہا تھا۔ اس کا سارا جسم تھل تھل کر رہا تھا اور کسی وقت تو سرخ مخمل کی لنگی بھی خطرے میں نظر آنے لگتی تھی۔

آخر وہ ہانپ کر رک گیا۔ شوخ سنبل بیڈ کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ وڈے صاحب ریان فردوس نے ایک گہری سانس لے کر ایک سائڈ ٹیبل کی دراز کھولی اور اس میں سے ایک سبز ڈبیا نکال کر سنبل کو دکھائی۔ اس نے ڈھکن اٹھایا تو ڈبیا کے اندر سے ایک جڑاؤ کنگن نکلا۔ فوٹیج میں کنگن کی پوری خوب صورتی تو نمایاں نہیں ہوتی تھی تاہم پتا چلتا تھا کہ اس پر سبز زمرد جڑے ہوئے ہیں اور اس کی مالیت لاکھوں میں ہوگی۔ اس نے بستر پر بیٹھ کر انگلی کے اشارے سے سنبل کو اپنے قریب بلایا۔ ان مرحلے پر وہ قریب آ گئی۔ پہلے اس نے ٹشو پیپر سے ریان فردوس کا ماتھا صاف کیا پھر اپنی کلائی آگے بڑھا دی۔ ریان فردوس نے بڑے سلیقے سے اسے کنگن پہنایا۔ لیکن کنگن پہنانے کے بعد بھی کلائی چھوڑی نہیں۔ وہ بہت بڑا سرمایہ دار تھا اور سرمایہ دار جانتا ہے کہ کنگن اور کلائی کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ کنگن پہنا کر کلائی چھوڑی نہیں جاتی۔ کنگن تو شاید پہنایا ہی کلائی پکڑنے کے لیے جاتا ہے۔ خیر آلے جیسے جسم والے ریان فردوس نے خوش اندام سنبل کو اپنی بانہوں میں لے لیا، وہ دونوں بستر پر گر کر پن ہول کیمرے کی نظر سے اوجھل ہو گئے۔

یہ چار پانچ منٹ کی وڈیو بہت اچھی بنی تھی لیکن یہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔ میرے کام کی چیز آگے چل کر تھی اور یہ وڈیو نہیں آڈیو کی شکل میں تھی۔ وڈیو اور آڈیو کے درمیان کم و بیش دس گھنٹے کا فرق تھا۔ ان دس گھنٹوں میں بہت سی چیزیں اس جدید کیمرے میں ریکارڈ ہوئی تھیں۔ جذباتی سرگوشیاں، سانسوں کی سرسراہٹ، قہقہے، ان کی آوازیں، دروازے کھلنے یا بند ہونے کی صدا۔ صبح دم جب کمرے کی لائٹس آن ہوئیں پھر آدھ پون منٹ کی وڈیو بنی تھی لیکن اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فقط وسیع بیڈروم کے ایک گوشے میں وڈے صاحب نے اپنے سیل فون پر ایک کال سنی تھی۔ مختصر گفتگو سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ تب وڈا صاحب چینی کے ہاتھ میں سگار سلگاتا ہوا فریم سے نکل گیا تھا۔ بعدازاں سنبل نے یہ بار شاید کسی الماری میں رکھ دیا تھا۔ یہاں صرف آڈیو ریکارڈنگ ہوئی تھی اور وہ بھی نہایت مدھم۔ جو اہم ترین آواز ریکارڈ ہوئیں ان کا وقت دن دس بجے کے لگ بھگ تھا۔ یہ ایسی ریکارڈنگ تھی جس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ بہرحال یہ طے نہیں تھی کہ میں یہ سب کچھ جان سکوں گا۔

پہلے کچھ نامانوس آہٹیں سنائی دیں۔ پھر انداز ہوا کہ کسی دروازے کا لاک کھولا گیا ہے۔ اونچی ایڑی کی ٹھک ٹھک گونجی جو یقیناً سنبل کے سینڈل کی ہی تھی۔ تب دروازہ دوبارہ لاک ہو گیا۔ سنبل کی مدھم آواز ابھری۔ ''کیسے ہو؟'' جواب میں ایک مردانہ آواز نے کچھ کہا جو صاف سنائی نہیں دیا۔

''تمہارے لیے کھانا لائی ہوں، برگر اور جوس ہے۔''

''تم میرے لیے بڑی تکلیف اٹھا رہی ہو۔'' اس نوجوان کی آواز صاف تھی۔ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ یہ آواز میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ رضوان

بی کی آواز تھی۔

اتنے میں سنبل کی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ''اپنوں کے لیے کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔''

''تم مجھے اپنا سمجھ رہی ہو۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔''

اب شبہے کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ یہ رضوان ہی کی آواز تھی۔ پہلی خوشی تو یہ تھی کہ وہ زندہ ہے اور دوسری یہ کہ وہ قاتلوں کے ہتھے نہیں چڑھا اور محفوظ ہے۔ جتنی خوشی تھی اتنی ہی حیرت بھی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ سنبل تک کب اور کیسے پہنچا تھا۔ وہ پارا ہاؤس کے حساس ترین حصے میں موجود تھا۔ یہ بڑے صاحب عزت مآب ریان فردوس کی رہائش گاہ تھی۔ بلکہ اس کے بیڈروم کا کوئی قریبی کمرا تھا شاید۔

گفتگو جاری تھی۔ ''تم میرے لیے بہت بڑا خطرہ مول لے رہی ہو۔ مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

''لیکن اب نکلنا اتنا آسان نہیں۔ بہت سخت پہرا ہے۔''

''لیکن اگر یہاں کوئی آ گیا تو پھر؟'' رضوان کی سرگوشی ابھری۔

''بڑے صاحب کے سوا یہاں کوئی نہیں آتا، اور وہ بھی کبھی کبھار ہی قدم رکھتا ہے۔ میں...... کوشش کروں گی...... کہ وہ اس طرف آنے ہی نہ پائے۔''

''لیکن اگر وہ آ گیا تو؟ مجھے...... اپنے سے زیادہ...... تمہاری فکر ہے۔'' رضوان بولا۔

''تمہارے لیے کوئی مصیبت آ بھی گئی تو سہ لوں گی۔'' سنبل نے ذرا جذباتی لہجے میں کہا۔

''تم بہت اچھی ہو۔ مجھے دکھ ہے کہ [illegible] نے تمہارے ساتھ بدتمیزی کی۔''

''اس وقت تم مجھے جانتے نہیں تھے اور نہ میں جانتی تھی۔'' سنبل کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''تمہاری...... گردن...... اب کیسی ہے۔'' رضوان نے دریافت کیا۔ لگتا تھا کہ گفتگو کے ساتھ ساتھ وہ کچھ کھا بھی رہا ہے۔

''اب ٹھیک ہوں۔ جو لوگ مجھے یہاں لے کر آئے تھے، ان میں سے ایک سجاول صاحب ہیں۔ انہوں نے میری گردن کا نیل دیکھ لیا تھا۔ پوچھ رہے تھے کیا ہوا۔ میں نے بتایا کہ میرے گود میں اخبار رکھا تھا، اس کا پاؤں لگ گیا۔''

''میری خاطر کتنے جھوٹ بولنے پڑ رہے ہیں۔''

''کوئی بات نہیں رضوان صاحب۔ [illegible]

اور تم بے گناہ ہو۔ کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ...... بڑے صاحب کو سب کچھ بتا دوں، اور اگر......''

''نہ...... نہ...... یہ غضب نہ کرنا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم ان بڑے لوگوں کے طور طریقوں سے واقف نہیں ہو۔ یہ کچے اخروٹ کی طرح اوپر سے نرم اور اندر سے پتھر ہوتے ہیں۔ ابھی اپنی زبان بالکل بند رکھو۔ صرف یہ کوشش کرو کہ میں کسی طرح حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکل سکوں۔''

لگتا تھا کہ وہ دونوں بالکل پاس پاس بیٹھے ہیں۔ بار میں موجود اسپائی کیمرے کے ذریعے آڈیو بالکل صاف ریکارڈ ہو رہی تھی۔

کچھ دیر بعد ایک بار پھر کھٹ پٹ سنائی دی۔ آوازیں پہلے مدھم ہوئیں، پھر معدوم ہو گئیں۔

یہ سنسنی خیز صورتِ حال تھی۔ یہ بات اب تقریباً ثابت ہو چکی تھی کہ ڈاکٹر ارم کا قتل رضوان نے نہیں کیا۔ ریکارڈنگ میں سنبل اسے بار بار بے گناہ کہہ رہی تھی۔ انداز یہی ہو رہا تھا کہ ارم کے قتل کے وقت رضوان کو بھی پکڑنے کی کوشش کی گئی یا پھر پکڑ لیا گیا اور مارنے کی کوشش کی گئی۔ وہ بھاگ نکلا اور پتا نہیں کس طرح بچ بچا کر پارا ہاؤس کے خاص الخاص حصے تک جا پہنچا۔ اگر ڈاکٹر ارم کے قتل کے ڈانڈے آقا جان سے مل رہے تھے تو پھر رضوان چشم دید گواہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یقیناً اس نے ان لوگوں کو دیکھا تھا جنہوں نے ارم کی جان لی اور اس جرم کو رضوان کے سر تھوپنے کی کوشش کی۔ رضوان کی گواہی قاتلوں کے لیے بے حد سنگین ثابت ہو سکتی تھی۔ چھوٹے صاحب ابراہیم نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ [illegible] آقا جان کو ہرگز معلوم نہیں [illegible] کی میت [illegible] رپورٹ غلط ہے۔ اب اس غلط رپورٹ دینے والی کو قتل کر دیا گیا تھا اور پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ اس قتل میں آقا جان ملوث ہیں۔ اگر اس کا ثبوت مل جاتا تو آقا جان کی بنیادیں ہل جاتیں۔

میں نے اسی وقت سجاول کو بلایا اور اسے ریکارڈنگ دکھائی۔ سجاول کا پہلا تاثر شدید طیش ہی کا تھا۔ اس نے سنبل کو کئی غائبانہ صلواتیں سنائیں اور پھنکارا۔ ''اس الو کی پٹھی سے ایسی ہی بے وقوفی کی امید تھی۔ خوامخواہ ہی نے بیٹھے بٹھائے اتنا بڑا پنگا لے لیا ہے۔ اگر بڑے صاحب کو پتا چل گیا تو بیڑا غرق ہو جائے گا اس کا......''

''لیکن کچھ بھی ہے یار! اس میں ایک پہلو فائدے کا بھی تو ہے۔ سنبل کی وجہ سے اس بندے کی جان بچ گئی [illegible] پہچان

لیا تو مجھے لگتا ہے آقا جان کی منحوس گردن ضرور شکنجے میں آئے گی۔ یہاں پارا ہاؤس میں اس کے نام کا جو ڈنکا بج رہا ہے وہ ڈنکا پھٹ جائے گا۔''

''لیکن وہ مسٹنڈا وہاں سے نکلے گا کیسے؟ جب بھی نکلے گا یہ حرامزادی پھنسے گی اور مجھے تو لگ رہا ہے کہ یہ اس سے عشق معشوقی بھی جھاڑنے لگی ہے۔''

''چلو، یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ سب سے پہلے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ لڑکے کو وہاں سے نکالا کس طرح جائے؟ اور اس سے بھی زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کہیں وہ کھوتے کی بچی اسے خود وہاں سے نکالنے کی کوشش نہ کرے۔ ایسا کرے گی تو دونوں پکڑے جائیں گے۔'' سجاول نے کہا۔

''تو پھر بلاؤ اس کو دوبارہ۔'' میں نے کہا۔

''وہ بڈھا گھگڑ ضرور شک میں پڑے گا۔ دیکھا جائے تو ابھی دو چار دن ہمیں اس اُلو کی پٹھی سے رابطہ نہیں کرنا چاہیے۔''

''لیکن دو چار روز میں وہ کوئی نہ کوئی حماقت ضرور کر جائے گی بلکہ مجھے تو دو چار گھنٹے بھی خطرناک لگ رہے ہیں۔''

ہم سنبل سے دوبارہ ملاقات کا سوچ رہے تھے لیکن اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ ہو گیا جس نے خودبخود سنبل سے ملاقات کا موقع پیدا کر دیا۔ صبح ناشتے کے وقت ہی اینق کا دوست ازمیر طیب وہاں ہمارے پاس آ دھمکا۔ اس کا چہرہ بجھا ہوا سا تھا۔ اینق نے شکستہ انگریزی میں اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

وہ بولا۔ ''سارا معاملہ ہی چوپٹ ہو رہا ہے۔ شادی کی تیاریاں تھیں لیکن سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں۔ چھوٹے صاحب ابراہیم شادی کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے لیے ڈھولک بجائی جا رہی ہے نہ گیت گائے جا رہے ہیں۔ چھوٹے صاحب کمال کی شادی کی تھوڑی بہت تیاری ہو رہی ہے لیکن رات والے واقعے کے بعد اس کا مزہ بھی کرکرا ہو گیا ہے۔''

''کیا ہوا؟'' اینق نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں ازمیر نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں، اور گاہے بگاہے مالے کے لفظ بھی استعمال کر کے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

رات کو چھوٹے صاحب کمال احمد کی شادی کی رسموں کے سلسلے میں شمعوں کی محفل تھی۔ ملائی رواج کے مطابق لڑکیاں مل کر شمعیں جلاتی تھیں اور بڑے بڑے گھیردار کپڑے پہن کر گول گول گھومتی تھیں۔ سنبل بھی گھومتے جوگر جاتی تھی۔ اسے لڑکیوں کی اس محفل میں ناچنا اور گانا پڑتا تھا۔ اس محفل میں باہر کی لڑکیاں اور خواصیں بھی شامل تھیں۔ اچانک سنبل کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ لڑکیوں نے مل کر بہت مشکل سے ریشمی لبادے کی آگ بجھائی۔ بظاہر تو یہی لگا کہ اتفاقاً سنبل کا لبادہ کسی شمع سے چھو گیا ہے لیکن ایک خواص عائزہ خانم نے دیکھ لیا تھا کہ لبادے کو جان بوجھ کر آگ دکھائی گئی ہے اور یہ آگ روحی نامی اسی لڑکی نے دکھائی تھی جو سنبل سے پہلے ''ملازمت'' کے لیے پارا ہاؤس میں داخل ہوئی تھی۔ (اور سنبل کی آمد کے بعد نظرانداز کر دی گئی تھی) آگ سے سنبل کا ایک بازو جل گیا تھا اور اس کے بالوں کو بھی نقصان پہنچا تھا۔

یہ ایک سنگین واقعہ تھا۔ سجاول مشتعل نظر آنے لگا۔ وہ پھنکارا۔ ''اتنا کچھ ہو گیا اور ہمیں خبر ہی نہیں ہوئی۔''

اسی دوران میں حلمی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اردو میں کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں مسٹر سجاول! سنبل کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے بازو پر دوا وغیرہ لگا دی گئی ہے۔ بے شک یہ ایک خطرناک واقعہ تھا لیکن خواص عائزہ صاحبہ اور ان کی دو خادماؤں نے خود کو خطرے میں ڈال کر سنبل کی آگ بجھائی۔ سنبل سے زیادہ تو وہ دونوں تینوں زخمی ہوئی ہیں۔ ایک تو اسپتال میں ''ایڈمٹ'' ہے۔''

سجاول غضیلے لہجے میں بولا۔ ''حلمی صاحب! اس لڑکی کے بارے میں سنبل پہلے بھی شکایت کر رہی تھی اگر اس کی شکایت پر توجہ دی جاتی تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔''

''لیکن اب اسے کیے کی سزا ملی ہے۔'' حلمی نے کہا۔ ''آقا جان ڈسپلن کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں کرتے۔ حالانکہ روحی نامی یہ لڑکی آقا جان کے کسی جاننے والے کے واسطے سے یہاں پہنچی تھی لیکن اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا ہے جو کسی بھی لڑکی کے ساتھ ہوتا۔''

تفصیل بتاتے ہوئے حلمی نے کہا کہ روحی نے جو حرکت کی وہ ایک وڈیو کیمرے میں بھی محفوظ ہو گئی تھی۔ اس وڈیو سے تصدیق ہو گئی کہ سنبل کے لبادے کو آگ غلطی سے نہیں لگی بلکہ روحی نے خود ایک شمع کے ذریعے لگائی۔ اس کا لبادہ آگ کے لیے اتنا خطرناک تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ خواص عائزہ اور ملازماؤں نے جان کی بازی لگا کر یہ آگ بجھائی۔ جب روحی کو وڈیو دکھائی گئی تو اس کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنا جرم تسلیم کر لے۔ اس سے کہا گیا کہ وہ پولیس کے حوالے ہونا چاہتی ہے یا پارا ہاؤس میں سزا

جھگتنا چاہتی ہے۔ اس نے پارا ہاؤس میں رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے سر کے سارے بال مونڈ دیے گئے ہیں۔ اسے اسی وقت سو بید لگائے گئے۔ اب وہ بستر پر اوندھی پڑی ہے۔ کل یا پرسوں تک جب وہ بہتر ہو جائے گی اسے بھنگنوں والا لباس پہنایا جائے گا اور وہ پورے ایک ماہ تک پارا ہاؤس کے واش روم صاف کرے گی۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ سزا آغا جان نے دی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ یہاں سزائیں آغا جان ہی دیتے ہیں؟''

حلمی بولا۔ ''آغا جان تجویز کرتے ہیں۔ تصدیق کی مہر عزت مآب کی ہوتی ہے۔''

کہنے کو تو حلمی کہہ رہا تھا مگر ہم دیکھ رہے تھے کہ یہاں اکثر اہم اور مشکل فیصلے آغا جان یا حلمی ہی کر رہے ہیں...... خاص طور سے آغا جان کی جڑیں تو یہاں بہت گہری نظر آتی تھیں۔

سردار سجاول نے کہا۔ ''حلمی صاحب! سنبل اب کیسی ہے؟''

''میں نے کہا ہے ناں وہ بالکل ٹھیک ہے، ابھی تھوڑی دیر میں شاید وہ یہاں آپ لوگوں سے ملنے بھی آجائے۔''

قریباً آدھ گھنٹے بعد واقعی سنبل اپنے ''عملے'' کے ساتھ آتی دکھائی دی۔ اس کا بیٹا سینا آج ایک خادمہ کی گود میں نظر آ رہا تھا۔ سنبل ٹھیک ہی لگ رہی تھی۔ صرف ایک بازو پر ایک سفید مرہم کا لیپ تھا جو کلائی سے کہنی تک کیا گیا تھا۔ ہاں، اس کے حلیے میں نمایاں تبدیلی اس کے بالوں میں آئی تھی۔ اس کے بالوں کو یقیناً نقصان پہنچا تھا اور اب انہیں نئے انداز سے تراشا گیا تھا۔ یہ انداز بھی اس پر جچ رہا تھا۔

سردار سجاول نے سرپرست کی حیثیت سے اسے اپنے ساتھ لگایا اور اس کا حال احوال دریافت کیا۔ لگتا تھا کہ سنبل نے اس واقعے سے بہت زیادہ اثر نہیں لیا۔ ممکن ہے کہ شروع میں اثر لیا ہو لیکن جب سزا کے طور پر روحی کی ایسی تیسی ہو گئی تو اس کے کلیجے میں کچھ ٹھنڈ پڑ گئی ہو۔ ویسے بھی آتشزدگی کا زیادہ صدمہ تو سنبل کے بجائے خواص عائزہ اور اس کی ملازماؤں نے جھیلا تھا۔

رات والے واقعے کی رُوداد ختم ہوئی تو سجاول کی تیوری چڑھنا شروع ہو گئی۔ وہ سنبل کو گھور کر تیز سرگوشی میں بولا۔ ''آگ سے تو بچ گئی ہو لیکن جو آگ تم خود اپنے آپ کو لگا رہی ہو اس سے کیسے بچو گی؟''

وہ چونک کر سجاول کو دیکھنے لگی۔ ''ہم...... میں سمجھی نہیں؟''

''تمہیں گندی نالی سے اٹھایا ہے میں نے اور سونے چاندی کے ڈھیر پر بٹھایا ہے...... انسان کی بچی بن۔ اور تو یہ کیا حرکتیں کر رہی ہے۔''

سنبل کا خوب صورت نکھرا نکھرا چہرہ گہری زردی سے ڈھک گیا۔ ''ہم...... میں نے کیا کیا ہے سردار؟''

''تھپڑ ماروں گا ناں تو آدھے دانت گر جائیں گے اور آدھے ایسے ہو جائیں گے کہ ساگو دانہ بھی نہ کھا سکے گی۔'' وہ پھنکارا۔ ''کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟ کوئی جھلی چڑی ہوں میں؟ تم اپنی مرضی کے نئے نئے پنگے لو گی اور مجھے پتا نہیں چلے گا۔''

اس کے ساتھ ہی سجاول نے وہ آڈیو سنبل کے سامنے کر دی جس میں اس کی اور رضوان کی گفتگو محفوظ تھی۔ چار پانچ فقرے سننے کے بعد ہی سنبل نے کانپنا شروع کر دیا۔ سجاول کی سرخ آنکھیں دیکھ کر بڑوں بڑوں کا پتا پانی ہوتا تھا۔ یہ نازک سی لڑکی تو کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ یقیناً وہ اس بات پر بھی حیران تھی کہ یہ آوازیں کس طرح ریکارڈ ہوئی ہیں۔

''کیسے آیا یہ بندہ تیرے کمرے میں؟''

''میری کوئی قصور نہیں سردار۔ وہ زبردستی آ گیا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ میری گردن پر چھری رکھ دی۔''

''چھری تو اس نے رکھی ہو گی لیکن یہ پرانی بات ہے۔ اب تو تو اس کے ہاتھ آگے ٹکا کر رہی ہے۔ کمینی! سب کچھ ریکارڈ ہے اس میں۔''

''نن...... نہیں سردار! میں تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔ کچھ نہیں کروں گی۔''

''میری مرضی کے بغیر اسے اپنی گود میں تو گھسا کر بیٹھی ہوئی ہے...... جانتی ہے کتنی بڑی حماقت کر رہی ہے تو؟ دل چاہتا ہے ابھی ایک فٹ کا چھرا تیرے پیٹ میں اتار ڈالوں۔''

''مجھے معاف کر دو سردار...... ہم...... میں نے سب کچھ تمہیں بتا دینا تھا......''

شاید سجاول مزید کچھ بولتا لیکن میں نے اس کا بازو دبا کر اسے دھیرج رکھنے کا اشارہ دیا۔ اس نے وہسکی کا ایک لمبا گھونٹ لے کر گلاس فرش پر لڑھکا دیا۔

میں نے کہا۔ ''سنبل! جو کچھ ہوا اچھا نہیں ہوا لیکن تم ذرا تفصیل سے بتاؤ۔''

جواب میں اس نے اٹک اٹک کر اور ہونٹوں پر زبان

پھیر پھیر کر جو کچھ بتایا اس سے پتا چلا کہ قتل کے بارے میں رضوان سے اس کی بات چیت ہوئی ہے۔ رضوان نے کہا ہے کہ ڈاکٹر ارم کو قتل کرنے والے چار افراد تھے۔ انہوں نے چہرے سیاہ ڈھاٹوں میں چھپا رکھے تھے۔ لیکن ارم سے ہاتھا پائی کے دوران میں ایک بندے کا ڈھاٹا اتر گیا تھا۔ دو بندوں نے ارم کو جکڑ رکھا۔ تیسرے نے اس پر چاقو سے وار کیے۔ پھر ان میں سے ایک نے ارم کو چھوڑ دیا اور دوسرے کے ساتھ مل کر رضوان کو پکڑنے کی کوشش کی۔ رضوان ان کی زد سے نکل کر بھاگا اور پارا ہاؤس کے بڑے اسٹور روم میں چھپ گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے اسٹور ایریا میں ایک ایسا کمرا ڈھونڈ لیا جہاں اسپیشل فورس کے محافظوں کی دھلی ہوئی یونیفارمز پڑی تھیں۔ اس نے اپنے جسم کے مطابق ایک یونیفارم ڈھونڈ لی اور پہن کر ایک راہداری میں گھس گیا۔ وہ باؤنڈری وال کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن یہ راہداری بل کھا کر اسے اندرونی حصے میں اور پھر خاص الخاص رہائشی پورشن میں لے گئی۔ دو فی میل گارڈز سے بچنے کے لیے وہ عین اس کمرے میں گھس آیا جہاں سنبل موجود تھی۔ اس نے چھری کی مدد سے سنبل کو بے بس کیا۔ لیکن بعد ازاں اس نے سنبل کو بتایا کہ وہ وہی ہے جس پر ڈاکٹر ارم کے قتل کا الزام لگایا جا رہا ہے لیکن وہ ایک سو ایک فیصد بے گناہ ہے۔

سنبل نے اس سے نرم رویہ اختیار کیا تو رضوان نے اس کی گردن سے چھری ہٹا دی۔ (سنبل کی گردن پر ہمیں جو گہرا نیل نظر آیا تھا وہ اسی کھینچا تانی کا نتیجہ تھا) وہ سنبل کو واقعی بے گناہ اور مظلوم لگا۔ اس کے چہرے پر تشدد کے نشان تھے اور گردن کی جلد پر ایسے آثار تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ اسے رسی ڈال کر گھسیٹا جاتا رہا ہے۔ یہ باتیں سنبل کے کانوں تک بھی پہنچ چکی تھیں کہ مقتولہ ارم اپنے شوہر پر تشدد کرتی ہے۔ اس کے دل میں خوف زدہ رضوان کے لیے شدید ہمدردی پیدا ہوئی۔ اس نے رضوان کو فوری طور پر چھپانے کا فیصلہ کیا۔ اس وسیع و عریض بیڈ روم سے ملحق ایک اور کمرا تھا۔ اسے ''ڈارک روم'' کہا جاتا تھا۔ یہاں در و دیوار اور فرنیچر سمیت ہر چیز گہری سیاہ تھی۔ وڈا صاحب کبھی کبھار مکمل سکون اور غور و فکر کے لیے یہاں استراحت فرماتا تھا۔ لیکن ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ اب پچھلے قریباً چار دن سے رضوان اس ڈارک روم میں بند تھا اور سنبل بڑی رازداری سے اسے وہیں پر کھانا پہنچا رہی تھی۔

یہ ساری روداد حیران کن تھی۔۔۔ بہر حال یہ روداد سن کر ہمیں کم از کم اتنی تسلی تو ہوئی کہ ہم اس نازک صورت حال سے بے خبر نہیں ہیں۔

سجاول بدستور سنبل سے ڈانٹ ڈپٹ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ جو بھی صورت حال تھی اسے فوراً وڈے صاحب کو بتانا چاہیے تھا۔ اب وہ لڑکا (رضوان) چار دن سے چھپا ہوا ہے اور اسے سنبل نے چھپا رکھا ہے۔ اگر یہ بات اب وڈے صاحب کو بتائی گئی تو اسے کسی صورت بھی ہضم نہیں ہوگی۔ وہ اسے پتا نہیں کیا مطلب دے گا۔

سجاول کی بات درست تھی۔ یہ بڑا نازک معاملہ بن گیا تھا۔ وڈا صاحب آج کل بے طرح سنبل پر لٹو تھا۔ اگر اسے پتا چل جاتا کہ سنبل نے ایک خوبرو نوجوان کو اس کے بیڈ روم کے پہلو میں چھپا رکھا ہے تو یقیناً وہ بہت اثر لیتا اور اس کا ایکشن بھی سخت ہوتا۔

ہم نے سنبل کو سمجھا بجھا کر واپس بھیجا کہ وہ فی الحال حالات کو جوں کا توں رکھے۔ ہم اس مسئلے کا حل سوچتے ہیں۔

مجھے خبر مل رہی تھی کہ انچارج گارڈ قادر خان اب رو بصحت ہے، ہو سکتا ہے کہ اسے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ میں انیق کے ساتھ اس کی خبر لینے پارا ہاؤس کے نجی اسپتال پہنچا تو اس کا بستر خالی تھا۔ پتا چلا کہ وہ کل شام ہی ڈسچارج ہو گیا ہے۔ ایک سینئر گارڈ نے بتایا کہ انچارج قادر صاحب پارا ہاؤس کے بڑے اسٹور روم کی طرف گئے ہیں۔

میں اور انیق اسٹور روم پہنچے تو وہاں بہت اتھل پتھل نظر آئی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ وسیع و عریض اسٹور ایریا کو چاروں طرف سے پہرے داروں نے گھیر رکھا تھا۔ مختلف کمروں میں زبردست قسم کی تلاشی لی جا رہی تھی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں قاتلوں سے اپنی جان بچانے کے بعد رضوان نے عارضی طور پر چھپا تھا۔

قادر خان بھی یہیں موجود تھا۔ ان چند دنوں میں وہ کافی کمزور ہو گیا تھا مگر اس وقت نسبتاً چوکس نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے باقاعدہ سیلیوٹ کیا۔۔۔۔ اور آنکھوں میں نمی بھر لایا۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا کر اس کا شانہ تھپکا وہ بولا۔ ''خدا کے بعد میری زندگی آپ کی دین ہے۔ پرسوں بڑا ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ زہر سے بھرا ہوا سانپ تھا۔۔۔۔۔ کوئی آدھ چھٹانک زہر میرے اندر ڈال دیا تھا اس نے۔''

''چلو جو بھی ہوا۔ اب تم اپنے پیروں پر کھڑے ہو۔ یہی بڑی بات ہے۔''

وہ ایک بار پھر تہِ دل سے شکریے کے الفاظ ادا کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ ”یہ اسٹور ایریا میں افراتفری کس چیز کی ہے؟“

”تلاشی ہو رہی ہے۔ یہ بھی لیڈی ڈاکٹر کے قتل والا چکر ہے۔ شک ہو رہا ہے کہ اس کا مفرور شوہر کہیں اسی جگہ موجود ہے۔“

”شک کیوں ہو رہا ہے؟“

”میں نے آپ کو اسپتال میں بتایا تھا ناں کہ ایک دو فوٹیج اس طرح کی ملی ہیں۔“

”کہاں ہیں فوٹیج؟“

”شاہی بھائی! آپ ایسا کریں، اپنے کمرے میں چلیں۔ میں وہیں آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔ تفصیل سے بات کریں گے۔“ قادر خان بولا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد قادر خان اہم فوٹیج سمیت میرے پاس موجود تھا۔ سی سی ٹی وی کی یہ فوٹیج اس نے ”کمپیوٹر بوائے“ کی مدد سے اپنے سیل فون پر منتقل کر لی تھی۔ یہ دراصل دو تین کیمروں کی فوٹیج تھی۔ پہلے ایک فوٹیج ڈاکٹر ارم کے اپارٹمنٹ کے بیرونی حصے کی تھی۔ وہ اپنی موت سے قریباً بیس پچیس منٹ پہلے لفٹ سے اتر کر راہداری میں چلی آ رہی تھی۔ گلے میں اسٹیتھ اسکوپ جھول رہا تھا۔ ہاتھوں میں دو بڑے بڑے لفافے تھے جن میں یقیناً اشیائے خورد و نوش تھیں۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ یہ اشیا وہ کبھی استعمال نہیں کر سکے گی۔ وہ سفید کوٹ، سبز شلوار اور جوگر پہنے، مگن انداز میں چلی آ رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ آج اپنے معتوب محبوب کے لیے کس طرح کی اذیت ایجاد کرے گی لیکن آج رات تو اذیت اس کے لیے تھی اور اس اذیت کے ساتھ موت بھی اس کی منتظر تھی۔

فوٹیج ختم ہوئی تو قادر خان بولا۔ ”اس سے آگے کے دو کیمرے وقوعے سے آٹھ دس گھنٹے پہلے ہی بند ہو گئے تھے۔ اب معلوم نہیں کہ ان میں خرابی ہوئی یا انہیں جان بوجھ کر بند کیا گیا۔ جہاں ڈاکٹر قتل ہوئی وہاں کوئی کیمرا موجود نہیں تھا اس لیے کوئی ثبوت بھی نہیں ہے۔ کہیں سے کوئی واضح فنگر پرنٹ بھی نہیں مل سکا، نہ کوئی زبانی شہادت ملی ہے۔“

”دوسری فوٹیج کون سی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

قادر خان نے ایک بار پھر سیل فون آن کیا۔ ”یہ دونوں فوٹیج زیادہ واضح تو نہیں ہیں، مگر پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر کا شوہر اپارٹمنٹ سے نکلنے کے بعد اسٹور روم کی طرف بھاگا تھا۔“

اس نے فوٹیج چلائیں۔ رات کا وقت تھا اور اس جگہ روشنی بھی کافی نہیں تھی۔ بس ایک ہیولا سا نظر آیا جس نے گھبراہٹ میں گارڈینا کی باڑ پھلانگی اور ایک طرف اوجھل ہوا۔ چند لمحے بعد اس کے پیچھے مزید تین افراد نے باڑ پھلانگی۔ ان چاروں افراد میں سے کسی کا حلیہ واضح نہیں ہوا۔ ہاں اتنا ضرور اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں میں سے دو کے پاس کوئی رائفل یا دوسرا ہتھیار موجود ہے۔ دوسری فوٹیج میں بھی کافی فاصلے سے یہی منظر دکھائی دیا۔

قادر خان بولا۔ ”آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ بھاگنے والے اکیلے بندے کا رخ سیدھا اسٹور روم کی طرف ہے...... اور قریباً نوے فیصد یہی لگتا ہے کہ وہ ڈاکٹر کا شوہر ہے۔“

”اور اس کے پیچھے کون تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی یقیناً میرے گارڈز تو نہیں تھے، اگر ایسا ہوتا تو وہ بتاتے۔ ابھی تک کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس نے مفرور کا پیچھا کیا ہے۔“

”اس سے کیا مطلب نکلتا ہے؟“

”یہی کہ ڈاکٹر کا شوہر قتل میں ملوث نہیں۔ وہ قاتلوں سے جان بچا کر بھاگا ہے لیکن دوسرے امکان کو بھی رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ چاروں ہی بھاگ رہے ہوں۔ ڈاکٹر کا شوہر ذرا آگے ہے اس لیے یہی لگ رہا ہے کہ شاید باقی اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔“

میں قادر خان کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے خیالوں کے گھوڑے غلط سمت میں دوڑا رہا ہے۔ وہ جسے اسٹور ایریا میں ڈھونڈ رہا ہے وہ وہاں کہیں نہیں مگر ابھی میں قادر پر اس حد تک اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ”قادر، لیڈی ڈاکٹر کے قتل کی وجہ تمہارے نزدیک کیا ہو سکتی ہے؟“

وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”کسی وقت تو مجھے بھی کوئی گہرا چکر لگتا ہے جی۔ سنا ہے کہ اندر گھر والوں کے درمیان بھی کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے۔ چھوٹے صاحب ابراہیم شادی سے انکار کر رہے ہیں۔ وڈے صاحب کہہ رہے تھے کہ ہر صورت شادی ہو گی اور اپنے وقت پر ہو گی...... مگر اب لگتا ہے شاید کہ یہ دونوں شادیاں ہی کینسل ہو جائیں۔“

قادر خان کی باتوں سے تصدیق ہوئی کہ دیگر لوگوں کی طرح اسے بھی زہر خورانی والے معاملے کا کوئی علم نہیں اور نہ ہی اسے پتا ہے کہ ابراہیم نے شادی سے دراصل انکار کیوں کیا ہے۔

افاور خان کیا ہی تھا کہ ایک اندر آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی سی تھی، بولا۔ ''بہارو پھول برساؤ، آپ کا محبوب آیا ہے......''

میں سمجھ گیا کہ وہ جاناں کی بات کر رہا ہے۔ میں کمرے میں پہنچا تو وہ آفتِ جاں میرا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس نے بال بڑے سلیقے سے جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ ویلوٹ کا سرخ جوڑا اس کے لمبے جسم پر جچ رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کافی دلکش نظر آتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اسپین میں بل فائٹنگ کے کھیل میں سرخ کپڑا بیل کو مشتعل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تم کس کو طیش دلانا چاہتی ہو؟''

وہ میری بات کی گہرائی سمجھ گئی لیکن سنجیدہ رہتے ہوئے بولی۔ ''اگر آپ کو سرخ رنگ اچھا نہیں لگتا تو میں نہیں پہنوں گی۔''

اس کا یہ فقرہ پتا نہیں کیوں مجھے ماضی کے اسی دل دہلا دینے والے واقعے کی طرف لے گیا جس نے میری زندگی کو مکمل طور پر تہ و بالا کر دیا تھا۔ میرا جان سے پیارا دوست مامون اور اس کی خوب صورت اور ذہین دوست انیتا، دونوں ایک جان دو قالب کی طرح تھے۔ ہر وقت ہنستے مسکراتے رہتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں دن رات بس ایک ہی سپنا جگمگایا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی جمنازیم کا سپنا۔ انہوں نے اس کے لیے بہت خون پسینا بہایا تھا اور پھر وہ گھڑی آن پہنچی تھی جب انہیں اپنے خوابوں کی سنہری تعبیر ملنا تھی۔ ایک روز بعد ان کے جم کا افتتاح تھا۔ اسی روز ان دونوں کے درمیان ایک ایسا ہی مکالمہ ہوا تھا۔ انیتا نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی اور بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ مذاق کرتے ہوئے مامون نے کہا تھا۔ ''ڈارلنگ کہیں تم مجھے سانڈ تو نہیں سمجھتی ہو۔ سرخ کپڑا تو سانڈ کو طیش دلانے کے لیے لہرایا جاتا ہے۔''

وہ ہنس ہنس کر دہری ہو گئی تھی پھر بولی تھی۔ ''یہ سرخ کپڑا نہیں...... سرخ جھنڈی ہے تمہارے لیے...... آج کی رات بہت امن سکون سے گزارنی ہوگی...... کل بہت سا کام کرنا ہے۔''

اور وہ سارے کام دھرے کے دھرے رہ گئے تھے۔ صبح سویرے ان ہنستے مسکراتے چہروں کو، ان زندگی سے بھرپور جسموں کو ان کے جمنازیم کے اندر ہی خون میں نہلا دیا گیا تھا۔ انہیں اتنی اذیت سے مارا تھا ڈیرک کے درندہ صفت کارندوں نے کہ جائے واردات کے در و دیوار بھی لہو کے آنسو رو پڑے تھے۔ یہ صدمہ جیسے میرے دل و دماغ میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔ بے شک پاکستان میں میری چچازاد بہن فائزہ اور چچی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بھی ناقابلِ فراموش تھا لیکن اس حوالے سے اتنی تسلی ضرور تھی کہ میں نے ان کے قاتلوں لالہ نظام وغیرہ کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا تھا۔ مامون اور انیتا کے قاتل ابھی زندہ تھے۔ وہ ابھی میری پہنچ سے دور تھے اور بہت زیادہ طاقتور بھی تھے۔ ان کا زندہ ہونا دن رات میرے سینے کو سلگاتا تھا۔

''کہاں کھو گئے؟'' جاناں کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

''کچھ نہیں...... ویسے ہی...... ایک بات یاد آ گئی تھی۔''

اس نے بڑی ادا سے اپنے سرخ دوپٹے کو سینے پر درست کیا اور بولی۔ ''کیسے ہیں آپ؟''

''تم کیسی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

میرے نرم لہجے سے اسے تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ ''بس ہر وقت آپ کی ٹانگیں دباتی رہتی ہوں، اچھی گزر رہی ہے۔''

''یعنی ٹانگیں میڈم لورین کی دباتی ہو اور احسان مجھ پر چڑھا رہی ہو...... خیر چھوڑو...... کس سلسلے میں آئی ہو؟''

''سلسلہ تو ہے کیونکہ سلسلے کے بغیر آئی تو ضرور آپ سے جھاڑ کھائی۔''

''کیا سلسلہ ہے؟'' میں ذرا چونک گیا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''کل رات نو بجے کے آس پاس یہاں کچھ نہ کچھ ہونا ہے۔ میں نے ایک کال سنی ہے۔ شاید پارا ہاؤس کے ہی دو بندے آپس میں بات کر رہے تھے۔''

''کیسے سن لی کال تم نے؟''

''میں نے لینڈ لائن پر میڈم لورین کو فون کیا تھا، لیکن کسی دوسرے فون کی لائن ملی ہوئی تھی، گفتگو کی مدھم باریک آواز آ رہی تھی۔ میں سنتی رہی۔ کنکریٹ والی مشین چلنے کی مدھم آواز بھی فون میں سنائی دے رہی تھی، جس سے ثابت ہوتا تھا کہ کال پارا ہاؤس کے آس پاس سے ہی کی جا رہی ہے۔ ایک بندے نے کہا...... پہلے والا پروگرام ہی ہے۔ پہلے انہیں خود ہی بھگایا جائے گا، پھر کام کر دیا جائے گا......

دوسرے نے کہا۔ اگر وہ سچ مچ بھاگ ہی گئے تو پھر......؟

پہلے نے کہا۔ تیرا اتنے بھی ہوشیار نہیں ہیں وہ اور جو سیکیورٹی ہے اس کا بھی تمہیں پتا ہے۔ آج کل تو چڑیا بھی پر نہیں مار رہی...... بس تم نے نو اور دس بجے کے درمیان بالکل ہوشیار رہنا ہے۔'' جاناں نے ذرا توقف کیا اور اپنے جوڑے کو پھر سے باندھتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے کچھ اور باتیں بھی کیں جو پوری طرح میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا کہ کل نو بجے کے بعد کچھ ہونے والا ہے۔''

''نو بجے سے کیا پتا چلتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دن کے نو بجے ہوں؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے، جو کچھ میں نے سنا ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ جو کچھ ہونا ہے کل رات ہوتا ہے اور نو دس بجے کے درمیان ہونا ہے۔''

جب وہ بات کررہی تھی، میں نے اس کے ترشے ہوئے سرخ ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ نچلے ہونٹ پر دائیں طرف ایک نشان نظر آرہا تھا۔ ننھا سا سرخ دھبا..... جیسے یہاں انجکشن لگا ہو۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ پوچھتا، اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو لڑکیاں، لڑکوں کو لکھا کرتی ہیں۔'' وہ مسکرائی۔

وہ ایک اہم اطلاع لے کر آئی تھی اور میں اسے بدمزہ کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ اس وقت میرا موڈ ہرگز رومانوی نہیں تھا۔ وہ سچ مچ جھاڑ کھا سکتی تھی۔

میں کاغذ کی تہ کھولنے لگا۔ اس نے فوراً میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''پلیز شاہ زیب! آپ ناراض نہ ہونا۔ میں جانتی ہوں، میرے جیسی لڑکی آپ کے لائق نہیں ہوسکتیں..... آپ جو تھوڑا بہت وقت مجھے دیتے ہیں وہ بھی آپ کی مہربانی ہے لیکن میں کیا کروں، اپنی سوچوں پر میرا اختیار نہیں۔''

''یہ اقوالِ زریں تو تم پہلے بھی کئی بار دہرا چکی ہو۔'' میں ہولے سے مسکرایا۔

''چلو..... ایک بار اور سہی۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

میں نے کاغذ کھولا۔ یہ خط نہیں تھا۔ بس شاعری تھی۔ ایک آزاد نظم تھی جو غالباً اس نے اپنے خون سے لکھی تھی۔ مطلب کچھ اس طرح سے تھا۔

میں اُسے کیسے بھلادوں
وہ تو میری رگ رگ میں بس چکا ہے
میں برف کے اندھیرے گھر میں تھی
اور پل پل ختم ہورہی تھی میری زندگی
وہ سورج بن کر آیا
تیرگی چھٹ گئی
برف بھی پگھل گئی
میں پھر سے جی اٹھی
اب یہ زندگی اس کی امانت ہے
سوچتی ہوں وہ محبوب ہے یا دیوتا
سوچتی ہوں یہ محبت ہے یا عبادت ہے
انگنائے

نظم پڑھ کر میں نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ ''دیکھو جاناں! مجھے اتنے اونچے بانس پر نہ چڑھاؤ کہ گروں تو ہڈی پسلی ایک ہوجائے۔ میں جتنے جوگا ہوں، مجھے اتنا ہی رہنے دو۔''

''آپ کو شاید خود بھی پتا نہیں کہ آپ کیا ہیں۔ میرے بس میں ہو تو آپ کے قدموں میں سر رکھ کر جان دینے کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں۔''

''اچھا اب زیادہ قربانہ جان بننے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ تم نے بتایا ہے وہ اگر واقعی درست ہے تو کافی اہم ہے۔ مجھے سوچنے اور سجاول سے مشورہ کرنے کا موقع عنایت کرو۔''

وہ مجھے شکوہ کناں نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے اٹھنے اور کھڑے ہونے کا اپنا ایک انداز تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی جسمانی خوب صورتی بیٹھنے سے چھپ جاتی ہے اور کھڑے ہونے سے نمایاں ہوتی ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز مجھے تاجور کی یاد دلا دیتا تھا۔ وہ بھی اس حوالے سے بے مثال تھی۔ بیٹھتی تھی تو اپنے اندر سمٹ سی جاتی تھی لیکن جب اٹھ کر ابھرتی تھی، اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑی ہوتی تھی تو پنجاب کے سارے لہلہاتے اور جھومتے درختوں کی دلکشی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ اس وقت کہاں تھی؟ کیا کررہی تھی؟ اس کے پاس میرا نمبر تھا۔ وہ چاہتی تو اپنی انگلی کی ایک مختصر حرکت کے ساتھ مجھ سے رابطہ کرسکتی تھی لیکن اس نے نہیں کیا تھا۔ جب کبھی فاصلہ ختم کرنا ہی نہ چاہے تو پھر ایک قدم کا فاصلہ بھی ہزاروں لاکھوں کوس میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہی رویہ تھا جو تین چار سال پہلے بھی تاجور نے مجھ سے اختیار کیا تھا۔ لاہور میں ہونے والی وہ ادھوری سی لیکن ناقابلِ فراموش ملاقاتوں کے بعد اس نے مجھے ایک موبائل فون نمبر دیا تھا اور پھر اس نمبر پر میں ہزار بار کوشش کے باوجود رابطہ نہیں کرپایا تھا۔ چلو اس وقت تو اور بات تھی، وہ ادھوری سی ملاقاتیں تھیں لیکن اب تو ہم نے ایک دوسرے کو چھوا تھا، ایک دوسرے کے قریب آئے تھے، بہت سا وقت ساتھ گزارا تھا۔ کیا اس کے باوجود ایک بار پھر وہ مکمل طور پر اجنبی بن چکی تھی۔ جب میں اس طرح سوچتا تھا تو مجھے تاجور کے کورے پن اور سخت دلی پر حیرت ہونے لگتی تھی اور کبھی کبھی غصہ بھی آتا تھا۔

''آپ بات کرتے کرتے کہاں کھو جاتے ہیں؟'' جاناں نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

''بس تمہارے انکشاف کے بارے میں ہی سوچ رہا

ہوں ۔ کیا کل ، ابھی کوئی نیا ہنگامہ ہونے والا ہے؟" میں نے جھوٹ بولا ۔

اس نے ادا سے کہا۔ "میں سمجھی، آپ میری اس نظم کے بارے میں سوچ رہے ہیں...... دیکھیں اپنے پیاروں کو خون کے ساتھ تو سارے ہی تحریریں بھیجتے ہیں لیکن میں نے یہ تحریر خاص قسم کے خون سے لکھی ہے۔"

"خاص قسم کا خون؟"

اس نے چنچل انداز میں اپنی انگلی سے اپنے نچلے ہونٹ کی طرف اشارہ کیا، جہاں ایک ننھا سا سرخ نشان نظر آرہا تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی، اس نے اپنے ہونٹ میں سوئی وغیرہ چبھو کر خون نکالا تھا اور پھر یہ نظم لکھی تھی۔ وہ موسیقی اور شاعری سے لگاؤ رکھنے والی عجب رومان پسند لڑکی تھی۔ انسپکٹر قیصر، پاشا اور لالہ دریام جیسے نجانے کتنے بدمست مردوں نے اسے روندا تھا لیکن اس کے اندر کی شعریت اور رومانیت کو کچلنے میں ناکام رہے تھے۔

وہ چلی گئی تو انیق آدھمکا۔ میں نے اسے اپنے اور جاناں کے درمیان ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔ انیق کا خیال بھی یہی تھا کہ ہمیں جاناں کی اس اطلاع کو ایزی نہیں لینا چاہیے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں سر کھجا کر بولا۔ "مجھے تو ایک اور خطرہ بھی محسوس ہورہا ہے شاہی بھائی۔"

"وہ کیا؟"

"کہیں...... خدانخواستہ...... میرا مطلب ہے کہ کہیں...... یہ گفتگو ہمارے بارے میں ہی نہ ہو۔"

یہ شک چند لمحوں کے لیے میرے ذہن میں بھی آیا تھا لیکن میں نے رد کردیا تھا۔ اب یہی بات انیق بھی کہہ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بات تو اب طے ہے کہ یہ آقا جان لومڑ سے زیادہ عیار اور بھیڑیے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ہم سے بہت خار بھی کھائے ہوئے ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی خطرناک ڈراما رچا کر ہمیں راستے سے ہٹانا چاہتا ہو بلکہ......" انیق کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔

"بریک کیوں لگا لیے ہیں جو منہ سے پھوٹنا چاہتے ہو پھوٹو۔"

"شاہی بھائی، مجھے تو آپ کے امریش پوری سے بھی خطرہ محسوس ہورہا ہے۔ یہ بڑی تیزی سے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا رہا ہے۔ آقا جان سے بھی اس کی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ڈاکو ابنِ ڈاکو ہمارا پتا کاٹنے کی فکر میں ہو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے یقین ہوتا جارہا ہے کہ تم نے ایک نہ ایک دن سجاول کے غصے کی زد میں آکر ضائع ہونا ہے۔ تمہارا ہر شک گھوم پھر کر سجاول کی طرف چلا جاتا ہے......"

"ٹھیک جاتا ہے شاہی بھائی! آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے "ہتھ جوڑی" میں جان بوجھ کر اپنی ہار تسلیم کرلی اور یوں سجاول کو اپنا احسان مند بنالیا، اب وہ آپ پر اپنا ہاتھ ہولا رکھے گا۔ یہ بات بھول جائیں۔ درندے پر جتنی مرضی محبت نچھاور کریں وہ درندہ ہی رہتا ہے۔"

"لیکن درندے کو ایک دائرے میں تو رکھا جاسکتا ہے ناں۔ سرکس میں شیر ہمارے بچوں کو خوش کرتا ہے یا نہیں۔"

"مگر جناب! یہ انسان سے درندہ بنا ہوا ہے۔ ایسے درندوں کی خطرناکی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ہمارے حشمت راہی صاحب نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے۔

چیتا تو چیتے کو کھاتا نہیں، نہ شیر ہی شیر کو کھاتے ہیں
لیکن بندے ہی درندے بن کر بندوں کے دروازے کھڑکھاتے ہیں۔"

میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ مزید شعر سنانے سے باز رہا اور سنجیدہ صورت بنا کر بولا۔ "ویسے اگلے چند گھنٹے میں ہمیں چوکس رہنا چاہیے۔ آقا جان اس بات پر بہت بھڑکا ہوا ہے کہ چھوٹے صاحب ابراہیم نے گارڈز سے جھڑپ ہونے کے بعد آپ کی حمایت کی اور آپ کو اپنے ساتھ رہائشی حصے میں لے گئے۔ اسے یہ بھی شک ہے کہ ہم دونوں اور خاص طور سے آپ، یہاں کے معاملات کی ٹوہ لگا رہے ہیں......"

ہم نے اس معاملے پر کافی دیر بات کی...... اگلا روز بھی تناؤ میں گزرا۔ میں نے سجاول کو بھی ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ جوں جوں رات کے نو بجے کا وقت نزدیک آرہا تھا ہمارے تجسس میں اضافہ ہورہا تھا۔ پارا ہاؤس کی صورتِ حال کے پیشِ نظر حلیمی نے ہمیں مسلح کر رکھا تھا اور ہمارے ہتھیار ہمارے پاس موجود تھے۔

بہرحال جب رات کے قریباً ساڑھے نو بجے تو ہمارے سارے اندیشے غلط ثابت ہوگئے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ پارا ہاؤس میں کچھ ہوا ہی نہیں۔ پارا ہاؤس میں جاناں کی اطلاع کے مطابق بہت کچھ ہوا، لیکن اس کا تعلق براہِ راست ہم سے نہیں تھا۔ میں، انیق اور سجاول اکٹھے ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ اچانک تہ خانوں کی طرف شور سنائی دیا۔ "بھاگو...... پکڑو...... " کی آوازیں آئیں۔

چار دیواری کی بلندی پر موجود سرچ لائٹس نے اپنا

رخ تبدیل کیا اور احاطے کے مرکزی حصے کو روشن کرنے لگیں۔ میں نے ایک بپھرے ہوئے شخص کو دیکھا، اس کے ہاتھ میں جدید آٹومیٹک رائفل تھی اور وہ اپنے عقب میں فائرنگ کرتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہم نے اسے ایک لحظے میں پہچان لیا۔ یہ ثاقب تھا۔ انہی لوگوں کا سرغنہ جنہوں نے چند روز پہلے پارا ہاؤس کو خون میں نہلایا تھا اور ابراہیم کو یرغمال بنایا تھا۔ بعدازاں ثاقب اور اس کے ایک ساتھی کو پکڑ لیا گیا تھا۔ ہمارا خیال یہی تھا کہ ان دونوں مجرموں کو پولیس کے حوالے نہیں کیا گیا اور آج یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔

''وہ دیکھو، اس کا دوسرا ساتھی بھی ہے۔'' سجاول نے چلّا کر ایک طرف اشارہ کیا۔

بے شک وہ ثاقب کا غیر ملکی ساتھی ہی تھا۔ وہ بھی مسلح تھا اور اندھا دھند فائر کرتا ہوا مرکزی حصے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اسی اثنا میں ثاقب نے ایک بڑے ستون کے پیچھے پوزیشن لے لی تھی اور تابڑ توڑ گولیاں چلا رہا تھا۔ میں نے ایک گارڈ کو گولی کھا کر کالے گلابوں کے ایک تختے میں گرتے ہوئے دیکھا۔ پھر یکایک پتا نہیں کیا ہوا احاطے کی شمالی جانب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی کم شدت کے پانچ چھ دھماکے ہوئے اور ہر طرف شعلے بکھرتے نظر آئے۔ دراصل یہ کوئی آوارہ گولی تھی جو پورچ میں کھڑی ایک جیپ کے فیول ٹینک میں جا لگی تھی۔ ٹینک پھٹ گیا۔ ساتھ ہی قطار میں چار پانچ ہیوی موٹر بائیکس کھڑی تھیں۔ یہ وہی بائیکس تھیں جو عزت مآب وڈے صاحب کے شاندار کانوائے کے آگے پیچھے چلتی تھیں۔ دھماکے سے انہوں نے بھی آگ پکڑ لی۔ میں نے دو موٹر سائیکلز کو آگ کے گولے کی صورت ہوا میں بلند ہوتے اور رہائشی حصے کے بالائی لان میں گرتے دیکھا۔ یہ ایک ہولناک منظر تھا۔ بالکل ہالی ووڈ کی کسی ایکشن فلم جیسا۔ ان دھماکوں نے ہر طرف تھرتھلی سی مچا دی۔ رہائشی حصے کے ایک پورشن میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سیاہ گاڑھا دھواں تیزی سے ہر طرف پھیل رہا تھا۔

پورے پارا ہاؤس کے الارم ایک بار پھر بلند آواز سے چلّانے لگے۔ اندھا دھند گولیاں ابھی چل رہی تھیں۔ میں نے سجاول کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ''سجاول! اگر واقعی کوئی ڈراما ہوا ہے تو اس ڈرامے سے ہم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ہم اندر ڈارک روم میں پھنسے ہوئے رضوان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

بات سجاول کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ ''اگر تم مناسب سمجھو تو میں اور انیق جاتے ہیں۔ تم یہاں کی صورت حال دیکھو۔''

''لیکن کوئی کام خراب نہ کر بیٹھنا۔ آقا جان تمہارے خلاف پہلے ہی بھرا بیٹھا ہے۔''

''تم بے فکر رہو۔''

میں اور انیق اپنی رائفلیں سنبھالے ہوئے تیزی سے باہر نکلے۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی۔ دھواں ہر شے کو چھپا رہا تھا۔ کوئی پچاس قدم آگے ہمیں برآمدے میں ثاقب کے ساتھی کی لاش پڑی نظر آئی۔ پورا ایک برسٹ اس کی کمر کو چھلنی کر گیا تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ ثاقب ابھی زندہ ہے اور زوردار جوابی فائرنگ کر رہا ہے۔ میں اور انیق اندھا دھند دوڑتے رہائشی حصے میں گھس گئے۔ پورا انتظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ دو چار گارڈز نے ہمیں دیکھا بھی لیکن کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتے تھے ہمیں وڈے صاحب کا اعتماد حاصل ہے اور ہم اس سے پہلے بھی ہنگامی صورت حال میں پارا ہاؤس کا دفاع کر چکے ہیں۔ ہمیں ایک جگہ اندریا لوسی کی جھلک بھی نظر آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی تھی اور جست لگا کر ایک کھڑکی سے باہر کود رہی تھی۔ چند گولیاں آئیں اور ایک اندرونی کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر گئیں۔ کوئی لڑکی کمرے کے ایک گوشے میں سمٹی بری طرح چلا رہی تھی۔ کوئی ملازمہ تھی جس کے بال بڑے بے ڈھنگے طریقے سے تراشے گئے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی لڑکی ربنہ تھی جس پر بیگم کے کپڑوں کو آگ لگانے کا الزام ثابت ہوا تھا اور اسے بید مارنے کے علاوہ واش رومز صاف کرنے کی سزا بھی دی گئی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا ''وائپر'' نظر آ رہا تھا۔

''نیچے لیٹ جاؤ۔'' میں اسے دیکھ کر چلّایا۔

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور اچھا ہی کیا۔ ایک اور برسٹ آیا اور کئی جگہ سے دیوار کا پلاستر اکھاڑ گیا۔ چند فی میل گارڈز دھوئیں کے سبب بری طرح کھانستی اور ابکائیاں لیتی ہوئی کوریڈور میں بھاگی چلی جا رہی تھیں۔ ''آپ کے پاس ٹارچ ہے؟'' انیق نے بلند آواز میں مجھ سے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا، وہ بولا۔ ''آن کر لیں۔''

میں نے ٹارچ آن کر لی۔ انیق نے اپنی چھوٹی نال کی چینی رائفل سے دو فائر کیے۔ یکایک رہائشی پورشن کا بہت بڑا حصہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ جیسا کہ بعدازاں معلوم ہوا انیق نے بجلی کی ایک ''ڈی پی'' کو نشانہ بنایا تھا۔ یہ تاریکی ہمارے کام کے لیے بہت معاون تھی۔ ہم ٹارچ کی روشنی

میں رہائشی پورشن کے بناس الخاص حصے کی طرف بڑھتے۔ چند سیکنڈ کے اندر ہم عزت مآب وڈے صاحب کی قیام گاہ کے سامنے تھے۔ ہر طرف آہ و بکا کی اور چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میری ٹارچ کا روشن دائرہ ایک چونکا دینے والے منظر پر پڑا۔ چند ہی کی نی میل گارڈز نے بے ہوش سنبل کو ہاتھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور اسے بیرونی کوریڈور کی طرف لے جارہی تھیں۔ سنبل یقینا بڑھتے ہوئے دھوئیں اور گھبراہٹ سے بے ہوش ہوئی تھی۔ فی میل گارڈز خود بھی بری طرح کھانس رہی تھیں۔ آگ اس حصے تک نہیں پہنچی تھی مگر دھواں اور تاریکی وحشت پھیلا رہے تھے۔ ہم دونوں نے اپنے چہرے کپڑوں میں لپیٹے اور سیدھے وڈے صاحب کی عظیم الشان آرام گاہ میں گھس گئے۔ یہاں بھی تاریکی تھی لیکن ٹارچ اپنا کام کررہی تھی۔ سنبل نے ایک دن پہلے ہمیں ڈارک روم کا محل وقوع اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ دھواں بڑھ رہا تھا۔ یہاں رکنا خطرناک تھا لیکن رضوان کو بچانا ہر لحاظ سے ضروری تھا۔ اس نے ان تالکوں کو دیکھا اور سنا تھا جنھوں نے لیڈی ڈاکٹر ارم کی جان لی۔ وہ آقا جان کے خلاف کوئی ایسا ثبوت فراہم کرسکتا تھا جس سے وڈے صاحب اور دیگر اہلِ خانہ کی آنکھیں کھل جاتیں اور وہ اس خطرناک شخص کا اصل کردار جاننے اور ماننے پر مجبور ہو جاتے اور اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ یہ ایک دوست کی جان بچانے کا معاملہ تھا۔ وہ اس ڈارک روم میں پھنسا تو پہلے سے ہی تھا۔ اب یہ تاکی دھواں فوری طور پر اس کی زندگی کو فل اسٹاپ لگا سکتا تھا۔

ٹارچ کا روشن دائرہ سنبل کے ایک سالیڈنگ دروازے پر پڑا۔ یہی ڈارک روم تھا۔ چابی ڈھونڈنے کا وقت کہاں تھا۔ میں نے آہنی قفل پر دو فائر کیے۔ تیسرے فائر نے دروازے کو آن لاک کردیا۔ میں نے ٹارچ گھمائی رضوان کہیں نظر نہیں آیا۔

''رضوان کہاں ہو تم؟ میں شاہ زیب ہوں۔ سامنے آؤ۔'' میں پکارا۔

وہ ڈرا سہما ہوا سا ایک سیاہ الماری کی اوٹ سے نکلا۔ یہاں در و دیوار سمیت ہر شے سیاہ تھی۔ یہاں وڈا صاب استراحت فرماتا تھا، اور آنکھیں بند کرکے یقینا ارب پتی سے کھرب پتی ہونے کے پروگرام سوچتا ہوگا۔ آہ...... زندگی کتنی مختصر اور پروگرام کتنے طویل ہوتے ہیں۔

میں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا اور ٹارچ کا روشن دائرہ اپنے چہرے پر پھینکا۔ ''شاہ زیب بھائی! آپ...... یہاں؟'' رضوان ہکلایا۔

''چلو نکلو۔'' میں نے اس کا بازو تھاما۔

''یہ کیا ہنگامہ ہے جناب...... اور یہ دھواں؟'' وہ ہکا بکا تھا۔

''یہ سب باتیں بعد میں، پہلے یہاں سے نکلنا ہے۔''

برآمدوں کی طرف شعلوں کی سرخی دیکھ کر وہ مزید خوف زدہ ہوگیا۔ ''وہ...... وہ لڑکی...... سنبل...... کہاں ہے؟''

''وہ نکل گئی ہے یار، تو اپنی فکر کر۔'' میں نے اسے کھینچا۔ انیق نے ایک بھیگا ہوا تولیا اس کے چہرے کے گرد لپیٹ دیا۔ ہم کوریڈور کی طرف لپکے۔ زیرِ تعمیر عمارت کی طرف سے بھی بیسیوں افراد آگ بجھانے کے لیے پہنچ رہے تھے۔ آگ کو بس چند کمروں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ مگر دھواں غضب کا تھا۔ یہ دھواں ہماری جان نے سکتا تھا۔ مجھے خود سے زیادہ رضوان کی فکر تھی۔ ہم دونوں نے رضوان کو اپنے بازوؤں کے حصار میں لیا ہوا تھا اور جھک کر بھاگ رہے تھے۔ ہم نے اپنے سانس روکے ہوئے تھے لیکن وہ بری طرح کھانس رہا تھا۔ وہ ابھی تک اسپیشل فورس کی اس یونیفارم میں تھا جس میں بھاگ کر وڈے صاحب کے پُرشکوہ بیڈروم تک پہنچا تھا۔ کوئی دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ اسپیشل فورس کے کسی گارڈ کی جان بچا رہے ہیں۔

احاطے میں پہنچے تو کچھ فاصلے پر آقا جان نظر آیا۔ وہ غصے میں دہکا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے جیسے جھاگ چھوٹ رہے تھے۔ چہرہ فرطِ غضب سے بگڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بے جان جسم کو ٹھوکریں مار رہا تھا۔ حملہ آوروں کے سرغنہ ناقب کی لاش تھی۔ لاش کو ٹھوکریں مارتا ہوا وہ واقعی ایک جنون آشام درندہ نظر آتا تھا اور یہی وہ شخص تھا جو پارا باؤس والوں کے دل و دماغ کو اپنے شیطانی حصار میں جکڑے ہوئے تھا۔ ان سے اپنی مرضی کے فیصلے کرا رہا تھا۔ اس کی جڑیں اس خاندان میں اتنی گہری کیوں تھیں؟ یہ بڑا اہم سوال تھا...... وہ یہاں جس کو چاہتا تھا بچا لیتا تھا، جس کو چاہتا تھا مار دیتا تھا۔ یقینا سرغنہ ناقب اور اس کے ساتھی کو موت کی کڑی سزا بھی اسی نے دی تھی۔ میں نے گہرے دھوئیں کی اوٹ سے اسے دیکھا اور میرے دل نے گواہی دی کہ اس بندے کو زیر کرنا آسان نہیں ہوگا۔

سعید شرارت بھرے انداز میں گڑیا کے پاس آکر رک گیا۔

گڑیا نے ناگوار نگاہوں سے ڈیڈی کی طرف دیکھا اور زور سے چلائی۔ ”شیم شیم ڈیڈی، شیم شیم۔“

”کیوں بھئی۔“ سعید نے مسکرا کر پوچھا۔ ”ڈیڈی کیوں شیم شیم، ڈیڈی سے کیا غلطی ہوگئی؟“

”آپ نے ٹائی کی ناٹ پھر غلط لگائی ہے۔“ گڑیا نے کہا۔

ایک نوجوان کی اثر انگیز سرگزشت جو آزاد ہوتے ہوئے بھی قید تھا۔

بعض حقائق اور سچائیاں سامنے ہوتے ہوئے بھی جھوٹ ہی گردانے جاتے ہیں کیونکہ ان کو ثابت نہیں کیا جا سکتا... آتشِ انتقام کو سرد کرنے کی کوشش میں جرائم اس کے پیروں کی زنجیر بنتے چلے گئے... نادیدہ منزلیں... انجانے راستے اور غیر متوقع حادثات اس کی تقدیر بن گئے...

بڑا آدمی

منظر امام

"تو کیا ہوا میری بیٹی ٹھیک کر دے گی۔"

نازیہ دوسرے کمرے سے مسکراتے ہوئے آ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ "دونوں باپ بیٹی آج پھر جھگڑا کر رہے ہیں۔"

"نہیں ممی، میں جھگڑا نہیں کر رہی۔" گڑیا نے احتجاج کیا۔ "میں تو ناٹ کی بات کر رہی ہوں۔"

سعید، گڑیا کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ گڑیا نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اس کی ناٹ درست کر دی۔ سعید نے مسکراتے ہوئے گڑیا کی پیشانی چوم لی۔

یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔ چھوٹا لیکن خوب صورت سا گھر اور ایک دوسرے سے محبت کرنے والے لوگ۔ سعید، اس کی بیوی نازیہ اور بیٹی گڑیا۔

بس اس گھر میں یہی تینوں تھے اور ڈھیر سی خوشیاں تھیں۔

سعید ایک بزنس مین تھا۔ اچھا خاصا کامیاب۔ نازیہ ڈاکٹر تھی۔ بچوں کے ایک اسپتال کی ڈاکٹر۔ جہاں خون کے مرض میں مبتلا بچوں کا علاج کیا جاتا اور ان دونوں کی صرف ایک ہی اولاد تھی، گڑیا۔

پانچ چھ برس کی ایک خوب صورت بچی۔ بھولی بھالی لیکن ذہین۔ جس نے پیدا ہوتے ہی اپنے بے پناہ پیار کرنے والوں کو اپنے آس پاس دیکھا تھا۔

ملازمہ نے ان تینوں کے لیے ناشتا لگا دیا۔

"بھئی جلدی سے ناشتا کر لو۔" سعید نے گڑیا سے کہا۔ "آج مجھے کچھ دیر ہو گئی ہے۔"

"آپ اتنا تکلف کیوں کرتے ہیں۔" نازیہ سعید سے بولی۔ "اسکول چند ہی قدم کے فاصلے پر ہے۔ گڑیا اکیلی بھی جا سکتی ہے۔ میں گیٹ پر کھڑی ہو کر اسے دیکھ بھی سکتی ہوں۔ پھر بھی آپ نے یہ عادت بنا لی ہے۔"

"تم نہیں جانتیں نازیہ بیگم کہ اس طرح کتنا مزہ آتا ہے۔" سعید نے کہا۔ "راستے میں ہم دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کو پہیلیاں سناتے ہوئے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم دونوں کا جھگڑا بھی ہو جاتا ہے۔"

نازیہ کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ باپ بیٹی کا یہ پیار اس کے لیے بہت طمانیت کا سبب بنا کرتا۔ اسے کبھی کبھی یہ خوف بھی ہوتا کہ کہیں ان کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ "چلیں جائیں، جیسے آپ دونوں کی مرضی۔"

فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ملازمہ نے ریسیور اٹھا کر کچھ سنا پھر نازیہ کی طرف دیکھا۔ "باجی آپ کا فون ہے۔"

نازیہ نے فون پر کچھ دیر باتیں کیں پھر ناشتے کی میز پر آ گئی۔ وہ کچھ خاموش دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے نا؟" سعید نے پوچھا۔ "تم کچھ پریشان سی ہو گئی ہو۔"

"میں آپ کو گل زادہ نام کے بچے کے بارے میں بتا چکی ہوں۔" نازیہ نے کہا۔ "وہ میرا ہی پیشنٹ ہے۔ اس بے چارے کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں تو یہ کہتا ہوں کہ تم اس اسپتال سے اپنا ٹرانسفر کروالو۔ کہیں بھی کسی بھی جگہ۔ کیونکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بچوں کے دکھ تم سے دیکھے نہیں جاتے۔ تم خود پریشان ہو جاتی ہو۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" نازیہ نے ایک گہری سانس لی۔ "واقعی میں یہ نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے باوجود میں ان کے درمیان ہی رہنا چاہتی ہوں۔ انہیں زندگی کی طرف لانے کی کوششیں کر سکتی ہوں۔ کئی ایسے بچے ہیں جو مجھ سے اتنے مانوس ہو گئے ہیں کہ میں اگر کسی دن نہ جاؤں تو باقاعدہ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

"اور جب تم چھٹی والے دن بھی چلی جاتی ہو تو پھر ہم دونوں ناراض ہو جاتے ہیں۔" سعید نے کہا۔

نازیہ اس بات پر مسکرا دی تھی۔ ایک پیار کرنے والی بیوی کی طاقت ور مسکراہٹ۔

☆☆☆

پولیس والوں کی وہ میٹنگ ہزار چہرے والے کے بارے میں ہو رہی تھی۔

ہزار چہرہ۔ ایک ایسا مجرم جو آج تک پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ میک اپ کا ماہر ہے۔ اپنی صورت بدل لیتا ہے۔ اسی لیے اسے ہزار چہرے کا نام دیا گیا تھا۔

وہ عام طور پر فراڈ یا دھوکا دہی کی بڑی بڑی وارداتوں میں ملوث پایا گیا تھا۔ بہت سے کاروباری اس کے ہاتھوں برباد ہو چکے تھے۔ وہ چھلاوے کی طرح نمودار ہوتا اور اپنی کارروائی کر کے غائب ہو جاتا۔

"سوال یہ ہے کہ ایسے آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے ہم کیا حکمتِ عملی اختیار کر سکتے ہیں۔" ایک پولیس آفیسر نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا۔ "کیونکہ ہم ابھی تک اس کی شناخت سے محروم ہیں۔ ہم نہیں جانتے وہ کیسا ہے، اس کا قد کتنا ہے، رنگ کیا ہے، وغیرہ، وغیرہ۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ ہزار چہرے والے کی شہرت سے فائدہ اٹھا کر دوسرے بھی وارداتیں کر رہے ہوں۔"

کسی نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔'' پولیس آفیسر نے جواب دیا۔ ''کیونکہ اس کی وارداتیں عام طور پر ایک ہی انداز کی ہوتی ہیں۔ تشدد سے پاک۔ اس نے کسی کو جسمانی نقصان نہیں پہنچایا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ صرف ذہن سے کام لیتا ہے اور ہزار چہرہ ہمارے شہر میں صرف ایک ہی ہے۔''

''میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے جناب۔'' سب انسپکٹر تنویر نے کہا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا اور بہت پُرجوش۔ ہزار چہرہ کی کئی وارداتیں اس کے علاقے میں بھی ہو چکی تھیں۔

''سر! وہ شخص باہر سے آنے والوں کو بھی لوٹ لیا کرتا ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو کاروباری معاہدوں کے لیے آتے ہیں یا کاروبار کے لیے آتے ہیں اور جن کا قیام بڑے بڑے ہوٹلوں میں ہوتا ہے۔'' تنویر نے بتایا۔

''ہاں ایسا تو ہوتا ہے۔'' آفیسر نے کہا۔

''اس طرح کی کئی وارداتیں ایسے ہوٹلوں میں ہو چکی ہیں۔'' تنویر نے بتایا۔

''تجویز کیا ہے آپ کے ذہن میں؟''

''بہت آسان تجویز ہے سر، کیا ہم کسی بزنس مین کو پلانٹ نہیں کر سکتے۔'' تنویر نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''مطلب یہ ہے سر کہ کیا ہم کسی مصنوعی تاجر کو ایسے ہوٹل میں ٹھہرا کر اس آدمی کے گرد جال نہیں بچھا سکتے؟''

سب اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ یہ ایک اچھی ترکیب تھی۔ اس طرح ہزار چہرے والا ان کے بچھائے ہوئے جال میں آ سکتا تھا لیکن ایک الجھن یہ بھی تھی کہ اس ہزار چہرے والے کو یہ کیسے معلوم ہو پاتا کہ کوئی بزنس مین فلاں ہوٹل میں آ کر ٹھہرا ہے۔

اس کا حل بھی تنویر ہی نے پیش کیا۔ ''سر! میں چونکہ اس موضوع پر سوچتا رہا ہوں۔ اسی لیے پورا ہوم ورک کر کے آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرے ذہن میں یہ ہے کہ ہم اس نام نہاد تاجر سے چھوٹی سی پریس کانفرنس کروا دیں جس میں وہ بتائے کہ وہ کسی فیکٹری کے قیام کا جائزہ لینے کسی غیر ملک سے آیا ہے۔ اخبارات اور چینلز پر اس کی کوریج ہو گی۔ اس طرح ہزار چہرے والے کو بھی پتا چل جائے گا۔''

''ہاں، یہ اچھی ترکیب ہے لیکن ایسا کون آدمی ہو سکتا ہے؟''

''سر! یا تو کوئی عام سا آدمی ہو جو ہمارے لیے کام کرنا پسند کرے یا پھر میں خود اس کام کو انجام دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم؟'' سب چونک گئے تھے۔ ''تم کس طرح یہ سب کر سکتے ہو، تم ایک پولیس آفیسر ہو۔ لوگ تمہیں جانتے ہیں۔''

''سر! میں یہ کام اپنے بڑے بھائی کی مدد سے کر سکتا ہوں۔'' تنویر نے بتایا۔

''تمہارے بڑے بھائی اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

''وہ کسی زمانے میں تھیٹر سے وابستہ رہے ہیں۔'' تنویر نے بتایا۔ ''انہوں نے انگلینڈ جا کر میک اپ کا ہنر سیکھا ہے۔ ان کا شعبہ ہی میک اپ ہے۔ فلم سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ آج کل ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ وہ میرے چہرے کو اس طرح تبدیل کر سکتے ہیں کہ کوئی شناخت نہیں کر سکتا۔''

''دلچسپ، تو چلو یہ ٹاسک تمہارے ہی حوالے کر دیا جاتا ہے۔''

''بہت بہت شکریہ۔'' تنویر نے کھڑے ہو کر سب کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے لیے یہ ایک بہت بڑی بات تھی۔ پولیس میں آنے کے بعد ہی اس کی یہ خواہش رہی تھی کہ وہ ایسے کارنامے انجام دے جو اس محکمے میں اس کی ساکھ بنا دیں۔ عام قسم کی بھاگ دوڑ اور مجرموں کی پکڑ دھکڑ تو ہوتی ہی رہتی تھی۔ مزہ تو یہ تھا کہ کوئی ایسا کیس ملے جس میں ذہنی مشقت بھی شامل ہو۔

ہزار چہرے والے کا کیس ایسا ہی ثابت ہونے والا تھا۔ اگر وہ اس شاطر مجرم کو گرفتار کر لینے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی دھاک بندھ جاتی۔

اس نے اپنے بڑے بھائی توقیر کے بارے میں غلط بیانی نہیں کی تھی۔ وہ واقعی اپنے فن کا ماہر تھا۔ کسی زمانے میں اس کی اتنی ڈیمانڈ تھی کہ اس کے پاس ایک لمحے کی فرصت نہیں ہوا کرتی۔ لیکن اب وہ ان سب سے کنارہ کش ہو کر تنہائی کی زندگی گزار رہا تھا۔

تنویر نے گھر پہنچ کر جب توقیر کو آج کی بات بتائی تو وہ مسکرا دیا۔ ''واہ، پولیس میں آنے کے بعد تم بہت سمجھ دار ہو گئے ہو۔''

''ہونا پڑتا ہے توقیر بھائی۔ آپ خود سوچیں، اس آدمی کو پکڑنے کا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟''

''اچھا تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

مجھے ایسا آدمی بنا دیں جو بہت باوقار دکھائی دے۔ کنپٹیوں پر سفید بال، بارعب سا بندہ۔"

تو قیر ہنس پڑا۔ اس نے تنویر کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ٹھیک ہے، ہو جائے گا۔"

☆☆☆

اسپتال میں بہت دشواریاں تھیں۔

یہ ایک ایسا اسپتال تھا جو ایک فلاحی تنظیم نے قائم کیا تھا۔ اس اسپتال میں ایسے بچوں کا علاج کیا جاتا جو خون کے سرطان میں مبتلا ہوں۔

یہ ایک تکلیف دہ مرض تھا اور اس کے علاج کے لیے دوائیں بھی بہت مہنگی ہوا کرتی تھیں۔ اس لیے اس اسپتال کو ہر وقت ایسے لوگوں کی ضرورت رہا کرتی جو اس کی مدد کر سکیں۔

ڈاکٹر نازیہ اسی اسپتال میں تھی۔ وہ مختلف وارڈز کے چکر لگا کر اپنے کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

کمرے میں موجود ایک نرس شہلا نے ریسیور اٹھایا۔ کچھ دیر دوسری طرف کی باتیں سننے کے بعد اس نے نازیہ کی طرف دیکھا۔ "میڈم! آپ خود ہی بات کر لیں۔ نہ جانے کون ہے، کیا چاہتا ہے۔"

نازیہ نے ریسیور لے لیا تھا۔ "ہیلو۔"

"میں آپ کو تو نہیں جانتا، لیکن اتنا ضرور علم ہے کہ آپ کا تعلق اسی اسپتال سے ہوگا۔"

"جی ہاں، میں ڈاکٹر ہوں یہاں کی، لیکن آپ کون ہیں؟"

"خدا کا ایک بندہ۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گی کہ میں کسی طرح آپ کے مریض بچوں کے کام آ سکوں؟"

"یہ تو بہت اچھی بات ہوگی۔" نازیہ نے کہا۔ "ہم تو ہر وقت ایسی مدد قبول کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"آپ اپنی انتظامیہ سے بھی بات کر لیں۔ میں آج شام چار بجے آپ کے اسپتال میں آ رہا ہوں۔ لیکن پلیز میں بچوں کے لیے جو کچھ کرنا چاہتا ہوں، اس سے انکار مت کیجیے گا۔"

نازیہ کو اس کی یہ بات بہت عجیب لگی تھی۔ اگر وہ سنجیدگی سے بچوں کی مدد کرنے آ رہا تھا تو اس پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ "نہیں، نہیں، انکار کی کیا بات ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "آپ چار بجے آ جائیں، ہم آپ کا انتظار کریں گے۔"

فون بند کرنے کے بعد نازیہ نے اسپتال کے دوسرے لوگوں کو بھی اس فون کے بارے میں بتا دیا۔ وہ سب خوش بھی تھے اور حیران بھی ہو رہے تھے۔

شام چار بجے نازیہ اپنے کمرے میں ہی تھی جب نرس دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ "میڈم وہ آ گیا ہے۔"

"کون آ گیا ہے؟" نازیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی میڈم، جس کا فون آیا تھا۔" نرس نے بتایا۔

"تو پھر اتنی حیران ہونے کی کیا بات ہے؟"

"وہ تو کچھ عجیب چیز ہے میڈم۔" نرس نے کہا۔ "آپ خود ہی دیکھ لیں۔"

نرس نے اپنی بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ وہ کمرے میں داخل ہو گیا۔ خود نازیہ بھی اس کو دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ ایک جوکر تھا۔

سرکس میں کام کرنے والے یا فیسٹیول وغیرہ میں تماشا دکھانے والے جوکروں کی طرح۔ اس کے چہرے پر بے تحاشا رنگ تھپے ہوئے تھے۔ سر پر اونچا سا ہیٹ تھا۔ لباس بھی ایسا دھاری دار تھا جیسے زیبرے کی کھال پہن کر آ گیا ہو۔

"میں وہی ہوں جس نے آپ سے فون پر بات کی تھی۔" اس نے بتایا۔

نازیہ اتنی دیر میں اپنی حیرت پر قابو پا چکی تھی۔ "لیکن آپ ہیں کون؟"

"جوکر۔" اس نے بتایا۔ "میرا نام ہی جوکر ہے اور کام بھی جوکروں والا ہے۔"

"لیکن آپ، میرا مطلب ہے کہ آپ بچوں کے لیے....."

"دیکھیں، یہ جو بچے ہوتے ہیں نا یہ پھولوں کی طرح ہوتے ہیں۔" جوکر نے کہا۔ "لیکن یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ یہ پھول جیسے بچے آہستہ آہستہ موت کی طرف جا رہے ہیں۔ اذیت برداشت کر رہے ہیں۔ اگر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جائے تو میں یہ سمجھوں گا کہ میری زندگی بے کار نہیں ہے۔ میں نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں، میں ان بچوں کے لیے بہت سے کھلونے اور ضروری دوائیں لے کر آیا ہوں، پلیز، آپ مجھے بچوں کے پاس پہنچا دیں۔"

اس جوکر کو بچوں کے ایک وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔

بستروں پر پڑے ہوئے، موت کا انتظار کرتے ہوئے بچے اس مہمان کو دیکھ کر ہنس پڑے تھے۔ شاید پہلی بار۔ جوکر ان بچوں کے درمیان اپنے لائے ہوئے تحفے تقسیم کر رہا تھا۔ انہیں ہنسا رہا تھا۔ الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا۔ بچے ہنس رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔ موت کے اس

وارڈ میں زندگی اپنی پوری توانائی کے ساتھ چلی آئی تھی۔
اس جوکر کا تماشا دیکھنے والوں میں اسپتال کے ڈاکٹرز بھی تھے۔ نرسیں بھی تھیں اور انتظامیہ کے لوگ بھی۔ وہ سب ہی جوکر کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ اس اسپتال میں ایسا واقعہ پہلی بار ہوا تھا۔
''کیا خیال ہے ڈاکٹر نازیہ اس آدمی کے بارے میں؟'' اسپتال کے ڈائریکٹر نیازی نے دریافت کیا۔
''سر! جا ہے یہ جو بھی ہو لیکن بہت بڑا آدمی ہے سر، اس نے اداس بچوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں۔ بہت بڑا آدمی ہے سر، بہت بڑا۔''

☆☆☆

''ڈیڈی، آج آپ نے پھر ٹائی غلط لگا لی۔'' گڑیا نے غصے سے کہا۔
''میں کیا کروں بھئی، تم کو دیکھ کر یہ ٹائی خود بخود غلط ہو جاتی ہے۔'' سعید مسکرا کر بولا۔ ''چلو تم ہی ٹھیک کر دو۔''
''ہاں میں کل کی بات بتانی تو بھول ہی گئی۔'' نازیہ نے کہا۔ وہ ناشتے کی میز پر تھی۔
''ظاہر ہے اسپتال ہی کا کوئی واقعہ ہوگا۔ کوئی نیا مریض آیا ہوگا یا کوئی بچہ صحت یاب ہو گیا ہوگا۔''
''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک مختلف واقعہ ہوا۔ اسپتال میں ایک جوکر آ گیا تھا۔''
''جوکر؟ وہ کیوں؟''
''بچوں کو خوش کرنے کے لیے۔'' نازیہ نے بتایا۔
''میں نے زندگی میں کبھی ایسا جوکر نہیں دیکھا۔ وہ نہ صرف بچوں کو خوش کرنے کے لیے الٹی سیدھی حرکتیں کر رہا تھا بلکہ وہ اپنے ساتھ ڈھیر سارے تحفے بھی لے کر آیا تھا۔''
''گڈ، پھر تو وہ واقعی بہت اچھا آدمی ہوگا۔''
''ممی، وہ کیسا جوکر تھا۔ وہی سرکس والا؟'' گڑیا نے پوچھا۔
''ہاں بیٹا، ویسا ہی۔''
''ممی مجھے بھی لے چلیں نا، میں بھی جوکر سے ملوں گی۔''
''ٹھیک ہے، جب وہ دوبارہ آئے گا تو تمہاری ملاقات کروا دوں گی۔'' نازیہ نے کہا۔ ''چلو اب ناشتا کر لو، اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔''
ناشتے سے فارغ ہو کر سعید نے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے کہ آج مجھے واپسی میں کچھ دیر ہو جائے۔''
''کیوں، خیریت تو ہے نا؟'' نازیہ نے پوچھا۔
''ہاں، خیریت ہی ہے۔ میں نے تم سے اپنے ایک دوست انیس کا ذکر کیا ہے نا، وہی لاہور والا۔ وہ یہاں اپنا کاروبار سیٹ کرنے آیا ہے۔ پیسے والا بندہ ہے۔''
''یہاں اس کے رشتے دار وغیرہ بھی ہوں گے۔''
''ہو سکتا ہے لیکن وہ ہوٹل بلیو اسٹار میں ٹھہرا ہے۔'' سعید نے بتایا۔ ''حالانکہ میں نے اسے آفر بھی دی تھی کہ وہ ہوٹل کے بجائے ہمارے گھر آ جائے۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔''
''تو آپ اس سے ملنے جائیں گے؟''
''ہاں، ہو سکتا ہے کہ رات کا کھانا بھی اس کے ساتھ ہو۔''
''ٹھیک ہے، تو پھر میں بھی آج جلدی آ جاؤں گی۔''
گڑیا کو اسکول پہنچانے کی ذمے داری سعید نے لے رکھی تھی۔ دوپہر کے وقت گڑیا کی واپسی ملازمہ کے ساتھ ہوا کرتی۔ پھر وہ ملازمہ دن بھر گڑیا کی دیکھ بھال کرتی۔ نازیہ شام کے وقت واپس آ جاتی تھی۔
سعید نے معمول کے مطابق گڑیا کو اسکول پہنچایا اور دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر سے جلدی فارغ ہو کر اس نے ہوٹل بلیو اسٹار کا رخ کیا۔
ہوٹل کے کمرے میں انیس اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی تھا۔ ادھیڑ عمر۔ باوقار سا۔ جس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ بہت ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والا۔
''سعید، یہ ہیں مکرم صاحب۔'' انیس نے اس آدمی کا تعارف کروایا۔ ''بہت بڑے صنعت کار ہیں۔ کراچی میں اپنی فیکٹری بنانا چاہتے ہیں۔ کل انہوں نے اس سلسلے میں ایک پریس کانفرنس بھی کی تھی۔ اتفاق سے میں بھی اس میں شریک تھا پھر جب میں نے ان کو یہاں دیکھا تو پتا چلا کہ یہ تو میرے برابر والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔''
اب مکرم نے بات آگے بڑھائی۔ ''اور اس طرح ہم دونوں کی دوستی ہو گئی۔ انہوں نے مجھے چائے کی دعوت دی اور میں ان کے کمرے میں دکھائی دے رہا ہوں۔''
سعید نے بھی مسکرا کر اپنا تعارف کروایا تھا۔
''مکرم صاحب، یہ تو بتائیں آپ نے سرمایہ کاری کی کیا حد مقرر کی ہے۔'' انیس نے دریافت کیا۔ ''معاف کیجیے گا یہ میں یونہی پوچھ رہا ہوں۔''
''میرے ذہن میں پچیس کروڑ تک کی سرمایہ کاری ہے۔'' مکرم نے بتایا۔

"یہاں، ارے نہیں تو فیکٹری قائم ہو سکتی ہے۔" اس نے کہا۔

"مکرم صاحب، میں آپ کو ایک خطرے سے آگاہ کر دوں۔" سعید، مکرم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آج کل ہمارے شہر میں کوئی بڑا فراڈی انسان وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ اس کا نشانہ آپ جیسے صنعت کار اور کاروباری بن رہے ہیں۔ پولیس اسے ہزار چہرے والے کے نام سے یاد کرتی ہے۔"

"جی ہاں، میں نے بھی اس کے بارے میں سن رکھا ہے لیکن کیا ایسے کسی آدمی کا وجود ہے یا صرف ایک کہانی ہے۔"

"کہانی نہیں ہے جناب۔ میرا ایک دوست پچھلے دنوں اپنے بیس لاکھ اس کے چکر میں گنوا چکا ہے۔ آپ لوگوں سے ڈیلنگ کرتے ہوئے ہوشیار رہیے گا۔ اس کے ہزار چہرے ہیں۔ نہ جانے کس روپ میں آپ کے سامنے آجائے۔"

"ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت آپ ہی کے روپ میں میرے سامنے بیٹھا ہو۔" مکرم نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے۔" سعید بھی ہنس پڑا۔ "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ بہت ہوشیار ہو کر معاملات کیجیے گا۔"

"آپ کے اس مشورے کا بہت بہت شکریہ۔" مکرم نے کہا۔ "لیکن میں اندھے سودے کرنے کا قائل نہیں ہوں، میں نے اب تک جن سے باتیں کی ہیں، بہت سوچ سمجھ کر کی ہیں۔ ویسے میں اور بھی زیادہ محتاط ہونے کی کوشش کروں گا۔"

جس وقت اس کمرے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کمرے کے دروازے کے باہر ایک آدمی اس طرح کھڑا تھا جیسے وہ اندر کی سن گن لے رہا ہو۔

وہ لمبے قد کا آدمی تھا۔ سیاہ سوٹ میں اس کی شخصیت بہت پُراسرار دکھائی دے رہی تھی۔ کسی کی آہٹ سن کر وہ جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔

آنے والا ہوٹل کا ویٹر تھا جو حیرت سے اس آدمی کو دیکھ رہا تھا۔

"ویٹر!" اس پُراسرار آدمی نے ویٹر کو آواز دی۔ اس دوران وہ دروازے سے پیچھے اور دور ہٹ آیا تھا۔

"یس سر۔" ویٹر نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

"کمرا نمبر پانچ میں مسٹر مکرم ٹھہرے ہیں نا، ان سے کہنا۔" وہ اس وقت اپنے روم میں نہیں ہیں۔ تم انہیں میرا یہ کارڈ دے دینا۔" اس نے اپنی جیب سے ایک کارڈ اور سو کا ایک نوٹ نکال کر ویٹر کی طرف بڑھا دیا۔ "لو یہ رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے سر۔" ویٹر نے گھبرا کر پوچھا۔

"تمہاری ٹپ۔" اس نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں ایک انشورنس ایجنٹ ہوں۔ مسٹر مکرم براہِ راست مجھے نہیں جانتے۔ تم میرا کارڈ انہیں دینے کے ساتھ یہ کہہ دینا کہ میں یہاں اکثر آتا رہتا ہوں۔ بس اتنا سا کام ہے۔ فرنانڈس نام ہے میرا، نام تو یاد رہے گا نا؟"

"یس سر۔" ویٹر نے نوٹ جیب میں رکھ کر مستعدی سے جواب دیا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ مجھے آپ کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔"

"گڈ۔" اس آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

پھر وہ پُراسرار آدمی بڑے باوقار انداز سے لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

جلال کی سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔

وہ بہت پیارا بچہ تھا۔ گیارہ برس کا۔ باپ کی آنکھوں کا تارا۔ باپ کی زندگی۔ ماں کی موت کے بعد باپ ہی نے اس کی پرورش کی تھی۔ ماں بن کر پالا تھا اس کو۔ اپنی ساری محبت اس پر نچھاور کر دی تھی لیکن اتنی محبت کے باوجود وہ جلال کو موت کے منہ میں جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔

جلال خون کے کینسر میں مبتلا تھا۔ موت... بے رحم اور بے حس موت اس کے بہت قریب آچکی تھی۔ باپ کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اپنے لختِ جگر کا علاج کسی مہنگے اسپتال میں کرا سکتا۔ اسی لیے اس نے اپنے بیٹے کو ایک ایسے اسپتال میں ڈال دیا تھا جو ایک فلاحی ادارے کے تحت کام کرتا تھا۔

ویسے تو یہاں ہر طرح کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ مگر کبھی کبھی پریشانیاں بھی ہو جاتیں یا کبھی کوئی دوا نہیں ہے۔ وہ اپنے بیٹے سے اپنا چہرہ چھپا کر رویا کرتا۔ اس کو اپنے بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھے ایک عرصہ گزر گیا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کا بیٹا بھی کبھی ہنستا مسکرایا کرتا تھا۔ کبھی ضد کیا کرتا۔ کبھی دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلا بھی کرتا تھا۔ یہ سارے خوب صورت دن خواب ہو کر رہ گئے تھے۔

ایک شام جب وہ اپنے بیٹے کے پاس اسپتال آیا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے بیٹے کے چہرے پر

خوشیوں کا عکس تھا۔ وہ تکلیف اور کرب کے باوجود مسکرا رہا تھا۔

یہ دیکھ کر باپ کا دل خوشی سے نہال ہو گیا۔

''جانتے ہیں ابو، آج یہاں کیا ہوا تھا۔'' بیٹے نے پوچھا۔

''نہیں بیٹے، میں تو نہیں جانتا، تم بتاؤ۔'' باپ اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''آج یہاں ایک جوکر آیا تھا ابو۔'' بیٹے نے بتایا۔

''بہت زبردست جوکر، اس نے ہم سبھوں کو اتنا ہنسایا، اتنا ہنسایا کہ میں بتا نہیں سکتا۔''

''واہ، پھر تو جوکر انکل بہت اچھے ہوئے نا۔''

''ہاں وہ بہت اچھے تھے۔'' بیٹے نے بتایا۔ ''انہوں نے ہم سب کو ڈھیر سارے تحفے بھی دیے ہیں۔ یہ دیکھیں میرے تحفے یہ'' بچے نے برابر میں رکھی ہوئی چھوٹی کیبنٹ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں رکھے ہیں۔''

باپ نے کیبنٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں قیمتی کھلونے بھرے ہوئے تھے۔

''ارے، اتنے سارے کھلونے۔''

''ہاں ابو، انہوں نے تو ڈھیر ساری دوائیاں بھی دی ہیں یہ'' بیٹے نے مزید بتایا۔ ''ابو جوکر انکل بہت اچھے ہیں۔ میں بہت دنوں سے ہنسا نہیں تھا نا، اسی لیے خوب ہنسا ہوں۔ سارے بچے ہنس رہے تھے۔''

باپ کی آنکھوں میں اس جوکر کے لیے احسان مندی کے جذبات جاگ اٹھے۔ اس نے ایک بڑا کام کیا تھا۔ یہ سعادت ہر ایک کے حصے میں نہیں آیا کرتی۔ خوشیاں بانٹنے کا عمل کچھ اور ہوا کرتا ہے۔ ایسی کاوشیں دلوں میں براہِ راست اپنا راستہ بنا لیتی ہیں۔

''ابو، آپ مجھ سے ایک وعدہ کریں۔'' بیٹے نے کہا۔

''کہو بیٹا، کیسا وعدہ کر دوں۔''

''یہی کہ آپ بھی بچوں کو ہنسایا کریں گے۔''

باپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''ٹھیک ہے بیٹا، میں بھی تمہارے جوکر انکل کی طرح بچوں کو ہنسایا کروں گا۔''

بیٹے نے اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے باپ کا یہ وعدہ سن کر اسے سکون مل گیا ہو۔ باپ بیٹے کو چھوڑ کر ڈیوٹی روم میں آ گیا جہاں دو چار نرسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''میرا بیٹا بتا رہا تھا کہ اس کے وارڈ میں کوئی جوکر آیا تھا۔'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ایک جوکر آیا تھا۔ بہت مزے مزے کی حرکتیں کر کے گیا ہے۔''

''کیا مجھے اس کا پتا مل سکے گا۔'' اس نے پوچھا۔

''میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے بیٹے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آیا ہے۔''

''ہاں، اور بھی کئی والدین اس کا پتا دریافت کر رہے ہیں لیکن ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔''

''وہ آئے تو اسے بتا دیجیے گا کہ اسے دعائیں دینے والوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے۔''

☆☆☆

تنویر کو فرنانڈس کا انتظار تھا۔ لیکن وہ اس سے ملنے نہیں آیا۔

تنویر، مکرم کے نام سے ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کے بھائی توقیر نے اس کے میک اپ اور گیٹ اپ میں اپنا کمال دکھا دیا تھا۔ اب وہ ایک جوان شخص کے بجائے ادھیڑ عمر کا بڑا تاجر دکھائی دینے لگا تھا۔

پلاننگ کے مطابق اس نے ایک پریس کانفرنس بھی کی تھی جس میں اعلان کیا تھا کہ وہ بھاری سرمایہ کاری کی غرض سے آیا ہے۔ گویا اس نے ہزار انداز سے ہزار چہرے والے کے لیے اپنے جال بچھا دیے تھے لیکن وہ ابھی تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔

صرف ایک بار کسی فرنانڈس کا کارڈ ملا تھا۔ یہ کارڈ ویٹر نے دیا تھا۔ اس کارڈ پر ایک پتا بھی درج تھا۔ لیکن اس پتے پر فرنانڈس نام کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ تنویر کے خیال میں یہ فرنانڈس ہی وہی ہزار چہرے والا تھا لیکن پرابلم یہ تھا کہ وہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔

تنویر کو اپنا منصوبہ ناکام ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''ہزار چہرے والے نے اس دوران اور کئی وارداتیں کر ڈالیں۔ وہی اپنے مخصوص انداز میں۔ اور پولیس اس کی تلاش میں ناکام ہو کر اپنا سر پیٹتی رہ گئی تھی۔

بالآخر تین چار دنوں کے بعد تنویر کو اس کے آفیسرز نے واپس بلا لیا تھا۔

''سر! یہ ٹھیک ہے کہ میرا منصوبہ ناکام ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنے آفیسر سے کہا۔ ''لیکن، پلیز، آپ یہ کیس میرے پاس ہی رہنے دیں۔ کیونکہ اس شخص کی گرفتاری میرے لیے چیلنج بن گئی ہے۔ میں ہر حال میں اسے گرفتار کر کے رہوں گا۔''

''کیا تمہارے ذہن میں کوئی اور ترکیب ہے؟''

ٹی الحال تو کوئی نہیں ہے سر۔ لیکن سوچتے سوچتے اتنے بڑے شہر میں اسے کیسے تلاش کیا جائے۔''

کوئی نہ کوئی راہ نکل ہی آئے گی۔'' اس نے کہا۔ ''میں ناکام تو ہو گیا ہوں لیکن مجھے ایک سراغ مل گیا ہے۔ یعنی اس کیس کی اسٹڈی کرنے کے بعد اس شخص کی ایک عادت سامنے آئی ہے۔''

''اچھا وہ کیا؟''

''وہ یہ ہے سر کہ یہ شخص جمعہ، ہفتہ اور اتوار کے دن کوئی واردات نہیں کرتا۔'' تنویر نے بتایا۔ ''پچھلے کئی ہفتوں کی خبریں یہ بتا رہی ہیں کہ اس نے جو کچھ کیا وہ ان دنوں کے علاوہ کیا ہے۔''

''بہت خوب، یہ تو بہت دلچسپ بات ہے لیکن اس سے کیا پتا چلتا ہے؟''

''اس سے اس کی کسی کمزوری کا پتا چل رہا ہے سر۔'' تنویر نے کہا۔

''ہاں اس کی کسی کمزوری یا عادت کا پتا تو چل رہا ہے لیکن صرف یہی معلوم ہو جانے پر تو اس کا سراغ نہیں مل سکتا۔ بہر حال یہ کیس تمہارے ہی پاس ہے۔''

تنویر گھر واپس آیا تو اس کا بھائی توقیر ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی برآمدے میں بید کی کرسی پر بیٹھا نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

تنویر نے اس کے پاس پہنچ کر بڑے پیار سے آواز دی۔ ''توقیر بھائی۔''

توقیر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اوہ تم آگئے، کب آئے؟''

''بس ابھی ابھی آیا ہوں۔'' تنویر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ''توقیر بھائی، آپ نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔''

''کیوں، کیا خرابی ہے میرے حال میں۔ میں ٹھیک تو ہوں۔''

''نہیں بھائی، آپ ٹھیک ہی تو نہیں ہیں۔ آپ نے تو یہ دنیا ہی تیاگ دی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے زندگی سے منہ موڑ لیا ہو۔ نہیں توقیر بھائی، ایسا نہ کریں، خود کو سنبھالیں۔ کہیں آئیں جائیں، تفریح کریں، دنیا ابھی ختم نہیں ہوئی ہے بھائی۔''

توقیر مسکرا دیا۔ ''تم تو آج کسی بزرگ کی طرح نصیحتیں کر رہے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ تمہارے اس ہزار چہرے والے کا کیا بنا؟''

''کچھ نہیں ہوا۔ وہ کم بخت ہاتھ ہی نہیں آ رہا۔ اب شاید میرے میک اپ میں کوئی خرابی رہ گئی ہو۔''

''ارے نہیں تو قیر بھائی۔ آپ نے تو ایسا میک اپ کیا تھا کہ خود میرے ساتھ والے مجھے نہیں پہچان سکے تھے لیکن وہ میرے پاس ہی نہیں آیا۔ لگتا ہے کہیں اور مصروف ہو گیا ہو۔ بہر حال وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔ اس کی ایک عادت ہمارے علم میں آ گئی ہے۔''

''وہ کون سی؟''

''وہ یہ کہ وہ جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو کوئی واردات نہیں کرتا۔'' تنویر نے بتایا۔

''تو اس علم سے تم اُسے کیسے پکڑ پاؤ گے؟'' توقیر ہنس پڑا۔

''یہی بات تو سمجھ میں نہیں آ رہی۔'' تنویر بے بسی سے بولا۔ ''ویسے ایک بات تو بتائیں، آپ کے ذہن میں کیا آتا ہے یعنی وہ ان تین دنوں کوئی واردات کیوں نہیں کرتا؟''

''اس کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں۔'' توقیر کچھ سوچ کر بولا۔ ''مثال کے طور پر وہ کسی خاص عقیدے یا مسلک سے تعلق رکھتا ہو اور یہ تین دن اس کے لیے بہت احترام کے دن ہوں یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان تین دنوں میں شہر سے باہر چلا جاتا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ تین دن عام طور پر کاروباری چھٹیوں کے ہوتے ہیں، اس لیے اسے واردات کا موقع نہ ملتا ہو۔''

''ہاں کچھ اسی قسم کی باتیں ہو سکتی ہیں۔'' تنویر نے گردن ہلائی۔ ''بہر حال چھوڑیں اس کو، آپ اپنی طرف توجہ دیں۔ آپ کو اس حال میں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔''

توقیر کے پاس اس بات کے جواب میں ایک پیار بھری مسکراہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

☆☆☆

آج گڑیا بھی جوکر کا تماشا دیکھنے کے لیے آئی ہوئی تھی۔

جوکر اس شام بھی بچوں کے لیے ڈھیر سے تحائف اور دوائیں وغیرہ لے کر آیا تھا۔ بچوں کو اب اس کی آمد کا انتظار رہنے لگا تھا۔

وہ بچوں کے لیے اب صرف ایک جوکر نہیں بلکہ جوکر انکل تھا۔ اس کے وارڈ میں داخل ہوتے ہی جوکر انکل، جوکر انکل کی صدائیں بلند ہونے لگتیں اور وہ بچوں میں پیار تقسیم کرنے میں مصروف ہو جاتا۔

ایک شام ڈاکٹر نازیہ نے اس سے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں، ہم لوگ آپ کو کیا کہیں۔ بچے تو جوکر انکل کہہ کر مخاطب کر لیتے ہیں لیکن ہم تو جوکر نہیں کہہ سکتے نا۔''

''کیوں نہیں کہہ سکتیں، جب میں جوکر ہوں تو جوکر ہی کہیں۔''

''دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے آج تک آپ کی اصل صورت نہیں دیکھی۔ آپ جب آتے ہیں آپ کے چہرے پر اتنا رنگ و روغن ہوتا ہے کہ آپ کی اصل صورت کا سراغ نہیں ملتا۔''

''کیا کرنا ہے میری اصل صورت دیکھ کر۔ میں بہت بدصورت آدمی ہوں۔'' جوکر ہنس کر بولا۔

''ہماری ایک چھوٹی سی بچی ہے۔ ہم اُسے پیار سے گڑیا کہتے ہیں۔ وہ آپ سے ملنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔'' نازیہ نے بتایا۔

''کوئی بات نہیں۔ میں جب یہاں آؤں تو آپ اسے لے آئیں۔'' جوکر نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ آپ کی گڑیا سے میری دوستی ہو جائے۔''

تو اس طرح گڑیا آج جوکر کا تماشا دیکھنے چلی آئی تھی۔

جوکر اس سے ہاتھ ملانے کے بعد دوسرے بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اچھل رہا تھا۔ بے ہنگم آوازیں نکال رہا تھا۔ بُرے بُرے منہ بنا رہا تھا اور بچے اس کی حرکتیں دیکھ دیکھ کر خوشی سے نہال ہوئے جا رہے تھے۔ ان بچوں کے لیے خوشیوں کا ایسا موقع شاید ہی آتا ہوگا۔

''ممی۔'' گڑیا نے نازیہ سے کہا۔ ''آپ جوکر انکل سے میری دوستی کرا دیں نا۔''

''کیوں بھئی، کیا جوکر انکل بہت اچھے لگے ہیں۔'' نازیہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں، بہت اچھے، دیکھیں نا، سب ہنس رہے ہیں۔ میں بھی ہنس رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے بھئی، ابھی یہ اپنا تماشا ختم کر دیں تو پھر تم سے ملاقات کروا دیتی ہوں۔'' نازیہ نے کہا۔

جوکر اپنا تماشا ختم کر کے جب جانے لگا تو نازیہ نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ ''جوکر صاحب! میری بیٹی سے تو دوستی کرتے جائیں۔''

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' جوکر گڑیا کے پاس آ گیا۔

''یہ تو واقعی بہت پیاری سی گڑیا ہے۔''

''جوکر انکل، آپ کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟'' گڑیا جوکر سے باتوں میں مشغول ہو گئی تھی۔

جوکر کو بھی گڑیا بہت اچھی لگی تھی۔ اس کی معصوم باتیں، معصوم انداز اور بھولے بھالے سوالات۔ جوکر اس سے بہت دیر تک باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر وہ گڑیا کو پیار کر کے اسپتال والوں سے اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔

''میں نے اپنی زندگی میں ایسا جوکر کبھی نہیں دیکھا۔'' جوکر کے جانے کے بعد ایک ڈاکٹر نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' نازیہ نے گردن ہلائی۔ ''لیکن مجھے یہ شخص کوئی پروفیشنل جوکر معلوم نہیں ہوتا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کی لائف کچھ اور ہے اور کرتا کچھ اور ہے۔ اس کی گفتگو کا انداز اسے تعلیم یافتہ ظاہر کر رہا ہے۔ وہ صرف بچوں کے لیے جوکر بن گیا ہے۔''

''لیکن کیوں، بچوں کو بہلانے کے لیے ایسی حرکتیں تو کوئی بھی نہیں کرتا ہوگا۔''

''ہوسکتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی کہانی چھپی ہوئی ہو۔'' نازیہ نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اس طرح اس نے اپنے غم جانان کو غم دوراں بنا لیا ہو۔ پتا کون جانے کس چہرے کے پیچھے کتنے دکھ ہوتے ہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔''

''ممی۔'' گڑیا بول پڑی۔ ''میں نے جوکر انکل کو اپنے گھر آنے کے لیے کہا ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''میں انہیں اپنے کھلونے دکھانا چاہتی ہوں۔''

''اچھا تو کیا وہ آئیں گے۔''

''ضرور آئیں گے انہوں نے وعدہ کیا ہے۔''

ڈاکٹر نازیہ اگر وہ شخص آپ کے گھر آجائے تو ذرا اسے کریدنے کی کوشش کریں۔ وہ آپ سے خاصا مانوس معلوم ہوتا ہے۔''

''ضرور، میں تو خود اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔''

☆☆☆

پچھلے کئی دنوں سے سکون تھا۔

ہزار چہرے والے نے یا تو کوئی واردات نہیں کی تھی یا اس کی کوئی واردات سامنے نہیں آئی تھی۔ کچھ کا یہ خیال تھا کہ وہ شہر چھوڑ گیا ہے لیکن تنویر سمجھتا تھا کہ ایسا ہو نہیں سکتا۔ جس شخص کو ایک بار جرم کی چاٹ لگ جائے اس کا بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس خاموشی کا مطلب یہ ہوسکتا تھا کہ یا تو وہ بیمار ہے یا اسے کوئی بڑا چانس نہیں مل سکا۔

پھر اس خاموشی کی وجہ بھی سامنے آ گئی۔

وہ ایک پولیس والا تھا جس نے وہ لاش دریافت کی تھی۔ یہ دریافت اتفاقاً ہوئی تھی۔ پولیس والا اُدھر سے گزر رہا تھا کہ اس نے کچرے کے پاس کچھ کتوں کو ڈھیر کریدتے ہوئے دیکھا۔ ویسے تو یہ ایک عام سی بات تھی۔ پورے شہر میں کچرے کے ڈھیر لگے رہتے اور کتے انہیں کریدتے رہتے۔ لیکن اس پولیس والے کے دھیان دینے کی وجہ یہ تھی کہ اس میں ایک انسانی جسم بھی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ کسی ایسے انسان کی لاش تھی جسے گولی مار کر ہلاک کرنے کے بعد اس کی لاش کو کچرے کے ڈھیر پر لا کر پھینک دیا گیا ہو اور کتے اس کے مردہ بدن کی ضیافت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

پولیس والے نے فوری طور پر اپنے حکام کو اس کی خبر دی۔ ذرا سی دیر میں پولیس کی کئی گاڑیاں وہاں پہنچ چکی تھیں۔

لاش کے پوسٹ مارٹم کے دوران ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ لاش کے چہرے پر میک اپ تھا۔ یعنی ایک چہرے کے پیچھے دوسرا چہرہ۔ اس کی جیبوں سے کئی عدد وزیٹنگ کارڈز بھی نکلے تھے۔ ایک کارڈ فرنانڈس کے نام کا تھا اور بھی کئی کارڈز تھے اور ان کارڈز کے سارے پتے جعلی ثابت ہوئے تھے۔ سوال یہ تھا کہ مرنے والا کون تھا؟

”سر! مجھے وہ لاش ہزار چہرے والے کی معلوم ہوتی ہے۔“ تنویر نے اپنے افسران سے کہا۔

”یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اس لاش کی نوعیت بھی یہی بتا رہی ہے سر۔“ تنویر نے کہا۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ اس آدمی نے اپنے چہرے پر میک اَپ کر رکھا تھا۔ ہزار چہرے والا بھی ہزار چہروں کے ساتھ سامنے آیا کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے پاس سے کئی عدد کارڈز ملے ہیں۔ ان میں سے ایک فرنانڈس کا ہے۔ اسی نام کا ایک آدمی مجھ سے ہوٹل میں ملنے آیا تھا اور تیسری سب سے اہم بات ہے کہ پچھلے کئی دنوں سے شہر میں دھوکا دہی کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ جب وہ زندہ ہی نہیں ہے تو واردات کیا کرتا۔“

”ہوں، تمہاری باتیں سمجھ میں تو آ رہی ہیں۔ یعنی ہزار چہرے والے کی فائل بند ہو گئی۔“

”لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دوسری فائل کھل گئی ہے سر۔“ تنویر نے کہا۔ ”یعنی خود ہزار چہرے والے کو کس نے مارا۔ کون ہے اس کا قاتل۔

یہ واقعی ایک نئی اُلجھن ہے۔ بہرحال یہ کیس شروع سے تمہارے پاس تھا۔ اب تم ہی کو اس کے قاتل کے پکڑنے کی ذمے داری بھی دی جا رہی ہے۔“

تنویر گھر واپس آیا تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ توقیر گھر پر نہیں تھا۔ وہ اب باہر آنے جانے لگا تھا۔ بہت دنوں کے بعد اس نے زندگی میں دلچسپی لی تھی۔

ورنہ بیوی اور بچے کی موت کے بعد وہ صرف گھر یا قبرستان کا ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کہیں آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا، باوقار اور مہذب شخص تھا لیکن اسے میک اَپ آرٹسٹ بننے کا شوق رہا تھا۔ اس نے باہر جا کر اس ہنر کی تعلیم حاصل کی تھی۔

پہلے تو دربدر کی ٹھوکریں کھائیں۔ بالآخر اس کے ہنر کی شناخت ہونے لگی۔ انگلینڈ کے تھیٹرز میں کام ملنے لگا۔ پھر وطن واپس آیا تو فلم والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اس فیلڈ میں اس کا کوئی ثانی نہیں رہا۔ فلم والوں کی یہ خواہش ہوا کرتی کہ ان کی فلم کا میک اَپ اور گیٹ اَپ توقیر ہی کا ہو۔

اس کے پاس پیسے آنے لگے۔ اخبارات اور رسائل اس کے فن کو سراہا کرتے۔ اس نے بے شمار ایوارڈز حاصل کیے۔ پھر اس کی زندگی میں ایک حادثہ رونما ہوا۔

بلکہ یکے بعد دیگرے دو حادثے ہوئے اور وہ ذہنی طور پر برباد ہو کر رہ گیا۔

پہلا حادثہ بیوی کی موت کا تھا۔ وہ ایک ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر مری تھی۔ اپنے بچے خرم کی خاطر توقیر نے اس حادثے کا دکھ برداشت کر لیا۔ اس کی محبتوں کا محور اب صرف اس کا بیٹا تھا۔ پھر خرم بھی بیمار ہو گیا۔ انتہائی شدید بیمار۔ اور اس بیماری نے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

بس اس کے بعد سے توقیر گھر یا قبرستان کا ہو کر رہ گیا۔ اس نے اپنے کام کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ آنا جانا چھوڑ دیا۔ تنویر کو یہ سب دیکھ کر بہت دکھ ہوا کرتا۔ تنویر کے لیے بھی اس کی زندگی میں اس کے بھائی توقیر کے سوا کوئی نہیں تھا۔

والدین کی موت کے بعد دونوں بھائی ہمیشہ ایک ساتھ ہی رہے۔ توقیر ہی نے تنویر کی پرورش کی تھی۔ ایک مہربان باپ کی طرح۔ اسی لیے تنویر کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا بھائی اوروں کی طرح زندگی میں دلچسپی لے۔ غم تو بہت وزنی ہوتے ہیں۔ لیکن اب ایسا بھی نہیں کہ ان غموں کے بوجھ سے گھبرا کر انسان دنیا ہی کو تیاگ دے۔

اس دن توقیر بہت دیر کے بعد واپس آیا تھا۔ معمول کے برعکس وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا اور مطمئن سا۔ اس اطمینان اور خوشی کا اظہار اس کے چہرے سے ہو رہا تھا۔

''خدا مبارک کرے توقیر بھائی۔'' تنویر نے کہا۔ ''آج آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔''

''ہاں، میں واقعی بہت خوش ہوں۔'' توقیر مسکرا کر بولا۔ ''بلکہ پچھلے کئی ہفتوں سے ایسی خوشیاں مجھے ملنے لگی ہیں۔''

''ذرا مجھے بھی تو بتائیں کون ہے وہ جس نے میرے بھائی کے دامن میں خوشیاں بھر دی ہیں؟''

''تم غلط سمجھ رہے ہو، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' توقیر نے کہا۔ ''بلکہ میں اپنے بیٹے خرم کی روح کو خوش ہوتا ہوا محسوس کر رہا ہوں کیونکہ میں اس کی آخری خواہش پوری کر رہا ہوں۔''

''کون سی خواہش؟''

''میرے بھائی، میں بچوں کو خوش کرنے، انہیں ہنسانے کے لیے اسپتال جایا کرتا ہوں۔'' توقیر نے بتایا۔

''میں نہیں سمجھا۔''

''تمہیں یاد ہوگا خرم جب اسپتال میں تھا۔ ایک بار اس کے وارڈ میں ایک جوکر آیا تھا۔ اس جوکر نے اسے اور دوسرے بچوں کو بہت ہنسایا تھا۔ پھر خرم نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں بھی اس جوکر کی طرح بچوں کو ہنسایا کروں تو میرے بھائی، میں اس کی خواہش میں بہت سے ایسے بچوں کے لیے ان کا جوکر انکل بن گیا ہوں۔''

''کیا؟'' تنویر نے حیرت سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، تنویر۔'' توقیر کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ''تم اس خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے جو اُن بچوں کو خوش دیکھ کر مجھے حاصل ہوتی ہے۔ میں جب اپنے چہرے کو رنگوں سے سجا کر ان کے سامنے الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہوں تو ان کے اداس چہروں کی مسرت اور حیرت مجھے ایسا اطمینان دے دیتی ہے جو خرم کی موت کے بعد کبھی نہیں ملا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یہ سارے بچے میرے ہی ہوں۔ میرے اپنے خرم۔ اور میں ایک باپ بن کر ان کی خدمت کر رہا ہوں۔ انہیں پیار دے رہا ہوں۔''

تنویر اپنے بھائی کی طرف دیکھتا رہا۔ توقیر اس وقت سرشاری کی کیفیت میں تھا۔

''تمہیں معلوم ہوگا کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت دولت کمائی۔ میرے فن نے مجھے ہمیشہ مالدار رکھا۔ اب وہی پیسے ان بچوں کے کام آ رہے ہیں۔ میں شہر کے کئی اسپتال میں بچوں کے لیے ڈھیر سے تحفے اور قیمتی دوائیں لے کر جایا کرتا ہوں جو اُن بچوں کے کام آ جاتی ہیں۔''

''بھائی! آپ بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔'' تنویر کی آواز لرز رہی تھی۔ ''مجھے فخر ہے آپ پر۔ میں بھی کسی دن آپ کو دیکھنے آؤں گا۔''

☆☆☆

کوئی نہیں جانتا کہ حادثے کس انداز میں اور کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔

یہ حادثے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ انسان ان کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ اپنی بے بسی پر سوائے آنسو بہانے کے اور کچھ نہیں کر سکتا۔

سعید کی موت بھی اسی طرح ہوئی تھی۔ بالکل اچانک۔ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ہنستا کھیلتا، اپنی گڑیا سے بے پناہ پیار کرنے والا شخص اس طرح خاموش ہو جائے گا کہ کسی کی پکار کا بھی جواب نہیں دے گا۔ اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور اس ایکسیڈنٹ نے اس کی جان لے لی۔

ایسے حادثے برداشت ہوتے نہیں ہیں، کر لیے جاتے ہیں۔ زندہ رہ جانے والوں کی خاطر۔ نازیہ نے بھی برداشت کر لیا تھا کیونکہ اب اسے گڑیا کو دیکھنا تھا۔ اس کی پرورش کرنی تھی۔ اس کو ماں کے پیار کے ساتھ باپ کی شفقت بھی دینی تھی۔

گڑیا پورے گھر میں باپ کو تلاش کرتی پھرتی۔ کئی دنوں تک تو نازیہ کو یہ ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے اعصاب منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے سب کچھ جھوٹ ہو۔

سعید کی موت جھوٹی ہو۔ محلے والے، عزیز رشتے دار سب اس سے جھوٹ بول رہے ہوں۔ سعید مرا نہیں ہو۔ وہ زندہ ہو۔ صرف نازیہ اور گڑیا کو پریشان کرنے، انہیں ستانے کے لیے کہیں چھپ گیا ہو۔ وہ پہلے بھی اس قسم کا کھیل کھیلتا تھا۔ پھر سامنے آ جاتا تھا۔ ایک بار پھر سامنے آ جائے گا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔

اس خوب صورت گھر کے در و دیوار پر اداسی مسلط ہو گئی۔ آنے جانے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی چلی گئی اور ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ لوگ کچھ دنوں تک تو ساتھ دیتے ہیں پھر تنہائی ہو جاتی ہے اور اس تنہائی کے دوران ایک آدمی نازیہ سے ملنے اس کے گھر آ گیا۔ نازیہ اسپتال نہیں جا رہی

تھی۔ آنے والا اس کے لیے اجنبی تھا۔ لیکن اس کی آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

''میں نے جب آپ کے شوہر کے انتقال کی خبر سنی تو یقین کریں مجھے بہت افسوس ہوا۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے۔ خوشیاں راس کیوں نہیں آتیں۔ ہنستا بستا گھر ویران کیوں ہو جاتا ہے۔ کاش کسی کے پاس اس سوال کا جواب ہوتا۔''

''آپ کی ہمدردی کا بہت بہت شکریہ۔'' نازیہ دھیرے سے بولی۔ ''لیکن میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ ویسے آپ کی آواز کچھ جانی پہچانی لگ رہی ہے۔''

''میں وہی ہوں جو کسی کو اداس نہیں دیکھ سکتا ڈاکٹر نازیہ۔'' اس نے کہا۔ ''جو بچوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لایا کرتا ہے۔ آپ کے اسپتال میں آنے والا جوکر۔''

''کیا؟'' نازیہ کو جھٹکا سا لگا تھا۔ ''آپ...... آپ وہی ہیں؟''

''ہاں میں وہی ہوں۔ ویسے میرا نام توقیر ہے۔''

''ارے آپ تو خاصے معقول انسان ہیں۔'' نازیہ بول پڑی پھر خود ہی جھینپ گئی۔

''جی ہاں۔'' توقیر مسکرا دیا۔ ''آپ نے اس لیے نہیں پہچانا ہوگا کہ میں اپنے چہرے پر دنیا بھر کے رنگ تھوپ کر سامنے آیا کرتا ہوں۔''

اس دوران گڑیا بھی دوسرے کمرے سے آگئی۔ وہ نازیہ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

''بیٹا! یہ تمہارے جوکر انکل ہیں۔'' نازیہ نے بتایا۔

''ہاں بیٹا، میں تمہارا جوکر انکل ہوں۔'' توقیر نے کہا۔ ''آؤ میرے پاس آؤ۔''

''جوکر انکل، آپ ایسے کیوں ہوگئے؟''

''بیٹا، میں ایسا ہی ہوں۔'' توقیر نے کہا۔ ''وہ تو میں تم لوگوں کو ہنسانے کے لیے جوکر بن کر آتا ہوں۔''

''میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ جب تک آپ گڑیا سے باتیں کریں۔''

نازیہ ملازمہ کو ہدایت دے کر جب واپس آئی تو گڑیا توقیر سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد وہ اچھی طرح کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا جوکر انکل اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

نازیہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ توقیر نے اس کی کیفیت محسوس کر لی تھی۔ ''دیکھیں۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ ہی اسے سنبھال سکتی ہیں۔ اسے تحفظ کا احساس دلا سکتی ہیں۔ اس معصوم کے لیے وہ وقت واپس تو نہیں آسکتا لیکن آپ اسے ہنستی کھیلتی زندگی کی طرف ضرور لاسکتی ہیں۔''

''یہ اپنے ڈیڈی سے بہت اٹیچڈ تھی توقیر صاحب اور ان کا بھی یہ حال تھا کہ جب تک یہ سو نہیں جاتی، وہ جاگتے رہتے۔ دو قدم پر اسکول ہے لیکن خود پہنچانے جاتے تھے۔''

''اور ڈیڈی...... مجھے راستے میں کہانیاں بھی سناتے تھے۔ میں ان کی ٹائی کی ناٹ بھی ٹھیک کرتی تھی۔''

''ہاں، یہ ان کی عادت تھی۔ وہ جان بوجھ کر گڑیا کو ستانے کے لیے ناٹ غلط لگاتے تھے اور گڑیا ٹھیک کرتی تھی۔''

گڑیا نے رونا شروع کر دیا۔

''بری بات بیٹا اس طرح روتے نہیں ہیں۔ چلیں، میں آپ کو آئسکریم کھلا کر لاتا ہوں۔'' توقیر نے اجازت طلب نگاہوں سے نازیہ کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں اسے لے جاسکتا ہوں؟''

''توقیر صاحب، آپ پر پورا بھروسا ہے مجھے۔'' نازیہ نے کہا۔

توقیر گڑیا کو لے کر چلا گیا۔ نازیہ کے لیے یہ بہت اچھا تھا کہ گڑیا کسی طرح باہر جانے پر راضی ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں واپس آئے تو گڑیا ہنس رہی تھی۔ اس کے جوکر انکل نے کمال کر دکھایا تھا۔

☆☆☆

شہر کے ایک اور حصے میں کچھ جرائم پیشہ ایک کمرے میں موجود تھے۔

پولیس کو کچرے کے ڈھیر سے جو لاش ملی تھی اور بعد میں پتا چلا کہ اس کے چہرے پر میک اپ ہے۔ میک اپ صاف ہونے کے بعد جو چہرہ سامنے آیا وہ ایک بدمعاش شیدے کا تھا۔

پولیس کو بھی اس کی تلاش تھی اور اس گروہ کو بھی۔ شیدہ پہلے اسی گروہ میں شامل تھا پھر وہ اس گروہ کو دھوکا دے کر بھاگ نکلا تھا۔

اس گروہ کے سرغنہ کے حکم پر اسے قتل کر کے اس کی لاش کچرے پر پھینک دی گئی تھی۔ پھر کسی نے اس کے چہرے پر میک اپ کر دیا تھا۔

کچھ دنوں کی بھاگ دوڑ کے بعد شیدے کا اصل قاتل گرفتار ہوگیا تھا لیکن اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا کہ لاش کے چہرے پر میک اپ کیوں اور کس نے کیا تھا۔

پھر یہ بات واضح ہوگئی کہ لاش کے چہرے پر اس لیے میک اپ کیا گیا تھا کہ اس کو کوئی اور روپ دیا جائے۔ کوئی اور شخصیت ظاہر کیا جا سکے۔

لیکن ایسا کس نے کیا ہوگا؟

ظاہر ہے، ہزار چہرے والے نے۔ کیونکہ مرنے والے شیدے کی جیبوں سے جعلی وزیٹنگ کارڈز بھی ملے تھے۔ ان میں ایک کارڈ فرنانڈس کا بھی تھا۔

شیدے کے قاتل کو بھی توقیر نے گرفتار کیا تھا۔ گتھیاں سلجھنے کے بعد یہ بات سامنے آگئی تھی کہ ہزار چہرے والا کسی کا قاتل نہیں ہے۔ بلکہ اس نے صرف اپنی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

گڑیا اب جوکر انکل سے بہت مانوس ہوگئی تھی۔

حالانکہ جوکر انکل اس کے گھر پر بالکل عام لوگوں کی طرح آتے۔ ان کے چہرے پر رنگ بھی نہیں ہوتے تھے۔ ان کا لباس بھی بہت سلیقے کا ہوتا تھا۔ وہ الٹی سیدھی حرکتیں بھی نہیں کرتے تھے اس کے باوجود جوکر انکل سے اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ جوکر انکل اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

نازیہ نے پھر سے اسپتال جانا شروع کر دیا۔ جہاں توقیر بچوں کو بہلانے کے لیے پہلے کی طرح جوکر بن کر آیا کرتا۔ کبھی کبھی گڑیا بھی اس کا یہ تماشا دیکھنے کے لیے چلی آتی۔ اس وقت اسے بہت فخر کا احساس ہوتا۔ دوسرے بچے تو جوکر انکل کو بس جوکر کے طور پر جانتے تھے لیکن گڑیا جانتی تھی کہ جوکر انکل کا اصل نام کیا ہے۔ ان کی صورت شکل کیسی ہے۔

نازیہ نے ایک دن توقیر سے دریافت کیا۔ ''توقیر صاحب! آخر آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا دکھ ہے آپ کو؟''

''میں اپنے بیٹے سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہا ہوں۔'' توقیر نے بتایا۔ ''وہ بھی خون کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ چھن گئی تھی پھر ایک شام میں نے اسپتال میں اسے ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس نے بتایا کہ ایک جوکر انکل بچوں کو ہنسانے کے لیے آئے تھے پھر اس نے مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ میں بھی بچوں کو ہنسایا کروں گا۔ بس میں بھی جوکر انکل بن گیا۔''

''گڑیا آپ سے بہت مانوس ہوگئی ہے۔'' نازیہ نے کہا۔ ''باپ کی موت کے بعد وہ بجھ کر رہ گئی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ آپ کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ بھی واپس آرہی ہے۔ یہ آپ کا بہت بڑا احسان ہے۔ ویسے تو اسکول جاتے ہوئے آج بھی اپنے ڈیڈی کو اس کی نگاہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔''

''ہاں، آپ نے بتایا تھا کہ گڑیا ان ہی کے ساتھ اسکول جاتی تھی۔''

''صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ آپ کو یہ بھی بتا چکی ہوں کہ وہ شرارت کے طور پر اپنی ٹائی کی ناٹ غلط لگاتے تھے تو گڑیا اس کو ٹھیک کرتی تھی۔ خدا جانے اچھے دن اتنی جلدی کیوں چلے جاتے ہیں۔''

''ہاں، اچھے دن ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ بے وفا سے۔ کچھ دیر کے لیے دل کو بہلائے رکھتے ہیں۔ اس کے بعد کہیں گم ہو جاتے ہیں۔'' توقیر نے کہا۔

''اس کی باتیں نازیہ کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ اس شخص کے مزاج میں ایک خاص قسم کا ٹھہراؤ تھا۔ ایک طرف تو اس کی الٹی سیدھی جوکروں والی حرکتیں اور دوسری طرف ایسا سلجھا ہوا انسان جس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور بہت سے غم اپنے سینے میں چھپا رکھے تھے۔

نازیہ کو اب اس کے آنے کا انتظار رہنے لگا تھا۔ گھر پر یا اسپتال میں۔ توقیر اس کے لیے اپنے دونوں روپ میں محترم ہوتا جا رہا تھا۔

نازیہ کی طرح گڑیا کو بھی اس کا انتظار رہنے لگا تھا۔ جوکر انکل بھی اس سے شاید اتنا ہی پیار کرتے تھے جتنا پیار اسے اپنے ڈیڈی سے ملا تھا۔

ایک شام توقیر جب نازیہ کے گھر آیا تو بہت اداس اور الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گڑیا اس وقت اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔

''خیریت تو ہے۔ آج آپ کچھ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔'' نازیہ نے پوچھا۔

''ہاں، کسی بڑے فیصلے پر پہنچنے سے پہلے انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔'' توقیر نے کہا۔

''کیسا بڑا فیصلہ؟''

''ہوسکتا ہے کہ کل کے بعد میں بچوں کو خوش نہ کر سکوں۔ ان کا جوکر انکل ان کے پاس نہ آئے۔ کل کا تماشا آخری ہو۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، کیوں؟''

''بہتر یہی ہے کہ ابھی اس سوال کا جواب نہ لیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ شاید یہی میرے حق میں بلکہ شاید آپ کے حق میں بھی بہتر ہو۔ آپ کو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا کہ میرے کتنے چہرے ہیں اور اب میرے لیے اتنے چہروں

کے ساتھ زندہ رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ آنے والے دنوں کی بھلائی کے لیے میں وہ راستہ اختیار کرلوں جو وقتی طور پر تو پریشان کرنے والا ہو۔ تکلیف دہ ہو۔ لیکن آگے جا کر سکون اور اطمینان دے سکے۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اور گڑیا اس جوکر کو کل کے بعد دیکھنا بھی پسند نہ کریں لیکن جوکر انکل کا آخری تماشا گڑیا کو ہمیشہ یاد رہے گا۔''

☆ ☆ ☆

تنویر آفس ہی میں تھا کہ کسی کا فون موصول ہوا۔ کوئی اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''ہیلو، میں انسپکٹر تنویر بول رہا ہوں۔'' تنویر نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب، آج ایک بہت بڑے مجرم نے خود کو آپ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

تنویر کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ یہ آواز کچھ مانوس سی معلوم ہو رہی تھی۔''کون ہو تم؟''

''ہزار چہرہ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''کیا؟''

''ہاں بھئی، کیا ہزار چہرے والے کو گرفتار کرنا پسند نہیں کرو گے؟''

تنویر نے اب وہ آواز پہچان لی تھی۔''توقیر، توقیر بھائی، یہ آپ بول رہے ہیں؟''

''ہاں میرے بھائی، یہ میں ہوں ہزار چہرہ۔ تمہارا بھائی توقیر۔''

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔'' تنویر یقین نہ کرنے والے انداز میں بولا۔

''ہاں بھائی، یہ سچ ہے۔ میں ہی ہوں ہزار چہرہ۔ لیکن میں نے کبھی کسی پر تشدد نہیں کیا۔ کسی کا خون نہیں کیا۔ کبھی کسی ایماندار تاجر یا دولت مند کو دھوکا نہیں دیا۔ دو نمبر کے لوگ میرا شکار بنتے رہے ہیں۔ البتہ دھوکا دینے کے لیے ایک ایسی لاش پر میک اپ کردیا تھا جو کچرے کے ڈھیر پر پڑی تھی۔ اس کی جیبوں میں بہت سارے کارڈ ز ٹھونس کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ ہزار چہرے والا مر گیا ہے لیکن اب میں اپنے آپ کو خود ہی ظاہر کررہا ہوں۔ ہاں ایک بات اور......''

وہ بول رہا تھا اور تنویر سکتے کے عالم میں یہ سب سن رہا تھا۔

''میرے بھائی، تمہیں اس بات کی الجھن تھی نا کہ ہزار چہرے والا جمعہ، ہفتہ اور اتوار کے دن واردات کیوں نہیں کرتا۔'' توقیر نے کہا۔''تو میرے بھائی اس کی وجہ یہ ہے کہ میں یہ تین دن مریض بچوں کے ساتھ گزارا کرتا ہوں۔ آج میں اسپتال میں آخری شو دکھا رہا ہوں۔ کیا تم مجھے گرفتار نہیں کرو گے؟'' اپنا فرض ادا نہیں کرو گے؟''

تنویر کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ توقیر بھائی اتنے سارے بچوں میں تحائف اور دوائیں تقسیم کرنے کے لیے پیسے کہاں سے لایا کرتے تھے۔

''بتاؤ، تم آرہے ہو نا؟''

''آرہا ہوں بھائی۔'' تنویر خود پر قابو پاکر بولا۔ ''آرہا ہوں۔''

☆ ☆ ☆

جوکر انکل بچوں کو اپنا آخری شو دکھا رہے تھے۔ نازیہ اور گڑیا بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔ آج جوکر انکل نے کچھ زیادہ ہی تماشے دکھائے تھے۔ سب بچے ہنس ہنس کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ گڑیا تالیاں بجا رہی تھی۔

اسی وقت پولیس گاڑیوں کے سائرن نے ماحول کو بدل کر رکھ دیا۔ جوکر اپنا تماشا دکھاتے دکھاتے رک گیا تھا۔ پولیس وارڈ میں داخل ہوگئی۔

تنویر جوکر کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔''بھائی، میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

''ضرور، لیکن اتنی اجازت دو کہ میں اپنا حلیہ تبدیل کرلوں۔ اس روپ میں گرفتار ہونا اچھا نہیں لگتا۔''

تنویر نے گردن ہلا دی۔ توقیر ایک بیگ اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اب وہ کوئی جوکر نہیں بلکہ ایک باوقار معزز آدمی تھا۔

اس نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ جس پر اس نے ٹائی باندھ رکھی تھی۔ وہ گڑیا کے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور گڑیا بول پڑی۔''انکل آپ نے تو ٹائی کی ناٹ ہی غلط باندھی ہے۔''

''چلو ٹھیک کردو۔''

نازیہ رو رہی تھی۔ گڑیا نے ٹائی کی ناٹ درست کی۔ توقیر نے گڑیا کو دیکھا۔ وارڈ کے بچوں کو دیکھا اور سب کو خدا حافظ کہتے ہوئے اس انداز سے نازیہ کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، میں لوٹ کر آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

نازیہ نے اس کی خاموش زبان سمجھ کر اپنی گردن ہلا دی۔ کچھ دیر پہلے کا چہکتا ہوا ماحول اچانک اداس...... بہت

کچھ خواب ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقیقت اور خواب کے درمیان ہوتے ہیں۔

پتا نہیں چلتا کہ جو کچھ دیکھا تھا، وہ خواب تھا۔ یا اب جو کچھ سامنے ہے وہ خواب ہے۔ ''ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب سے۔''

عدیل کا خواب کچھ ایسا ہی تھا۔

وہ ایک سرنگ میں تھا۔ بہت طویل سرنگ تھی اور بالکل اندھیری۔ البتہ بہت دور روشنی کا ایک دھبا سا ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ جب چاہے گا اس خواب سے بیدار ہو جائے گا۔

خواب ہی میں اُسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ جیسے اس کے سامنے کوئی دلچسپ کھیل ہو رہا ہو اور کچھ دیر میں یہ تماشا ختم ہو جائے۔

لیکن وہ آگے بڑھتے رہنے پر مجبور تھا۔ کوئی طاقت اسے آگے کی طرف دھکیل رہی تھی۔ روشنی کے اس دھبے کی طرف جو

پُراسرار خواب کے سلسلے کا انوکھا انجام......

خواب ایسے سوداگر ہوتے ہیں... جو اپنی من چاہی دنیا میں لے جاتے ہیں... کچھ خواب ہمیں حقیقت کی دنیا میں بسے محسوس ہوتے ہیں... لاشعور سے شعور تک سفر وہ کیسے اور کب طے کرتے ہیں ہمیں اس کا احساس تک نہیں ہوتا... ایک ایسے ہی خواب پرست کا احوال وہ خواب دیکھتا تھا اور خوف کے حصار میں قید ہو گیا تھا... اس قید سے رہائی ہی اس کی زندگی کا ضامن تھی

وہ خواب

سرور اکرام

اب کچھ واضح ہو گیا تھا۔

پھر اس نے ایک آواز سنی۔ ”یہ ہمارا پہلا پڑاؤ ہوگا۔ اس میں پہلے آدمی کو اپنی قربانی دینی ہوگی۔“

نہ جانے کس کی آواز آئی اور وہ کیسی قربانی کی بات کر رہا تھا۔ پھر پڑاؤ سے کیا مراد تھی سرنگ میں پڑاؤ کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

نادیدہ طاقت اسے آگے کی طرف دھکیلتی رہی۔ روشنی کا وہ دھبا اور واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ ایک چبوترا تھا جس پر کسی طرف سے روشنی پڑ رہی تھی۔ اس نے اس روشنی میں ایک آدمی کو دیکھا جس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور دوزانو بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک آدمی چمکتی ہوئی تلوار لیے کھڑا تھا۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا جیسا پرانی تاریخی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔

اسے ذرا سی دیر کے لیے خوف محسوس ہوا۔ اس نے چاہا کہ وہ نیند سے بیدار ہو جائے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب اس عذاب کو جاری نہیں رہنا چاہیے، بہت ہو گئی۔

اس نے خواب ہی میں سوچا کہ جب وہ بیدار ہوگا تو اپنے کمرے میں اپنے بستر پر ہوگا اور سب کچھ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے تلوار والے نے اپنی تلوار اٹھائی اور دوزانو بیٹھے ہوئے شخص کی گردن اڑا دی۔

خون کے چھینٹے عدیل کے چہرے پر بھی آئے اور وہ نیند سے بیدار ہو گیا۔ وہ اپنے ہی کمرے میں تھا، اپنے بستر پر۔ جیسا اس نے خواب میں سوچا تھا کہ جب وہ بیدار ہوگا تو اپنے ہی کمرے میں ہوگا۔

اس نے اپنے چہرے پر نمی محسوس کی۔ اس نے اپنی ہتھیلی اپنے چہرے پر پھیری۔ وہ خون نہیں تھا پسینا تھا۔ وہ پوری طرح پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

وہ اٹھ بیٹھا۔ اس خواب نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ بہت ہی بے تکا خواب تھا لیکن خواب تو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ پریشان کر دینے والے۔

اس کی بیوی اس کے لیے بیڈ ٹی لے کر آ گئی تھی۔

”ارے کیا ہوا آپ کو، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ عارفہ نے پوچھا۔

”ہاں، ہاں ٹھیک ہوں۔“ اس نے کھوئی کھوئی آواز میں جواب دیا۔

”پھر اتنے پسینے پسینے کیوں ہو رہے ہیں؟“ عارفہ نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، ایک خواب دیکھا تھا۔“ عدیل نے بتایا۔ ”لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ میں جاگ گیا ہوں۔ میری خوب صورت بیوی میرے لیے چائے لے آئی ہے۔ کھڑکی سے باہر دنیا روشن ہے۔ پرندوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ سب ٹھیک ہو چکا ہے۔“

”جائیں، چائے پی کر شاور لے لیں۔ میں جب تک ناشتا لگاتی ہوں“ عارفہ نے پیار سے کہا اور بہار کے تازہ جھونکے کی طرح چہکتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

وہ ایک خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔

اچھا کاروبار تھا۔ اپنا گھر تھا۔ پیار کرنے والی خوب صورت بیوی تھی۔ پچھلے سال ایک بچہ بھی پیدا ہوا تھا۔ گاڑی تھی۔ بینک بیلنس تھا۔ یعنی بظاہر ابھی تک کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن اس غیر معمولی خواب نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔

وہ شاور لیتے ہوئے بھی اسی خواب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس خواب کے حوالے سے ایک عجیب بات یہ تھی کہ اسے خواب میں بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور جب چاہے اس سلسلے کو ختم بھی کر سکتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔ ایسا لگا جیسے وہ اس خواب کو مکمل دیکھنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔

ناشتے کے بعد وہ بیوی کو خدا حافظ کہہ کر اور بچے کو پیار کر کے اپنے کام کی طرف چلا گیا۔ دن بھر کی مصروفیت میں اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے کوئی پریشان کرنے والا خواب بھی دیکھا تھا۔

اس کے بعد پھر سب ٹھیک ہو گیا۔

اس رات اس نے کوئی خواب نہیں دیکھا۔ دوسری اور تیسری رات بھی نہیں۔ خوابوں کا کیا ہے۔ وہ تو اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی دکھائی دے گئے اور کبھی غائب ہو گئے۔

لیکن پانچویں یا چھٹی رات کو پھر وہی خواب نظر آیا۔

اس بار یہ خواب وہاں سے شروع ہوا تھا جہاں پچھلا خواب ختم ہوا تھا۔ یعنی اس چبوترے سے۔ اور اس لاش سے جس کی گردن کٹی ہوئی تھی۔

اسے پھر آگے کی طرف دھکیلا جا رہا تھا۔ وہی سرنگ تھی۔ جو نہ جانے کتنی دور چلی گئی تھی۔ اندھیری اور بہت فاصلے پر روشنی کا ایک اور دھبا۔

وہ قوت اسے آگے کی طرف دھکیلتی رہی۔ اس بار اس نے احتجاج کیا۔ وہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اس نے یہ احتجاج خواب میں کیا تھا یا وہ واقعی احتجاج کر رہا تھا۔

"نہیں، مجھے یہ خواب نہیں دیکھنا۔" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "مجھے اٹھ جانا چاہیے، فوراً۔"

لیکن وہ اٹھ نہیں پایا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسمسا رہا ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہے۔ جاگ جانا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ آگے بڑھتا رہا۔ وہ خود نہیں بڑھ رہا تھا بلکہ کوئی طاقت اسے مسلسل دھکیل رہی تھی اور پہلے کی طرح اس بار بھی روشنی کا وہ دھبا واضح اور بڑا ہوتا چلا جا رہا تھا۔

روشنی کا وہ دھبا واضح ہوتا چلا گیا۔ یہ بھی ایک چبوترا تھا۔ جو دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آواز سنائی دی۔ "یہ آواز ایسی تھی جیسے کوئی اعلان کیا جاتا ہے۔" ہمارا دوسرا پڑاؤ آ گیا ہے۔ اس پڑاؤ پر بھی ایک آدمی کی قربانی ہو گی ہے۔"

وہ دوسرے پڑاؤ کے پاس پہنچ گیا۔ ایک آدمی اسی طرح دوزانو بٹھایا گیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور ایک آدمی اس کے برابر میں تلوار لیے کھڑا تھا۔

بالکل ویسا ہی سب کچھ جیسا اس نے پچھلے خواب میں دیکھا تھا۔ اس نے اس بار زیادہ جدوجہد کی۔ "نہیں، ختم کرو یہ سب۔ ختم کرو، مجھے یہ خواب نہیں دیکھنا، نہیں دیکھنا۔" اس نے بیدار ہونے کی بھی کوشش کی لیکن صرف ہاتھ پاؤں چلا کر رہ گیا۔

تلوار والے نے ایک مکروہ ہنسی کے ساتھ بندھے ہوئے آدمی کی گردن اڑا دی۔ اس دفعہ اس سین میں ایک اضافہ تھا۔ پچھلی بار بالکل خاموشی رہی تھی لیکن اس بار وہ تلوار والا شخص ہنسا تھا۔

بندھے ہوئے آدمی کی گردن اڑ گئی۔

خون کے چھینٹے اڑے جو عدیل کے چہرے پر گرے۔

اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی بیوی اس کے سامنے پانی کا گلاس لیے کھڑی تھی۔

عدیل کو بیدار دیکھ کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ عدیل سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

"ارے کیا ہو گیا تم کو، کیوں رو رہی ہو؟"

"کیا ہو گیا تھا آپ کو؟ آپ کو کتنی آوازیں دیں۔ کتنا جھنجوڑا، لیکن آپ کوئی جواب ہی نہیں دے رہے۔ پھر آپ کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیے تو آپ ہوش میں آ گئے۔ کیا ہوا تھا آپ کو؟ ایسی مدہوشی کیوں ہو گئی تھی؟ بتائیں نا، میں آپ کے لیے بیڈ ٹی لے کر آئی تھی لیکن جب یہ دیکھا کہ آپ عجیب انداز سے ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں تو پھر میں گھبرا گئی۔"

"عارفہ! میں ابھی اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔" عدیل نے کہا۔ "کچھ دیر کے بعد بتاؤں گا۔"

ناشتے کے بعد اس نے عارفہ کو اپنے ان خوابوں کے بارے میں بتا دیا۔

"توبہ توبہ۔ یہ تو شیطانی خواب ہیں۔" عارفہ نے کہا۔ "کوئی سورۃ وغیرہ پڑھ کر سویا کریں۔ آج سے میں آپ پر دم کر دیا کروں گی۔"

پہلی بار اس نے جو خواب دیکھا تھا، اس کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا تھا لیکن اس دوسرے خواب نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ کوئی الجھی ہوئی بات۔ کوئی نفسیاتی گرہ۔

اس نے اپنے ایک دوست کو فون کر کے صورت حال بتا دی۔ اس کا وہ دوست ایک ڈاکٹر تھا۔ لیکن میڈیکل ڈاکٹر۔

کچھ دیر بعد عدیل کے پاس پہنچ گیا تھا۔ "ہاں یار، پھر سے بتاؤ، کیا صورت حال ہے۔"

عدیل نے پوری تفصیل سے صورت حال بتا دی۔ "سمجھ گیا۔ کوئی نہ کوئی نفسیاتی وجہ ہے اور اس کا صحیح مشورہ کوئی سائیکاٹرسٹ ہی دے سکتا ہے۔"

"کیا تم کسی کو جانتے ہو؟"

"ہاں، ڈاکٹر ضیا کو۔ وہ ایک بڑے سائیکاٹرسٹ ہیں۔ وہ تمہارا نفسیاتی تجزیہ کر کے تمہیں صورت حال بتا دیں گے۔"

خود اس نے ڈاکٹر ضیا کو فون کر کے ان سے وقت لے لیا تھا۔

دو دنوں کے بعد عدیل ڈاکٹر کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کا دوست ڈاکٹر بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ ڈاکٹر ضیا نے بہت غور سے اس کی کہانی سنی تھی۔

پھر بہت دیر بعد اس نے بتایا۔ "بہت گہرائی کوئی وجہ ہے جو بظاہر آپ کو یاد نہیں آ رہی لیکن جب میں آپ کو ٹرانس میں لے جاؤں گا تو پھر آپ کے لاشعور میں پوشیدہ یہ خواب سامنے آ جائے گا۔"

"ڈاکٹر صاحب! کیا یہی علاج ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، یہ علاج نہیں بلکہ مرض کی تشخیص ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "علاج کا مرحلہ تو اس کے بعد شروع ہوگا۔ آپ کے ذہن کو کھرچ کر وہ تاثر زائل کرنا ہوگا۔"

"او کے ڈاکٹر، میں تیار ہوں۔" عدیل نے کہا۔

"تو پھر آ جاؤ، دوسرے کمرے میں۔" ڈاکٹر نے عدیل کے دوست کی طرف دیکھا۔ "تم یہیں رہو گے۔ تم سمجھتے ہو نا، یہ کسی شخص کی مکمل پرائیویسی کا معاملہ ہوتا ہے۔"

"ہاں، ہاں۔ سمجھتا ہوں میں۔"

عدیل ڈاکٹر ضیا کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ان دونوں کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ دونوں خوش گوار موڈ میں تھے۔ ''لو بھائی۔'' ڈاکٹر ضیا نے عدیل کے دوست کی طرف دیکھا۔ ''اسے کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔''

''خیریت تو ہے، کیا بات ہوئی؟''

موصوف نے چار پانچ مہینے پہلے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ ''سلاٹر ہاؤس'' اس فلم میں اسی قسم کے مناظر تھے۔ وہ مناظر ان کے ذہن سے چپک گئے اور مہینے بعد خواب بن کر پریشان کر رہے ہیں۔''

''خدا کی پناہ! میں تو پریشان ہو کر رہ گیا تھا کہ میرے دوست کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔'' عدیل کے دوست نے کہا۔

''لیکن ڈاکٹر صاحب یہ کیسا خواب تھا جس میں یہ احساس رہتا تھا کہ یہ خواب ہے اور میں جلدی جاگ جاؤں گا یا اپنی مرضی سے جاگ سکتا ہوں۔''

''ہاں خوابوں کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر ضیا نے کہا۔ ''اس میں شعور اور لاشعور دونوں ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ کے ساتھ ایسی کیفیت ہوتی ہے۔''

''کیا یہ خواب دوبارہ بھی آسکتا ہے؟''

''میں نے تو آپ کے ذہن سے اس کو ہٹانے کی کوشش کی ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ آپ دوبارہ بھی دیکھیں، لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔ یہ صرف خواب ہیں۔''

''ایک بات اور پوچھنا تھی کہ دوسرا خواب اس طرح کیوں شروع ہوا جیسے کوئی سیریل چل رہی ہو۔ یعنی جہاں پہلا خواب ختم ہوا تھا وہاں سے دوسرے خواب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔''

''ہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ ایک ہی سیکوئنس کے خواب کہلاتے ہیں۔'' ڈاکٹر ضیا نے کہا۔ ''بہرحال کوشش کرو کہ آئندہ سے کوئی الٹی سیدھی ہارر فلم نہ دیکھا کرو۔ لاشعور اس کا بہت گہرا اثر قبول کر لیتا ہے۔''

ڈاکٹر نے اسے کچھ دوائیں دے دی تھیں جو اس کے اعصاب کو پرسکون رکھنے کے لیے تھیں۔

کئی دن گزر گئے پھر کوئی خواب نہیں آیا اور ایک رات پھر وہی خواب۔ اس بار یہ خواب دوسرے پڑاؤ کے بعد شروع ہوا تھا۔

دوسرے آدمی کی بھی گردن کٹی لاش ایک طرف پڑی ہوئی تھی اور کوئی اسے آگے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ اس بار بھی وہ شعور اور لاشعور کے اسٹیج پر تھا۔

بیک وقت دونوں کیفیات تھیں۔ وہ خواب دیکھ رہا تھا اور نہیں بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے قوت ارادی سے کام لیتے ہوئے اس خواب سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی لیکن یہ ممکن نہیں ہوسکا۔

کوئی طاقت اسے آگے کی طرف دھکیلتی رہی۔ اس بار یہ فاصلہ بہت طویل معلوم ہو رہا تھا۔ اندھیری سرنگ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

ابھی تک روشنی کا وہ دھبا دکھائی نہیں دیا تھا جو پچھلے دو خوابوں میں نظر آتا رہا تھا۔ بس وہ اندھیری سرنگ میں دوڑتا جا رہا تھا بلکہ وہ خود نہیں دوڑ رہا تھا کوئی اسے دوڑا رہا تھا۔ کوئی نادیدہ طاقت کوئی ان دیکھے ہاتھ جو اسے آگے کی طرف دھکیل رہے تھے۔

کچھ دیر بعد روشنی کا وہی دھبا دکھائی دینے لگا۔

اس دھبے کے ساتھ ہی اعلان ہوا۔ ''اور یہ ہے تیسرا اور آخری پڑاؤ۔''

عدیل پھر وہی دردناک منظر دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے پوری قوتِ ارادی کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھوں اور پیروں میں جان ہی نہیں رہی

وہ نادیدہ ہاتھ اسے دھکیلتے جا رہے تھے۔ روشنی کا وہ دھبا بڑا ہو رہا تھا۔ پھر وہ دھبا ایک چبوترے میں تبدیل ہوگیا۔

لیکن آج کے خواب میں اس چبوترے پر کوئی نہیں تھا۔ چبوترہ خالی تھا۔ تلوار بردار اپنی جگہ تلوار لیے کھڑا تھا لیکن قیدی کوئی نہیں تھا۔

عدیل ایک بار پھر وہی منظر دیکھنے سے بچ گیا تھا۔ اس نے اپنے خواب ہی میں اطمینان کی کیفیت محسوس کی۔ اچانک اسے پکڑ لیا گیا۔

دو چار ہاتھوں نے اسے پکڑ لیا۔ وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ ہاتھ اسے چبوترے پر لے گئے۔

اس کو زبردستی دو زانو بیٹھنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ دیے گئے۔ وہ چیخنے لگا۔ تلوار والے شخص نے اپنی تلوار اٹھائی اور اسی وقت کوئی اسے جھنجوڑنے لگا۔ ''انھیں، کیا ہوا ہے آپ کو، اٹھ جائیں خدا کے لیے۔''

اب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بیوی عارفہ اس کے سامنے تھی۔ ''کیا ہوا تھا آپ کو۔ آپ کیوں چیخ رہے تھے؟''

''عارفہ، پھر وہی خواب۔'' اس نے بتایا۔ ''اس بار تو یہ خواب پہلے سے بھی زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ بہت ہی

خطرناک۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے مجھے عین وقت پر جگا دیا۔ ورنہ شاید خواب ہی میں میرا ہارٹ فیل ہو چکا ہوتا۔''

''خدا غارت کرے ایسی فلم کو، جو آپ کے ذہن سے چپک کر رہ گئی ہے۔''

''عارفہ، میں تو ایسی ایسی درجنوں فلمیں دیکھ چکا ہوں۔ یہ معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔''

''اور کیا معاملہ ہوگا۔ آپ پھر ڈاکٹر ضیا کے پاس جائیں۔ ان کے علاج سے آپ میں بہتری آنے لگی تھی۔''

''بہتری آنے لگی تھی سے کیا مراد؟ کیا میں پاگل ہوں؟''

''اوہو، میں یہ کہہ رہی ہوں کہ خوابوں کا یہ سلسلہ تو رک گیا تھا نا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' عدیل نے اعتراف کیا۔

اس بار وہ ڈاکٹر ضیا کے پاس خود ہی گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو پوری کہانی سناتے ہوئے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب، یہ تیسرا خواب کیا معنی رکھتا ہے؟''

''سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر وہ اس فلم کا سیکوئل ہوتا تو آپ پہلے ہی طرح دوسرے دن کی قربانی دیکھتے۔ بہرحال اب آپ کے لیے ایک مشورہ ہے۔''

''وہ کیا ہے ڈاکٹر صاحب؟''

''آپ کچھ دنوں کے لیے کسی پُرفضا مقام پر چلے جائیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آب و ہوا کی تبدیلی سے بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔''

''پُرفضا مقام پر تو ذہنی مریضوں کو بھیجا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب۔'' عدیل نے کہا۔

''کوئی ضروری نہیں۔'' ڈاکٹر مسکرا دیا۔ ''آپ جیسے صحت مند بھی جا سکتے ہیں۔ ہاں ایک بات اور...... کیا آپ کو اندازہ ہے کہ اس قسم کے خواب آپ کو رات کے کس پہر دکھائی دیتے ہیں؟''

''جی ہاں، اچھی طرح۔ کیونکہ اسی وقت عارفہ آ کر مجھے اٹھا دیتی ہے۔ وہ میرے لیے بیڈ ٹی لے کر آتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں اس قسم کا خواب صبح کے وقت دیکھتا ہوں۔''

''ہاں، مجھے بھی ایسا ہی لگتا تھا۔ اب آپ کی بیگم کو آپ کے ساتھ تعاون کرنا ہوگا۔''

''کیسا تعاون؟''

''وہ آپ کو خواب دیکھنے سے روک سکتی ہیں۔''

''ڈاکٹر صاحب، یہ کیسے ممکن ہے؟''

''دیکھیں اس قسم کے خواب بیدار ہونے سے کچھ پہلے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن ان کی پتلیاں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہیں۔ جس کا اندازہ آنکھوں کی موومنٹ سے ہو جاتا ہے۔ خوابوں کے اس پروسیس کو REM کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی RAPID EYES MOVEMENT۔ اس وقت آپ خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ کی بیگم کو یہ قربانی دینی ہوگی کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے پہلے آپ کے لیے چائے لا کر آپ کی آنکھوں کو دیکھتی رہیں جیسے ہی انہیں محسوس ہو کہ آنکھیں گردش کرنے لگی ہیں، فوراً اٹھا دیں پھر وہ خواب مکمل نہیں ہو سکے گا۔''

''ڈاکٹر صاحب! اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ یہ کوئی شیطانی چکر ہے۔''

''کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ویسے یہ طریقہ میڈیکل پوائنٹ سے تو بچکانا ہے۔ اس قسم کے مشورے بچے دیا کرتے ہیں لیکن آپ کے کیس میں ہو سکتا ہے کہ اس سے کوئی فائدہ ہو جائے۔''

''اوکے ڈاکٹر صاحب، میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ کل سے اس ڈیوٹی پر لگ جائے گی۔''

''آپ عام طور پر کب بیدار ہوتے ہیں؟''

''ٹھیک سات بجے۔ جب وہ میرے لیے چائے لے کر آتی ہے۔''

''اوکے، اب ان سے کہیں کہ وہ ساڑھے چھ بجے چائے لے کر آ جائیں۔''

یہ مشورہ سن کر عارفہ بھی پرجوش ہو گئی تھی۔ ''میرا کیا ہے۔ میں تو چھ بجے سے آپ کو دیکھتی رہوں گی۔ خدا کرے کہ اس موذی خواب سے آپ کی جان چھوٹ جائے۔''

''ہو جائے گا۔ ڈاکٹر نے یقین دلایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر دو چار بار مجھے وقت سے پہلے جگا دیا جائے تو وہ خواب میرے لاشعور سے غائب ہو جائے گا۔''

''میں تیار ہوں۔'' عارفہ جلدی سے بولی۔ ''نجانے یہ کیسا شیطانی چکر ہے۔''

دوسری صبح عارفہ چھ بجے اٹھ کر کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ وہ چائے لے کر جب کمرے میں داخل ہوئی تو پورے کمرے میں خون کے چھینٹے تھے۔ عدیل کی کٹی ہوئی گردن بستر پر ایک طرف پڑی ہوئی تھی۔

عارفہ چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ عدیل نے آج وہ خواب وقت سے پہلے دیکھ لیا تھا۔

آوارہ گرد

قسط: 29

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شہزاد احمد خان شہزی نے ہوش سنبھالا تو اسے اپنی ماں کی ایک ہلکی سی جھلک یاد تھی۔ باپ اُس کی نظروں کے سامنے تھا مگر سوتیلی ماں کے ساتھ۔ اس کا باپ بیوی کے کہنے پر اسے اطفال گھر چھوڑ گیا جو یتیم خانے کی ایک جدید شکل تھی، جہاں بوڑھے بچے سب ہی رہتے تھے۔ ان میں ایک لڑکی عابدہ بھی تھی، شہزی کو اس سے اُنسیت ہو گئی تھی۔ بچے اور بوڑھوں کے سنگم میں چلنے والا یہ اطفال گھر ایک خدا ترس آدمی، حاجی محمد اسحاق کی زیر نگرانی چلتا تھا۔ پھر شہزی کی دوستی ایک بوڑھے سرمد بابا سے ہو گئی جن کی حقیقت جان کر شہزی کو بے حد حیرت ہوئی کیونکہ وہ بوڑھا لاوارث نہیں بلکہ ایک کروڑ پتی شخص تھا۔ اس کے اکلوتے بے حس بیٹے نے اپنی بیوی کے کہنے پر سب کچھ اپنے نام کروا کر اسے اطفال گھر میں پھینک دیا تھا۔ ایک دن اچانک سرمد بابا کو اس کی بہو عارفہ ادارے سے لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ شہزی کو اپنے اس بوڑھے دوست کے یوں چلے جانے پر بے حد دکھ ہوا۔ اطفال گھر پر رفتہ رفتہ جرائم پیشہ عناصر کا عمل دخل بڑھنے لگا۔ شہزی نے اپنے چند ساتھیوں سمیت اطفال گھر سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا جس کے نتیجے میں دلشاد خان المعروف گگل خان اور اس کے حواری نے ان پر خوب تشدد کیا، اشرف اور بلال اُن کے ساتھی شہزی گروپ کے دشمن بن گئے۔ گگل خان اپنے کسی دشمن گروپ کے ایک اہم آدمی اول خیر کو اطفال گھر میں یرغمال بنالیتا ہے، شہزی اس کی مدد کرتا ہے اور وہ اس کا دوست بن جاتا ہے۔ شہزی کا دوست اول خیر چوہدری ممتاز خان کے حریف گروپ جس کی سربراہ ایک جوان خاتون مختاری بیگم ہے، سے تعلق رکھتا تھا۔ وہاں وہ چھوٹے استاد کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بڑا استاد کبیل دادا ہے جو زہرہ بانو کا خاص دستِ راست اور اس کا یکطرفہ چاہنے والا بھی تھا۔ زہرہ بانو درحقیقت ممتاز خان کی سوتیلی بہن ہے۔ دونوں بھائی بہنوں کے بیچ زمین کا تنازع عرصے سے چل رہا تھا۔ زہرہ بانو شہزی کو دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کبیل دادا شہزی سے خار کھانے لگتا ہے۔ اس کی وجہ زہرہ بانو کا شہزی کی طرف خاص التفات ہے۔ بیگم صاحبہ کے حریف، چوہدری ممتاز خان کو شہزی ہر محاذ پر شکست دیتا چلا آرہا تھا، زہرہ بانو، کبیل شاہ نامی ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی جو درحقیقت شہزی کا ہم شکل ہی نہیں، اس کا بچھڑا ہوا بھائی تھا۔ شہزی کی جنگ پھیلتے پھیلتے ملک دشمن عناصر تک پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی شہزی کو اپنے ماں باپ کی بھی تلاش ہے۔ ...ر جان جو اس کا سوتیلا باپ ہے، اس کی جان کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ ایک جرائم پیشہ گینگ "اسپیکٹرم" کا زونل چیف تھا، جبکہ چوہدری ممتاز خان اس کا حلیف۔ رینجرز فورس کے میجر ریاض باجوہ ان ملک دشمن عناصر کی کھوج میں تھے لیکن دشمنوں کو سیاسی اور عوامی حمایت حاصل تھی۔ لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لیے شہری کو اعزازی طور پر بھرتی کر لیا جاتا ہے اور اس کی تربیت بھی پادر کے ایک خاص تربیتی کیمپ میں شروع ہو جاتی ہے، بعد میں ان میں شکیلہ اور اول خیر بھی شامل ہو جاتے ہیں، ایک چھوٹی سی غلطی کی صورت میں پادر کو مصلحتاً ڈراپ کر دیا جاتا ہے۔ عارفہ علاج کے سلسلے میں امریکا جاتے ہوئے عابدہ کو اپنے ساتھ لے جاتی ہے۔ اسپیکٹرم کا سربراہ لولوش شہزی کا دشمن بن چکا ہے۔ وہ جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کی ملی بھگت سے عابدہ کو امریکی سی آئی اے کے چنگل میں پھنسا دیتا ہے۔ اس سازش میں بالواسطہ عارفہ بھی شریک ہوتی ہے۔ باسکل ہولارڈ ایک یہودی نژاد کٹر مسلم دشمن اور جے بی سی کے خفیہ دنیا کے مسلم کے خلاف سازشوں میں ان کا دستِ راست ہے۔ باسکل ہولارڈ کی فورس ٹائیگر ٹیگ شہزی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ باسکل ہولارڈ کی لاڈلی بیٹی انجیلا لولوش کی بیوی ہے۔ اڈیسہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں عارفہ اور سرمد بابا کے درمیان چپقلش آخری نہج پر پہنچ جاتی ہے، جسے لولوش اپنی ملکیت رکھتا ہے۔ ایک بودلقیا سیٹھ نوید ساتھ مذکورہ شیئرز کے سلسلے میں ایک طرف تو لولوش کا تاذٹ ہے اور دوسری طرف وہ عارفہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ اس دوران شہزی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ماں باپ کو تلاش کر لیتا ہے۔ اس کا باپ تاج دین شاہ، درحقیقت وطنِ عزیز کا ایک گمنام بہادر غازی سپاہی تھا۔ وہ بھارت کی خفیہ ایجنسی کی قید میں تھا۔ بھارتی خفیہ ایجنسی بلیوٹمکسی کا ایک افسر کرنل سی جی بھجوانی، شہزی کا خاص ٹارگٹ ہے۔ شہزی کے ہاتھوں بیک وقت اسپیکٹرم اور بلیوٹمکسی کو ذلت آمیز شکست ہوتی ہے اور وہ دونوں آپس میں خفیہ گٹھ جوڑ کر لیتے ہیں۔ شہزی، کبیل دادا اور زہرہ بانو کی شادی کرنے کی بات چلانے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں کبیل دادا کا شہزی سے نہ صرف دل صاف ہو جاتا ہے بلکہ وہ بھی اول خیر کی طرح اس کی دوستی کا دم بھرنے لگتا ہے۔ باسکل ہولارڈ، امریکا میں عابدہ کا کیس دہشت گردی کی عدالت میں منتقل کرنے کی سازش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ امریکا میں مقیم ایک بین الاقوامی مبصر اور رپورٹر آنسہ خالدہ، عابدہ کے سلسلے میں شہزی کی مدد کرتی ہے۔ وہی شہزی کو مطلع کرتی ہے کہ باسکل ہولارڈ، سی آئی اے میں ٹائیگر ٹیگ کے دو ایجنٹ اس کو اغوا کرنے کے لیے خفیہ طور پر امریکا سے پاکستان روانہ کرنے والا ہے۔ شہزی ان کے شکنجے میں آجاتا ہے، ٹائیگر ٹیگ کے مذکورہ دونوں ایجنٹ اسے پاکستان سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاز راں کمپنی اڈیسہ کے شیئرز کے سلسلے میں لولوش برما (رنگون) میں مقیم تھا۔ اس کا دستِ راست سے جی کو ہارا، شہزی کو ٹائیگر ٹیگ سے چھین لیتا ہے اور اپنی ایک لگژری بوٹ میں قیدی بنا لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات ایک اور قیدی، ہشام جھنگری سے ہوتی ہے جو کبھی اسپیکٹرم کا ایک ریسرچ آفیسر تھا جو بعد میں تنظیم سے کٹ کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ روپوشی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسپیکٹرم کو واقعی ایک بین الاقوامی معتبر ادارے کی حیثیت حاصل تھی۔ اور مسٹر ... کار کردگی کے چیف ڈائریکٹر اور لولوش

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ان کا نائب تھا، جو ایک جرائم پیشہ شخص تھا، وہ اسپیکٹرم جیسی معتبر تنظیم کو اپنے مجرمانہ مقاصد کے لیے اسے ہائی جیک کر کے خود اس کا سربراہ بن جاتا ہے۔ ہشام اسے پاکستان میں سوئن جو دڑو سے برآمد ہونے والے طلسم نور ہیرے کے راز سے آگاہ کرتا ہے۔ جو چوری ہو چکا ہے اور تین ممالک ہٹلر کی طرح اس ہیرے کی آڑ میں تیسری عالمی جنگ چھڑوانا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے ورلڈ بگ بینگ کا نام دے رکھا ہے۔ لواش اور سی جی بھجوانی کے ایک مشترکہ معاہدے کے تحت سے جی کوہارا کی بوٹ میں بلیوٹکسی کے چندر ناتھ، شیام اور کورنیلا آتے ہیں۔ وہ شہزی کو آنکھوں پٹی باندھ کر بلیوٹکسی کے ہیڈکوارٹر لے جاتے ہیں، وہاں پہلی بار بلیوٹکسی کے چیف سی جی بھجوانی کو شہزی اپنی نظروں کے سامنے دیکھتا ہے، کیونکہ یہ وہی درندہ صفت شخص تھا جس نے اس کے باپ پر اس قدر تشدد کے پہاڑ توڑے تھے کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھا تھا۔ اب پاکستان میں شہزی کے باپ کی حیثیت ڈکلیئر ہو گئی تھی کہ وہ ایک محب وطن گمنام سپاہی تھا، تاج دین شاہ کو ایک تقریب میں اعلیٰ فوجی اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے شہزی کی اہمیت بھی کم نہ تھی، یوں بھجوانی اپنے منصوبے کے مطابق اس کی رہائی کے بدلے شہزی کے ساتھیوں، زہرہ بانو اور ادل خیر دغیرہ سے پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے جاسوس سندر داس کو آزاد کروانا چاہتا تھا۔ ایک موقع پر شہزی، اس بری قصاب اسے جی کوہارا اور اس کے ساتھی بھوبک کو بے بس کر دیتا ہے، سوشیلا اس کی ساتھی بن جاتی ہے۔ سوشیلا کے ایل ایڈوانی سے اپنی بہن، بہنوئی اور اس کے دو معصوم بچوں کے قتل کا انتقام لینے اور طلسم نور ہیرا حاصل کرنے کے لیے شہزی کی ساتھی بن جاتی ہے۔ دونوں ایک خونی معرکے کے بعد ایک ساحل پر جا پہنچتے ہیں۔ وہاں ایک بوڑھا جوگی بابا ان کو اپنی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ شہزی کی حالت بے حد خراب ہو چکی تھی۔ جوگی بابا اس کا علاج کرتا ہے وہیں پتا چلتا ہے کہ یہ بوڑھا جوگی لوگوں کے ذریعے لوگوں کا خون نچوڑتا تھا۔ شہزی کے دشمن مسلسل تعاقب کرتے ہوئے اس جھونپڑی تک آ پہنچتے ہیں مگر شہزی اس بوڑھے جوگی کی جھونپڑی کو آگ لگا دیتا ہے اور سوشیلا کے ہمراہ ایک ڈاکٹر کے پاس جا پہنچتا ہے۔ دگرگوں حالات کے باعث شہزی کی حالت ابتر خراب ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسے سرائے میں لے جاتا ہے۔ ڈاکٹر مہارانی اور جوگی کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرتا ہے۔ شہزی کو ایک صبح کلینک سے مہارانی کے کارندے زبردستی اپنی حویلی لے جاتے ہیں۔ مہارانی ان کو قید میں ڈال دیتی ہے۔ اسی اثنا میں پولیس کے ہمراہ شہزی کے دشمن حویلی پر دھاوا بول دیتے ہیں، ان کی گرفت میں آنے سے پہلے ہی شہزی سوشیلا کے ہمراہ فرار ہو جاتا ہے...... اور بھٹکتے بھٹکتے ایک بستی میں جا پہنچتا ہے۔ پولیس ان دونوں کے تعاقب میں تھی۔ مگر شہزی اور سوشی کا سفر جاری رہتا ہے۔ حالات کی سنگین بے ترتیبیوں کے باوجود وہ ان چھوٹی سی بستی میں تھے کہ کوہارا اور چندر ناتھ حملہ کر دیتے ہیں۔ خونی معرکے کے بعد شہزی اور سوشیلا وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہزی کا پہلا ٹارگٹ صرف سی جی بھجوانی تھا۔ اسے اس تک پہنچنا تھا۔ ممبئی ان کی منزل تھی۔ ممبئی میں ان دونوں کو ایک ریسٹورنٹ میں ملنا تھا مگر اس کی آمد سے پہلے ہی وہاں ایک ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ کچھ لوفر لڑکے ایک ریتا نامی لڑکی کو تنگ کر رہے تھے۔ شہزی کافی دیر سے یہ برداشت کر رہا تھا۔ بالآخر اس کا خون جوش میں آیا اور ان غنڈوں کی اچھی خاصی مرمت کر ڈالی۔ ریتا اس کی مشکور تھی۔ اسی اثنا میں ریتا کے باڈی گارڈ وہاں آ جاتے ہیں اور یہ روح فرسا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ ایل کے ایڈوانی کی پوتی ہے۔ ان کے ساتھ آسمان سے گرے کھجور میں اٹکنے والا معاملہ ہو گیا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

سوشیلا کے لہجے میں زہر کی کاٹ تھی......

حالات جس تیزی اور غیر متوقع انداز میں پلٹا کھا رہے تھے، اس نے مجھے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تاہم اتنی ہی تیزی کے ساتھ مجھے ان ساری باتوں کا وجدان بھی عطا ہو رہا تھا کہ میری قوتِ مشاہدہ بھی وقت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ جس کے مطابق، ریتا کا مجھ سے ایکا ایکی بددل ہو جانا اور اسے ایک حد تک میری حقیقت کا پتا لگنا، میری بدقسمتی ہی تھی، ورنہ تو میں ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھیک ٹھاک پوزیشن میں آ چکا تھا۔ مگر اب تو وہ پتے بھی ہوا دینے لگے جن پہ تکیہ کیا تھا یعنی اب سوشیلا کا بھی مجھ سے دل خراب ہونے لگا تھا، دشمن ایجنٹ یا دوش، بہرحال یہ ایک ایسا ہی بات سمجھوتا نہیں کر سکتا تھا، نہ ہی وہ خود پر ''غدار'' کا ٹھپا لگانا پسند کرتا، شاید یہی حال سوشیلا کا ہوا تھا۔ مجھے تو لگتا تھا کہ مجھے ایک ملک دشمن ایجنٹ سمجھنے کے بعد وہ اپنی ایڈوانی والی مہم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دے رہی۔ اس پر مجھے سخت پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ مجھے اپنے سلسلے میں پہلے ہی سوشیلا کو اعتماد میں لے لینا چاہیے تھا......

جب میں نے بلراج سنگھ پر حملہ کیا تھا تو اس وقت بھی سوشیلا کا میرا ساتھ دینے کا ایک اپنا مقصد تھا کہ وہ کسی صورت میں بھی خود کو بلراج سنگھ کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، جانتی تھی وہ اچھی طرح کہ ایک بار وہ ان کے (جنرل ایڈوانی) ہتھے چڑھ گئی تو وہ اس کے ساتھ بھی اس کی بہن والا حشر کریں گے لیکن اب جبکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ ریتا کا اندیشہ تھا کہ اس سے میرا بیان کا کوئی بھی آدمی میرے ساتھ

ہوائے فرانس مہیش کا باپ بھارتی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں آئی پی تھا، اس نے اسی لیے مجھے اس کے حوالے کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اب سوشیلا سے متعلق اتنی صورت حال مجھ پر وجدانی محرکات سے واضح تو ہوگئی تھی کہ وہ ایک طرف خود کو ایڈوانی جیسے درندہ صفت انسان سے بچا رہی تھی اور دوسری طرف مجھے، یعنی ایک ''دیش دروہی'' کو پولیس کے حوالے کر کے اپنے سر سے یہ دوسری مصیبت (ایڈوانی کے بعد والی) یعنی غداری کا دھبا دھونا چاہتی تھی، وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میرا اور اس کا ساتھ ان مخدوش حالات میں زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

کرنل سی جی بھجوانی نے دونوں اطراف سے میرے گرد دائرہ عنکبوت تننا شروع کر دیے تھے۔ ایک طرف وہ اسپیکرم کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلا رہا تھا تو دوسری طرف اس نے پولیس بھی میرے پیچھے لگا دی تھی۔ جس کا صاف مطلب تھا کہ وہ میرے خوف سے اس قدر بوکھلا گیا تھا کہ خود اپنی کارروائی کو بھی ''سیکریٹ'' نہیں رکھ سکا تھا۔ چاہے جیسے بھی سہی، ایک بار میں اس کی گرفت میں آ جاؤں...... ورنہ تو کوئی بھی ملک ہو، ان کی سیکریٹ ایجنسیاں، اپنی بعض خفیہ کارروائیاں اور ''کاز'' کو خفیہ ہی رکھتے ہیں۔

بہرحال میں نے بلاچوں و چرا، کار کو اسی جانب موڑ لیا، جہاں مہیش کی رہائش تھی، تھوڑی دیر پہلے ہم نے اسے ڈراپ کیا تھا۔

''گڈ! تم نے یہ کام کر کے بھارت ماتا کا سر فخر سے بلند کر دیا...... مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے لیکن جہاں بات دیش اور آدرش کی ہوگی، میرا خیال ہے ہر بھارتی کا دل ایک ہو کر دھڑکے گا۔'' رینا نے ستائشی لہجے میں سوشیلا سے کہا۔'' جبکہ میں بہ ظاہر خاموشی سے پُرسوچ انداز میں اپنے دانت بھینچے کار کا اسٹیئرنگ سنبھالے ہوئے تھا۔'' اس پر سوشیلا نے گہری متانت کے ساتھ اس سے کہا۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ میں دھوکے سے اس کے جھانسے میں آگئی تھی۔''

''لیکن پھر تم نے میرے محافظوں کو کیوں چھوڑا، وہ یہ کام بہتر طور پر کر سکتے تھے۔'' رینا نے اس سے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔'' اِدھر میرا ذہن بھی تیزی سے کچھ سوچنے میں مگن تھا۔

''تمہارے دو ووٹ اور ان کے محافظ کا مقصد کچھ اور تھا۔ میرے سلسلے میں...... زندگی رہی تو تمہیں تمہارے دو ووٹ کی بھی اصلیت بتا دوں گی۔ تمہیں......''

''واٹ؟ کیا مطلب؟''

''چھوڑو اس موضوع کو، تم ابھی اپنے سیل پر مہیش سے رابطہ کرو اور......'' سوشیلا کی بات حلق میں ہی رہ گئی۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایک نسبتاً تنگ اور ویران سا موڑ کاٹا اور تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ گھما کر بریک لگا دیے کہ کار مڑتے ہی اسکڈ ہوئی اور ایک طوفانی جھٹکے سے جام ہوگئی، چونکہ میں تو سنبھلا ہوا ہی تھا، مگر رینا اور سوشیلا اس کے لیے تیار نہ تھیں، نتیجتاً انہیں ایک زبردست جھٹکا لگا اور ان کے حلق سے چیخ خارج ہوگئی، ادھر میں نے کار رکتے ہی، ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اپنے اوپری دھڑ کو موڑا اور سوشیلا کے پستول پر ہاتھ مارا، اسے اپنے قبضے میں کرتے ہی، میں نے ان دونوں کو اپنی جگہ محبوس رہنے پر مجبور کر دیا۔ ان دونوں عورتوں کے چہروں سے خوف اور دہشت ٹپکنے لگی تھی اور وہ پھٹی پھٹی متوحش سی آنکھوں سے میرے چہرے کو تکے جا رہی تھیں۔

''میں تم دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا لیکن مس رینا! میری صرف ایک بات غور سے سن لو، میں تمہیں اپنی حقیقت بتانا چاہتا ہوں...... کہ میں اصل میں ہوں کون......''

اتنا کہہ کر میں نے ایک محتاط سی نگاہ گرد و پیش پر ڈالی، ہر سُو تاریک رات کا دم بخود سناٹا طاری تھا۔ یہ تنگ موڑ مین روڈ سے کسی ذیلی سڑک کی طرف مڑتا تھا، جس کے اطراف میں جنگل اور بنجر سا ویرانہ پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

''مس رینا!''

میں نے ایک نظر اس کے ساتھ جڑی بیٹھی سوشیلا پر ڈالنے کے بعد رینا سے مخاطب ہو کے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے دل میں اپنے دیش بھارت کے لیے حب الوطنی کا یہ جذبہ ہے تو اس میں اگر جذبۂ آدم گری اور انسانیت بھی ہے تو یہ تمہاری ایک قابلِ احترام اور قابلِ لحاظ سوچ اور وسیع النظری کہلائے گی، جس کی ہر مذہب اور ہر ملک کے باشندے کو تائید کرنی چاہیے، اس میں تم مجھے بھی شامل کر سکتی ہو لیکن اگر تمہارا جذبہ صرف دیش بھگت تک محدود ہے اور اس کے سامنے تم انسانیت اور اس پر رائج اصولوں کی نفی کرتی ہو تو یہ محض ایک تعصب اور تنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ ایک بات تو طے ہے کہ دنیا کا کوئی بھی

مذہب ہو وہ سب سے پہلے انسانیت کے جذبے کا پرچار کرتا ہے اور اس کے احترام کا درس دیتا ہے۔ بلاوجہ کسی کو ستانا، الزام تراشی کرنا، سازشیں کرنا...... یہ ایک انسان کو زیب نہیں دیتا۔

''تمہاری طرح مجھے بھی اپنے وطن پاکستان سے پیار ہے۔'' لیکن میرے اس جذبۂ حب الوطنی میں کسی تنگ نظری اور برتری کا کوئی غرور نہیں ہے، اب میری بات غور سے سننا۔''

اتنا کہہ کر میں ذرا رکا اور پھر ایک نظر دوبارہ گردوپیش پر ڈالنے کے بعد رینا سے بولا۔ اس کے ساتھ سوشیلا بھی میری باتیں غور سے سن رہی تھی۔

''تمہارے دیش کے مہا پرچکر...... جو آئے دن انسانیت کے پرچار اور سیکولر ہونے کا راگ الاپتے رہتے ہیں، کیا تم ان کے کرتوتوں سے واقف نہیں ہو؟ جبکہ آدھے سے زیادہ بھارتی جنتا کو پتا ہے کہ پاکستان جب سے معرض وجود میں آیا ہے، بھارت نے اسے دل سے تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ ایک مخصوص لابی، جو ابتدا سے ہی میرے وطن پاکستان میں انتشار پھیلانے اور اسے توڑنے کے مذموم عزائم کے منصوبے بناتی رہی ہے، جس کی مثال پاکستان میں را اور اس کے ایجنٹوں کی گرفتاری ہے۔ پاکستان کو دولخت کرنے میں بھی تمہارے ہی ملک کے جرنیلوں، افسروں اور متعصب وجنونی سیاسی شخصیات کارفرما رہی ہیں۔ تمہارے دیش کی...... انتہا پسند ہندو تنظیموں، بجرنگ دل، اکالی دل، شیوسینا، آر ایس ایس نے یہاں اقلیتوں کا جینا حرام کر رکھا ہے، بابری مسجد کا واقعہ، گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام اور مقبوضہ کشمیر میں نہتے بے گناہ لوگوں پر بھارتی مظالم کی ویڈیو اور کوریج تو غیر ملکی صحافیوں نے بھی کی ہے۔ تم کس خوش فہمی میں مبتلا ہو رینا جی......! کہ ان حرکتوں کی وجہ سے خود تمہارے اپنے ہی لوگ اپنے دیش کا منہ پوری دنیا میں کالا کر رہے ہیں اور خوش ہیں کہ وہ دنیا میں مہذب کہلا رہے ہیں۔ ہم نے (پاکستان نے) ان سب باتوں کے باوجود...... ہمیشہ اچھے پڑوسی ہونے کے ناتے پھر بھی بھارت کی طرف دوستی، امن اور بھائی چارے کا ہی ہاتھ بڑھایا ہے، اور ہمیشہ پڑوسیوں سے اچھے تعلقات کا خواہاں رہا ہے، کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور اسلام سب کے ساتھ امن کا درس دیتا ہے، کیونکہ ہم اپنے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے فرمان پر چلتے ہیں کہ اگر تمہارا پڑوسی تم سے خوش نہیں ہے تو تم مومن نہیں، ہو مگر تمہارے ملک کے مہا ویر ہمارے گلے بھی

ملتے ہیں اور اقوام متحدہ میں ہمارے خلاف زہر اگلتے ہیں، یعنی منہ میں رام رام اور بغل میں چھری رکھتے ہیں۔ ہم ایک انسان کی ہلاکت کو پوری انسانیت کی ہلاکت پر تعبیر کرتے ہیں، اچھے برے ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن ہمیں کم از کم اپنی تو کوئی راہ متعین کرنی چاہیے کہ رائج اور مہذب اصولوں کی خلاف ورزی نہ ہو۔

''رینا جی! اب ذرا انسانیت کی نظر سے دیکھو اور سوچو...... اب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کون ہوں...... تو سنو...... میں بے شک ایک پاکستانی محب وطن شہری ہوں، لیکن اس سوچ کے ساتھ کہ اس جذبے سے، انسانیت کا جذبہ متاثر نہ ہو، خواہ وہ کسی اور ملک کا... شہری ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ میں ایک پاکستانی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مسلمان بھی ہوں اور میرا مذہب اسلام مجھے یہی درس دیتا ہے۔ آخر میں ایک اور بات بتادوں جو یقینی طور پر ایک عام محب با شعور شہری کی حیثیت سے تمہیں بھی شاید اس کا کچھ اندازہ ہو۔''

ایک بار پھر میں نے لمحاتی توقف اختیار کیا اور آگے بولا...... ''عام عوام چاہے جس ملک کی ہو، وہ امن پسند ہی ہوتی ہے۔ ان کا مفاد امن عامہ ہی ہوتا ہے لیکن جنگ و جدل، نفرتوں کا زہر پھیلانا، اس کے پس پردہ بعض مفاد پرستوں کا اپنا ذاتی مقصد ضرور کارفرما ہوتا ہے۔ انتہا پسند تنظیمیں ہوں یا سیاسی شخصیات، یہ انہی کے سارے کھیل ہوتے ہیں، جنہیں اپنے اقتدار، اپنی گدی اور شاہانہ طاقتوں سے لبریز اپنی گدی ہی عزیز ہوتی ہے۔ یہ عام عوام کے جذبات کو ابھار کر محض اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اور انہیں آپس میں لڑاتے ہیں اور ان کے شعور اور ان کی سوچوں کو اپنے تابع بنا کر جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی اپنا غلام بنا لیتے ہیں، میں یہی کہوں گا کہ ہر انسان کو اللہ نے عقل دی ہے، وہ حقائق اور شواہد کے مطابق اپنے اور اپنی شعور سے بہت کچھ خود بھی سمجھ سکتا ہے، بجائے اس کے کہ وہ کسی دوسرے کی سوچ سمجھ کو اختیار کرے۔''

اس کے بعد میں نے اسے اپنے باپ کے بارے میں بتایا اور بلوتکسی کے کرنل سی جی بھگوانی کی انسانیت سوز ریشہ دوانیوں کا بھی حال اسے سنایا، اس کے بعد میں نے اس کے اپنے ہی ہیرو (جنرل ایڈوانی) کی سامنے کی مثال بھی دیتے ہوئے اس کے کالے کرتوتوں کے در وا کیے کہ کس طرح وہ عالم انسانیت کو جنگ کی آگ میں جھونکنے کے لیے عمل پیرا تھا۔ یہ حقیقت تو ان بھی سوشیلا کی صورت میں اس

کے سامنے ہی تھی جس کی سوشیلا نے بھی تائید کی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔

''اب بولو مس رینا! کیا کہتی ہو تم اپنے ان مہاویروں کے بارے میں جنہیں تم بھارتی جنتا اپنا نجات دہندہ اور نجانے کیا کیا سمجھتی ہو...... اگر تمہارے اندر ضمیر نام کی بھی کوئی شے ہے تو یقیناً تم اس پر شرمسار ہو گی...... میں جا رہا ہوں...... تم دونوں کو کوئی بھی نقصان پہنچائے بغیر...... لیکن اب سوشیلا کی جان کی حفاظت کی ذمے داری تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ اس کا میں نہیں تمہارا وتو دشمن ہے۔ میں تو انسانیت کے ناتے اس کی مدد کر رہا تھا، اور یوں یہ بھی میرے اس مشن میں شامل تھی کہ ہم دنیا کو تیسری عالمی جنگ کی آگ میں جھونکنے سے بچائیں۔''

یہ کہہ کر میں مڑا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ اسی وقت رینا اور سوشیلا بھی فوراً نیچے اتر آئی تھیں، میں اس وقت پستول اپنی پینٹ کی بیلٹ میں شرٹ کے نیچے اڑس رہا تھا کہ مجھے ان دونوں کی کورس میں آواز سنائی دی۔

''شہزی...... !پلیز رک جاؤ......''

میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ان کی طرف گھوما۔

آسمان پر چاند پوری طرح روشن تھا، اس کے گرد منور تاروں کا حصار قائم تھا۔ سبک خرام ہوا کے جھونکوں سے میرے سر کے بال پیشانی پر دائیں آنکھ کے نیچے لہرا تھرتھرا رہے تھے، میں نے ایک سر کے خفیف جھٹکے سے انہیں پرے کیا اور ان دونوں خواتین کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میرے قریب آ گئی تھیں۔ میں خاموش مگر تیز نظروں سے ان کے بشروں کو دیکھ رہا تھا، جہاں مجھے اپنی باتوں کے مثبت اثرات نظر آ رہے تھے۔

''شہزی! میرا دل تو پہلے ہی کہتا تھا کہ تم بائے نیچر ایک اچھے انسان ہو...... تم نے اپنے جس انداز اور رویے سے مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، کاش! یہ سب کچھ مجھے تم پہلے ہی بتا دیتے تو......'' سوشیلا یہ کہتے ہوئے چپ سی ہو گئی، اس کا لہجہ رندھ سا گیا تھا، رینا نے حوصلہ افزا انداز میں سوشیلا کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور مجھ سے بولی۔

''تم نے اپنے اچھے انسان ہونے کی ایک جھلک مجھے بیچ ریسٹورنٹ میں دکھائی تو تمہارے اس عمل سے میں بے حد متاثر ہوئی۔ لیکن اب جو باتیں تم نے مجھ سے کہیں، وہ تمہارے اس سے بھی زیادہ ایک اچھے انسان ہونے کی غمازی کرتی ہیں۔ سچ کہوں تو میں تمہارے سامنے خود کو بہت چھوٹا انسان سمجھ رہی ہوں اور سوشیلا کے معاملے میں تو میں خود کو اس کی مجرم بھی سمجھنے لگی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ میرے ددو، جن پر ہمیشہ میں اس لیے فخر کرتی تھی کہ وہ اس دیش کے ایک کمانڈر جنرل رہ چکے ہیں لیکن افسوس کہ وہ تو انسانیت کے معیار اور میری نظروں سے بھی خود کو نیچے گرا چکے ہیں۔ اگر تم ہمیں معاف کر دو تو یہ تمہارا ہم پر بڑا احسان ہو گا؟''

''میں معاف کرنے والا کون ہوتا ہوں بھلا۔'' میں نے بے تاثر سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرے لیے یہی بہت ہے مس رینا! کہ آپ نے میری باتوں کو پورے اعتماد اور سچائی کے ساتھ صحیح جانا۔ بس! اب سوشیلا کی ذمے داری تمہیں سونپتا ہوں، اس بے چاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے، ہو سکے تو اسے انصاف دلانے کی کوشش ضرور کرنا، بہ صورت دیگر اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دینا، میرا راستہ اور منزل تو پھر بھی الگ ہی تھا، میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں پلٹا تو سوشیلا مجھے پکارتی ہوئی یک دم میرے سامنے آ گئی اور بولی۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟ کون ہے تمہارا یہاں؟ نہیں جانتے تم کہ سارے دیش کی پولیس اور خفیہ ایجنسی تمہارے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ مجھے اب اپنی کوئی پروا نہیں مگر تم......'' وہ کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی، میں نے غور سے اس کے سندر چہرے کی طرف دیکھا، اس کی کشادہ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ ایک اَن کہے تعلقِ خاطر کا پتا دیتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ نرم لبوں پر ایسا ارتعاش تھا کہ جیسے دل کی آواز ہونٹوں تک آتے آتے ٹھہر جائے۔ جیسے جدائی کے متوقع لمحات کے جاں گسل خوف کا اظہار ایک تاثر کا ثبات بن کر بے زبان خاموشی چیخ اٹھے۔ اسی وقت رینا بھی چند قدم بڑھ کر میرے قریب آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بھی ایک نامعلوم سے کرب کی آنچ دہکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی مجھے......

''نہیں شہزی! تم نہیں جا رہے...... ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں مگر سوشیلا کی یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ تم واقعی ہر طرف سے بڑے خطرات میں گھرے ہوئے ہو بلکہ خود سوشیلا کی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہے۔ پلیز شہزی! اب تو تم نے سب کلیئر کر دیا کہ تمہارا راستہ انسانیت کے خلاف نہیں بلکہ اس کی بھلائی کا راستہ ہے، برے کو برا ہی کہنا اور سمجھنا چاہیے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اچھا انسان سب کے لیے اچھا اور برا سب کے لیے برا ہی ہوتا ہے۔''

''لیکن میری وجہ سے تم بھی کسی مصیبت کا شکار ہو سکتی

ہو۔'' میں نے بگلو خلاصی چاہی۔ حقیقت یہی تھی کہ تازہ کار حالات کی ظہور کاری کے بعد خود مجھے ان مخدوش تر حالات میں اپنے راستے کا تعین کرنا مشکل ہی نظر آرہا تھا۔

''آئی ڈونٹ کیئر، کچھ نہیں ہوگا، ہم مل جل کر راستے آسان بنالیں گے لیکن اس وقت تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تم چلو ابھی میرے ساتھ......''

''کہاں......؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''آؤ تو سہی، بعد میں بتاتی ہوں، وقت بہت کم ہے۔ آؤ سوشی! تم بھی۔''

وہ خاصی جوش میں آگئی تھی۔ وہ کار کی طرف بڑھی۔ ڈرائیونگ سیٹ اس وقت اسی نے سنبھالی، اس نے سوشیلا کو ہی اپنے برابر میں اور مجھے عقبی سیٹ بیٹھنے کا کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد کار فرائے بھرتی ہوئی کسی نامعلوم منزل کی جانب رواں دواں تھی۔

☆☆☆

ہر رات کے بعد صبح ہوتی ہے اور ہر مشکل کے بعد آسانی...... کارزارِ زیست چلانے کے لیے تقدیر کی یہ ظرف کاری ازل سے جاری ہے لیکن میں یہ کہہ سکتا تھا کہ میری راہ میں مشکلات زیادہ اور آسانیاں بہت تھوڑی رہی تھیں۔ ریٹا کی صورت میں ان مخدوش ترین حالات کا پھندا میرے گلے کے گرد کچھ ڈھیلا تو پڑا تھا مگر اترا نہیں تھا۔ ابھی امتحان اور بھی تھے...... یہ کیا کم شکر گزاری کی بات تھی کہ بگڑتے ہوئے حالات یکلخت قابو میں آنے لگے تھے۔ کم سہی، لیکن فوری طور پر جیسے خطرہ میرے گلے کو آن پڑا تھا وہ عارضی طور پر سہی کچھ کم ضرور پڑا تھا۔

سوشیلا اور بالخصوص ریٹا کا میری باتوں سے متاثر ہونا، اس بات کا بین ثبوت تھا کہ میری وہ باتیں صرف زبان سے ہی ادا نہیں ہوئی تھیں بلکہ دل سے نکلی تھیں، ان میں جذبات کی سچائی کی تپش بھی شامل تھی۔ سچائی تو اپنا اظہار خود کرتی ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ ریٹا کو بھی اس راہِ پُرخار میں ہمرکاب بناؤں...... جبکہ سوشیلا کا معاملہ اور تھا۔ ریٹا کی ابھی عمر ہی کیا تھی، یہ مشکل اٹھارہ، انیس سال، اس نے ابھی کیا دیکھا تھا؟ مگر پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی، میں اس سے چار پانچ سال کے وقفے سے بڑا تھا اور سوشی بھی لگ بھگ میری ہی عمر کی تھی۔

اس دوران ریٹا کا سیل بار بار بج رہا تھا مگر اس نے کال اٹینڈ کرنے کے بجائے اسے سائلنٹ پر کر دیا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ کال کن لوگوں کی ہوسکتی ہے۔ اس دوران میں میرا دل بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کار نامعلوم منزل کی طرف دوڑی جارہی تھی۔ ہمارے بشروں پر گمبھیر خاموشی طاری تھی۔

اندازاً پندرہ، بیس منٹ بعد ہی ریٹا ہمیں ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں لیے داخل ہوئی۔ گیٹ پر چوکیدار ایک بینچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ریٹا نے مجھے نیچے جھک جانے کا کہا تھا۔ چوکیدار شاید ریٹا کو جانتا تھا۔ اس نے سیکیورٹی گیٹ کھول دیا، وہ کار لیے اندر آگئی۔ یہاں انڈر گراؤنڈ پارکنگ تھی۔ کار پارک کر کے ہم نیچے اتر آئے اور ریٹا کی تقلید میں لفٹ کی جانب بڑھے۔ تیسرے فلور پر ہم ایک 203/B اپارٹمنٹ کے دروازے پر رکے، اس میں ہمسی قفل لگا ہوا تھا۔ ریٹا اس میں چابی گھمانے لگی۔ میں اس سے کچھ پوچھنے ہی والا تھا کہ وہ دروازہ کھولنے کے درمیان بول پڑی۔

''یہاں تم دونوں محفوظ رہو گے۔ فی الحال یہ مناسب ٹھکانا ہے، آجاؤ...... یہ خالی ہے۔''

میں نے قدرے طمانیت کی سانس لی اور ہم اندر داخل ہوگئے۔ یہ شاندار اپارٹمنٹ تھا۔ اب پتا نہیں یہ ریٹا یا اس کے ڈیڈی کی ملکیت تھا یا پھر اس کی کسی سہیلی وغیرہ کا تھا۔

''تم یہاں آرام سے کچھ وقت گزار لو، جبکہ میرا اب زیادہ دیر یہاں رکنا مناسب نہ ہوگا۔'' وہ بولی۔ ''یہاں ضرورت کی ہر شے موجود ہے مگر خبردار! کوئی فون اٹینڈ مت کرنا۔ میں واپس جارہی ہوں اور مزید حالات کی جان کاری لینے کی کوشش کرتی ہوں۔ نیش اور اپنے ڈیڈ سے بھی تم دونوں کے متعلق بات بنانا ہوگی، بلکہ اب تو نیش کے پیا جی بھی مجھ سے تم لوگوں کے سلسلے میں پوچھ تاچھ کریں گے۔ انہیں بھی مجھے مطمئن کرنا ہوگا، یوں سمجھو مس گائیڈ کرنا ہوگا۔ بہرحال...... میں مناسب وقت دیکھ کر خود ہی آؤں گی۔''

''یہ کس کا فلیٹ ہے؟'' میں نے آسان الفاظ میں پوچھا۔

''میری ایک دوست کا ہے، وہ گوا گئی ہوئی ہے، اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون منانے۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد ہی آئے گی۔'' ریٹا نے جواب دیا۔ اس کے بعد وہ ہمیں مزید چند ہدایات دے کر جانے لگی تو میں نے اس سے کہا۔

''ایک کام اور کرسکتی ہو؟''

''ہاں! کہو؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا تم کہیں سے ریڈی میک اپ کے سامان کا بندوبست کرسکتی ہو؟''

وہ ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری بات کا مطلب سمجھ رہی ہوں، یہ میرے ذہن میں بھی تھا۔ تم دونوں کا بہروپ بدلنا ضروری ہے، تم چنتا نہ کرو، میں بہ آسانی یہ ساری چیزیں لے آؤں گی۔'' اس کے بعد وہ چلی گئی۔ رینا اپنی عمر سے بڑھ کر عقل مند ثابت ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ ایک ریٹائرڈ بھارتی فوجی افسر کی پوتی تھی اور کوئی بعید نہ تھا کہ اس کا باپ بھی ایسی کسی پوسٹ پر رہا ہو، مگر ابھی تک مجھے رینا کے متعلق اتنی جان کاری نہیں ہوسکی تھی کہ رینا کے ماں باپ زندہ بھی تھے یا نہیں۔

بہرکیف...... میں نے حلق سے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ اپارٹمنٹ خاصا آرام دہ اور کشادہ تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ سوشیلا سے ابھی میں نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ فریج سے پانی کی بوتل اور کچھ کھانے پینے کی اشیا نکال لائی۔ جس کی اجازت رینا نے بھی دی تھی۔

وہ اس نے میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ میں نے صرف پانی پیا اور صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر تھکے تھکے انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔

''مجھ سے ناراض ہو ابھی تک......؟'' معاً سوشیلا کی نرم سی آواز ابھری۔

''نہیں۔'' میں نے یونہی اپنی آنکھیں موندیں رکھتے ہوئے مختصر اجواب دیا۔

''میرا یوں تمہاری طرف سے بہک جانا ایک فطری عمل تھا، میرا اس میں کوئی قصور نہ تھا لیکن سچائی کا علم ہوتے ہی میرا ہی نہیں رینا کا بھی دل تم سے اب صاف ہو گیا ہے۔'' اس نے کچھ صراحت سے کہا تو میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھی تھی اور گہری نگاہوں سے مجھے تکے جارہی تھی۔ میں نے متانت سے کہا۔

''اس موضوع کو چھوڑ و اب...... مجھے رینا کا ساتھ بھی اپنے مشن میں رکاوٹ لگ رہا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' اس نے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے تو بلکہ خوشی ہو رہی ہے کہ رینا کی وجہ سے ہماری یہ مہم اور بھی آسان ہو جائے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر وہ تمہاری بہن اوشا اور اس کی نیملی کا ایک سنگ دل قاتل ہے، ہیرا برآمد کرنے کے بعد ہمیں اسے جہنم رسید کرنا تھا۔''

''وہ تو کریں گے ہی، ایسے نرک میں پہنچانا تو ویسے بھی پوری عالم انسانیت پر احسان ہوگا۔'' وہ نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر بولی تو میں نے کہا۔

''تم شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھی ہو۔''

''مطلب؟'' اس نے وضاحت طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''جنرل کے ایل ایڈوانی رینا کا دادو ہے، اور وہ اس سے محبت کرتی ہے، وہ کیسے چاہے گی کہ وہ ہمارے ہاتھوں ہلاک ہو؟ یہی کچھ ہمیں سوچنا پڑے گا اب کہ رینا ہماری محسنہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔''

میری بات سن کر سوشیلا کو بھی ایک پُرسوچ سی چپ لگ گئی۔ اس نے شاید واقعی اس حساس نکتے پر سوچا ہی نہ تھا۔

''میں اسی لیے نہیں چاہتا تھا کہ رینا کو اپنے ساتھ اپنی کسی مدد وغیرہ میں شامل کرتے۔''

''ابھی جیسے چل رہا ہے، چلنے دو...... وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ پہلے ہیرا تو اس کے قبضے سے برآمد کرلیا جائے۔'' بالآخر اس نے ایک گہری ٹھنڈی سی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ اس کی بات بھی ٹھیک ہی تھی۔ اب اصل مسئلہ ہیرے کی برآمدگی کا تھا...... مجھے یہ دونوں اہم مشن اب کھٹائی میں پڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ بلو تھی اور بھارتی پولیس کو بھنک مل چکی تھی ہم ممبئی یا اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔

''ہمیں رینا کے پروں سے لگنا ہوگا...... تم ایک کام کرو سوشی! موہن کو فون کر دو کہ وہ کہاں ہے اور کہاں رہ گیا تھا؟''

بالآخر میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں آئے ایک خیال کے تحت کہتی لہجے میں سوشیلا سے کہا۔ ''ان حالات میں موہن ہمارے لیے بہتر ثابت ہوگا، کیونکہ اس کا اور ہمارا مشن ایک ہی ہے۔''

''لیکن تم یہ کیوں بھول گئے کہ موہن تک بھی ہمارے سلسلے میں وہ ساری خبریں پہنچ چکی ہوں گی، جس کے متعلق رینا نے کہا تھا کہ ہماری فوٹو اور کارگزاریاں ملک کے ہر ٹی وی چینل پر دکھائی جارہی ہیں۔ وہ میرے سلسلے میں تو شاید نہیں لیکن اب تمہارے بارے میں ابہام کا شکار ہوسکتا ہے۔''

سوشیلا کی یہ بات سوچنے کی تھی، میں نے کہا۔ ''تم مجھ سے قائل ہو چکی ہو اب تم ہی موہن کے بارے میں بتا سکتی ہو کہ وہ میرے سلسلے میں کس حد تک متاثر یا قائل ہوسکتا

ہے؟''

''میرے تو خیال میں اسے قائل ہو جانا چاہیے۔ یوں بھی وہ کچھ اور ہی مزاج کا آدمی ہے۔'' سوشیلا میری بات کا مطلب سمجھ گئی۔ فون قریب ہی ایک خوب صورت نیشنی اسٹینڈ پر رکھا تھا، وہ موہن کو فون کرنے کے لیے اٹھی تو میں نے اسے چند ضروری ہدایات دے ڈالیں کہ اسے موہن سے کیا بات کرنا تھی اور کیا بتانا تھا۔

''میری طرح وہ بھی ایڈوانی سے انتقام لینے کے لیے بھرا بیٹھا ہے۔'' وہ جواباً بولی۔

یہ کہہ کر وہ صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ہیلو! موہن؟'' سوشیلا نے نمبر ملاتے ہی استفسار یہ کہا اور پھر دوسری جانب سے کچھ سنتی رہی، اس کے بعد اس نے میری ہدایات کے متعلق اسے بتایا۔

''موہن! تمہارے نہ آنے کی وجہ سے ہم وہاں پیچ ریسٹورنٹ میں ایک بڑی مصیبت کا شکار ہو گئے تھے، باقی تفصیل تو ملاقات ہونے پر ہی بتا سکتی ہوں، بس! اتنا جان لو ابھی کہ... وہاں اتفاقیہ طور پر ایڈوانی کے اسی جلاد صفت آدمی بلراج سنگھ نے مجھے دیکھ لیا تھا اور اس سے بڑی مشکلوں سے جان چھڑا کر نکلے ہیں۔ او...... ابھی نہیں...... بس! فی الحال مجھ سے رابطے میں رہو اور واپس لوٹ جاؤ۔ ہم اس وقت اپنے ایک ہمدرد کا ٹھکانا نہیں چھوڑ سکتے، اس کی واپسی جلد ہوگی، اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کروں گی۔''

دوسری طرف سے وہ موہن کی کوئی بات سنتی رہی اور پھر جواب میں بولی۔

''میں سب جانتی ہوں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، یہ سب ایڈوانی کی شرارت ہے، وہ اس ایشو کو بات بنا کر میرے خلاف جال بُننا چاہتا ہے۔ بتا رہی ہوں ناں کہ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں بلراج سنگھ کی نظروں میں آگئی۔ اوکے! باقی تفصیل ملاقات پر ابھی تھوڑا انتظار کرلو، بائے۔''

اس کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر کے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟ کہاں رہ گیا تھا وہ......؟'' میں نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''یہی کہہ رہا تھا کہ راستے میں اس کی کار میں کوئی خرابی ہوگئی تھی۔ پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ باقی اس تک بھی تمہارے متعلق خبریں پہنچ چکی ہیں۔''

''ٹی وی آن کرو ذرا......'' اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا، وہ بھی چونک کر بولی۔

''او ہو...... اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ سامنے ایک دیوار پر ایل ای ڈی لگا ہوا تھا اور ساتھ ہی ریموٹ رکھا تھا، سوشیلا نے اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اور دوبارہ میرے قریب آکر صوفے پر براجمان ہوگئی۔

اب ہماری دھڑکتی ہوئی نظریں اسکرین پر جم گئی تھیں۔

تقریباً ہر بھارتی چینل پر اس وقت میری اور سوشیلا کی فوٹیجز دکھائی جارہی تھیں۔ مبصر، تجزیہ کار اور نجانے کون کون، میرے حوالے سے پاکستان کے خلاف زہر اگلنے میں مصروف تھے۔ مجھے اسی بات کا زیادہ قلق ہونے لگا کہ یوں میرے ملک کو بدنام کیا جارہا ہے۔ بھارت جو پاکستان کو عالمی برادری میں بدنام کرنے کے لیے ہمیشہ ہی ایسے کسی موقع کی تاک میں رہتا آیا ہے، یہ الگ بات تھی کہ بعد میں اس کا ہر دعویٰ کھوکھلا ہی ثابت ہوتا تھا۔ لیکن میں بھارت میں کسی قسم کی دہشت گردی نہیں کرنے آیا تھا، نہ ہی کوئی ملکی راز چرانے آیا تھا بلکہ مجھ پر دشمنوں نے جو جنگ مسلط کی تھی، میں اس کا جواب دینے آیا تھا۔ بلیو ٹکسی کا کرنل سی جی بھجوانی پاکستان کو دولخت کرنے کی لابی سے تعلق رکھتا تھا۔ را کا یہ ونگ (بلیو ٹکسی) خصوصی طور پر پاکستان کے خلاف مذموم خفیہ سازشوں کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ جس کی مثال وطن عزیز میں بھارتی ایجنٹوں کی، ملک دشمن خفیہ سرگرمیاں اور ایک بین الاقوامی گینگ اسکینڈل کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا۔ بلیو ٹکسی والے ہر ممکن طریقے سے اپنے خصبے چھپی بات ٹاٹ ایجنٹ سندر داس سکینہ کو چھڑانے کے لیے ایڑی چوٹی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور میں ان کی ہر ایسی کوشش کو ناکام بناتا آیا تھا، کرنل سی جی بھجوانی مجھ سے بری طرح خوف زدہ تھا، وہ جان گیا تھا کہ میں یہاں بھارت میں اس کی یقینی موت بن کر آیا ہوں۔ یہی وجہ تھی وہ میرے خلاف یہاں اپنی کارروائی کو بھی خفیہ نہ رکھ سکا تھا اور بھارتی پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا تھا، حالانکہ یہ ایک خفیہ ایجنسی کے شایانِ شان بات نہیں تھی، مگر سی جی تو چاہتا تھا کہ جاہے جیسے بھی سہی، بس! کسی طرح میں دوبارہ اس کی گرفت میں آجاؤں اور یہ وہ کررہا تھا۔

میرے نزدیک سب سے اہم اور ضروری مشن یہی تھا کہ میں بھجوانی کا خاتمہ کر ڈالوں، جلد سے جلد......

وہ رات ہم نے یہیں بسر کر گزار دی۔ اگلے دن صبح

رینا آگئی اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا تھا۔ اس کے اندر میک اپ کا سامان تھا اور کچھ کھانے پینے کی اشیا کے علاوہ دیگر چھوٹی موٹی ضرورت کا بھی سامان تھا۔ رینا نے بتایا۔

''شہزی! تمہارا ابھی ممبئی جانا بالکل بھی مناسب نہیں ہوگا، وہاں چپے چپے پر تمہاری تلاش جاری ہے، سوشیلا کے گھر پر بھی چھاپا پڑا ہے، وہاں کوئی ادھیڑ عمر خاتون اکیلی تھیں، تارا...... اسے بھی پولیس پوچھ گچھ کے لیے گرفتار کر کے لے گئی ہے۔ شنید ہے کہ بعد میں اس بے چاری کو خفیہ ایجنسی کے حوالے کر دیا گیا ہے۔''

''او...... مائی گاڈ...... میری ممی......!'' سوشیلا صدمے سے نڈھال ہونے لگی اور اپنی پیشانی مسلتی ہوئی صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ میں نے اسے تسلی دی۔

''حوصلہ کرو سوشی! پہلے رینا کی ساری بات سن لو۔'' کہتے ہوئے میں نے مستفسرانہ نظروں سے ایک بار پھر رینا کی طرف دیکھا تو وہ آگے بتانے لگی۔

''یہاں بھی تمہاری تلاش جاری ہے، ودو کے محافظ بھی بلراج سنگھ سمیت تمہاری کھوج میں مصروف ہیں۔ اب تم خود ہی آگے اپنی راہ کا تعین کرو کہ تمہیں کرنا کیا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر چپ ہو گئی۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا، رینا نے کوئی نئی بات نہیں بتائی تھی، یہ سب کچھ میرے لیے وہی تھا جس کی میں توقع کیے بیٹھا تھا لیکن میں کچھ اور طرف سوچ رہا تھا، لہٰذا بولا۔

''یہاں ہم کب تک اور کتنے روز تک رہ سکتے ہیں؟''

''ایک سے ڈیڑھ ماہ......'' رینا نے جواب دیا۔

''اس دوران میں یہاں کوئی آئے گا تو نہیں؟ میرا مطلب کسی قسم کا کوئی خطرہ تو نہیں ہوگا ہمیں یہاں؟''

''میرے خیال میں تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اتفاق کی بات اور ہے، باقی تم دونوں کی اپنی احتیاط پر منحصر ہے۔''

''ہم......'' میرے منہ سے نکلا اور پھر میں اس سامان کا جائزہ لینے لگا۔ رینا، سوشی کو تسلیاں دینے میں مصروف ہو گئی۔ جب وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تو میں نے اس سے کہا۔

''سوشی! ہمیں اپنا بہروپ بدلنے میں دیر نہیں لگانی چاہیے۔''

''چلیں! میں تیار ہوں۔'' وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولی۔ اپنی ممی کی گرفتاری اور بھارتی خفیہ ایجنسی کی حوالگی نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ تاہم اب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

ہم دونوں کو اس کام میں تقریباً ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ میں نے ادھیڑ عمر بڈھے کا میک اپ کیا تھا اور سوشیلا نے بھی میرے ہی جیسا بہروپ بھرا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر جب ہم رینا کے سامنے آئے تو ایک لمحے کو اسے بھی مغالطہ ہو گیا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''آ آ...... آپ کون؟...... او...... مائی گاڈ!''

ہماری مسکراہٹ اور لہجے نے اسے باور کرایا تو وہ ششدر سی رہ گئی۔

''تم واقعی اپنے کام میں ماہر ہو شہزی!''

''شکریہ!''

''تم نے نہ صرف اپنی شکل/صورت بدل ڈالی ہے

تعارف

شرابی رات دو بجے شراب کے نشے میں روڈ پر جا رہا تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اسے روکا اور پوچھا۔ ''صاحب آپ کون ہیں؟''

شرابی نے کہا۔ ''میں کوئی بھی ہوں۔ تم سے میرا کیا کام؟''

کانسٹیبل نے کہا۔ ''بتاؤ ورنہ چالان کر دوں گا۔''

شرابی نے جواب دیا۔ ''پھر میرا پتا سنو۔ یہاں سے سیدھے گلی نمبر 6 میں جاؤ، وہاں مڑ کر مکان نمبر 48 دیکھو اور وہاں گھنٹی بجاؤ۔ نکلنے والے سے پوچھو کہ یہ بنگلا کس کا ہے اگر وہاں سے جواب ملے ادھر نہیں ہے تو... [illegible] ہوں۔''

ڈاک خانے

ہمارا ڈاک کا نظام کتنا عمدہ اور فعال ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ چند سال پہلے ایک پوسٹ ماسٹر صاحب کو انہوں نے لکھے ایک عرضی [illegible] جس میں استدعا کی گئی کہ

''براہِ کرم مجھے پنشن کی رقم بذریعہ ڈاک کبھی نہ بھیجی جائے۔ میں خود آ کر یہ رقم لے جایا کروں گا۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ورنہ دوسری صورت میں مجھے فاقوں مرنا پڑے گا۔''

انتخاب۔ امداد اللہ عمر [illegible] کریم خان، بنوں

بلکہ چال ڈھال سے بھی پتا لگنے نہیں دیا کہ میں شہری ہوں۔ میں تو تمہیں لہجے اور آواز سے ہی پہچان پائی ہوں۔''

''پولیس کو تو جل دیا جا سکتا ہے، مگر خفیہ ایجنسی والے بہروپ بدلے ہوئے کو بھی فوراً پہچان لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا! وہ کیسے؟''

''آئی ڈینٹی فکیشن اور باڈی لینگویج سے...... یعنی چال ڈھال اور لب و لہجہ، باتیں کرنے کا انداز......''

''او کے...... اپنا خیال رکھنا اور بڑی احتیاط سے اپنا کام کرنا...... معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑتے ہی میں ہیرے سے متعلق کچھ کرتی ہوں۔'' رخصت ہوتے وقت اس نے مجھ پر ایک ذرا گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم عمر رسیدگی میں بھی خاصے گریس فل اور ہینڈسم لگ رہے ہو۔''

''شکریہ......'' میں اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیا۔

وہ چلی گئی۔

''شکر ہے کہ ہمیں یہاں اچھا ٹھکانا مل گیا ہے۔'' سوشیلا نے ریناکے رخصت ہوتے ہی کہا۔ ''ایک مہینے کا عرصہ بہت ہوتا ہے۔ اس دوران ہم اپنا مشن مکمل کر لیں گے۔''

''لیکن میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکنا چاہتا۔'' میں نے پرسوچ متانت سے کہا تو سوشیلا قدرے چونک کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

''کیا مطلب......؟''

''مطلب یہی ہے کہ میں ریناکا ساتھ زیادہ دیر نہیں چاہتا، اس میں کئی خطرات ہیں۔''

''کیا تم ابھی تک اس کی طرف سے غیر مطمئن ہو؟''

''وہ ایک اچھی، سلجھی اور سمجھدار لڑکی ہے...... لیکن اس کا یہاں بار بار آنا جانا کسی کو بھی کھٹکا سکتا ہے۔''

''اور...... میں کیسی ہوں؟'' سوشیلا اچانک بولی۔ میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اس کے گداز لبوں پہ شوخ سی مسکراہٹ تھی۔

''تم بھی ٹھیک ہی ہو......'' میں نے کہا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکان یکا یک دم توڑ گئی۔

''کیا مطلب...... ٹھیک ہی ہوں؟''

''چھوڑو اب ان باتوں کو......'' میں نے بیزاری سے کہا۔

''نہیں، مجھے بتاؤ ابھی۔ میں نے کب تمہارا ساتھ نہیں دیا، ہر مشکل گھڑی میں ہم ساتھ رہے ہیں، کبھی تم نے اور کبھی میں نے جان پر کھیل ایک دوسرے کو موت کے منہ میں جانے سے بچایا ہے اور تم میرے مقابلے میں اس ڈیڑھ چھٹانک کی لڑکی رینا کو مجھ پر فوقیت دے رہے ہو......؟'' وہ ایک دم بپھر گئی۔ میرے لیے اس کا یہ ایک نیا روپ تھا، جو اگرچہ خالصتاً نسوانی سہی لیکن میرے لیے اس میں حیرت کی بات تو یہ تھی کہ میرا اور اس کا آپس کا تعلق ہی کیا تھا؟ محض ایک مقصد کے حصول تک...... اس کے بعد اس کا الگ راستہ تھا اور میرا الگ لیکن وہ تو اس طرح مقابلے بازی پر اتر آئی تھی جیسے میں اور وہ قربتوں کی حدود کی اس نہج پر ہوں جہاں ایک مرد کا ایک عورت کے سامنے کسی دوسری عورت کی تعریف کرنا اسے ناگوار گزرتا ہے۔ جبکہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ ہمارے ساتھ کی اصل بنیاد ایک دوسرے کے مفادات کا مشترکہ حصول ہے۔ اس میں کسی ایسے تعلق خاطر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کے لیے اتنا جذباتی ہو جانا، جیسے سوشیلا ہو رہی تھی۔ یہ بھی درست تھا کہ کچھ عرصہ ساتھ رہنے سے بھی ایک طرح کی نامعلوم سی انسیت بھی آپوں آپ پروان چڑھتی ہے مگر...... میں اس سے آگے نہ سوچ سکا۔

''جواب دو مجھے......'' اسی وقت سوشیلا بھناتے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس نے باقاعدہ لڑاکا عورتوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر ٹکا رکھے تھے۔

''ارے...... رے! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ سوشی! میں نے تو یونہی تمہیں ذرا چھیڑا تھا۔'' میں نے بات بنانے کی کوشش چاہی، لیکن پھر دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہو کر دوبارہ اس سے بولا۔

''مجھے اسی بات کا دکھ ہے کہ چلو، رینا سے تو میری چند منٹوں کی ملاقات تھی اور وہ اچانک میرے خلاف ہو گئی تھی مگر تم تو کافی عرصے سے میرے ساتھ رہی ہو...... اور ہمارے درمیان یہ معاہدہ بھی ہو چکا تھا کہ...... تم کو وہی کچھ کرنا ہے جیسا میں کہوں گا لیکن تم نے تو مجھ پر بھی پستول تان لیا تھا، کم از کم مجھے اپنے بارے میں صفائی پیش کرنے کا موقع تو دیا ہوتا، مگر تم نے تو مجھے رینا کے ساتھ مل کر مہیش کے پولیس افسر باپ کے حوالے کرنے کی ٹھان لی تھی۔''

''تمہارے دل میں ابھی تک بال ہے اس بات کی وجہ سے......'' وہ پھر شکوہ کناں ہوئی۔

جبکہ میرا یہ ردعمل فطری تھا۔ رینا کی کایا پلٹ نے مجھے بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کہیں...... میرا مقصد ملکی

مفاد سے بالاتر نہ ہوجائے اور میں ایک غدار کہلاؤں، اگرچہ غدار تو میں اب بھی کہلاؤں گی ہی، مگر اس بار تمہاری صفائی پیش کرنے سے رینا کی طرح میرا بھی دل صاف ہوگیا ہے اور میں اپنے ضمیر سے تو کم از کم مطمئن ہی ہوں......'' وہ رکی اور ایک گہری سانس لی تو میں اس میں ایک حسرت آمیز سی آزردگی کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا وہ آگے بولی۔

''شہزی! کچھ باتیں انسان لبوں تک اس ڈر سے نہیں لاسکتا کہ وہ الفاظ جن کی حرمت دل میں ہی رکھنے سے قائم رہتی ہے، اسے کہہ دینے سے کہیں وہ اپنا مقام ہی نہ کھو دیں، بس! اسی لیے میں بھی کچھ باتیں اپنے دل میں اسی ڈر سے دبائے بیٹھی ہوں۔ لیکن کیا تم نے کبھی یہ سوچنے کی کوشش کی ہے کہ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد میرا کیا ہوگا؟ تم تو شاید اپنے وطن لوٹ جاؤ لیکن بعد میں میرا کیا بنے گا؟ میں کہاں جاؤں گی، یہ دھرتی تو میرے لیے تنگ کردی جائے گی۔ جبکہ ان حالات میں تم پر بھی نہ صرف ایک غیر ملکی ایجنٹ کا الزام لگ چکا ہے اور مجھے بھی تمہارے ساتھ ایک مددگار کی صورت میں لڑکی کے غدار وطن کا ٹھپا لگا دیا گیا ہے۔ جانتے ہو تم...... ایک غدار وطن کی کیا سزا ہوتی ہے اور اسے کس قدر نفرت و غصے کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی اور واپس الٹے پیر صوفے کی طرف لوٹ گئی اور تھکے تھکے انداز میں گرگئی۔

اس کی بات نے مجھے بھی اندر سے ہلا کے رکھ دیا تھا۔ میں نے واقعی اس پوائنٹ پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس کی بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھی۔ میں مشن کی کامیابی کے بعد ادھر ادھر ہوسکتا تھا، بعد میں سوشیلا کہاں جاتی؟ تقدیر نے اسے میرے ساتھ نتھی کردیا تھا اور ظاہر ہے کہ میں بھی اتنا بے حس نہ تھا کہ اپنا مطلب نکل جانے کے بعد سوشیلا کو اس کے حال پہ چھوڑ دیتا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ صوفے پر سر جھکائے سسک رہی تھی، میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا ایک ہاتھ بڑی آہستگی سے اس کے شانے پر رکھ دیا اور نہایت ملائمت آمیز مگر مستحکم لہجے میں بولا۔

''سوشی! میرا وعدہ ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا، مشن مکمل ہونے کے بعد بھی جب تک تمہیں کسی محفوظ مقام پر نہ سمجھوں، تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔''

میری بات پر اس نے سر اٹھایا۔ اس کی غمناک سی آنکھوں میں مجھے ایسی گہرائی محسوس ہوئی تھی جیسے تعبیر الفت میں وہ مجھے بھی لیے اترنے کو تیار ہو۔ وہ اسی نگاہوں سے مجھے تکتی ہوئی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر میرے قریب آگئی، بہت قریب، اتنی...... کہ اس کی بے ترتیب سانسیں اپنی سانسوں کے قریب محسوس ہونے لگیں پھر وہ اپنے دونوں بازو میری کمر کے گرد پھیلا کر مجھ سے لگ کر کھڑی ہوگئی، بازوؤں کا گھیرا اس نے میری پشت کے گرد لپٹا لیا تھا اور اپنا سر میرے فراخ سینے پر رکھ دیا تھا۔

''ایک بار پھر یہ وعدہ کرو شہزی کہ تم مجھے اکیلا نہیں چھوڑو گے......''

میں نے محسوس کیا کہ سوشیلا کا نرم و نازک وجود میرے کرخیل وجود کے ساتھ رگڑ کھا رہا تھا۔ پل کے پل مجھے یوں لگا جیسے دو جسم کسی چقماق پتھر کی طرح رگڑ کھا کر جذبات کی آگ ہی نہ بھڑکا دیں، میں نے اسے دھیرے سے خود سے علیحدہ کیا...... وہ پتا نہیں میری اس بات کا کیا مطلب سمجھ بیٹھی تھی، حالانکہ میں نے اب تک صرف سوشیلا سے ہی کیا کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایسی کوئی ''آزمائش'' کھڑی آنے ہی نہ دی تھی...... آج بھی تو خود ہی پہلوتہی کرلیتا آج بھلا میں سوشیلا کو کیا بتاتا کہ میں کن راہوں کا راہی تھا اور ''کس کی'' خاطر تھا۔ میرا مقصد ''کس کی'' خاطر تھا جو مجھ سے کوسوں دور ہو کے بھی کس قدر قریب تھی۔ سوشیلا بھی اس وقت میرے جتنے قریب تھی، عائدہ کی قربت، جو میری روح اور سانسوں تک میں بسی ہوئی تھی، وہ اس کی رسائی کا عشر عشیر بھی نہ تھی۔

میں اسے الگ کر کے چند قدم پیچھے کو سرک گیا۔ وہ ابھی اسی طرح گم صم سی کھڑی میری طرف تکتی رہی۔ میں کچھ دیر جا کر اس کی طرف مڑا، وہ بجھی بجھی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہولے سے کہا۔

''سوشی! تم نے شاید میری بات کا کوئی اور مطلب لے لیا ہے...... میرا مطلب تو......''

''کہ تمہارا تعلق کسی اور سے ہے؟'' سوشیلا نے اچانک میری بات کاٹ کر کہا۔ وہ شاید میرے یوں آہستہ سے دور ہو جانے اور اس کی قربت سے پہلوتہی کرنے پر اپنے نسوانی وجدان سے کچھ بھانپ گئی تھی، تو میں نے بھی اس سے اشارتاً ہی مگر صاف گوئی سے کہہ ڈالا۔

''ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''کون ہے وہ خوش قسمت اور کہاں رہتی ہے؟ کیا تمہاری بیوی ہے؟'' سوشیلا نے کسی قدر کریدنے سے پوچھا۔ میں نے اپنے سے لہجے میں جواب دیا۔

خوش قسمت ہے کہ میری ابھی اس سے شادی نہیں ہوئی مگر وہ جہاں رہتی ہے، وہ جگہ جہنم سے کم نہیں، میں اسے اسی جہنم سے نجات دلانے کے لیے نکلا ہوں۔''

''اوہ...... بڑا دکھ ہوا یہ سن کر۔'' سوشیلا نے کہا۔ میں اس موضوع سے ہٹتے ہوئے فوراً آگے بولا۔

''میں آج شام تک یہاں سے نکل جاؤں گا۔''

''کہاں؟ اور اکیلے؟'' سوشی نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''سورت جاؤں گا اور اکیلا ہی جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' وہ بولی۔

''یہ خطرناک مشن مجھ اکیلے کو ہی انجام دینا ہوگا۔ تمہاری وجہ سے میں کسی اضافی مشکل میں پڑ سکتا ہوں۔''

''نہیں شہزی! پلیز، مجھے اپنے ساتھ لے چلو نا...... مجھے تمہاری چنتا (فکر) مار ڈالے گی یہاں... نجانے تم کس حال میں ہوگے؟''

''مجھے خونخوار بھیڑیوں کے جھنڈ میں گھس کر اپنا مشن مکمل کرنا ہوگا۔ تم کیا کرو گی وہاں؟''

''پھر بھی شہزی! تمہاری نظروں میں اگر میں ایک کھوٹا سکہ ہی سہی...... لیکن مجھے یقین ہے کہ میں...... اس مشن میں تمہارے لیے کچھ آسانیاں پیدا کرنے کی کوشش تو ضرور کر سکتی ہوں، پستول چلانا مجھے آتا ہے، راستوں کے معاملے میں بھی تمہاری مدد ہو سکتی ہے۔'' میں نے غور کرنے کے انداز میں ہونٹ بھینچے اور اس کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''تمہیں میں نے بھلا کب کھوٹا سکہ کہا ہے؟ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ یہ مشن کسی فرار کا منصوبہ نہیں ہے، جس میں اب تک تم میرا کامیابی سے ساتھ دیتی آ رہی ہو بلکہ یہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے والی بات ہے۔ تمہاری مہی کو بھی اس خبیث سی جی بھجوانی کے قبضے سے چھڑانا ہے۔ یہ ایک خطرناک مہم ہے، تم وہاں میری کمزوری بھی بن سکتی ہو۔''

''اگر ایسا ہوا تو تم صرف اپنے مشن پر توجہ رکھنا، میری جان کی پروا مت کرنا، کیونکہ میں سمجھ چکی ہوں، تمہارا مشن انسانیت کی بھلائی ہے، جب انسانیت ہی نہ رہے گی تو بعد میں......'' سوشیلا نے مستحکم لہجے میں کہا اور مجھے بے اختیار اس کی بات پر خوشگوار حیرت ہوئی...... اب تک میرا اور سوشیلا کا ساتھ چلتا رہا تھا۔ یہ رفاقت داری ''واز اسٹیٹ'' کے لیے کو تعلق خاطر کی ایک نامعلوم سی نمود دے چکا تھا۔ یہ تو خیر ایک انسان کی مثال تھی، جانور بھی ساتھ رہے تو انسان اس سے کافی مانوس ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ میں سوشیلا کو ایک جانور سے تشبیہ دے رہا تھا۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔

میں نے بے اختیار خلوص اور کسی قدر اپنائیت سے اس کے شانے پر، تیرے سے ہاتھ رکھ دیا اور نرمی سے مسکرا کر بولا۔

''میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں سوشی! دیکھو، مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل بھروسا ہے، اس نے میری جتنی لکھی ہوئی ہے، میں اس سے ایک سیکنڈ تو کیا ایک پل کا ہزارواں حصہ بھی اضافی زندگی نہیں گزار سکتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ...... اسی مولائے کریم نے مجھے اب تک جانے کتنی ایسی ناگہانی آفات اور خطرات سے بھی بچایا ہے کہ جب میں نے موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے دیکھا۔ یہ مشن مجھ اکیلے کو ہی کرنے کا متقاضی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ تم میرے ساتھ ہوگی تو ہم جلدی نظروں میں آ جائیں گے، اس لیے کہ اب میرے ساتھ تمہارا نام بھی جڑ چکا ہوا ہے۔ چاہے ہم نے بھیس ہی کیوں نہ بدلا ہو، یہ بات دشمنوں کے ذہن میں پہلے سے ہوگی کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور میرے ساتھ ایک عورت بھی ہے......''

میرے رسانیت سے سمجھانے پر وہ بالآخر ایک گہری ہمکاری خارج کرکے خاموش ہو گئی۔ میں نے اسے یہاں میرے بعد اکیلے رہنے پر احتیاط اور ہوشیاری کی ہدایت کر دی۔ اس کے بعد میں نے اس سے کچھ معلومات لیں اور شام کا ملگجا اندھیرا پھیلتے ہی اللہ کا نام لے کر میں فلیٹ سے نکل گیا۔

میں نے سیدھا اسٹیشن کا رخ کیا۔ فون کے ذریعے سوشیلا نے ریلوے انکوائری فون کر کے سورت جانے والی ٹرین کے بارے میں پتا کر لیا تھا۔ میں وقت پر اسٹیشن پہنچ گیا۔ یہاں مجھے خاصی سخت ''چیکنگ'' دیکھنے میں آئی۔ پلیٹ فارم پر موجود ہر ایک مسافر کے ٹکٹ کے علاوہ اس کی مکمل جانچ پڑتال کی جا رہی تھی، یہ ان لوگوں کے لیے تھی جو یا تو اکیلے تھے یا پھر مرد، یعنی جو فیملی (عورتوں اور بچوں) کے ساتھ تھا، اس کی کوئی چیکنگ نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی، کیونکہ میں اکیلا تھا، چیکنگ کرنے والوں میں پولیس کا عملہ ہی تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ یہاں سادہ وردی میں پولیس کے اہلکار بھی ایک ایک مسافر پر کڑی نگاہ رکھے

ہوئے ہوں۔ جیسے ہی انہیں کوئی مشکوک آدمی نظر آتا، وہ اسے "چھاپ" سکتے تھے۔ بے شک میری تصاویر وغیرہ کی صورت میں انڈین خفیہ ایجنسی یلو ٹیکسی ہی نہیں بلکہ بھارتی پولیس کے پاس بھی پوری معلومات موجود ہو سکتی تھیں۔ سیکریٹ سروس والے بھیس بدلنے کے باوجود چال ڈھال اور لب و لہجے سے بھی پہچان لیتے تھے۔ یہی کچھ مجھے بھی اپنی "پاور سیکریٹ سروس" کی تربیت کے دوران سکھایا گیا تھا۔

میں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ میری چال ڈھال سے کسی کو مجھ پر شبہ نہ ہو، اور حتی المقدور میں اپنے لب و لہجے کو بھی بدلنے کی پریکٹس کر چکا تھا اور ریہرسل بھی کی تھی۔ لیکن یہ چیکنگ والا مرحلہ میرے لیے لٹکتی تلوار ثابت ہو رہا تھا کیونکہ میرے پاس کوئی شناختی کاغذات نہ تھے اور ہوتے بھی کیونکر......؟ میں تو بھارتی شہری ہی نہیں تھا۔ اسی پر ہی مجھے دھر لیا جاتا۔

میں اسٹیشن کے مین گیٹ سے ہی مڑ گیا۔

سورت کا میں ٹکٹ خرید چکا تھا مگر اندر پلیٹ فارم پر جانے کے بجائے میں اس اسٹیشن کی عمارت کے ٹکٹ گھر والے حصے سے ہی مڑ کر باہر آ گیا اور اسٹیشن کی عمارت کے متوازی کچا راستہ کے ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ ان ٹریکس کی طرف نکل آیا جہاں گڈز کے شیڈز اور ایک لوکو شیڈ نظر آیا۔ یہاں دوسرے قسم کے لوگوں کی چہل پہل زیادہ دیکھنے میں آرہی تھی۔ یعنی عام ریلوے عملہ اور مزدور وغیرہ...... پولیس کا کوئی آدمی یہاں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں اسی طرف بڑھ گیا اور اندر داخل ہو گیا۔ سامنے ایک ٹریک لگا ہوا تھا اور میں یونہی چیک کرنے لگا۔

"لگتا ہے کسی ٹرین میں بغیر ٹکٹ سوار ہونا چاہتے ہو......"

اچانک ایک آواز پر میں چونکا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرے سامنے ایک دبلا پتلا مگر خاصا چالاک سا شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے پل کے پل اس کا جائزہ لیا۔ وہ ریلوے کے عملے کا ہی کوئی آدمی لگتا تھا، اس نے ہلکے نیلے رنگ کا وردی ٹائپ لباس پہن رکھا تھا۔ وہ مجھے کوئی موقع شناس معلوم ہوا۔ یہ "گیس" کر کے میں نے دانستہ چور سی نظروں سے گردوپیش میں دیکھ کر اس سے کہا۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے لیکن لگتا ہے کہ تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد کرنا چاہتے ہو؟"

"ایک دم پرفیکٹ......" وہ چٹکی بجانے والے انداز میں اپنے ایک ہاتھ کو ہلاتے ہوئے معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "میں اپنے لوگوں کے خوب کام آتا ہوں، بشرطیکہ......" یہ کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اپنے سیدھے ہاتھ کے...... انگوٹھے کو شہادت کی انگلی میں رگڑ کر معنی خیز اشارہ کیا، یعنی نوٹ......

"اچھا بھائی! اگر یہ بات ہے تو میں تمہیں کچھ نہ کچھ روپے دے دوں گا، بولو! کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"کہاں جانا چاہتے ہو؟"

"سورت۔"

"پانچ سو روپے۔" اس نے چھوٹ ریٹ بتایا۔

"چلے گا......" میں اشارتی لہجے میں کہا۔

"آؤ میرے ساتھ......" وہ بولا اور ایک طرف چلا، میں اس کے تعاقب میں ہو گیا۔ وہ مجھے لیے ایک چھوٹے سے آفس میں آ گیا، وہ شاید یہیں کام کرتا تھا۔ یہاں جابجا، بیلچیں اور نجانے کیا کیا الا بلا پھیلا ہوا تھا۔

"یہ میرے صاحب کا آفس ہے۔ وہ اس وقت اپنے ساتھیوں کے ساتھ کینٹین میں چائے وغیرہ پینے گیا ہوا ہے، تم ادھر ٹھہرو، میں تمہارا بندوبست کر کے آتا ہوں۔"

"بھائی! کتنی دیر لگاؤ گے؟" میں نے اسے دروازے کی طرف بڑھتے پاکر ذرا کہا۔

"ابھی آجاتا ہوں، چنتا نہ کرو، یہاں ابھی کوئی نہیں آئے گا، آیا تو کہہ دینا رامیش کا کوئی رشتے دار ہوں۔" وہ چلا گیا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ مجھے حیرت تھی کہ پاکستان کی طرح یہاں بھی رشوت کا بازار گرم تھی، وہاں پولیس، کنڈیکٹر اور قلی وغیرہ کی ملی بھگت سے کام ہوتا تھا اور یہاں...... یہ اس طرح ہو رہا تھا۔

ریلوے اور اسی طرح کے اداروں کی تباہی میں اسی طرح کی "کرپشن" کا بہت ہاتھ ہوتا ہے۔ بہرحال اس وقت تو یہی "کرپشن" میرے کام آرہی تھی، کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ یہ مجھے اس طرح کسی پولیس اہلکار وغیرہ کی نظروں میں لائے بغیر اپنا بھی اور میرا بھی "کام بہ احسن خوش اسلوبی" سے کر جائے گا۔

تھوڑی دیر میں وہ آ گیا۔ اس کے ہمراہ ایک آدمی تھا۔ اس نے بھی ہلکے نیلے رنگ کی وردی پہن رکھی تھی۔

"لال جی! یہ ہے وہ، جس کو سورت جانا ہے، پانچ سو میں بات طے کی ہے میں نے۔" رامیش نامی اس آدمی نے اپنے ساتھ آنے والے شخص سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لال جی نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بولا۔ "بھیو!

سورت تک پورے بارہ سو کرایہ لگتا ہے۔ پانچ سو تو بہت تھوڑا ریٹ لگایا ہے۔''

''ارے ٹھیک ہے لال جی!'' رامیش نے رازدارانہ انداز میں اس سے کہا۔ ''یہ بابا جی ہیں، کچھ ان بے چاروں کی عمر کا ہی خیال کرلو......''

میں نے بھی بولنا ضروری سمجھا اور ''بابا جی'' ہی کے لہجے میں بولا۔

''ارے بھیّو! کچھ میری عمر کا ہی خیال کرلو، غریب منش ہوں، سورت میں میری بیٹی بیاہی ہوئی ہے۔ اس سے ملنے جارہا ہوں۔ تھوڑے پیسے بچ جائیں گے تو اس بے چاری کے لیے اور اس کے بچوں کے لیے کچھ تھوڑا بہت سامان ہی لے جاؤں گا خیر کر......''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔'' لال جی نامی شخص ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا اور پھر رامیش سے مخاطب ہوکر بولا۔

''ابھی ٹرین کے آنے میں تھوڑی دیر ہے، اسے ادھر ہی بیٹھائے رکھ، وہاں سخت چیکنگ بھی ہورہی ہے، پتا نہیں کیا معاملہ ہے، پہلے تو دیکھنے میں نہیں آئی، خیر...... جیسے ہی ٹرین آجائے گی، میں خود اسے لینے آجاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ میں دل ہی دل میں اس امداد غیبی پر خدا کا شکر بجالانے لگا کہ کس طرح یہاں میرے ایک اہم مسئلے کا حل خود ہی نکل آیا تھا، ورنہ تو میرے اِدھر کا رخ کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ میں یہاں سے چھپ چھپا کر کسی طرح رینگتی ٹرین میں سوار ہوجاؤں گا۔

رامیش مجھے آفس کے باہر کھڑا کر کے جاچکا تھا۔ پیسے مجھے لال جی کو دینا تھے اور بعد میں شاید انہوں نے اس کا حصہ داری کرنا تھی، پتا نہیں روز انہ یہ کتنے ایسے شکار پھانستے ہوں گے۔ ٹرین آگئی تھی، اسٹیشن پر مسافروں کے شور اور بھگدڑ سے ٹرین کی آمد کا اندازہ ہوتا تھا۔ ٹرین پلیٹ فارم پر آکر رک گئی تھی۔ لیکن مسافروں کی بھاگ دوڑ کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں اور بھی شدت آگئی تھی۔ مجھے رامیش یا لال جی کا انتظار تھا، دونوں ہی غائب تھے، مجھے بے چینی ہونے لگی کہ کہیں ٹرین نکل ہی نہ جائے۔

تھوڑی دیر اور گزری، دونوں کا پتا ندارد تھا۔ میں ایک خستہ حال سی سرکاری کرسی پر بیٹھا ہوا تھا جو کہ دروازے کے قریب ہی تھی، وہیں میں نے دو افراد کو دیکھا، وہ آفس کے سامنے آکر رک گئے تھے اور بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مسافر یا متعلقہ محکمے کے آدمی تھے لیکن اچانک ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہ بار بار اسی طرف دیکھ رہے تھے، میں انہیں اوپر سے مجھے پروازے کے پار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے ان پر کوئی خاص توجہ نہ دی۔ مجھے ان دونوں کا انتظار تھا۔ وہ نجانے کہاں غائب تھے، ٹرین نے وسل دی تو میری بے چینی فزوں تر ہوگئی، ٹرین مجھے سامنے کھڑی نظر آرہی تھی، دوسری وسل پر اس نے رینگنا شروع کردیا۔ میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی دروازے تک قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک لال جی دوڑا آیا اور مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''آجاؤ...... آجاؤ...... جلدی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس پلٹا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ وہ دوڑنے کے انداز میں ایک بوگی کی طرف بڑھا اور میرے ساتھ ہی اس میں سوار ہوگیا۔ وہاں ایک سرخ لباس والا قلی کھڑا تھا۔ اس نے میری جانب اشارہ کر کے اسے کچھ بتایا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا، پھر لال جی نے مجھ سے نوٹ نکالنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنی جیب سے فوراً نوٹ نکال کر اس کے حوالے کردیے اور وہ چلتی ٹرین سے اتر گیا۔ ابھی ٹرین کی رفتار سلو ہی تھی۔ قلی نے مجھے آگے جانے کا اشارہ کیا اور سیٹ نمبر بتاتے ہوئے کہا کہ میں اس سیٹ سے ہلوں تک نہیں۔

میں وہیں آکر بیٹھ گیا۔ ٹرین اب رفتار پکڑنے لگی تھی۔ شام ڈھل کر رات میں بدلنے والی تھی۔ بوگی میں رش اور افراتفری کا سماں تھا مگر رفتہ رفتہ یہ بھی پُرسکون ہوگیا۔ یہاں تک کہ ہر کوئی اونگھنے لگا۔

میں نے بھی طمانیت کا سانس لیا۔ شکر تھا کہ میں چیکنگ سے بچ گیا تھا۔ بس! میرے لیے یہی کافی تھا۔ میں نے دیکھا وہ قلی ساتھ ہی کھڑا تھا۔ اس دوران ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی، وہ میری طرف بڑھا اور بولا۔

''میں اگلے اسٹیشن پر اتر جاؤں گا۔ تم سے کوئی ٹکٹ کا پوچھے تو کہہ دینا کہ بڑے بابو چمن داس کا آدمی ہوں، آج کی بات اسے بتا دینا کہ وہ آج آفس کی بیرک نمبر...... دو میں بھوجن پانی کررہے تھے۔'' یہ شاید ٹکٹ چیکر کو یقین دلانے کا کوئی کوڈ ورڈ تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹرین اگلے اسٹاپ پر رکی اور وہ قلی اتر گیا۔ سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک جانے والی ٹرین کھڑی تھی، وہ بس روانہ ہونے ہی والی تھی، اس نے وسل دی اور رینگنے لگی، ادھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ قلی اس ٹرین میں سوار ہوگیا۔

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کر کے سیٹ سے

سر ٹکا کر آنکھیں...... موند لیں۔

کرپشن کا گھن چکر اسی طرح گول گھومتا ہے، ایک اسٹیشن سے دوسرے اور پھر تیسرے تک سفر کرتا ہے اور پھر واپس پہلے اسٹیشن پر آٹھہرتا ہے، نئے شکار کے انتظار میں۔ یہ کام یقیناً صبح سے شام اور رات تک اسی فلمی چکر کی طرح گھومتا رہتا تھا۔

''اپنا ٹکٹ دکھایئے...... پلیز......''

معاً ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، میرے سامنے اگر کوئی ٹکٹ چیکر ہوتا تو میرے لیے کوئی حیرانی کی بات نہ ہوتی، کیونکہ میرے پاس تو سورت تک کا ٹکٹ تھا لیکن یہاں معاملہ اور تھا۔ ٹکٹ چیک کرنے والے کوئی اور تھے جو سادہ وردی میں تھے۔

یکلخت میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ یہ وہ دونوں ہی تھے، جنہیں میں گلڈز کے آفس والی بیرک کے سامنے دیکھ چکا تھا جو بظاہر آپس میں باتیں کرنے کے انداز میں کھڑے تھے، لگتا ہے یہ گاہے میری طرف بھی دیکھ لیتے تھے جبکہ میں نے ان کی اس حرکت کو معنی خیز نظر سے دیکھا تھا اور اب بھی وہ دونوں بیٹھے ٹکٹ کا پوچھ رہے تھے۔

میں نے اپنے اندر کی اتھل پتھل پر قابو پاتے ہوئے ایک عام آدمی کی طرح بغیر کسی جھجک اور ڈر کے ان کا جائزہ لیا اور پھر چڑچڑے بڈھے کا سا انداز اپناتے ہوئے ان سے بولا۔

''کیوں بھیو؟ آپ کون ہوتے ہو میرا ٹکٹ پوچھنے والے؟ کوئی ٹکٹ چیکر ہو؟''

میں جانتا تھا کہ میرا ٹکٹ چیک کرنے کے بعد یہ دونوں مجھ سے آئی ڈی وغیرہ اور دیگر معلومات بھی لینے کی کوشش کریں گے۔

''ہم سادہ وردی میں خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔'' دوسرے نے ذرا تیز لہجے میں میری طرف گھورتے ہوئے کہا تو میں نے ایکا ایکی اپنے لہجے میں خوف سا سموتے ہوئے کہا۔

''اوہ...... سمجھا بھیو! پھر تو آپ سے بحث بے کار ہے۔ ای اوہمرا ٹکٹ......'' کہتے ہوئے میں نے اپنی جیب سے ٹکٹ نکال کر پہلے والے آدمی کے حوالے کر دیا اور ساتھ ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ آیا یہ دونوں خفیہ پولیس کے ہی آدمی تھے یا پھر بلیو تسی کے کوئی ایجنٹ؟

''سورت جاوت ہیں ہم...... اپنی بٹیا کے پاس۔ میرا لہجہ بوڑھوں والا ہی تھا۔ اس دوران میں نے اپنی باڈی لینگویج اور آئی ڈینٹی فکیشن...کا بھی خیال رکھا تھا۔ پہلے والے نے میرے ٹکٹ پر سرسری سی نگاہ ڈالی، اس کے ساتھی نے بھی یہی کیا۔ پھر دوسرا مجھ سے سرد لہجے میں مستفسر ہوا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''بوبن۔'' میں نے ذہن سے گھڑ کر ایک فرضی نام بتا دیا۔

''اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔''

''وہ تو ہمرے پاس نا ہیں ہے۔ ہم جیب میں لیے تھوڑا ہی پھرت ہیں۔''

''تم اُدھر گلڈز کے آفس میں کیا کر رہے تھے؟'' پہلے والے نے بہ غور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ تو ہم اپنی بٹیا کے لیے ایک لوہے کا بڑا سا صندوق لے جانا چاہتے تھے۔ اسی کا پوچھ رہے تھے کہ سورت تک لے جانے میں کتنا خرچ آئے گا۔'' میں نے جواب دیا۔

لیکن مجھے اچانک خیال آیا کہ مجھے ٹکٹ دکھانے کے بجائے صاف انکار کر دینا چاہیے تھا کہ میں کس طرح اپنا کرایہ بچا کر چور راستے سے ٹرین میں سوار ہوا ہوں۔ لیکن اس میں ایک خدشہ تھا کہ وہ میری تلاشی لے سکتے تھے اور ٹکٹ برآمد کر لیتے، یوں میری بات غلط ثابت ہو جاتی۔

میری بات سن کر دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

''بھیو! خیریت تو ہے، کیا کوئی خطرناک مجرم ٹرین میں گھس آیا ہے؟'' میں نے اس بار اپنے لہجے کو احمق سا بناتے ہوئے پوچھا۔

انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ اس کے بعد ٹکٹ مجھے تھما دیا اور آگے بڑھ گئے۔ میں ابھی تک ایک عام آدمی کی ایکٹنگ کیے ہوئے حیرت سے ان کی جانب تکتا رہا۔ پھر سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر تکنے لگا۔ ساتھ ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی۔

میرے مطابق یہ دونوں بلیو تسی کے ایجنٹ نہیں ہو سکتے تھے، کیونکہ انہیں اگر...... مجھ پر یا کسی بھی شخص پر ایک بار شبہ ہو جاتا تو وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ اسی لیے میں نے ان دونوں کے بارے میں یہی اندازہ قائم کیا تھا کہ ان کا تعلق بھارتی خفیہ پولیس سے ہی ہو

سکتا تھا۔

بہر کیف...... یہی بہت تھا کہ بلا ٹل گئی تھی۔

ٹرین نے اب خاصی رفتار پکڑ لی تھی۔ باہر رات کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک ایکسپریس ٹرین تھی، سوشیلا کے مطابق ممبئی یہاں سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت پر جبکہ سورت، دو ڈھائی گھنٹے کے سفر کی دوری پر تھا۔ یہ تیز رفتار ٹرین تھی ممکن تھا کہ دو گھنٹوں کے اندر ہی پہنچا دیتی اور ہوا بھی ایسا ہی، رات پورے دس بجے تک میں سورت کے پلیٹ فارم پر تھا۔ یہاں بھی مسافروں کا رش دیکھنے میں آتا تھا، مگر چیکنگ ندارد...... میں نے سکون کا سانس لیا اور دیگر مسافروں کے جلو میں چلتا ہوا نکاسی والے گیٹ کی طرف بڑھنے لگا...... اپنا ٹکٹ چیک کرایا اور عمارت سے باہر آ گیا۔

سورت کے متعلق مجھے سوشی نے چند گنی چنی یا ضرورت کی حد معلومات دے دی تھیں، جبکہ میں نے خود بھی اپنے طور پر اس شہر مذکور کے محل وقوع کا ایک نقشہ بنایا تھا، جو اب صفحۂ قرطاس سے میرے ذہن میں منتقل ہو چکا تھا اس کے مطابق یہاں میری منزل کس جانب سے شروع ہوتی تھی، اس کا میں پہلے ہی تعین کر چکا تھا، لہٰذا میں نے ایک ٹیکسی والے کو روکا اور اسے سودیا روڈ چلنے کو کہا۔

''اور تساں نے کتھے جاڑاں ہے بابا جی؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے کھڑکی سے اپنا سر باہر نکال کر پوچھا۔ وہ کوئی سکھ ڈرائیور تھا۔ خاصا موٹا تازہ اور بھاری بھرکم جثے والا......

میں نے دوبارہ کہا۔ ''بس! تم مجھے وہاں اتار دینا، میں آگے خود ہی چلا جاؤں گا۔''

''بیٹھو جی بیٹھو......'' وہ مست لہجے میں سر دھنتے ہوئے بولا۔ میں اس کی عقبی نشست کا دروازہ کھول کر براجمان ہو گیا۔ اس نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ سکھ ڈرائیور سارے راستے بولتا رہا۔ میں نے اسے بھی فقط اپنے بارے میں یہی بتایا کہ میں ممبئی سے یہاں اپنی بیٹی سے ملنے آیا ہوں۔

''اے بیٹیاں بی وڈی نیاڑیاں ہوندیاں نیں...... ماں پیو دا جیڈا خیال اے رکھدیاں نیں اتنا پتری لوکی نہیں رکھدے...... ہوندے۔''

''صحیح آکھیا تسی......'' میں نے بھی بالآخر پنجابی میں جواب دیا اور گویا پھنس گیا، وہ سکھ ڈرائیور حیرت سے اپنا سر گھما کر میری طرف دیکھنے لگا اور اسی لہجے میں بولا۔

''اوئے ہوئے...... تسی پنجابی ہو؟ تے ضرور مسلم ہو گے...... سکھ ہوندے تے ایناں دے گیٹ اپ وچ ہی ہوندے......'' اس کم بخت نے اپنی عقل سلیم کا خوب استعمال کیا تھا...... ظاہر ہے، اگر میں خود کو پنجابی سکھ ظاہر کرتا تو اس کا گیٹ اپ بھی ہوتا، کیونکہ سکھ کم از کم سر پر اپنے پگڑ تو ضرور ہی باندھتے ہیں، چاہے نیچے پتلون ہی کیوں نہ پہنی ہوئی ہو......

''آہو جی، تو ہاڈا اندازہ تے سو فیصدی درست ہے، ہن تسی اگے ویکھو، گڈی کدرے لگ نہ جائے......''

اس نے فوراً اپنا سر ونڈ اسکرین کی طرف گھما لیا۔ وہ پھر بھی چپ نہیں ہوا، بولتا رہا۔ آخر کار سودیا روڈ آ گیا۔ سوشی سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق سورت بھارتی گجرات کا ہی ایک شہر تھا۔ اس کا پرانا نام سورج نگر اور سوریا نگر تھا، بعد میں سورت پڑ گیا۔

میں نے ٹیکسی سے اتر کر اسے کرایہ دیا اور پھر ایک طرف چل دیا۔ جب مجھے تسلی ہو گئی کہ وہ جا چکا ہے تو میں نے اپنی مطلوبہ سمت قدم بڑھایا۔ مجھے سورت کے جنوب مشرقی مضافات کی طرف روانہ ہونا تھا اور وہاں کسی ٹیکسی یا رکشے والے کو میں آگے نہیں لے جا سکتا تھا، اس کے لیے مجھے احمد آباد جانے والی کسی مسافر بس میں سوار ہونا تھا۔ میں فٹ پاتھ پر درمیانی رفتار سے پیدل چلتا ہوا آگے پہنچا تو احمد آباد جانے والی بس روانگی کے لیے تیار ہی کھڑی مل گئی، میں ایک قریبی اسٹاپ کا پتا بتا کر اس میں سوار ہو گیا۔ ذرا دیر بعد وہ روانہ ہو گئی۔

میں اپنی سیٹ پر بظاہر خاموش اور مطمئن انداز میں بیٹھا تھا، سیٹ میری کھڑکی کی طرف تھی اور دانستہ اسی سمت بیٹھا تھا جہاں مجھے اترنا تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق مطلوبہ مقام آدھے گھنٹے بعد آنا تھا، اس سے پہلے میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر سے ہیلی کاپٹر میں سوار کروا کر سے جی کو بارا کی بوٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو... خوش قسمتی سے واپسی کے وقت میری آنکھوں سے پٹی تھوڑی سرکی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ایک باریک جھری بن گئی تھی، میں نے اسی میں سے واپس آتے سمے مقدور بھر کوشش اور ہوشیاری کے ساتھ اطراف اور گرد و پیش کا جائزہ لیا تھا، حتیٰ کہ بلیو ٹکسی کے ہیڈ کوارٹر سے لے کر ہیلی کاپٹر میں سوار ہونے اور روانگی تک میں نے کافی حد تک راستہ ازبر کر لیا تھا۔ یہ پہلا مقام تھا۔ باقی میں نے سوشیلا سے کچھ اہم

نشانیاں ڈسکس کر کے تسلی کر لی تھی۔

بہر حال ان ساری نشانیوں اور راستوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔

نصف گھنٹے بعد میں بس رکوا کے اتر گیا۔ یہ کوئی روڈ سائڈ ہوٹل تھا۔ سامنے اس کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ بس آگے روانہ ہو چکی تھی۔ میں ہوٹل کی طرف بڑھا۔ یہاں چند بار بردار ٹرک اور دو تین مسافر لگژری کوچز کھڑی تھیں۔ مسافر اور دیگر لوگ چار پائیوں اور چوبی بینچوں پر بیٹھے کھانے اور چائے وغیرہ پینے میں مصروف تھے۔ میرا یہاں کوئی مصرف نہیں تھا، میں یونہی اس طرف روشنی دیکھ کر نکل آیا تھا مگر اب پلٹ بھی نہیں سکتا تھا، وہاں جا کر میں نے کسی کیبن نما دکان سے چھوٹی موٹی شے خرید کر کھائی اور پانی کی چھوٹی بوتل لی، اسے ختم کرتا ہوا میں گرد و پیش کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ اپنا مطلوبہ علاقہ مجھے یہاں سے تھوڑی دوری کے فاصلے پر ہی محسوس ہو رہا تھا، میں اسی جانب بڑھ گیا۔ ہوٹل کی حدود پیچھے رہ گئی اور میں آگے ہی بڑھتا رہا۔

سپر ہائی وے جیسی سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی۔ یہ میرے سیدھے ہاتھ پر تھی اور بائیں جانب تاریک بنجر ویرانہ۔ مجھے یہاں کی فضا کافی مرطوب محسوس ہونے لگی۔ خنک ہواؤں کے خوشگوار جھونکے بھی چل رہے تھے۔ جلد ہی مجھے یہ مسرت آمیز احساس ہونے لگا کہ میں بالکل ٹھیک سمت میں تھا اور اب مجھے غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ میں ”دشمنوں کی“ کچھار کے پاس پاس تھا اور کوئی بعید نہ تھا کہ اپنے ہیڈ کوارٹر کی حدود سے باہر بھی ان کا کوئی لاسلکی یا معمول سیکیورٹی سسٹم کام کر رہا ہو...... بے شک میں دوسرے بہروپ میں تھا لیکن مجھے شک کی نگاہ سے ”اسپین“ تو کیا جا سکتا تھا۔ میری نقل و حرکت کو بھی واچ کیا جا سکتا تھا یا پھر ایسا سرے سے کچھ بھی نہ ہو یہ محض میرے خدشات ہوں......

تاہم حفظِ ماتقدم کے طور پر مجھے اپنی سی محتاط روی کا خیال تو رکھنا تھا۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے سڑک سے ہٹ کر بنجر ویرانے کی راہ لی اور پھر جیسے جیسے میں آگے بڑھتا رہا، فضا خنک اور نیم جنگلاتی ہونے لگی۔ میں مزید محتاط ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا دل بھی ایک جوش سے تیزی سے دھڑکنے لگا، کیونکہ یہاں مجھے ویسے ہی درخت اور کچھ عمارتیں نظر آنے لگیں، جنہیں میں پہلے دیکھ چکا تھا، پھر جب میں ایک ایسے مقام پر آکر رکا تو بے اختیار میرا جوش ایک سنسنی خیزی کی کیفیت میں بدل گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے ہیلی کاپٹر نے بلندی سے پہلی پرواز پکڑی تھی اور سمندر کی ساحلی پٹی کے ساتھ ساتھ قدرے نیچے ”ڈگڈگاتا“ ہوا وہ بے آف بنگال کی طرف مڑ گیا تھا اور پھر وہ خاصا بلند ہو گیا تھا۔

یہاں رک کر میں نے گویا سانس روکے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ پھر اپنی مطلوبہ سمت کا تعین کر کے ایک طرف اللہ کا نام لے کر بڑھ گیا۔

یہ اسی ساحلی جنگل کا وسطی علاقہ تھا، جہاں سے بلیو تکسی کے ہیڈ کوارٹر کی حدود شروع ہوتی تھی۔

اپنے ”ٹارگٹ“ کے قریب پہنچ کر یکلخت میرے اعصاب تن گئے۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس طرح کے عمل کو کمانڈو ایکشن ”گوریلا شپر مہم“ کہا جاتا تھا، جو کسی چالاک چیتے کی طرح تن تنہا شکار کے پورے ریوڑ پر دھاوا بول دیتا ہے۔ یہی میں کر رہا تھا۔ وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے میری چال ڈھال اب عمر رسیدہ شخص سے بدل کر اپنی ”اصل“ میں لوٹ آئی تھی۔

آسمان پر چاند سو کہیں چھپا ہوا تھا۔ ستاروں کی روشنی سے گرد و پیش کا ماحول کچھ منور ہوتا تھا، اسی کی روشنی میں، متعدد و بنجر حد تک از یادہ دور تو نہیں البتہ قریب کا منظر دکھائی دے رہا تھا سو میں محتاط روی سے آگے بڑھتا رہا۔

دفعتاً ہی میں نے محسوس کیا کہ میرے کانوں سے کوئی آواز ٹکرائی ہے، میں وہیں ٹھٹک گیا اور تمام حساسیت گویا سماعتوں تک سمٹ لیں۔ ایک ذرا سی بھی آہٹ پر میں نے پہلے ہی اسے اپنی توجہ مرکوز کر رکھی تھی۔ وہ آواز کیا نے کیسی تھی؟ مجھے اس کے آہنگ کا ادراک ہو سکا نہ ہی اس کی سمت کا اندازہ......

میں اسے عمومی نوعیت کا وہم جان کر پھر آگے بڑھا اور ابھی چند ہی قدم اٹھائے ہوں گے کہ اچانک ہی میرے عقب میں...... بہت قریب...... دھپ...... دھپ کی آواز ابھری جیسے کوئی پل کے پل ہی میرے سر پر پہنچ گیا ہو، میرے دیکھنے سے قبل ہی کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔ اس کے زور پر میں گرا تو نہیں مگر میرے قدم لڑکھڑا ضرور گئے اور مجھ سے ٹکرانے والا اپنی جھونک میں میرے ساتھ تقریباً لپٹ ہی گیا مگر اس کے لپٹتے ہی مجھے احساس ہوا کہ وہ کوئی نوجوان لڑکی تھی۔

اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح تیز تیز چل رہی تھیں، بال بکھرے ہوئے تھے اور حالت وحشت زدہ سی ہرنی کے مانند ہو رہی تھی جیسے اس کے تعاقب میں بھوکے اور خونخوار

شیروں کا پورا انداز لگا ہو۔

''ک ک...... کون......؟'' وہ متوحش انداز میں ہکلائی۔ وہ بالکل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور اپنا چہرہ اٹھائے یوں مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی گویا وہ کوئی پہاڑ سر کر رہی ہو۔ اس کے چہرے کے دلکش نقوش، گھنی مگر بکھری ہوئی زلفوں کے درمیان یوں ضوفشاں ہو رہے تھے جیسے کسی چھتنار درخت کی شاخوں سے چاندنی چھنک رہی ہو......

اس کی آنکھیں کشادہ اور گہری تھیں، ستواں ناک اور چہرے کی ملائم جلد اس کے نرم و گداز جسم کی لطافت کا پتا دیتی تھی۔

''تم کون ہو......؟ اور یوں کس سے ڈر کے بھاگی جا رہی ہو؟'' میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے سرگوشیانہ سی آواز میں پوچھا۔ اس نے جواب دینے سے پہلے پیچھے گردن موڑ کر دیکھا، تو لامحالہ میں نے بھی اسی سمت دیکھا تو مجھے دور کسی گاڑی کی ہیڈلائٹ نظر آ گئی۔

''وہ...... وہ...... مم...... میرے پیچھے آرہے ہیں...... بھگوان کے لیے مجھے بچالو...... یہ بہت ظالم لوگ ہیں...... انہوں نے...... انہوں نے، آہ......'' وہ پتا نہیں زخم سے کراہی تھی یا پھر کسی درد سے مگر اس وقت میرا اسے ہی نہیں بلکہ خود کو بھی ان سے بچانا ازبس ضروری تھا لہٰذا میں اسے لیے ایک دم سیدھے ہاتھ کی طرف بڑھ گیا جہاں خودرو جھاڑیوں کا ایک مختصر سا سلسلہ قریب بہتی ایک نہر کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ کوئی سمندری شاخ تھی، میں اسے لیے اسی طرف بڑھ گیا اور وہاں چھپنے کی کوشش ہی کی تھی کہ ہیڈلائٹ اسی طرف پڑی، کیونکہ وہ گاڑی جو غالباً اسی لڑکی کے تعاقب میں تھی، ہماری طرف مڑی، شاید اس کے سوار کی نگاہ بروقت ہم پر پڑ گئی تھی۔ ٹھیک اسی وقت وہی ہوا جس کی مجھے توقع تھی، یعنی گولی چلی۔ میں اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو لیے زمین پر گر گیا لڑکی کے حلق سے وحشت زدہ سی گھٹی گھٹی کراہ آمیز چیخ ابھری اور میں اسے اپنے ساتھ چپکائے لڑھکنیاں کھاتا، کسی طرح جھنگر میں جا گھسا، پھر تیزی کے ساتھ اندر تک لڑکی سمیت خود کو گھسیٹتا ہوا لے گیا۔ گاڑی کی آواز تیزی سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں لڑکی کو لیے ایک طرف دبک گیا۔ گچھے دار خودرو جھاڑیاں ایک طرف کر کے میں نے اس کے چھدرے چھدرے رخنوں سے گاڑی کی جانب دیکھنے کی سعی چاہی تو اس کے اندر سے مجھے تین چار چست وردی پوش نکلے اور ادھر ادھر آہٹ ہوتے نظر آئے۔ وہ کھلے تاروں بھرے آسمان تلے تھے۔

میرے اندر چھناکا ہوا، میں نے اپنے ساتھ دبکی لڑکی سے سرگوشی میں پوچھا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور تمہاری ان سے کیا دشمنی ہے؟''

''دش ک...... کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' لڑکی گھگھیاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ آواز پھنسی پھنسی تھی۔ ''ہمیں ان لوگوں نے ٹریس پاس کے الزام میں دھر لیا تھا، پھر ہم چاروں کو اپنے ساتھ تفتیش کے بہانے لے گئے تھے ساتھ...... خود کو یہ کسی حساس ادارے کے اہلکار بتارہے تھے مگر پھر......''

''ش...... شش......'' میں نے اسے بولنے سے روک دیا، کیونکہ اسی وقت وہ سب مخصوص وردی پوش جھنگر کے قریب آگئے تھے اور ان میں سے ایک انہیں تحکمانہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

''وہ لڑکی جانے نہ پائے، ورنہ ہماری خیر نہیں ہو گی...... لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے ہمراہ یہ شخص کون تھا؟''

''یہ بھی انہی لوگوں کا کوئی ساتھی ہو سکتا ہے۔'' ایک نے جواب دیا۔

''بے وقوف......! ان چاروں کے سوا اور کوئی نہیں تھا، آگے بڑھو......''

''تم ادھر سے ہلنا بھی مت...... سمجھیں؟'' میں نے اس کے نرم و نازک گال اور کان کے قریب منہ کر کے کہا اور اس نے ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔ پھر میں سانپ کی طرح ایک طرف تیزی سے رینگ گیا۔ یہ وہی سمت تھی جہاں سے یہ لوگ اندر در آنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ دو افراد آگے تھے اور باقی دو پیچھے ہاتھوں میں گنز تانے انہیں کور دیے قدم اٹھا رہے تھے۔ ان سے ٹکرا ناگزیر تھا۔

میرے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن میں معاً ہی ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کوندا اور میں کسی شکاری چیتے کی طرح بغیر آواز پیدا کیے ان کے پیچھے آ گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب عقب میں رہ جانے والا شخص جانے کس طرح اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس کرتے ہی پلٹا اور میں اس پر جھپٹ پڑا، میں نے جھپٹتے ہی اپنا مخصوص کمانڈو ہتھیار استعمال کیا اور اس کی ہنسلی کی ہڈی کے قریب رگ جاں کو مسل ڈالا...... وہ بغیر آواز پیدا کیے گرنے لگا تو میں نے اسے تھام لیا کہ کہیں اس کے گرنے سے دھمک نہ پیدا ہو

لیکن بدقسمتی سے اس کے آگے چلنے والے ساتھی کو اپنے پیچھے ہونے والی اس "کھڑبڑ" کی بھنک پڑ ہی گئی اور وہ پلٹا۔ میں نے اس کے بے سدھ ساتھی کو اس طرح سیدھا تھامے رکھا تھا کہ مدھم مدھم سی روشنی میں وہ چند سیکنڈ تو یہی سمجھا کہ اس کا ساتھی کھڑا ہے، وہ پلٹا اور میں اس پر جھپٹ پڑا۔ گن اس کے ہاتھ میں چونکہ پہلے ہی سے دبی ہوئی تھی، اس نے خطرے کی بو سونگھتے ہی بنا کسی بوکھلاہٹ میں یا اپنے اندھے دفاع میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی کے دھماکے سے پورا جنگل لرز گیا۔ اس کے ساتھی بھی چونکے، میں نے اس کے پہلے والے ساتھی کی گن پر قبضہ جماتے ہی اس پر گولی چلا دی۔ وہ کریہہ انگیز چیخ خارج کرتے ہی گرا، تو تیسرے اور چوتھے نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھ پر جنگلی بلّوں کی طرح چھلانگ لگا دی۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی شکاری، اپنے کسی آدم خور درندے کے بالکل قریب پہنچ گیا ہو اور لمحہ بھر کو اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے؟

بہرکیف...... میں نے ان کی طرف اپنی گن سیدھی کرنا چاہی تھی کہ وہ مجھ پر آن پڑے۔ ان کا نائٹ کا انداز خاصا منجھا ہوا تھا۔ میں ان کے پلٹے ہی بچے میں اچھے گیا۔ چھینی ہوئی گن بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر تاریکی میں کہیں جا پڑی۔ دونوں نے مجھے دبوچ لیا۔ ایک نے میری گردن پر اپنی گن کی سرد نال رکھ دی اور خونخوار لہجے میں غرایا۔

"خبردار...... اگر ذرا سی بھی حرکت کی۔" میں نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مجھے انہوں نے دبوچ کر اٹھا لیا اور یہی ان کی غلطی تھی۔ وہ مجھے نہتا اور شکار سمجھ بیٹھے تھے، جس نے ان کے ساتھ یہ ساری پھرتی کے لیے "مہم جوئی" کی تھی، میں نے سیدھے کھڑے ہوتے ہی ان میں سے ایک کی ناف کے نیچے ٹانگ جڑ دی، اس کے ساتھی نے ٹریگر دبایا، ٹانگ رسید کرتے ہی مجھے اس کی طرف سے یہی توقع تھی، اسی وجہ کے تحت میں نے اس کے ساتھی کو اس طور ٹانگ جڑی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے چند انچ اچھل کر اس پر جا پڑا اور...... اپنے ہی ساتھی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس کے حلق سے ابھرنے والی چیخ بڑی بھیانک تھی، کیونکہ وہ شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی یا دائیں بائیں کہیں گردے کے مقام پر لگی تھی۔ اس صورتِ حال نے آخری والے کو لمحہ بھر کے لیے بوکھلا دیا، میں نے اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے...... حرکت کی۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ میں اس پر چھلانگ لگانے والا ہوں، اس نے اپنی گن کا رخ میری جانب کرنا چاہا، میں اتنا بے وقوف نہ تھا کہ اس حرکت کی طوالت میں اس کی دوسری گولی کی زد میں آتا، میں نے جھکائی دی اور اپنی ایک ٹانگ سوئپ کی، نتیجے میں وہ اچھلا اور دھپ سے گرا، میں اس پر جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی، وہ لیٹے لیٹے بھی ایک ہاتھ سے اپنی گن کی نال کا رخ میری جانب موڑنے کی کوشش میں تھا کہ میں نے ایک مہیب جھٹکے کے ساتھ اس کی گردن کی ہڈی توڑ ڈالی۔ وہ وہیں ٹھنڈا پڑ گیا۔

"تت...... تم کک...... کون ہو؟"

وہ لڑکی اچانک ہی سامنے سے نمودار ہوئی، جو شاید کافی دیر سے خوف ناک کارروائی کا لرزہ خیز منظر دیکھ رہی تھی، اس نے سامنے آتے ہی مجھ سے سہمے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"آؤ اس طرف، جلدی...... ورنہ ان کے اور بھی ساتھی آ جائیں گے یہاں......" میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا اور ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے نازکی کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

وہ لڑکی مجھے ایک غیر رسیدہ کے روپ میں دیکھ کر یقیناً حیران ہو رہی تھی۔ میں اسے لیے جھنگر سے باہر آ گیا اور جنگل کی طرف بڑھ گیا، وہاں پہنچ کر ایک قدرے محفوظ مقام پر ٹھہر اور لڑکی سے تفصیل جاننا چاہی۔

"اب مجھے تفصیل سے بتاؤ یہ کیا معاملہ ہے؟ تمہارے ساتھ اور بھی کوئی ساتھی تھے، وہ کہاں ہیں؟"

میرے سوال پر اس کے پرکشش چہرے پر افسردگی کی چھاپ گہری ہو گئی بلکہ اس میں ایک وحشت زدہ سی بے چینی بھی محسوس ہوئی مجھے۔

"م...... میری مدد کرو پلیز......! م...... میرے سوشیت کو بچا لو، نجانے ان ظالموں نے اس کا کیا حشر کیا ہو؟" وہ میرے قریب آ گئی، اس قدر...... کہ مجھے اس کے گرم تنفس کی تپش بالکل اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ تاروں کی مدھم مدھم ضوفشانی میں اس کا صباحت بار چہرہ بھی چاند کی طرح پھیکا پھیکا مگر اثر انگیز دکھائی دیتا تھا۔

"تم مجھے ساری تفصیل نہیں بتاؤ گی تو میں تمہاری اور سوشیت کی مدد کیسے کروں گا؟"

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور بھیگی بھیگی آواز میں مختصراً بتانے لگی۔

"میرا نام پریتا ہے۔ میں اپنے منگیتر سوشیت اور اپنے

ایک اور دوست کپل، راج اور منی کے ساتھ سیر کی غرض کو اس طرف نکل آئے تھے، راج اور منی بھی ایک دوسرے کے منگیتر تھے، دراصل ہم چاروں ہی کلاس فیلو اور گہرے دوست بھی تھے، فائنل کے امتحانات کے اختتام کی خوشی میں ہم اپنی کار میں مرگ کے ساحلی علاقے کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں ہماری کار خراب ہوگئی اور ہم مدد تلاشنے کے لیے اس طرف نکل آئے تو یہاں کچھ مسلح آدمیوں نے ہمیں دھرلیا اور کہا کہ ہم ایک حساس سرکاری ادارے کی حدود میں غیر قانونی طور پر داخل ہوئے ہیں، لہٰذا انہوں نے ہم سے پوچھ گچھ کے لیے اپنے ساتھ گاڑی میں سوار کرالیا۔ یہاں سے تھوڑی ہی دور اُن شیطانوں کی وہ بیرک نما چوکی تھی، جہاں ان کے تین اور بھی ساتھی موجود تھے، وہاں پوچھ گچھ کے بہانے ان ظالموں نے منی اور میرے ساتھ کھلواڑ (دست درازی) کی کوشش کی تو راج اور سوشیت کی غیرت جوش میں آگئی، مگر ان مورکھوں نے راج کو گولی مار دی۔ منی نیم پاگل ہوکر بے ہوش ہوگئی، راج کو بھی زخمی کر دیا، میں موقع تاک کر بھاگ نکلی، اور......'' اس سے آگے وہ فرطِ غم یا پھر اس جاں گسل احساس تلے رو پڑی تھی کہ وہ اپنے منگیتر کو ان ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ آئی تھی، کیونکہ اگلے ہی لمحے ایک ذرا توقف کے بعد وہ یاس زدہ سے لہجے میں دوبارہ خود کو کوستے ہوئے بولی۔

''کاش! وہ شیطان مجھے بھی گولی ماردیتے...... آہ...... میرا سوشیت وہاں کس حال میں ہوگا، زندہ بھی ہوگا کہ......'' اس میں ایک بار پھر اپنا دردناک جملہ پورا کرنے کی سکت نہ رہی۔ میں پُرسوچ انداز میں اپنی بھویں سکیڑے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی باتوں سے اپنے طور پر کچھ ''اخذ'' کرنے کی بھی کوشش کررہا تھا، جن کے مطابق یہ کوئی رومانی جوڑے تھے اور تفریح کی غرض سے بلوتسی کے علاقے میں آن پھنسے تھے اور چوکیداری پر مامور ان کے اہلکاروں کے چنگل میں جا پھنسے، جنہوں نے موقع اور ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، اپنی رات کی اس یکسانیت بھری بیزار کن ڈیوٹی کو ''رونق'' بخشنے کے لیے ان نوجوان جوڑوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا تھا۔

''میں سمجھ گیا ہوں، یہ کون لوگ ہوسکتے ہیں، یوں سمجھو ان شیطانوں کے قبضے سے میں بھی اپنی ایک ساتھی کو چھڑانے کے لیے آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ یہ بتاتے ہوئے میرے ذہن میں سوشیلا کی ''صورت'' گھوم گئی تھی۔ یہ لوگ بہ ظاہر خود کو دیش کا محافظ سمجھتے ہیں مگر ان کے اندر کا شیطان ان سے کچھ اور کرواتا ہے۔ خیر...... جانے دو، یہ ایک لمبی بحث ہے۔ تم مجھے وہاں تک لے جاسکتی ہو جہاں یہ تم لوگوں کو لے کر گئے تھے؟'' میں نے آخر میں کسی خیال کے تحت اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ اب وہ بھی میرا چہرہ غور سے تکے جارہی تھی۔ جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کررہی ہو...... بالآخر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنے سر کو ہلکی اثباتی جنبش دے کر کہا۔

''چلو، مجھے تمہیں لے کر پہلے اس جگہ پر جانا ہوگا جہاں ان لوگوں نے ہمیں روکا تھا تبھی مجھے وہاں سے اصل راستے کا اندازہ ہوپائے گا۔''

''چلو......'' میں نے بہ یک ترنت کہا۔

ہم دونوں بڑی احتیاط کے ساتھ جھنگر کے اندر سے نکلے اور پھر پریتا کی نشاندہی پر ہم ایک طرف کو چل دیے۔ ان کی بیرک نما چوکی پر پہنچنا میرے لیے اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہاں میں ان کے ساتھیوں کو بھی چھڑا سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا، میرے اس مشن میں اس کا تھوڑا بہت اضافی بوجھ پڑ سکتا تھا، مگر اس کا مجھے بہت فائدہ ہوتا۔ انہیں چھڑا کر اور بلوتسی کا اصل سیاہ چہرہ میں ان کی انڈین عوام یعنی بھارتی جنتا کو دکھا کر ان سے بددل کرسکتا تھا۔ یہ بلوتسی کے خلاف ہی نہیں بلکہ میرا ''را'' والوں پر بھی ایک سماجی ضرب کے مترادف ہوتا۔ بھارتی جنتا کو یہ پتا چلنا چاہیے تھا کہ ان کے ملک کی انٹیلی جنس (را وغیرہ) صرف اپنے وطن سے مخلص ضرور ہو مگر بھارتی عوام ان کی نظروں میں محض قربانی کے بکرے کے سوا کچھ حیثیت نہیں رکھتی، بھارتی جرنیل اور فوجی نیز انٹیلی جنس آفیسرز سمیت، سب کو اپنی انا پرستی، جنگی جنون اور اپنی بالادستی سب سے زیادہ عزیز رہی ہے، عوامی مفاد میں یہ لوگ اپنی عوام سے ہی قربانی مانگتے ہیں بلکہ ضرورت پڑنے پر اپنے ہاتھوں سے ہی ان کی ''بلی'' بھی چڑھادیتے ہیں۔ ممبئی میں ہونے والے بم دھماکے بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔

بھارت، پاکستان کے خلاف زہر اُگلنے اور الزام تراشی میں ایک لمحے کی بھی دیر نہیں لگاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں حقائق سامنے آنے پر اسے خود ہی کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

بہرکیف جس مقام پر پریتا مجھے لے کر پہنچی وہاں مجھے ایک کنکریٹ کی بنی چھوٹی سی بیرک کی عمارت دکھائی دی،

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، ردا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

جہاں ایک بغیر ہڈ والی جیپ کھڑی تھی۔

''میرا منگیتر سوشیت اور میری ساتھی منی وہاں ابھی تک قیدی ہوں گے، راج تو بے چارہ اب زندہ نہ رہا ہو شاید......'' پریتا نے دھیمی آواز میں کہا۔ میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا اور بہ غور اس چوکی کا جائزہ لینے لگا۔ دشمن کی چھینی ہوئی گن میرے قبضے میں تھی۔ پریتا کو مجھ پر یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میں بھی کوئی عام آدمی نہیں۔

عمارت چوکور تھی اور وہاں سناٹا طاری تھا، اس کی وجہ شاید یہی رہی ہوگی کہ میں ان کے بیشتر ساتھیوں کو ہلاک کر چکا تھا، اب پریتا کے مطابق یہاں دشمنوں کے صرف تین ساتھی ہونے چاہیے تھے۔ چوکی سے میرا درمیانی فاصلہ تیس چالیس گز تک ہی تھا، اس کے دائیں جانب خاردار تاروں کی باڑ شروع ہوتی تھی جو بائیں سمت تک چلی گئی تھی۔ وہاں ایک ہڑول راڈ لگی ہوئی تھی، جس کے پار مجھے ایک نیم پختہ سا راستہ بل کھاتا ہوا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس راستے کو دیکھ کر میرے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی...... راستے کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ یہ بلوگئی کی شہ رگ (ہیڈ کوارٹر) تک جاتا تھا۔

ابھی میں اس بیرک نما چوکی کی طرف پیش قدمی کرنے کی نیت سے قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ معاً میں ٹھٹکا، ایک آدمی کو میں نے باہر نکلتے دیکھا۔ وہ پیچھے دروازے کی طرف دیکھتا ہوا جیپ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے کاندھے پر مجھے کوئی انسانی وجود لدا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ اس کے عقب میں اور ساتھی بھی چوکی کے دروازے سے نمودار ہونے والے تھے۔ اس کے کاندھے پر لدا ہوا انسانی وجود ٹھکانے لگایا جانے والا تھا، جو پریتا کے ساتھی اور منی کے منگیتر راج کی لاش تھی۔ یہی ہوا...... وہ جب تک جیپ کے پاس پہنچا، میں نے دو اور مسلح افراد کو نکلتے دیکھا...... وہ تو اسی کے ساتھی معلوم ہوئے مگر جن دو افراد کو انہوں نے دبوچ رکھا تھا وہ مجھے قیدیوں ہی کی صورت نظر آئے۔

اسی وقت میرے کان کے بالکل قریب پریتا نے سنسناتی سی سرگوشی کی۔

''ی ی...... یہی، بس...... سوشیت اور منی ہیں......''

''شش......'' میں نے ہولے سے اسے خاموشی کا اشارہ دیا۔

''ی۔ یہ...... لوگ ان دونوں کو کہاں لے جا رہے ہیں؟'' وہ میرے منع کرنے کے باوجود جیپ سے نیچے ہی اس پہ بوکھلاہٹ طاری ہو گئی تھی۔ میں نے نیچی اور ذرا سخت آواز میں کہا۔

''تمہاری آواز اگر ان تک پہنچ گئی تو ہم بھی ان کی بربریت کا نشانہ بن جائیں گے، تم ذرا خاموش نہیں رہ سکتیں؟''

''سس...... سوری۔''

''اب تم ادھر ہی رکو......'' میں نے اس سے کہا اور اس طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ اچانک ایک چلاتی ہوئی ہراساں آواز ابھری۔

''تت...... تم ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟'' یہ منی تھی، ایک اہلکار نے اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا، وہ چیخی، ٹھیک اسی وقت میری ٹھٹکی ہوئی نظروں نے ایک اور دل دوز منظر دیکھا۔ تھپڑ کھانے کے باوجود منی کے اندر جانے کہاں سے اتنی جرأت در آئی کہ اس نے ایک زوردار جھٹکے سے اپنا بازو اہلکار کی گرفت سے چھڑایا اور ایک طرف کو دوڑ لگا دی۔ اس کے ساتھی اور پریتا کے منگیتر نے خوف زدہ سی آواز میں اسے رک جانے کا بھی کہا، شاید اسے اس ہولناک حقیقت کا اندازہ تھا کہ وہ ماری جائے گی، سوشیت کا خدشہ صحیح نکلا، اسی وقت گولی چلنے کا دھماکا ہوا، جس اہلکار کی گرفت سے خود کو چھڑا کر منی جان بچانے کے...... احساس جوش تلے بھاگی تھی، اسی درندہ صفت نے اس پر گولی چلا دی تھی جو منی کی پشت میں لگی اور وہ وہیں ایک لرزتی ہوئی چیخ مار کر گر پڑی۔

اپنی ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر میرے ساتھ کھڑی تھر تھر کانپتی پریتا نے ایک ''جھٹکا'' مار دیا۔ وہ مارے دہشت و خوف کے اپنے حلق سے برآمد ہوتی چیخ کو نہ روک سکی تھی۔ اس کی چیخ کے ابھرنے کی دیر تھی کہ وہ دونوں اس طرف متوجہ ہوئے جس مختصر سے تاریک جھنڈ میں ہم دبکے ہوئے تھے، تب ہی ان دونوں نے اپنی گن سیدھی کر لی، پھر اس سے پہلے کہ وہ فائر کھولتے، میں خطرے کو پیشگی بھانپتے ہی اپنی گن سیدھی کر چکا تھا اور ان پر ایک برسٹ فائر کر دیا، منی کو گولی داغنے والا اہلکار ایک کریہہ انگیز چیخ خارج کرتے ہوئے گرا، میرا ہدف بھی یہی تھا، کیونکہ اس کے دوسرے ساتھی نے پریتا کے منگیتر سوشیت کو ہنوز اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ جو فائرنگ کی آواز سنتے ہی فوراً خود کو جیپ کی آڑ میں کر چکا تھا۔

ایک ''محفوظ'' انداز کے تحت میں نے حیران کھڑی پریتا کو دبوچا اور بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ

بدلی، ٹھیک اسی وقت برسٹ فائر ہوا اور اس مختصر سے جھنڈ میں برستی گولیوں نے ہلچل مچا دی، جہاں ذرا ہی دیر پہلے میں اور پریتا دبکے ہوئے تھے۔ تھا میں بھی نہیں تھا، کیونکہ جگہ بدلنے کے بعد اب میرے لیے چھپنے یا آڑ لینے کی کوئی جگہ نہیں بچی تھی، فقط ایک ڈھلان سی تھی، جو کسی منہدم یا بیٹھے ہوئے ٹبے کی ہی ہو سکتی تھی، اسی پر میں سینے کے بل لیٹ گیا تھا اور پریتا کو بھی لٹا دیا۔ میں نے اپنی گن سیدھی کی اور یونہی جیپ کی باڈی پر برسٹ داغا۔

اسی وقت پریتا نے ایک اور جھنڈ مارا، وہ حلق کے بل چلائی اور میرا گن والا ہاتھ پکڑ لیا۔

''فائرنگ مت کرو بے وقوف بڈھے! میرا منگیتر اس حرامی کے قبضے میں ہے۔''

میں اس کی حرکت اور لب و لہجے پر ایک لمحے کو ششدر رہ گیا۔ شاید اس پر ہسٹریائی دورہ پڑ گیا تھا۔ ایسے میں بعض عورتیں گالیاں دینے سے بھی نہیں چوکتیں۔ مجھے بے وقوف کہنے پر طیش آ گیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنی گن سے ہٹایا اور غصے سے بولا۔

''بے وقوفی تم کیے جا رہی ہو...... خود پر قابو پانے کے بجائے چلا چلا کر دشمن کو اس طرف متوجہ کر دیا۔ اب خاموش رہو ورنہ...... حالات کی ذمے داری تم پر......''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ جوابی برسٹ فائر ہوا، میں نے اپنا سر جھکا لیا مگر ساتھ ہی مجھے قریب...... بہت قریب ''بھچاک'' کی عجیب سی ہولناک آواز سنائی دی اور میرا پورا چہرہ خون سے بھر گیا۔

یہ خون پریتا کا تھا۔ وہ مجھ سے بحث میں الجھ گئی تھی اور بروقت میں اسے دشمن کی برسائی ہوئی گولیوں کی مہیب بوچھاڑ سے نہیں بچا سکا۔ اس کا سر اڑ گیا تھا اور اب وہاں خالی کاندھوں سے بھل بھل کرتا خون یوں ابلا پڑ رہا تھا جیسے، پانی کا کوئی پائپ پھٹ گیا ہو...... میں نے پلک جھپکتے ہی اپنی جگہ بدلی، کیونکہ دوسرا برسٹ فائر ہونے میں چند ہی سیکنڈ لگے تھے۔

پریتا کا انجام جس قدر اچانک تھا اتنا ہی ہولناک بھی۔ کاش اسے اس خطرناکی کا علم ہو جاتا کہ وہ اور اس کے ساتھی، کن لوگوں کے نرغے میں آ چکے ہیں، تو شاید وہ میری ایک ایک ہدایت پر بلا چون و چرا عمل کرتی۔

دوسری جگہ چھوڑنے کے بعد میرے پاس اور کوئی جگہ چھپنے یا دشمن کی گولیوں سے بچنے کو نہیں مل سکی تھی۔ لہٰذا میں .... بھی جوابی فائرنگ کی صورت اسے اپنی جگہ [illegible]

پر مجبور کرتے ہوئے چوکی کی عمارت کی جنوبی دیوار کی طرف پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی آڑ میسر آتے ہی مجھے آخری دشمن کی جھلک نظر آ گئی۔ اس کے لیے سوشیت بھی مسئلہ بنا ہوا تھا، مجھے نہیں پتا تھا کہ اسے اب تک اپنی منگیتر پریتا کی عبرتناک موت کا اندازہ ہوا بھی تھا یا نہیں، البتہ وہ تجھی حالات کا کچھ ادراک کرتے ہوئے، اب شاید کچھ ہمت دکھانے پر آمادہ ہونے لگا تھا۔ دونوں کے درمیان گن جھپٹنے پر زور آزمائی ہو رہی تھی اور مذکورہ سمت کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے اسی ''حوصلہ افزا'' منظر کی جھلک دیکھی تھی۔ تب ہی مجھے موقع ملا تھا، میں نے تیزی کے ساتھ اپنی گن کو سنگل شاٹ پر سیٹ کیا اور ایک گولی دشمن کی ٹانگ کا نشانہ لے کر داغ ڈالی، وہ چیخا اور لڑکھڑا کر جیپ کی باڈی سے اپنی پشت ٹکائی، گن ہنوز اس کے ہاتھ میں تھی، جس کی نال کا رخ لامحالہ طور پر سوشیت کی طرف تھا۔ یقینی موت کے خوف سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں مگر میں نے دوسرا فائر کر ڈالا، گولی دشمن اہلکار کے ہاتھ پر لگی اور اس کی گن سوشیت پر گرنے سے پہلے ہی گر پڑی۔ سوشیت کو سکتہ ہونے لگا، اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا، وہ موت کو اتنے قریب دیکھ کر بھی زندہ ہے۔

دشمن نے حرکت کرنی چاہی تھی کہ میں ملک الموت کی صورت اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ زمین پر پڑا رہ گیا اور میری گن کی مہیب نال اس کے سینے کو چھو رہی تھی۔ ابھی میں اس سے درشت لہجے میں مخاطب ہونے ہی لگا تھا کہ اچانک میری سماعتوں میں متعدد گاڑیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ میں نے ہونٹ بھینچ کر اپنی گن کا ٹھوس کندہ دشمن کے چہرے پر رسید کر دیا اور وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا، جبکہ اس کی ہیئت کذائی پہلے ہی خاصی دگرگوں ہو رہی تھی۔

میں نے قریب گم صم سے کھڑے سوشیت کی طرف دیکھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف تکے جا رہا تھا۔

''ادھر آ جاؤ...... ان کے ساتھی آ گئے ہیں۔'' میری آواز پر اس نے فوراً حرکت کی اور میرے ساتھ ہو گیا، میں نے ایک نظر اس طرف ڈالی جہاں سے مجھے ایک سے زائد گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس لہراتی چمکتی نظر آئیں، ان کا رخ اسی چوکی کی طرف تھا اور یہ سمت وہی تھی جہاں ہرڈل راڈ گرائی ہوئی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جو میرے محتاط اندازے کے مطابق بیلو تیس کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کی طرف جاتا تھا۔ یکلخت [illegible] بجلی کی لہریں بن کر دوڑنے لگا۔ میں نے

یہ غور ان گاڑیوں کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی سعی چاہی کہ یہ کتنی تعداد میں ہو سکتے تھے۔ گاڑیوں میں دو بڑی جیپیں اور ایک کار تھی۔ ہونٹ بھینچے بھینچے میں... تیزی سے سوچتے ذہن کے ساتھ چلتا اور سوشیت کو اپنے پیچھے آنے کا بھی اشارہ کیا۔

میں اس بیرک نما چوکی کے دروازے سے اندر جا گھسا۔ یہاں مجھے دو ہی کمرے نظر آئے ایک تو اقامتی طور پر مستعمل نظر آتا تھا جبکہ دوسرا تو باقاعدہ ایمونیشن ڈمپ کا منظر پیش کرتا تھا۔ وہاں راکٹ لانچر اور دیگر اسلحہ کے علاوہ ہینڈ گرینیڈ بم تھے۔ ایسا خطرناک اسلحہ دیکھتے ہی میرے اندر کا خطرناک اور تباہ کن کمانڈو چنگھاڑ مار کے بیدار ہوا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی زخمی شیر کو چیر پھاڑ کھانے کا موقع مل گیا ہو اور میرا شکار تھا...... کرنل سی جی بجوانی......

اس کے ایک کونے میں سیمنٹ کا ایک پختہ زینہ بھی میں نے اوپر چھت کی طرف جاتے دیکھا۔

میں نے پل کے پل ایک بڑی سی کراس شیپ کی بیلٹ جسم پر باندھی۔ راکٹ لانچر اس میں اڑسا، فاضل راکٹ، چند دستی بموں کے ساتھ اس کے چرمی رخنوں میں پھنسائے۔ اپنی گن پھینک کر (جو دشمن سے ہی چھینی ہوئی تھی) ایک دوسری نسبتاً زیادہ خطرناک اور جدید گن اٹھالی۔

سوشیت ایک طرف کونے میں کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک ''عمر رسیدہ'' آدمی کو یہ ساری ''تیاری'' کرتے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور ظاہر ہے کہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر ہی تھا کہ میں تھا کون......؟

ساری تیاری سیکنڈوں میں باندھنے کے بعد میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''تم سوشیت ہو؟''

''ہاں......!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ باہر گاڑیاں رکنے اور مسلح سواروں کے اترنے کی آوازیں ابھریں۔

''تمہاری منگیتر سمیت باقی ساتھیوں کے قاتل یہاں آن پہنچے ہیں۔ مقابلہ میں ان سے کروں گا، تم ادھر ہی کھڑے تماشا دیکھتے رہنا، خبردار......! بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ جان سے جاؤ گے۔'' اپنی منگیتر کی ہلاکت کا سنتے ہی اس بے چارے کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکے سے بیرک کا دروازہ کھلا، میں چونکہ پہلے ہی سے اس کے لیے تیار تھا اور اس نے دینے سے کھڑا تھا کہ در انداز ہونے والا میری بھاری مشین گن کی زد میں تھا۔ میں نے لبلبی دبا دی۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ سے بیرک کی محدود فضا آتشی رنگ و بو اور شور و شغب سے بھر گئی۔ زد میں آنے والا پہلا در انداز ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے لپکنے والے اس کے دو اور ساتھی بھی گولیوں کی طوفانی بوچھاڑ میں آ گئے۔ مجھے ان سب کی مرحلہ وار چیخیں سنائی دیں، میں نے پینترا بدلا اور کمرے کی اسی سمت کو لپکا جہاں زینہ اوپر جاتا تھا۔ میں نے سوشیت کو بھی اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا تھا، وہ اپنا دل چھوٹا کیے بیٹھا تھا، اپنی منگیتر کی موت کا سن کر اس پر مردنی سی طاری ہو گئی تھی۔ تاہم اس نے میری تقلید کی۔

میں اوپر چھت پہ آ گیا، یہ میرے لیے بہترین مورچا تھا۔ میں نے اس سمت والی منڈیر کی طرف دیکھا جو جھک کر دیکھنے سے سامنے کے رخ پر نیچے کا منظر پیش کر رہی تھی مگر اس سے پہلے میں نے زینے سے نیچے کمرے اور بیرک میں متعدد بھاری بوٹوں کی دھمک محسوس کرتے ہی ایک دو دستی بموں کی باری باری پنیں کھینچ کر زینے سے نیچے لڑھکا دیے اور پھر سوشیت کو لیے فوراً ہی وہاں سے ہٹ گیا۔

اس کے بعد دیگرے نیچے دو سماعت شکن دھماکے گونجے اور مجھے اس بیرک کی چھت لرزتی ہوئی محسوس ہوئی، انسانی چیخوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی زینے کے خلا سے میں نے دھوئیں کے گاڑھے مرغولے اٹھتے دیکھے۔

دشمنوں کی ٹیم کو اس طرف سے بوکھلاہٹ میں مبتلا کرنے کے بعد میں کمانڈو ایکشن کے دوسرے مرحلے پر آیا اور منڈیر کی طرف لپکا، یہ میرے دشمنوں پر آخری ضرب ثابت ہو سکتی تھی۔

منڈیر کی دیوار سے نیچے جھانکتے ہی مجھے باقی ماندہ دشمن ادھر ادھر پوزیشنیں سنبھالتے ہوئے دکھائی دیے، میں جانتا تھا کہ ان میں کوئی کسی بھی وقت مجھے دیکھ سکتا تھا اسی لیے ایک پل بھی ضائع کیے بغیر میں نے دو دستی بم ان پر اچھال دیے۔ ان میں سے کوئی خبرداری کے انداز میں چلایا بھی تھا مگر تب تک میرے پھینکے ہوئے دستی بم اپنا کام کر چکے تھے۔ ابھرنے والے سماعت شکن دھماکوں میں ان کی چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں نے اچھی خاصی بھگدڑ مچا دی تھی اور سمجھتا تھا اب کہ میں دشمنوں کی نفری کو طاقت سمیت کم کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں تو میں نے منڈیر سے نیچے ایک جیپ کی کینوسی چھت پر چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت دو مسلح دشمن دائیں جانب سے ابھر کر گن سمیت میری طرف لپکے، میں اپنی جگہ سے اچھلا اور ان پر جا پڑا۔ انہیں رگیدتے

ہوئے زمین تک گرنے پر میں ایک کی ٹھوڑی پر اپنے دائیں ہاتھ کے زوردار پنچ کو آزما چکا تھا۔ وہ وہیں ادغ کی خرخراتی آواز نکال کر ڈھیر ہو گیا جبکہ دوسرے کو میں نے دبوچ لیا۔

''تت...... تم کون ہو......؟'' وہ خاصا دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ مجھے جھٹکا لگا، اسے اس قدر خوف کے عالم میں دیکھ کر مجھے لگا میں بلیوتکسی کے تربیت یافتہ اہلکاروں سے نہیں بلکہ عام پولیسیوں سے نبرد آزما ہوں، یا پھر ممکن تھا کہ یہ بلیوتکسی کا کوئی فارورڈ ونگ گروپ ہو...... اصل تربیت یافتہ کمانڈو ایجنٹ ابھی اندر کہیں موجود تھے۔

''اپنی موت سمجھو لو......'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''وہ کتا! سی جی بجوانی کہاں ہے؟''

''مم...... میں نہیں جانتا۔'' وہ گھگیا کر بولا۔

''تو پھر اپنی کتے جیسی موت کے لیے تیار ہو جاؤ......'' دانت پیس کر یہ کہتے ہوئے میں نے دستی بم نکالا اور اپنے منہ کے قریب لے گیا......

''یی یی...... یہ کیا کرنے لگے ہو تم......؟'' وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

''تمہیں بھیانک موت سے ہمکنار کرنے لگا ہوں۔'' میں نے خوں رنگ لہجے میں کہا۔ ''یہ بم میں تمہاری پتلون کی (بیک) والی جگہ میں پھنسا کر آگے نکل جاؤں گا۔''

''بب...... بتاتا ہوں...... ٹھہ ٹھہ...... ٹھہرو......''

''جلدی بکو...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' میں غرایا۔

''وہ ادھر ہی موجود ہے۔''

''اس کے ٹھکانے کی طرف یہی راستہ جاتا ہے؟''

میں نے آنکھوں اور چہرے کی مدد سے اسی نیم پختہ راستے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں!''

''یعنی ہیڈ کوارٹر بھی ادھر ہے۔''

وہ چپ رہا۔ میں ایک بار پھر دستی بم کو اپنے منہ تک لے گیا، جیسے اس کی پن نکالنے ہی والا ہوں......

''ہاں...... ہاں۔''

''جھوٹ مت بولنا، کیونکہ تم بھی میرے ساتھ چلو گے۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں...... وشواس کرو میرا۔''

''ٹھیک ہے اٹھو...... مگر خبردار! کوئی غلط حرکت کی تو پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔'' میں نے اسے کرخت سے آواز کرتے ہوئے تہدید کی۔

میں نے دونوں جیپوں کو چھوڑ کر کار کا انتخاب کیا اور سوشیت کو اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا کہا۔ اس نے فوراً میری ہدایت پر عمل کیا۔

اب ہم اس مذکورہ راستے پر گامزن تھے۔ میں دشمن اہلکار کو عقبی سیٹ پر گن پوائنٹ پر لیے بیٹھا تھا اور سوشیت کار چلا رہا تھا۔

''انکل...... ! کک...... کیا واقعی میری پریتا کو ان ظالموں نے مار ڈالا ہے؟'' کار چلاتے ہوئے سوشیت نے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ وہ میرے ''گیٹ اپ'' کی وجہ سے مجھے ''انکل'' کہنے پر حق بجانب تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔

''ہاں! برخوردار...... ! وہ اب اس دنیا میں نہیں رہی، ان ظالموں نے اس بے چاری کو بھی بڑی بیدردی سے ختم کر ڈالا۔''

''یہاں ہوا کیا تھا؟'' مغلوب اہلکار نے پوچھ لیا۔

میں نے دانت پیس کر غصے سے کہا۔

''تم لوگ بھارتی سرکار کی وردی پہن کر یہاں کیا گل کھلا رہے ہو، یہ بہت جلد منظر عام پر آنے والا ہے۔'' میں نے کہا اور پھر پریتا کی بتائی ہوئی روداد بلاکم و کاست بیان کر دی۔

''میں اپنے ساتھیوں کی اس غلط اور ظالمانہ حرکت پر شرمندہ ہوں...... تم کون ہو؟'' وہ بولا۔ مجھے اس کے لہجے سے روایتی مکاری کی بو صاف محسوس ہونے لگی تھی مگر میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی سوشیت دکھ بھرے غصے سے بیک ویو مرر میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''تم جلاد ہو سب...... سرکار کی وردی میں بدمعاشی اور کھلواڑ کر رہے ہو یہاں...... تم نہیں جانتے کہ میں کون ہوں اور...... میری منگیتر پریتا کس کی بیٹی تھی، اس کے باپ گھوترا جی...... کو جب اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی ہلاکت کا علم ہو گا تو وہ پورے بھارت میں ایک بھونچال کھڑا کر دے گا۔''

''گھوترا جی...... گھوترا جی......''

یہ نام ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ میں بجنے لگا۔ یہ نام میرا سنا ہوا تھا۔ میں نے پل کے پل اپنی یادداشت کو کھنگالا اور بے اختیار میں نے سوشیت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم...... کہیں ان گھوترا جی کی بات تو نہیں کر رہے ہو جو بھارتی فلمی صنعت کا ایک بڑا اگر تا دھرتا ہے؟''

"انگریز یکیٹی ...... انکل! وہی گھوتراجی ہیں ...... کیا آپ انہیں نہیں جانتے ہیں؟" وہ بولا۔

"ہاں ......!" میں نے مختصراً کہا۔

ممبئی کے قریبی شہر کے ساحل سمندر میں واقع بیچ ریسٹورنٹ میں اس کی اور میری ملاقات ہوئی تھی، جب ریتا اور اس کے منگیتر مہیش کے ساتھ چند اوباش لڑکے بدمعاشی کر رہے تھے اور پھر میں ان کے بیچ کود پڑا تھا، بس پھر کیا تھا وہ گھوتراجی میرے پیچھے گویا ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے کہ میں ان کی نئی آنے والی ایکشن رومان فلم میں کام کروں، یہ جاننے کے باوجود کہ میں کوئی اداکار نہیں تھا نہ ہی مجھے اس کا تجربہ یا شوق بھی تھا، مگر گھوتراجی ماننے کو تیار نہ تھا، اب پتا نہیں میں نہیں جانتا تھا کہ اس رذیل بھجوانی نے پورے بھارت میں مجھے پاکستانی ایجنٹ ڈکلیئر کرنے اور میری تصاویر "وطن دشمن" کے روپ میں پورے بھارت میں پھیلا دینے کے بعد گھوتراجی کی اب میرے بارے میں کیا رائے یا تاثرات ہو سکتے تھے، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا۔

سامنے کسی عمارت کا خاکہ نمودار ہوتے ہی میں نے سوشیت سے کار روکنے کا کہا۔

سوشیت اب میرے لیے اہم ہونے لگا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "دیکھو برخوردار ...... ذرا بہادری سے کام لینا ہے اب تمہیں ...... اگر تم اپنی منگیتر پریتا اور اپنے ساتھیوں سے سچی محبت کرتے ہو تو تم پر بھی لازم ہے تم اپنے ان معصوم اور بے گناہ ساتھیوں کے خون ناحق کا پورا پورا بدلہ لو ...... ورنہ خاموشی سے جانا چاہتے ہو تو ...... یہ راستہ اور یہ کار تمہارے حوالے ہے، ابھی لوٹ جاؤ ......" میں نے تجاہلاً یہ بات اس سے کہہ کر اس کی کون سی رگ پھڑکا دی تھی کہ وہ ایک دم کار کو بریک لگا کر جوش سے بولا۔

"ہرگز نہیں انکل ......! میں اور پریتا بچپن کے ساتھی تھے اور ہم ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے۔ میں تو ابھی تک اپنی پریتا کی ناگہانی موت پر ذہنی طور پر تیار ہی نہیں ہو سکا ہوں، پھر راج اور منی کی دردناک موت کو بھی میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتے دیکھا۔ ہم سب گہرے اور بچپن کے دوست تھے، ہرگز نہیں انکل ......! میں آپ کے ساتھ ہوں اور اپنی پریتا سمیت اپنے ان دونوں معصوم ساتھیوں کی موت کا بدلہ ضرور لے کر رہوں گا ...... میں آپ کی طرح شہ زور تو نہیں ہوں انکل ......! لیکن آپ شاید پریتا کے ڈیڈی گھوتراجی کو نہیں جانتے۔ وہ بڑے اثر و رسوخ والے آدمی ہیں اور یہ کہنا جب انہیں اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی ہلاکت کا علم ہوگا اور وہ بھی ان جعلی اہلکاروں کے ہاتھوں، وہ ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیں گے۔"

مجھے جواب مل چکا تھا اور میں نے پیش آئندہ اور پیش آمدہ حالات کا فوراً تجزیہ کیا۔ اس کے بعد سوشیت سے بولا۔

"گڈ ...... اب تم ادھر ہی رکے رہو ...... یہاں سے ہلنا بھی مت ...... میں ابھی لوٹ کے آتا ہوں ...... ہاں، خطرہ محسوس کرو تو تمہیں جانے کی اجازت ہے۔ اپنی جان کی فکر کرنا پہلے ......!"

"آپ کوئی چنتا مت کریں انکل! آپ جتنی دیر میں بھی آئیں، مجھے ادھر ہی پائیں گے۔" اس کے لہجے کا استحکام میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ پھر میں خود سمیت دشمن اہلکار کو لیے کار سے نیچے اتر آیا اور سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ اگرچہ میں اپنے ہدف کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور مجھے ادھر پہلے بھی لایا گیا تھا اس لیے اب وہ میرے کام کا نہیں رہا تھا۔ اس نے غیر ارادی طور پر میرے اشارے کی سمت دیکھا تو میں نے بہ سرعت اس کی رگ حساس مسل ڈالی، وہ کٹے ہوئے شہتیر کے مانند گر پڑا۔

میں نے پیچھے مڑ کر کار کی کھڑکی سے حیران کن نظروں سے جھانکتے ہوئے سوشیت کو فتح کا انگوٹھا دکھایا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

یہ بالکل سو فیصد وہی جگہ تھی ...... یعنی جہاں میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا تھا اور واپسی کے وقت پٹی کی ایک بھری کھلی رہ جانے کی وجہ سے میں یہاں سے ساحل سمندر اور سے جی کو ہارا کی بوٹ تک سارا راستہ ازبر کرتا رہا تھا۔ خشکی کے راستے سے یہاں تک آنے کے لیے میں نے سوشیلا سے مدد لی تھی۔

اب میرا ٹارگٹ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے وسیع و عریض احاطے میں مجھے چند گاڑیاں کھڑی دکھائی دے رہی تھیں، کچھ مسلح افراد اس کے گرد اور چھت پر مٹر گشت کر رہے تھے۔ چھت والے مسلح پہرے داروں کے گلے میں انفراریڈ دوربینیں جھول رہی تھیں، جنہیں وہ گاہے بہ گاہے اپنی آنکھوں سے لگا کر گرد و پیش پر نظر ڈال لیتے تھے۔ چھت پر ایک بڑا پیالے کی شکل کا ڈش انٹینا بھی نصب تھا، جس کے درمیان ایک سرچ لائٹ لگی ہوئی تھی، یہ گردشی انٹینا تھا۔ جس کا جائزہ لیتے ہوئے میں دفعتاً ہی چونکا تھا، کیونکہ میں نے اس لائٹ کے سنگم میں ایک تیز نارنجی

رنگ کی لکیر بھی وقتاً فوقتاً پھوٹتے دیکھی۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا...... یہ ایک خطرناک سرچنگ ریز (کھوجی شعاع) تھی۔ جو خاصی دور دور تک پڑ رہی تھی۔ کوئی بعید نہ تھا کہ اس کے ساتھ طاقتور گن بھی نتھی ہو۔ عمارت کے سامنے مجھے فقط ایک ہی بڑا سا اونچی چوکھٹ والا دروازہ نظر آرہا تھا، ایک دو سنگل پٹ کے دروازے مجھے سامنے کی رخ والی دیوار کے دونوں آخری سمتوں پر بھی نظر آئے۔ یہاں ذرا ذرا فاصلے پر لوہے کے پائپوں پر گلوب نما بلب روشن تھے۔ خاردار آہنی باڑھ نے عمارت کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

میرے پاس چوکی سے حاصل کردہ اسلحہ موجود تھا۔ میں چاہتا تو دندناتا ہوا اندر جا گھستا، مگر یہ نری خودکشی کا بھی سبب بن سکتا تھا۔ جبکہ ابھی تک یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی تھی کہ میرا اصل ''شکار'' (سی جی بھجوانی) اندر موجود بھی تھا یا نہیں، اگرچہ آخری دشمن اہلکار نے مجھ سے یہی کہا تھا۔

ابھی میں دراندازی کے مختلف پہلوؤں پر غور کر ہی رہا تھا کہ اچانک میں نے سرچ لائٹ کے سنگم میں مختلف زاویوں میں گردش کرتی اس تیز نارنجی روشنی کی لکیر کو یکدم رخ بدلتے دیکھا۔ یہی نہیں، گھومتا ہوا یہ ریڈار سسٹم ڈش انٹینا کو بھی میں نے تھمتے دیکھا۔ میرے ذہن میں کھٹکا ہوا۔ کھوجی شعاع کا رنگ بدلنا اور گردش کرتی سرچ لائٹ کا ڈش سمیت رک جانا خالی از علت نہ تھا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن میں ابھرا کہ کہیں میں ہی تو اس کی ان دیکھی زد میں نہیں آگیا ہوں؟ مگر دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونکا۔

''سوشیت۔''

یہ نام اچانک ہی میرے بھٹکتے ہوئے ذہن پر سا میں ابھرا تھا اور میری پیشانی پر تفکر آمیز سلوٹیں نمودار ہو گئیں۔ شاید وہ اس کی کھوجی شعاع کی زد میں آگیا تھا اور اب اس کی مع تصاویر کے لوکیشن اندر بیٹھے کسی سیکیورٹی روم کے مانیٹر میں ٹریس کی جا رہی ہو گی۔ ان اسپائی آلات کی خفیہ کارکردگی کو بھلا مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا تھا؟ اور سوشیت اس کی زد میں آچکا تھا۔ سوشیت کی زندگی خطرے میں تھی اور میرا مشن بھی اسی زد میں تھا، جبکہ مجھے اپنے مشن کے ساتھ سوشیت کی بھی جان بچانی تھی۔ کیونکہ وہ ان اہلکاروں (بلیو ٹمسی) کی اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ''کھلواڑ'' اور بہیمانہ قتل و غارت گری کا چشم دید گواہ تھا اور گھوترا جی جیسے آدمی کا ہونے والا داماد بھی۔

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے عمارت کے اندر سے چند مسلح افراد دوڑتے ہوئے دکھائی دیے۔ وہ قریب کھڑی ایک جیپ میں تیزی سے سوار ہو رہے تھے، میں نے ان کی طرف... سردست کوئی توجہ نہ دی اور دوڑتا رہا...... سوشیت کار کے باہر بونٹ سے لگا کھڑا تھا، اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ خونی قاتلوں کی زد میں آچکا ہے جو اب خونخوار بھیڑیوں کی طرح اس کی طرف لپکنے والے تھے۔ اس سے پہلے میں وہاں جا پہنچا مگر اس کے قریب جانے کی غلطی نہ کی اور دور کھڑے ہو کر اسے اشارے سے بلایا...... وہ بھی کچھ بےچین سا نظر آرہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میری جانب لپکا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کھوجی شعاع اس کے تعاقب میں ہو گی۔ وہ اگر میرے قریب آیا تو میں بھی ٹریس کر لیا جاؤں گا لہٰذا میں نے اسے فاصلے پر ہی رک جانے کا کہا اور بولا۔

''ادھر ہی رک جاؤ...... تم دشمن کے ایک خطرناک سیکیورٹی سسٹم کی زد میں آچکے ہو اور وہ تمہیں ہلاک کرنے کے لیے نکل رہے ہیں......'' اس کے چہرے کا رنگ یکدم فق ہو گیا۔ میں نے کہا۔

''ہمت اور حوصلے سے کام لو...... میں تمہارے ساتھ ہوں...... بس! مجھ سے ذرا فاصلے پر رہنا......''

اس نے حلق میں اترتی رقیق شے کو نگلتے ہوئے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ یہی وہ وقت تھا جب قریب سے گاڑی کی آواز ابھری، یہ وہی لوگ تھے، میں نے سوشیت کو ایک درخت کی آڑ میں جانے کا اشارہ کیا اور خود اس راستے پر آگیا۔ جہاں سے وہ جیپ آرہی تھی، ذرا قریب آنے پر میں نے اپنے کندھے سے راکٹ لانچر اتار لیا...... اب دشمن کے ٹھکانے پر دھاوا بولنے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا، میں نے جیپ کا نشانہ لے کر فائر بٹن دبا دیا۔ ایک تیز سنسناتی ہوئی آواز ابھری اور راکٹ فائر ہوا...... جب تک جیپ سواروں کو خطرے کا پوری طرح اندازہ ہوتا، راکٹ ان کی جیپ سے ٹکرا چکا تھا۔ ایک سماعت شکن دھماکے سے جیپ کو میں نے آگ کے گولے کی طرح فضا میں اچھلتے دیکھا اور چلّا کر سوشیت سے بولا۔

''تم اب یہاں سے ہلنا بھی مت، ادھر ہی دبکے رہو، ورنہ جان سے جاؤ گے، میرا انتظار کرو......''

اس کے بعد میں تیزی سے پلٹا۔

دشمن کی صفوں میں ہلچل مچ چکی تھی۔ میں دوڑتا ہوا عمارت کی اس دیوار کے قریب آگیا جو جنوبی سمت

میں تھی۔ یہاں ذرا ایک کر میں نے دیکھا کہ اندر سے چند اور مسلح افراد برآمد ہو رہے تھے، میں جب اپنے کاندھے پر لدے ہوئے راکٹ لانچر کی نال میں دوسرا راکٹ پھنسا چکا تھا، دشمنوں کے اس نئے اور مختصر سے جتھے کو دیکھتے ہی میں نے ان پر راکٹ فائر کر دیا۔ دھماکا ہوا اور متعدد کریہہ انگیز چیخوں کے ساتھ میں نے دشمنوں کے ناپاک وجود کو فضا میں اڑتے دیکھا، اس پر ہی میں نے بس نہیں کیا، اس وقت میرے وجود کی نس نس میں جوش و غیظ کا طوفان بپا ہو گیا تھا..... میری لہورنگ نگاہوں کے سامنے بار بار میرے بوڑھے باپ کا چہرہ رقص کرنے لگا تھا۔ یہ وہی منحوس جگہ تھی جہاں میرے باپ تاج دین شاہ پر ایک طویل عرصہ تک ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑے گئے تھے اور آج میں اس مقام کی اینٹ سے اینٹ بجا دینا چاہتا تھا۔

میں نے ایک راکٹ اور فائر کر ڈالا۔ اس بار میرا نشانہ چھت پر نصب وہ ڈش انٹینا کی طرح کا ریڈار تھا۔ وہاں آگ لگ گئی اور سارا اسیکورٹی سسٹم تباہ ہو گیا۔

بلیو لنکس کے ٹھکانے کے باہر دھوئیں اور بارود کے بادل منڈلانے لگے تھے، میں اس کی آڑ لیتا ہوا محتاط روی سے آگے بڑھنے لگا۔ بھاری فولادی گارڈز کو میں نے ایک دستی بم مار کر پہلے ہی اڑا دیا تھا۔ ایک سائرن بھی گونجنے لگا تھا، جو تھوڑی ہی دیر تک ہنکارنے کے بعد بند ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بہت سے لوگوں کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے راکٹ لانچر پھینک کر بھاری مشین گن سنبھال لی تھی اور آواز کی سمت میں نے بے دریغ فائر کھول دیا، متعدد چیخوں ... کی آوازیں سنتا ہوا میں اس سنگل پٹ والے دروازے کے قریب پہنچ گیا اور ساتھ ہی مین گیٹ کی طرف یکے بعد دیگرے دو ہینڈ گرینیڈ اچھال دیے، کان پھاڑ دھماکوں کی آوازیں سننے کے دوران ہی میں نے اپنی گن سے سنگل پٹ والے دروازے کو توڑا اور اندر جا گھسا، میرے عقب میں کسی نے فائر کھولا تھا اور اس کے آہنگ سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ باہر میری تلاش میں نکلے ہوئے دشمنوں کی تعداد ''تسلی بخش'' حد تک کم ہو چکی تھی۔

اندر قدم رکھتے ہی..... مجھے ایک راہداری دکھائی دی، جو تھوڑا آگے جا کر سیدھے ہاتھ کی طرف مڑ رہی تھی، میں نے اس جانب دوڑ لگا دی۔ ابھی تک میرے سامنے کوئی ذی نفس نہیں آیا تھا، یا پھر لگتا تھا کہ ان کی ساری توجہ عمارت سے باہر تھی اور وہ باہر نکلتے چلے گئے تھے۔ میں نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی جارحانہ پیش قدمی کو جاری رکھا اور ایک کمرے میں آ کر دم لیا۔ یہاں کوئی نہیں تھا، دفعتاً مجھے اس کے دوسرے دروازے کے باہر دوڑتے ہوئے بھاری بوٹوں کی آواز سنائی دی۔ میں چونکا اور محتاط روی سے اس دروازے کی طرف بڑھا جو میرے بائیں ہاتھ کی طرف تھا، اسے تھوڑا کھول کر باہر جھانکا تو یہ مجھے بڑے سے ہال کی صورت نظر آنے لگا، اور یہاں میں نے آٹھ دس مسلح افراد کو بھاری مشین گنیں اٹھائے لپکتے دیکھا، ان کا رخ سامنے کی جانب تھا۔ میں نے دروازے کی چوکھٹ والی دیوار کی آڑ لے کر اپنی مشین گن سے ان پر فائر کھول دیا، کئی چھلنی ہو کر گرے، چند نے خود کو گرا کر گولیوں کی زد سے بچانے کی کوشش چاہی۔ یہی نہیں، انہوں نے بلاخیز پھرتی کے ساتھ لیٹے لیٹے پلٹ کر میری جانب برسٹ بھی چلائے، مگر میں ان کے نشانے سے بچا رہا اور جس تیزی کے ساتھ ان چند دشمنوں نے زیرک دماغی کے ساتھ پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے میری زندگی داؤ پر لگ سکتی تھی۔

خطا جانے والی گولیوں کی دائیں بائیں بوچھاڑ پڑتے ہی میں نے خود کو ایک دم چوکھٹ والی دیوار کی آڑ میں کر لیا اور ساتھ ہی ایک آخری بچا ہوا، بیلٹ میں اڑسا دستی بم نکال کر اس طرف اچھال دیا۔ سگریٹ جیسے دھوئیں کے مرغولے چھوڑتا، میرا پھینکا ہوا ہینڈ گرینیڈ لڑھکتا ہوا ان کی طرف چلا گیا اور دشمنوں نے اٹھ کر کھڑے ہونے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے، ہاتھوں، کہنیوں اور گھٹنوں کی مدد سے اپنے آپ کو دستی بم کی زد سے دور لے جانے کی اپنی سی کوشش چاہی تھی کہ کان پھاڑ دھماکے سے وہ پھٹ گیا۔ کریہہ انگیز چیخوں کی آواز پر میں نے تیزی مگر محتاط روی کے ساتھ پیش قدمی کی اور ان کے سر پر جا پہنچا، کافی سے زیادہ واصل جہنم ہو چکے تھے، باقی اِکا دُکا، جاں بہ لب تھے، میں نے ایک زخمی کو مشکوک سی حرکت کرتے دیکھ کر چھاپ لیا اور وحشت لہورنگ غراہٹ سے بولا۔

''وہ کتا..... سی جی بھیجانی کدھر ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ جیسے مرنے کے قریب ہو، میں نے اس پر وقت ضائع نہیں کیا اور گن سنبھالے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

مختلف کمرے کھنگالنے کے بعد میں جس کمرے میں پہنچا، تو اس کا نقشہ دیکھ کر میں بری طرح ٹھٹکا۔

یہی کمرا میرے شکار سی جی بھجوانی کا تھا...... کیونکہ سامنے دیوار پر اس کی شیشے کے فریم والی ادھ قد آدم تصویر ٹنگی ہوئی تھی، جس میں اس نے فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ چہرے پہ رعونت کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں سے سفاکی مترشح تھی۔

کمرا خاصا کشادہ تھا مگر باہر پھیلے بارود اور دھوئیں کے سبب یہاں کی محدود فضا بھی کچھ گدلی گدلی سی ہو رہی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں بڑا سا آرام دہ بیڈ رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک فیملی سائز صوفہ بھی بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کونے میں ایک بڑی سی میز رکھی تھی جس پر تین بڑی اسکرینز نظر آ رہی تھیں، دو بالکل تاریک تھیں، جبکہ ایک آن تو تھی مگر اس میں آڑی لکیروں کا جال سا تنا ہوا تھا، اس کے سامنے ہی ایک لمبا اونچی پشت گاہ والی ایزی چیئر رکھی ہوئی تھی، جس پر بیٹھنے کے ساتھ کوئی براجمان تھا۔

میری گن کا رخ اسی شخص کی پشت کی طرف تھا اور میری آنکھوں میں خون اترا آیا تھا، دفعتاً ہی کمرے کی بوجھل خودی فضا میں ایک شناسا اور کرخت آواز ابھری۔

”آؤ شہزی...... ! میں تمہیں یہاں سو یکار کرتا ہوں......“

اس آواز کے ابھرنے کے ساتھ ہی وہ شخص کرسی گھما کر میرے سامنے آ گیا۔ وہ کرنل سی جی بھجوانی ہی تھا۔ وہی درندہ صفت شخص، جس نے میرے باپ پر انسانیت سوز تشدد کر کے اس غریب کی یادداشت ختم کر ڈالی تھی مگر اس سے بھی قطع نظر یہ وہی مردود و ملعون شخص تھا جو یہاں بیٹھا میرے وطن کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ سب سے بڑا جرم اس کا تو ایک یہ بھی تھا کہ یہ خبیث اور متعصب ہندو...... ماضی میں میرے وطن کو دولخت کرنے کی سازش میں کار فرما لابی کا بھی ایک اہم رکن رہ چکا تھا۔ اس کی دشمنی کے بہت سے حوالے تھے میرے ساتھ...... اور ہر حوالہ اسے میری نظروں میں واجب القتل قرار دے چکا تھا۔ لیکن...... ان سب باتوں کے باوجود مجھے اس کا ایزی چیئر پہ براجمان ہو کر مجھ سے یوں مخاطب ہونا اور مجھے ایک بوڑھے کے بھیس میں ہونے کے باوجود پہچان لینا، میرے لیے کچھ اچنبھے کا ہی باعث تھا، تاہم میں نے اس سے مرعوب ہوئے بغیر دبنگ لہجے میں کہا۔

”بھجوانی...... ! اپنی موت کو آج پہچان لے جو تجھ سے اب زیادہ دور نہیں رہی ہے......“

”ہا...... ہا......“ اس نے ایک بلند بانگ قہقہہ بلند

کیا۔ میری پیشانی پر بل ابھر آئے۔ آخر اس بدبخت کو کس بات کا اطمینان تھا؟ یا پھر یہ اپنی یقینی موت کو دیکھ کر پاگل سا ہونے لگا تھا؟ میں کچھ اندازہ قائم نہ کرسکا۔

''تم مجھ سے پوچھو گے نہیں کہ میں نے یہاں بیٹھ کر تمہیں کیسے پہچان لیا؟'' وہ میری بات صرفِ نظر کرتے ہوئے پُرغرور لہجے میں بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہ پوچھنا میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

''ایک بات تو یہ کہ یہاں تک پہنچنے والا ایک شہزی کے سوا بھلا اور کون ہوسکتا ہے۔'' وہ آگے بولتا رہا۔ ''دوسرا یہ......''

کہتے ہوئے اس نے روشن والی اسکرین کے آگے ایک کی بورڈ کا بٹن پش کیا اور اسکرین پر میری موجودہ بھیس والی تصویر نمودار ہوگئی لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خاص سوفٹ ویئر کی مدد سے وہ تصویر مختلف زاویوں سے گزرتی میری اصل شکل میں آگئی۔... میں بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

''میرے لیے اب ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی ہے مردود کتے......! مرنے کے لیے تیار ہوجا......'' میں نے دانت پیس کر کہا اور اپنی گن کی نال کا رخ اس کے سینے کی طرف کرتے ہوئے لبلبی پر اپنی انگلی رکھ دی۔

''نا نا...... نا...... نا...... شہزاد احمد خان...... شانت رہو...... اتنی جلدی مت کرنا مجھے ہلاک کرنے کی...... شاید تم ابھی مجھ سے پوری طرح واقف نہیں ہو کہ میں ہمیشہ اپنے پاس ایک ٹرمپ کارڈ ضرور رکھتا ہوں......'' وہ استہزائیہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ اس کی بات پر گن کی لبلبی پر تھرکتی ہوئی میری انگلی ساکت ہوگئی، ورنہ اگلی جنبش پر میں برسٹ فائر کرنے ہی لگا تھا۔

''مانا کہ تم اپنے باپ کی طرح بہادر اور ذہین ہو، لیکن مکاری میں تم کبھی بھی سی جی بجھوانی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ میری دور اندیشانہ فراست وہاں تک جاتی ہے جہاں تمہاری ذہانت بھی پانی بھرتی ہوگی۔ کوہارا کی یوٹ کو نشانہ عبرت بنانے اور میرے اہم ساتھیوں کو ہلاک کرنے کے بعد سے جب تم فرار ہوگئے تھے تو میں تمہارے خلاف ایک اور چال پر عمل پیرا ہوچکا تھا، مگر بظاہر تم یہی سمجھے ہوئے تھے کہ میں تمہیں پکڑنے کے لیے کوشاں ہوں...... ہیں ناں......؟ میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا...... شہزی......؟''

اس کا لہجہ لحہ بہ لحہ زہریلا اور کاٹ دار ہو رہا تھا، جو میرے دل و دماغ میں طاری جوش اور غیظ کے طوفان کو فزوں سے فزوں کرنے کا باعث بن رہا تھا۔ میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

بالآخر میں نے جھلا کر کہا۔ ''تم کچھ بھی بکواس کرتے رہو...... بجھوانی! آج تم میرے ہاتھوں نہیں بچ سکتے......''

''بس......! اب ذرا...... یہ دیکھ لو پہلے......'' اچانک اس نے ایک اور بٹن دبایا۔ اسکرین میں جھماکا ہوا۔ اس کے بعد ایک فلش پلیئر کی تاریک اسکرین ابھری اور اگلے ہی لمحے اس پر ایک ویڈیو کلپ دکھائی جانے لگی۔ یہ کسی سیلن زدہ سے کمرے کا منظر تھا۔ جو قید خانہ ہی نظر آتا تھا۔ تین افراد قیدیوں کی صورت ایک ساتھ کھڑے تھے، ان کے ہاتھ، چھت سے جھولتی فولادی زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ چہرے سامنے کے رخ پر تھے، ان کی ہیئت کذائی بہت خستہ ہورہی تھی۔ جسموں پر جابجا تشدد کے نشانات نظر آرہے تھے مگران تینوں کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہونے لگے۔ انہیں پہچان کر مجھے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا دوبھر ہونے لگا۔ یہ تینوں قیدی، اول خیر، شکیلہ اور جمیل دادا تھے۔ جوشِ غیظ سے مغلوب الغضب ہوکر میں کرسی پر بڑے آرام سے براجمان، زہریلے انداز میں مسکراتے ہوئے سی جی بجھوانی پر جھپٹا اور اس کی گردن دبوچ لی...... اور اپنا لہورنگ چہرہ اس کی منحوس صورت کے بہت قریب لے جاکر پیچ و تاب کھانے والے انداز میں غرا کر بولا۔

''کتے...... کہاں قید میں رکھا ہے تم نے انہیں......؟ جلدی بتا کتے! ورنہ میں تیرا برا حشر کردوں گا۔''

اس کے اطمینان اور اعتماد بھرے انداز میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کے برعکس وہ گویا حظ اٹھانے والے انداز میں اسی طمانیت سے بولا۔ ''دھیرج...... مائی ڈیئر شہزی! دھیرج......!''

''نہیں ابھی بتا...... یہ کہاں قید ہیں؟ میں تجھے جان سے مار ڈالوں گا...... بول......''

''یہ میری قید میں ہیں اور نہ پاکستان میں ہیں نہ یہاں بھارت میں......'' وہ عجیب ڈرامائی اور سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''کہاں ہیں یہ تینوں؟''

''بتاتا ہوں...... گردن چھوڑو...... مجھے سانس لینے میں دقت ہورہی ہے......'' وہ ہولے سے کھانسی کا ٹھسکا مارتے ہوئے بولا۔

''ہرگز نہیں......''

''ہا...... ہا...... ہا......'' اس نے اپنے حلق سے پھنسا

پھنسا قہقہہ اُگلا۔ سانس رکنے کے باعث اس کا چہرہ سرخ اور پھر نیلا سا پڑنے لگا، آنکھیں حلقوم سے ابلنے کے قریب ہو گئیں مگر اس حالت میں بھی وہ اپنے ہونٹ پھیلا کر مسکرانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایسے میں مجھے اس کا چہرہ بہت ہی بھیانک اور مکروہ دکھائی دینے لگا۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلی کو نفی میں حرکت دی۔ اس کا اشارہ بھانپ کر میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ اسے ایک ٹھسکا لگا اور وہ بری طرح کھانستے ہوئے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ صاف لگتا تھا کہ وہ اپنی تذلیل آمیز شکست کے زیر اثر ''مینیا'' (ذہنی شکست وریخت کا شکار) کی حالت سے دو چار تھا۔

''میں مرنے سے نہیں ڈرتا..... شہزی!'' وہ بڑے ہولناک لہجے میں بولا۔ ''کیونکہ تم سے میں نے جو اب تک شکست کھائی ہیں وہ میرے لیے موت سے بھی بڑھ کر اذیت ناک ہے، مگر یاد رکھنا، اگر تم نے مجھے مار دیا تو میں بڑے سکون سے مروں گا کیونکہ پھر تمہارے یہ تینوں لاڈلے ساتھی بھی نہیں بچیں گے۔''

اس کی حرکت اور گفتگو نے مجھے بری طرح جھلا کر رکھ دیا۔ میں اس وقت اپنے ایک بڑے دشمن پر بالادستی قائم کرنے کے باوصف خود کو بے بس محسوس کرنے لگا تھا۔

''بتاؤ مجھے..... تم نے میرے ساتھیوں کو کہاں قید میں رکھا ہے؟ اور یہ کیسے تمہارے ہتھے چڑھے؟''

''ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔'' وہ ایک بار پھر اپنی سانسیں بحال کرتے ہوئے بولا۔ اس کا یاس زدہ طمانیت بھرا لہجہ مجھے بری طرح کھل رہا تھا۔ وہ مایوسی کی حد تک پہنچ چکا تھا مگر ایک نامعلوم سی تشفی آمیزی میں بھی مبتلا تھا اور اس حالت میں میرا اسے ہلاک کرنے کو دل مائل نہیں ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس مردود نے مجھے میرے جگری ساتھیوں کی قید و بند کی حالت میں تصاویر دکھا کر مجھے تشویش زدہ کر دیا تھا۔

''میں تمہیں خود بھی بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے کس طرح تمہارے ان تینوں جانثاری اور اہم ساتھیوں پر ہاتھ ڈالا، جسے سن کر تم بلاشبہ میری ذہانت کی داد.....'' ٹھیک اسی وقت میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور میں نے اس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ وہ منہ سے کراہ آمیز چیخ سی خارج کر کے بھاری بھرکم کرسی سمیت پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر جھکتے ہوئے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ فرش پر کر کے بل اسے پٹخ دیا۔ کرسی کو ایک لات رسید کر کے دور کر دیا اور پھر اپنی بائیں ٹانگ کا بوٹ اس کی گردن پر رکھ دیا۔

''سی جی.....! میں تم سے کوئی کہانی نہیں سننا چاہتا..... مجھے میرے ساتھیوں کے بارے میں بتاؤ، تم نے انہیں کہاں اور کس حالت میں رکھا ہوا ہے؟''

''میں نے کہا ناں..... کہ وہ تینوں نہ پاکستان میں ہیں نہ بھارت ماتا میں.....''

یہ کہتے ہوئے وہ ہنسا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میرا اسی طرح وقت ضائع کرتا رہے گا اور اتنی آسانی سے منہ سے کچھ نہیں اُگلے گا۔ میں نے پل کے پل ایک فیصلہ کیا اور پھر اپنی بھاری گن کا ٹھوس کندہ اس کی کنپٹی پر جڑ دیا، وہ وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اس کے ناپاک وجود کو اپنے کندھے پر لادا اور دروازے کی طرف لپکا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے باہر کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ میں باہر نکلا تو سامنے سوشیت کی کار کھڑی تھی اور وہ خود ہراساں و پریشان کار سے اتر رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونکا اور میرے قریب آتے ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''شکر ہے بھگوان کا تم زندہ ہو۔''

''جلدی نکل چلو یہاں سے..... اس سے پہلے کہ اس مردود کی..... مدد یہاں پہنچ جائے۔'' میں نے کہا اور کار کی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر سی جی بھجوانی کے بے سدھ وجود کو اندر ڈال دیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا کہ کہیں جلد ہی ہوش میں آ کر یہ کوئی گل نہ کھلا بیٹھے۔

سوشیت نے اس کے بارے میں مجھ سے استفسار کرنا چاہا تھا مگر میں نے اسے کار دوڑانے کی تاکید کر ڈالی۔ اس نے بھی کیا اور اگلے ہی لمحے کار زنانے بھر رہی تھی۔

''تم نے تو ان کے ٹھکانے پر اچھی خاصی تباہی مچا ڈالی ہے۔ تم آخر ہو کون انکل.....؟'' سوشیت سے بے خبر رہا نہ گیا۔ ''مجھے تو یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے گردن موڑ کر ایک نظر عقبی سیٹ پر بے سدھ پڑے کرنل سی جی بھجوانی کی طرف دیکھا۔

''اپنی توجہ آگے مرکوز رکھو، راستہ بڑا گنجلک اور ٹیڑھا میڑھا ہے۔'' میں نے اس کا سوال ہی صرف نظر کر ڈالا۔

''کہاں چلنا ہے؟ پولیس اسٹیشن؟'' تھوڑی دور نکل آنے کے بعد سوشیت نے مجھ سے استفسار کیا۔

''یہ پولیس سے بھی اونچی شے ہے، پولیس تو اس کے لیے الٹا مددگار ثابت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر.....؟'' وہ استفساریہ بولا۔

''اگر تمہیں ایک مقام پر اتار دوں گا۔ تم رکشا یا

نیکسی سے کر کسی طرح اپنی بدنصیب منگیتر پریتا کے باپ گھوتراجی سے ملاقات کرنا اور انہیں ساری حقیقت بتا دینا کہ کس طرح ان لوگوں نے تم پر ظلم کیا تھا، ابھی معاملہ تازہ ہے، دیر ہوگئی تو تمہاری منگیتر اور باقی دونوں ساتھیوں کا خون رائگاں چلا جائے گا۔ کیونکہ یہ لوگ بہت اثر ورسوخ والے ہیں، بعد میں ان کے ساتھی لاشیں تک گم کردیں گے ان کی۔''

''مگر.....؟''

''بحث مت کرو.....'' میں نے اسے چیں چپڑ کرنے سے روک دیا اور آگے بولا۔

''مجھے گھوتراجی کا نمبر دے دو، میں بہت جلد ان سے رابطہ کرلوں گا۔'' میری ہدایت پر اس نے فوراً عمل کیا اور گھوتراجی کا سیل نمبر مجھے بتا دیا۔ میں نے اسے آسان طریقے سے فوراً ذہن نشین کرلیا اور پھر عقبی سیٹ سے پشت لگا کر تھکے تھکے انداز میں اپنی آنکھیں موند لیں۔

کچھ منٹوں بعد کار مین روڈ پر آگئی۔ میں نے سوشیت کو اترنے کا کہا اور خود کار کی اسٹیرنگ کو سنبھال لیا اور سوشیت کو حیران و پریشان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

بہت ہی کم وقت میں، میں سوشیلا کے پاس اس کے ڈپلیکس میں پہنچا، (جو درحقیقت رینا کی کسی سہیلی ہی کا تھا)۔

رات اپنے آخری پہر میں تھی اور ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ اس رہائشی بلڈنگ کے گیٹ پر چوکیدار موجود تھا۔ سوشیت کو چھوڑنے کے بعد میں نے بجوانی کے بے سدھ وجود کو کار کی ڈکی میں ٹھونس دیا تھا۔

چوکیدار نے مجھے روک کر کچھ پوچھنے کی کوشش چاہی تھی، میں نے اسے وہی جواب دیا تھا جو رینا مجھے سکھا چکی تھی۔ یعنی میں ان کا مہمان تھا، وغیرہ۔ یوں بھی میں نے اپنا بھیس بدل رکھا تھا۔

کار پارکنگ میں آتے ہی میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر مطمئن ہوکر میں نے کار کی ڈکی کھولی تو اچانک میرے چہرے پر ایک گھونسا پڑا، وار غیر متوقع اور اچانک تھا، گھونسا میری ناک پر پڑا تھا، جس نے ایک لمحے کو میرا دماغ جھنجھنا دیا اور آنکھوں کے گرد اندھیرا سا چھانے لگا، پھر میں جب تک سنبھلتا، ایک لات بھی مجھے اپنے سینے پر کھانی پڑی، میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے کار کی ڈکی سے بجوانی کو وحشیانہ غراہٹ سے یوں ابھرتے اور نمودار ہوتے دیکھا، جیسے تابوت میں سے کوئی لاش اچانک زندہ ہوکر اٹھ کھڑی ہوئی ہو..... اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہورہی تھی۔ گنج پر پکے کھچڑی بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر دحشت برس رہی تھی، اور لباس بری طرح مسک کررہ گیا تھا۔

اس کم بخت کو جانے کب سے ہوش آچکا تھا اور وہ اسی انتظار میں تھا کہ وہ مجھ پر ڈکی کھولتے ہی حملہ کر ڈالے، اور یہی اس نے کیا بھی تھا، مگر یہ اس کی خطرناک کوشش سہی، تاہم جان بچانے کی اس نے اپنی سی حرکت ضرور کی تھی۔ وہ شور بھی مچا سکتا تھا، میں نے جلد ہی خود کو سنبھالا اور اس کی طرف لپکا۔ وہ ڈکی سے خود کو باہر اچھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ چھلانگ لگاتے ہی میں نے اسے چھاپ لیا اور اس کی کنپٹی پر مکا جڑ دیا۔ وہ اوغ کی آواز نکال کر ایک بار پھر بے حس و حرکت ہوگیا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو وہی چوکیدار اسی طرف کو چلا آرہا تھا، انداز اس کا معمول گشت کا ہی سا تھا، مگر میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں ہوا تھا، اور میرے پیچھے بظاہر یونہی آگیا تھا تاکہ مجھے نظروں میں رکھ سکے یہ اس کی ڈیوٹی کا حصہ تھا۔ میں نے جلدی سے خود کو پارکنگ کے اندر نصب ایک موٹے ستون کی آڑ میں کرلیا۔ وہ چوکیدار اسی طرف آرہا تھا، جہاں میں نے کار روکی تھی۔

میں اس کی تشکیکی نظروں سے کسی طرح بچتا بچاتا ہوا..... زینے کی طرف بڑھا۔ ڈپلیکس دوسرے فلور پر تھا۔ لفٹ بھی لگی ہوئی تھی مگر میں نے کسی خطرے کے پیشِ نظر اسے استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بے ہوش سی جی بجوانی کو کاندھے پر اٹھائے زینے چڑھنے لگا، ابھی فرسٹ فلور پر ہی پہنچا تھا کہ اچانک میرے سیدھے ہاتھ والے ڈپلیکس کا دروازہ کھلا اور وہاں سے ایک پختہ عمر شخص برآمد ہوا..... مجھے دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹک گیا، پل کے پل اس کے چہرے پر شک کے آثار ابھرے۔

''سوری! یہ میرے بھائی صاحب ہیں، کلب میں زیادہ چڑھالی تھی انہوں نے، اسی لیے کندھوں پر اٹھانا پڑا۔'' میں نے ذرا رک کر بغیر گھبراہٹ کے اس سے معذرت خواہانہ انداز میں کہا، حالانکہ میرا اس سے معذرت کرنے کا کوئی جواز بنتا نہیں تھا، تاہم یہ خوش اخلاقی کے مظاہرے کے طور پر تو تھا ہی، ساتھ ہی اس میں اپنا ''جرم'' چھپانے کی بھی خواہش کارفرما تھی۔

''مگر..... آپ..... آپ کون؟ پہلے کبھی آپ اس بلڈنگ میں نظر نہیں آئے؟'' وہ مجھے مشتبہ نظروں سے تقریباً گھورتے

ہوئے لپکا۔ میں اپنے ڈپلیکس کا پتا نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ مجھے چوکیدار سمیت اس "نیبر ڈسی" نے بھی دیکھ لیا تھا اور شک میں مبتلا ہو گیا تھا۔

''ارے جناب! میں تھک رہا ہوں..... یہاں اوپر تیسرے فلور پر کسی کے ہاں مہمان آیا ہوا ہوں.....'' یہ کہہ کر میں اوپر چڑھنے لگا۔ وہ مجھے تکتا رہا، سیکنڈ فلور پر پہنچ کر میں نے ذرا نیچے دیکھا تو وہی کم بخت جھک کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اب میں اس کے سامنے تو سیکنڈ فلور والے ڈپلیکس میں نہیں داخل ہو سکتا تھا اسی لیے مجبوراً مجھے اسے ڈاج دینے کے لیے تیسرے فلور پر چڑھنا پڑا..... وہ بھی سی جی بھجوانی کے حرام اور بھاری وجود کو اٹھائے، جبکہ میں پہلے ہی خاصا تھکا ہوا تھا۔ دیکھا کہ وہ شخص بدستور میرے تعاقب میں زینے طے کیے چلا آ رہا تھا۔ میں غصے سے دانت پیس کر رہ گیا اور غصے سے بڑبڑایا۔

''یہ کم بخت جاسوس کی اولاد مجھے اس وزن کے ساتھ ٹاپ فلور پر چڑھا کر ہی رہے گا۔''

میں غصے سے پلٹا اور اس ''خوامخواہ'' کے جاسوس کی طرف لپکا۔ مجھے یوں اچانک پلٹتا پا کر پہلے تو وہ جاسوس موصوف حیران ہوا..... مگر پھر میرے جارحانہ تیور دیکھ کر اس کے چہرے پر نروس کرنے جیسے تاثرات ابھرے، وہ بھی پلٹا مگر میں تب تک اس کے قریب پہنچ چکا تھا اور کرنل سی جی بھجوانی کو مشکلوں سے اپنے کاندھوں پہ تھامے تھامے جاسوس موصوف کی پشت پر ایک عدد لات رسید کر دی۔ وہ پہلے ہی مجھ سے ڈرا ہوا تھا، میری لات کھاتے ہی اس کے حلق سے لات کی ضرب سے زیادہ اس دہشت کے مارے چیخ ایک ''ہائیں'' کی صورت میں برآمد ہوئی اور وہ گھسٹتا ہوا..... نیچے جا رہا۔ میں نیچے آ گیا اور اپنے ڈپلیکس کا دروازہ کھٹکایا۔

شکر تھا کہ سوشیلا کچے کی نیند سونے کی عادی تھی اور دوسری ہی دستک پر جاگ پڑی تھی۔ لہٰذا اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میں سی جی کو اٹھائے غڑاپ سے اندر جا گھسا، سوشیلا حیران و پریشان نگاہوں سے دروازے پر ہی کھڑی مجھے گھورتی رہ گئی۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو یہاں.....؟'' وہ سرگوشی میں بولی۔ میں نے ایک صوفے پر بے ہوش سی جی بھجوانی کو پٹخا اور سیدھا کھڑے ہو کر سوشیلا سے ہانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''دروازہ بند کرو پہلے..... ایک مصیبت گلے پڑ گئی ہے۔'' میرا اشارہ اس جاسوس [illegible] طرف تھا۔ مگر سوشیلا یہ سمجھی کہ میں سی جی بھجوانی کو مصیبت کہہ رہا ہوں، بولی۔

''تو پھر اس مصیبت کو تم یہاں کیوں اٹھا لائے ہو.....؟''

اس نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا تھا۔

''میں اس مصیبت کی بات نہیں کر رہا ہوں..... نیچے پڑ گئی تھی مصیبت، بلکہ یک نہ شد دو شد.....'' پھر میں نے اسے مختصراً چوکیدار اور اس جاسوس موصوف کے بارے میں بتا دیا۔ وہ بھی خاصی تشویش زدہ ہو گئی، تاہم کچھ سوچ کر تشفی آمیز لہجے میں بولی۔

''تم اپنے اصل روپ میں نہیں ہو، کوئی بات نہیں، جلدی سے اب جا کر واش روم میں اپنا میک اپ اتار لو.....''

''کرنا تو یہی پڑے گا، مگر..... میں اپنے اصل روپ

میں اب بھی نہیں آنا چاہتا۔''

''تو پھر کوئی اور بہروپ بھر لو......'' اس نے مشورہ دیا۔ اس کی بات معقول تھی، میں نے یہی کیا، حالانکہ میں خاصا تھکا ہوا تھا۔ لیکن واش روم جانے سے پہلے میں نے سوشیلا سے ایک مضبوط رسی لانے کا کہا۔ ابھی میں نے اسے سی جی بھجوانی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، وہ بلاچون وچرا... میرا حکم مانتی رہی اور میرے ساتھ...... سی جی کو رسی بستہ کرنے میں مدد بھی کی۔ اس احتیاط کے پیشِ نظر، کہیں وہ ہوش میں آتے ہی شور مچانا نہ شروع کردے، میں نے اس کے منہ پر اسکاچ ٹیپ بھی چپکا دی تھی۔ اس کام سے فارغ ہوکر میں نے واش روم کا رخ کیا اور جلدی جلدی بابے والا بہروپ بدل کر ایک دوسرا نوجوان لڑکے والا بہروپ بھر لیا۔ اس کام میں مجھے آدھا گھنٹے سے اوپر کا ہی وقت لگا تھا۔

لوٹ کے آیا تو سوشیلا میرے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان ٹیبل پر لگا چکی تھی۔ لاؤنج کی بتی بجھا کر اس نے زیرو پاور کا بلب روشن کر دیا تھا۔ کرنل بھجوانی کو دوسرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔

کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سوشیلا کو دھیرے دھیرے سب بتا ڈالا۔ وہ متحیر سی ہوگئی۔ بھارت کی ایک خطرناک انٹیلی جنس کے چیف افسر کو اس وقت ایسی حالت میں اپنے ڈپلیکس میں پاکر اور اس کی حیثیت کے بارے میں جان کر وہ کچھ غیر مرئی خوف میں مبتلا ہوگئی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو بھانپتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا۔

''کک...... کچھ نہیں، بس یقین نہیں آرہا کہ تم نے تن تنہا اتنا بڑا مشن کیسے مکمل کرلیا؟ اور پھر اتنی بڑی اور خطرناک ایجنسی کے سربراہ کو کھلونے کی طرح کاندھوں پر اٹھا کر یہاں بھی لے آئے۔''

''اس لیے کہ یہ ایک مکمل طور پر کمانڈو مشن تھا لیکن افسوس کہ یہ ابھی بھی ادھورا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تو کیا تم اسے یہاں لاکر ہلاک کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ وہاں والا کام یہاں لاکر نمٹاؤں۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے اس کے منہ سے کچھ اگلوانا ہے۔''

''کیا؟''

''ابھی پتا چل جاتا ہے، تم ایک نمبر نوٹ کرو، کہیں میرے ذہن سے محو نہ ہوجائے۔'' کہتے ہوئے میں نے اسے سوشیت کا بتایا ہوا وہ نمبر جو بدنصیب پریتا کے باپ اور مشہور فلمی پروڈیوسر اور ڈائریکٹر گھوتراجی کا تھا، نوٹ کرا دیا۔

''آؤ میرے ساتھ......'' اس کے بعد میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس کمرے کی طرف قدم بڑھائے جہاں بھجوانی کو رسی بستہ حالت میں رکھا ہوا تھا۔

وہ ہوش میں تھا اور اسی طرح آڑا ترچھا قالین پر پڑا ہوا تھا۔

سوشیلا اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتی ہوئی ایک طرف کرسی پر بیٹھ گئی جبکہ میں بھجوانی کے قریب اکڑوں بیٹھ کر اس سے مخاطب ہوکر بولا۔

''سی جی! میں تمہارے منہ سے اسکاچ ٹیپ ہٹا رہا ہوں، تاکہ ہم آپس میں کچھ معاملات کی باتیں کرسکیں۔ ظاہر ہے وہ بولنے سے ابھی قاصر تھا مگر اس کی آنکھوں سے ایک عیارانہ سی مسکراہٹ مترشح ہوتی صاف محسوس ہوئی تھی۔ تاہم اس نے ہولے سے اپنے سر کو جنبش دی۔

میں نے آہستگی سے اس کے منہ پر سے اسکاچ ٹیپ ہٹا دی۔ وہ ہلکا سا کھانسا اور پھر قدرے ہانپتی ہوئی سی آواز میں بولا۔

''اگر تم اس خوش فہمی میں ہو کہ میں تمہیں ان تینوں ساتھیوں کے بارے میں بتادوں گا تو یہ تمہاری خوش فہمی پر ماتم کرنے کے مترادف ہوگا شہزی...... مائی ڈیئر......!''

''بکواس بند......'' میں نے ہولے سے غرا کر کہا۔ ''مجھے اس پر مجبور مت کرو کہ میں تمہاری زبان کھلوانے کے لیے تھرڈ ڈگری طریقے پر اتروں۔ جس کی کامیابی کا مجھے سو فیصد یقین بھی ہے۔ لیکن میں تمہارے شایانِ شان اس معاملے کو......''

''ہا......'' اس نے میری بات کاٹ کر ہوا میں اڑا دی اور زہر خند لہجے میں بولا۔

''تمہارے جیسا جلد باز اور بے وقوف میں نے نہیں دیکھا۔ تمہارے ساتھی تو تمہاری ناک کے بالکل نیچے تھے۔ شہزی......!''

اس بدبخت کی بات پر میں چونک اٹھا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے بھویں سکیڑ کر اس کے مکروہ چہرے کا جائزہ لیا۔

''تمہارے وہ تینوں ساتھی وہیں میری قید میں تھے مگر تم نے میری بات کا یقین ہی کب کیا تھا کہ وہ میرے

تہ خانے میں ہیں یا مین نفس بڑھک مار رہا تھا.....؟

اس رذیل کی بات نے مجھے واقعی اندر سے بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ دیکھا جاتا تو یہ مجھ سے واقعی ایک غلطی ہوئی تھی۔ لیکن بسا اوقات پیش آمدہ حالات میں آدمی وہی فیصلہ کرتا ہے جو اس وقت وہ اپنے تئیں درست سمجھتا ہے، بعد میں ہی اس کا ادراک ہوتا ہے کہ وہ صحیح تھا یا غلط..... لیکن باوصف اس کے مجھے سوچنا چاہیے تھا، اتنی بڑی بات بھجوانی جھوٹ کیسے کہہ سکتا تھا؟ مجھے وہیں اس کا منہ کھلوانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی، ممکن تھا کہ وہاں کسی خفیہ تہ خانے میں میرے تینوں ساتھی محبوس حالت میں مل جاتے مگر میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اول خیر، شکیلہ اور کمیل دادا یک دم تینوں اس کے ہتھے کس طرح چڑھے ہوں گے؟ جبکہ بقول اس خبیث کے وہ تینوں اس وقت نہ پاکستان میں تھے اور نہ ہی بھارت میں، تو پھر کہاں تھے وہ؟

میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''تم نے مجھ سے یہ تو جھوٹ ہی بولا کہ وہ تینوں ساتھی نہ پاکستان کی سرزمین پر ہیں نہ ہی یہاں بھارت میں۔''

''یہاں مجھے تھوڑا جھوٹ سے کام لینا پڑا تھا۔'' وہ خبیثانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ ''کیونکہ اس کے فوراً ہی بعد وہ اسی جگہ پہنچائے جاچکے ہوں گے، جہاں کا میں نے تمہیں بتایا تھا۔''

ایک بار پھر میں اس کی بات پر چونکا۔

''کوئی بات نہیں، میں اب بھی وہاں جا کر انہیں نکال لاؤں گا، اس کے بعد ہی تم سے دو دو ہاتھ کرتا ہوں گا۔'' یہ کہتے ہی میں اٹھنے لگا تو وہ ہنس کر بولا۔

''کہاں..... میں نے کہا وہ اب تمہیں وہاں نہیں ملیں گے۔'' وہ اطمینان سے بولا۔ ''میری دلیر ساتھی کوشیلا انہیں وہیں لے جاچکی ہوگی جہاں کا میں نے ایسے کسی حالات میں انہیں پہنچانے کا پہلے ہی سے حکم دے رکھا تھا۔''

''میرے ساتھی تمہارے ہتھے کس طرح چڑھے تھے؟''

''زہرہ بانو سے اپنے گرفتار شدہ جاسوس کے سلسلے میں گفتگو کرنے کے بعد میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ وہ تمہاری مدد کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتی اور نہ ہی تمہارے ساتھی..... وہ ضرور کسی نہ کسی طرح بھارت آنے کی کوشش کریں گے، میں نے اپنا جاسوسی کا نیٹ ورک ان تمام راستوں پر پھیلا دیا جہاں سے ان کی آمد متوقع ہو سکتی تھی۔ پھر ہی میرے جاسوسوں نے پتا لگا لیا۔ تمہارے تینوں مذکورہ ساتھی دوزنت ہڑنے بہ نابائی اثر بھارت پہنچنے والے ہیں، ان کے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ میں یہاں پہلے ہی سے ان کے خلاف جال بچھا چکا تھا۔ وہ بہ آسانی اس میں پھنس گئے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوا اور مجھے اس کے مکارانہ ذہن اور بیدار مغزی کا قائل ہونا پڑا۔ یہ سارا کامن سینس اور چوطرف خیالات کی دوڑ کا نتیجہ تھا کہ بھجوانی کے ذہن میں بھی وہی امکانی خیال گردش کر رہا تھا جس کا مجھے بھی خدشہ تھا کہ میرے ساتھی ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کبھی نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

''ٹھیک ہے، میں تمہارے ذہن کی داد دیتا ہوں، اب معاملے کی بات کرو، میرے پاس وقت کم ہے۔'' بالآخر میں نے کہا تو وہ زہرخند ہنسی کے ساتھ بولا۔

''معاملے کی بات پر آتے ہوئے پہلے، میرے اہم ایجنٹ سندرداس کی رہائی کی بات ہوگی۔''

''اس کو بھول جاؤ، وہ پرانی بات ہوچکی ہے۔ یوں بھی اب اس کا معاملہ ہمارے اختیار سے باہر جاچکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے پھر تم بھی اپنے ان تینوں ساتھیوں کو بھول جاؤ.....'' وہ تاؤ دلانے والے لہجے میں بولا۔ تو میرا سر گھوم گیا۔ اسی وقت سوشیلا نے مجھ سے کہا۔

''شہزی.....! تم پہلے پاکستان میں مقیم اپنے ساتھیوں کو فون کر کے کنفرم تو کرا لو کہ آیا تمہارے یہ تینوں مذکورہ ساتھی کہاں ہیں؟''

''میں اس بارے میں سوچ چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اس میں ہماری فون کال ٹریس ہونے کا خدشہ ہے۔''

''تمہیں کہیں بھی فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شہزی!'' معاً ہی بھجوانی بولا۔

''وہ تینوں میری قید میں ہی ہیں۔''

اس بار میں اپنے طیش پر قابو نہ پا سکا اور نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر اس کی گردن دبوچ لی اور خونخوار غراہٹ سے بولا۔

''تمہیں بتانا ہوگا سی جی! کہ میرے ساتھی اس وقت کہاں ہیں؟''

وہ خاموش رہا۔ اسے مطلق پروا نہیں تھی کہ اس کی جان اس وقت میرے رحم و کرم پہ ہے۔ ممکن تھا کہ یہ اس کی تربیت کا حصہ ہو، یا پھر وہ ایک مخصوص اسپائی والا کھیل رہا تھا۔ میرے ساتھ جو مجھ پر اسے یقین تھا کہ پوری طرح زیردست

آنے کے بعد مایوسی کا کھیل کھیلا جاتا ہے تاکہ مدِمقابل، اسے موت کی دھمکی دے کر بھی اس سے کچھ نہ اگلوا کے سے مایوس ہو کر بیٹھ جائے۔ اسے سائیکو پیتھ مائنڈ کنٹرول کہا جاتا تھا۔ یعنی دوسرے کو یہ باور کرانے کی کوشش کرنا کہ "زیردست" اب اس کے "کام" کا نہیں رہا ہے۔

"ٹھیک ہے، نہیں بتاؤ......" میں سیدھا کھڑا ہوگیا اور اسے گھسیٹ کر صوفے پر اسی حالت میں پھینکا اور سوشیلا کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز میں بولا۔

"تم کوئی خالی سرنج تلاش کر کے لاؤ...... میں ابھی اس خبیث کا منہ کھلواتا ہوں، یہ شاید بھول رہا ہے کہ میں خود بھی کوئی شے ہوں...... جلدی کرو۔" سوشیلا فوراً چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد دوبارہ نمودار ہوئی۔

"مجھے کوئی پروپر سرنج تو نہیں ملی ہے، یہی ایک ٹیبل کی دراز میں رکھی ہوئی تھی، اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو......" وہ ایک پتلی سی سرنج میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

یہ سرنج شوگر کے مریضوں کے لیے مستعمل ہوتی تھی۔ جس سے وہ خود کو انسولین بھر کر لگاتے تھے۔ شاید اس گھر میں کوئی شوگر کا مریض تھا، جو شوگر کنٹرول کرانے والی گولیوں کے بجائے انسولین استعمال کرتا تھا۔

"چلے گا، لاؤ......" میں نے یہ کہتے ہوئے سوشیلا کے ہاتھ سے سرنج لے لی۔ وہ خالی تھی۔ میں نے دو تین بار اس کے پلنجر (plunger) کو اندر باہر کر کے اس کے اندر سے ہوا نکالی اور ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے سی جی بھجوانی کی طرف بھی دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب کچھ تیز سوچ کی الجھن ابھری تھی اور مجھے "بلف" کرنے والی مایوسی عنقا ہونے لگی تھی۔

"مجھ پر ایسی کوئی دوا اثر نہیں کرے گی، مائی ڈیئر شہزی! جو میرا منہ کھلوا سکے۔" اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تمہارا منہ کھلوانے کے لیے مجھے ایسی کسی مہنگی دوا پر پیسہ خرچ کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے سی جی......! میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں خاموش موت سے ہمکنار کر دوں، لیکن یہ موت ایسی ہوگی کہ تم اس میں تڑپ تڑپ کر بڑی جاں کنی کے عالم میں اپنی جان دو گے، مگر تمہارے حلق سے ایک ذرا آواز بھی خارج نہ ہوگی۔ کیونکہ بہرحال میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ رہی میرے ساتھیوں کی بازیابی تو ان کا میں اپنے طور پر کھوج لگا لوں گا۔ تم اپنی پھانسی کی تیاری کرو...... کرنل سی جی بھجوانی!"

میں نے اپنے لہجے میں دانستہ ہولناک سی قطعیت سموتے ہوئے سناک لہجے میں کہا اور پھر اس کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی غیرمحسوس مگر بھانپتی ہوئی نظروں سے اس کے چہرے کا بھی جائزہ لیا۔ حسب توقع مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے کی ایک لرزاں سی جھلک لہراتی محسوس ہوئی۔ میں نے سردست اس کی مطلق پروا نہ کی، جانتا تھا کہ موت کو...... بلکہ ایک اذیت ناک موت کو سامنے دیکھ کر بڑے بڑے طرم خاں کے بھی حوصلے جواب دینے لگتے ہیں۔

میں نے اس کے بازو کو دبوچا اور اس کی نس کا جائزہ لیا۔ اسے چھوڑ کر میں نے سرنج کا پلنجر کھینچا، اب اس کے اندر ہوا بھر گئی...... پھر میں نے سوشیلا سے کہا کہ وہ اس کا بازو مضبوطی سے تھامے رکھے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد میں اس کی نس ڈھونڈ کر سرنج دھیرے دھیرے اس میں کھبونے کے لیے قریب کرتا چلا گیا۔

"یہ... یہ... یہ کیا کر رہے ہو تم؟ خالی سرنج لگا رہے ہو مجھے؟" بالآخر وہ بولا۔ اس کے لہجے کی خوف زدہ سی لڑکھڑاہٹ عیاں تھی۔

"ہاں! میں تم پر کوئی دوا نہیں ضائع کرنا چاہتا۔ یہ آسان اور موثر طریقہ ہے، شاید تم اس کی خطرناکی سے واقف نہیں ہو، اس سے تمہاری رگوں میں دوڑتے خون میں ہوا کے ائرببل (بلبلے) بن جائیں گے، جو دل کی شریانوں تک پہنچتے ہی تمہارے بوڑھے دل میں ہلچل مچا دیں گے، تمہیں اپنا دل پھٹنے کے قریب محسوس ہوگا۔ وہ رک جائے گا، جسے میڈیکل اصطلاح میں کارڈیک اریسٹ کہتے ہیں لیکن پھر دھڑکنا شروع کر دے گا، درد کی ایک شدید لہر تمہارے پورے وجود میں جلتے سلگتے انگارے کی طرح سرایت کر جائے گی۔ تم چیخنے کی کوشش کرو گے، مگر آواز نہیں نکلے گی۔ یوں تم ہارٹ اٹیک کے ایک ایسے جاں گسل عمل سے گزرو گے جو تمہیں بار بار پڑے گا، اب تم خود اندازہ کر لو۔"

اس کی موت کا ایک بھیانک نقشہ کھینچنے کے بعد میں نے سرنج کی نڈل اس کی نس میں ذرا چبھوئی تو وہ چلا اٹھا۔

"ٹھہرو...... ٹھہرو......"

میرا ہاتھ رک گیا مگر میں اسی پر جھکا رہا اور جھٹکے سے اپنی بھوئیں اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔

"اگر میں تمہیں تمہارے ساتھیوں کے بدلے اپنی جان

بچانے کی ڈیل کرنے کو تیار ہوں۔'' بالآخر سیاتی پٹری پر آ گیا جس پر میں اسے لانا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھیوں کے بدلے میں، پاکستان میں گرفتار شدہ اپنے اہم جاسوس سندرداس کی رہائی کا ''پہاڑا'' پڑھنا چھوڑ دے۔ میرا دل اپنی اس ''ٹیکنیکل'' چال پر بلیوں اچھل پڑا مگر میں نے دانستہ بے تاثر لہجے میں اس سے استفسار یہ کہا۔

''ڈن؟''

''ڈن۔''

میں ہٹ گیا اور سوشیلا کو بھی اشارہ کر دیا کہ وہ اس کا بازو چھوڑ دے۔

''سب سے پہلے مجھے بتاؤ کہ میرے ساتھیوں کو تم نے کہاں قید کر رکھا ہے مگر جھوٹ بولنے سے پہلے یہ یاد رکھنا، میں جب تک انہیں اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں، تم میری قید میں رہو گے۔''

''میں ابھی تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔'' وہ بولا۔ ''لیکن تمہیں پہلے میری زندگی کی ضمانت دینا ہوگی۔''

''مجھے خود اپنی زندگی کا نہیں پتا تو بھلا میں تمہاری زندگی کی ضمانت کس طرح سے دے سکتا ہوں۔''

''چالاک بن کر وقت ضائع کرو گے تو دونوں کا نقصان ہوگا۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں......؟'' وہ مکارانہ ذہانت سے بولا تو میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے کہا۔

''تمہاری زندگی کی ضمانت مشروط ہے، یہی کہ جب تک میں اپنے ساتھیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہ دیکھ لوں، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کروں گا اور...... یوں بھی تم ایسی کسی پوزیشن میں نہیں ہو اس وقت کہ مجھ سے اپنی کوئی بات منوا سکو، کیونکہ مجھے خود پر پورا اعتماد ہے کہ تمہیں بھسم واصل کرنے کے بعد بھی میں اپنے ساتھیوں کو تلاش کر لوں گا۔ آخر کو تمہیں بھی تو میں نے چھاپ ہی لیا تھا نا......''

''مجھے پانی پلاؤ۔'' اس نے کہا۔ میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا، وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ ''وہسکی نہیں مل سکتی؟'' وہ بولا۔

''نہیں......'' کہتے ہوئے میں نے پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ نصف بوتل پانی پی چکا تو اس نے کمرے میں نظریں دوڑا کر استفسار کیا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟''

''اب تم فالتو سوالات کر کے وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ تو وہ ایک ذرا گہری ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔

''جزائر انڈیمان کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا...... وہی جیل خانہ جس کا شمار کبھی دنیا کی خطرناک جیلوں میں کیا جاتا تھا۔ یعنی کالا پانی...... مگر آج ان عظیم جزائر پر گریٹ بھارت ماتا کا کنٹرول اور تصرف ہے...... آج بھی وہاں لوگ رہتے ہیں۔ بے شک اس کی ہیئت ماضی کے مقابلے میں کافی سے زیادہ بدل چکی ہے لیکن کسی مخصوص علاقوں تک، مگر نہ آج بھی کالا پانی، کالا پانی ہی کی دہشت رکھتا ہے۔ ممبئی کے انڈر ورلڈ ڈان کے آدمیوں کا وہاں کچھ علاقوں پر قبضہ ہے، خیر......''

وہ اتنا بتا کر رکا اور جزائر انڈیمان کے ذکر پر میرا پورا وجود سنسنا اٹھا۔

اطفال گھر میں ہفتے میں ایک بار دکھائی جانے والی جو سبق آموز اور معلوماتی دستاویزی فلمیں بچوں اور لڑکوں کو دکھائی جاتی تھیں، ان میں آزادیٔ وطن کا حصول اور نظریہ پاکستان سے متعلق بتایا جاتا تھا، بلکہ کبھی نہیں اسی قسم کے ڈرامے بھی دکھائے جاتے تھے۔ اسی طرح ''پاور سکرین'' میں بھی گزرے۔ ان میں نے اسیری کی تاریخی کتب پڑھی تھیں، ان میں ''کالا پانی'' کے بارے میں بھی پڑھا تھا، یوں بھی کالا پانی کے بارے میں کون نہیں جانتا؟

یہ وہی جیل خانہ تھا جہاں...... آزادیٔ وطن کے لیے کوشاں مسلم مجاہدوں اور آزادی کے متوالے بڑے بڑے مسلمان لیڈروں کو سزا کے طور پر ساری عمر قید رکھا جاتا تھا۔ یہاں ان کے ساتھ بڑا غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔

آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کسی قیدی کو انڈیمان بھیجنے کے لیے ''کالا پانی'' کا لفظ کیوں استعمال کیا جاتا تھا؟ ممکن ہے اس کا مطلب ''سمندر پار'' بھیجنا رہا ہو...... جو ہندوستان سے ہزاروں کوسوں دور واقع تھا۔ یوں بھی ایک ہندوستانی محاورے میں طویل فاصلے کے لیے ''کالے کوس'' جیسے الفاظ پہلے ہی سے رائج تھے۔ کالا پانی کی سزا ایسے باغیوں کو دی جاتی تھی جنہیں سزائے موت کے بجائے عمر قید کی سزا دینی ہوتی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں یہ سزا انہیں بھی دی جانے لگی جو مملکتِ انگلشیہ کے نو آبادیاتی نظام میں مداخلت کرنے اور بغاوت کرنے کے مرتکب ہوتے۔

کالا پانی کا نام سنتے ہی ذہن میں ایسے جیل خانے کا تصور ابھرتا ہے جہاں جو بھی ایک مرتبہ گیا وہ شاذ ہی زندہ

واپس لوٹنا تھا۔ اس کی لاش کو بھی اپنے وطن کی مٹی نصیب نہ ہوئی۔ گو کہ دور دراز جزیروں تو کئی اور جیلیں بھی موجود ہیں۔ امریکا نے القاعدہ اور طالبان قیدیوں کے لیے گوانتاناموبے جیسی اذیت ناک جیل بنائی ہے مگر کالا پانی جیل اس سے بھی بدتر تھی۔ اس جیل میں قیدی اگر سخت جسمانی مشقت سے نہیں مرتے تو ملیریا سے مرجاتے، کیونکہ جس جزیرے پر یہ جیل بنائی گئی تھی وہاں ملیریا کی بیماری عام تھی اور اس کا علاج نہ ہونے کے برابر۔

مجھے چند ثانیوں کے لیے گنگ پا کر سی جی بجوانی بولا۔

''تم شاید کالا پانی کا سن کر کسی تشویش میں مبتلا ہو گئے ہو مگر چنتا مت کرو۔ تمہارے ساتھی وہاں اب بھی زندہ حالت میں موجود ہیں۔ لیکن تمہارا یا تمہارے کسی ساتھی کا وہاں جانا ناممکنات میں سے ہے۔''

''تم اپنی بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ کہ میرے تینوں ساتھیوں کی رہائی کے لیے کیا کر رہے ہو؟'' میں نے غصے سے دانت بھینچ کر اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ خبیثانہ ہنسی کے ساتھ بولا۔

''رسی جل گئی مگر بل نہیں گئے، تم جتنے بھی طرم خاں کہلاؤ لیکن جزائر انڈیمان کا معاملہ تمہاری سوچ سے بھی......''

''چٹاخ......!'' کمرے میں ایک زوردار آواز کے ابھرتے ہی سی جی کے حلق سے بھی کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی، میرے بھاری بھرکم الٹے ہاتھ کا ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اس کا دایاں گال سرخ ہو گیا۔

''اب اپنے مکروہ منہ سے کوئی غلط بات مت نکالنا، مجھے صرف اپنے تینوں ساتھیوں کی رہائی چاہیے اور بس......'' میں نے غرا کر کہا تو اس نے اپنے سر کو ذرا جھٹکا دے کر شاید اپنے مضروب گال کو بغیر ہاتھ لگائے سہلانے کی کوشش چاہی تھی، کیونکہ رسن بستہ ہونے کے باعث وہ اپنا گال چھونے سے قاصر تھا۔

''پہلے میری رہائی کا بندوبست کرو۔'' اس نے بھی مسکت لہجے میں کہا۔

''پہلے مجھے اس بات کی تصدیق چاہیے کہ میرے تینوں ساتھی (اول خیر، شکیلہ اور کبیل دادا) تمہاری ہی قید میں ہیں......''

''ہم......ہم۔'' اس نے ہنکارا لیا اور بولا۔ ''ایک نمبر ملاؤ اسی وقت۔''

میں نے سوشیلا کو اشارہ کیا، وہ کارڈلیس ریسیور لے آئی، سی جی اسے نمبر بتانے لگا تو وہ اسے پنچ کرتی چلی گئی، رابطہ ہونے کے بعد سوشیلا نے وہ مجھے تھمایا، جو میں نے سی جی کے کان اور منہ سے لگا دیا۔

''ہیلو......کوریلا......رانس ی......ان تینوں قیدیوں سے بات......'' وہ کہتے کہتے اچانک رکا۔ ''یوں لگا جیسے، اس کی آواز سنتے ہی دوسری جانب سے کوریلا نے گویا چھوٹتے ہی اسے کوئی اہم خبر بتانا شروع کر دی ہو......اور بجوانی اسے بہ غور سننے لگا، اس کی آنکھیں اور بھویں سکڑنے اور پھیلنے لگیں، چہرے پہ کئی رنگ آ کر گزرتے رہے، میری یک ٹک اور دھڑکتی ہوئی نظریں اس کے چہرے کے لحہ بہ لحہ بدلتے تاثرات پر جم کر رہ گئی تھیں۔

پھر دفعتاً ہی وہ لرزیدہ سے لہجے میں بولا۔

''کک......کیا......؟ کلی منجارو......؟ کک......کیا تم صحیح کہہ رہی ہو کوریلا......؟ اد بھگوان......یہ ہی ہے تو غضب ہو گیا، وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا......'' یہ کہتے ہی سی جی بجوانی نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ اس کے چہرے سے بھی دہشت اترتے محسوس کی۔ جس نے مجھے خود بھی اپنے تینوں ساتھیوں کے حوالے سے ایک عجیب اور نامعلوم سی سراسیمگی میں مبتلا کر دیا تھا......نجانے یہ کلی منجارو'' کیا بلا تھی؟ اور کون تھی......؟ اور پھر دفعتاً ہی کلی منجارو (کلی من جارو) کے نام نے میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا......میں بری طرح اچھل کر رہ گیا۔

اچانک میں نے سوشیلا کو چونکتے پایا، وہ دروازے کی طرف اپنا منہ پھیر کر بڑبڑائی۔

''شاید کوئی دروازے پر زور آزمائی کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکلی، میں بھی خطرے کی بو محسوس کر کے لاؤنج کی طرف لپکا، ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ اچانک ایک دھماکے سے دروازہ کھلا اور تین مسلح افراد اندر گھستے چلے آئے۔ ان میں ایک پستول بہ دست بلراج سنگھ تھا اور باقی دو اس کے گن بردار ساتھی تھے۔ بلراج سنگھ......جو مجھ پر بری طرح ادھار کھائے بیٹھا تھا، مجھے سامنے دیکھتے ہی اس نے اپنے پستول کی نال کا رخ میری طرف کر کے گولی چلا دی۔

وہ کوئی عام ٹریلر نہیں تھا بلکہ پچاس فٹ طویل ان ٹریلر ہوم میں وہ تمام آسائشیں موجود تھیں جن کا تصور مجھ جیسا ملازم پیشہ شخص نہیں کرسکتا، اس میں ایک آراستہ و پیراستہ بیڈ روم، کچن اور بار کے علاوہ جدید طرز کا باتھ روم بھی بنا ہوا تھا جس کے باہر تب سے مکمل بادل کی خون میں لت پت لاش نکالی گئی تھی۔ باہر لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا جو سکتے کے عالم میں لاش کو لے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ دو لڑکیوں نے تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے مجمع کا

مداری

جمال دستی

شوبز کی جگمگاتی دنیا میں اکثر روشن چہروں کے پیچھے تاریکیوں کا راج ہوتا ہے... ان کے معمولاتِ زندگی اور جذبات و احساسات میں رنگینی اور سطحی سوچوں کی آمیزش ہوتی ہے... ایک کرن... ایک جگنو کی تلاش میں روشنیوں کی دنیا کا رخ کرنے والے ابھرتے ستاروں کا احوال... اجالے ان کی دسترس سے دور ہو رہے تھے۔

بغور جائزہ لیا کہ شاید کوئی ایسا شخص نظر آجائے جو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں مطمئن نظر آرہا ہو لیکن ناکامی ہوئی۔

میں ساتھی سراغ رساں اسکائی بیکس کی جانب متوجہ ہوا۔ جسے اکیڈمی سے فارغ ہوئے چار پانچ سال ہوگئے تھے لیکن ابھی تک وہ اسکول کے بچوں کی طرح یونیفارم پہنتا تھا۔

''ہمارے پاس کیا معلومات ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''مرنے والے شخص کا نام نکیل باڈل ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ کون تھا؟''

''نہیں، تم بتاؤ۔''

''اوہ میرے خدا۔ کیا تم ٹی وی نہیں دیکھتے؟''

''نہیں، مجھے ٹی وی دیکھنے کا شوق نہیں۔''

اسکائی نے اس طرح سر ہلایا جیسے اسے میرے بدذوق ہونے کا افسوس ہورہا ہو پھر بولا۔ ''وہ نکیل باڈل اسٹار کوئسٹ کا ایک جج ہے۔''

''میں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سنا۔''

''یہ شہر شہر پھر کر نوجوانوں کا انتخاب کرتے ہیں اور آڈیشن کے بعد انہیں شو میں گانے کا موقع دیتے ہیں۔ ہر ہفتے ایک گلوکار کی باری آتی ہے پھر ان میں سے کسی ایک کو ووٹنگ کے ذریعے فاتح قرار دیا جاتا ہے۔''

''یہ فیصلہ جج کرتے ہیں؟''

''نہیں، ناظرین کے ووٹوں کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ وہ ٹیلی فون کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔''

''جیتنے والے کو کیا ملتا ہے؟''

''دس لاکھ ڈالر اور ریکارڈنگ ایجنسی سے معاہدہ۔''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تب تو قتل کا محرک سمجھ میں آتا ہے۔''

☆☆☆

ایک عورت سلک بلاؤز اور سفید اسکرٹ پہنے وہاں پہنچی۔ اس کے پیچھے ایک شخص جینز اور سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس ہاتھ میں ٹی وی کیمرا پکڑے چل رہا تھا۔ وہ عورت لیلا اینکس تھی۔ اس نے دور سے ہی آواز لگائی۔

''بوائے، کیا تم مجھے ایک منٹ دے سکتے ہو؟''

میں جیسے ہی اس کے قریب گیا، وہ کیمرے کی طرف منہ کر کے بولنے لگی۔ ''میں لیلا اینکس اس وقت کنونشن سینٹر سے بول رہی ہوں جہاں پولیس نکیل کی موت کی تحقیقات کررہی ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مورگن پولیس کا سراغ رساں ایم بوائے بوٹ رائٹ موجود ہے۔ ڈیٹیکٹو، کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان سوڑ ہوم سے کس کی لاش ہٹائی گئی ہے؟''

''نو کمنٹس۔''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ وہ اسٹار کوئسٹ کا ایک جج نکیل باڈل تھا۔''

''سوری، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

''کیا یہ شخص طبعی موت مرا؟''

''نو کمنٹس۔'' میں نے اپنے الفاظ دُہرائے۔

''تمہارا تعلق ہومی سائیڈ ڈویژن سے ہے اور تم اس کیس کی تحقیقات پر مامور کیے گئے ہو۔ کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ یہ طبعی موت نہیں ہے۔''

''تحقیقات مکمل ہوتے ہی ہم تفصیلی بیان جاری کردیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت تک میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

''بہت بہت شکریہ، بوٹ رائٹ۔'' اس نے کیمرا مین کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تم سے اس بے رخی کی امید نہیں تھی۔ کم از کم تم میرے آگے ایک ہڈی ہی ڈال دیتے۔''

''نہیں لیلا۔ میں تمہارے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ بے رخی تب ہوتی جب تمہیں مکمل طور پر نظر انداز کردیتا۔''

اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے دیکھا۔ شاید وہ مجھے پرانے دنوں کی یاد دلانا چاہ رہی تھی جب ہم دونوں ایک تعلق کی ڈور میں بندھے ہوئے تھے لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ اس دوران میں پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

''کم آن۔'' اس نے کہا۔ ''آف دی ریکارڈ ہی بتا دو۔ کیا یہ نکیل باڈل ہی ہے؟''

''نو کمنٹس۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دو گھنٹے بعد میں اور اسکائی، کنونشن سینٹر کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کرائم سین چیف بلی میکس بول رہا تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی میڈیکل ایگزامنر نے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ دی تو وہ مجھے فون کرے گا۔

''کیا رپورٹ ہے بلی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک گولی اس کی شہ رگ کے آر پار ہوئی ہے جس کی وجہ سے ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اس کے جسم کا سارا خون بہہ گیا۔ اس پر چار فائر کیے گئے۔ بقیہ تین مہلک نہیں تھے۔ ہمیں اعشاریہ بائیس کے چار خول ملے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ قاتل کسی ایجنڈے پر کام کررہا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ واقعہ کب پیش آیا؟''

''جگر کے درجہ حرارت اور اعضا کی سختی کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اسے گزشتہ روز نصف شب سے قبل گولی ماری گئی۔''

''ہولڈ کرو۔'' میں نے فون پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسکائی سے کہا۔ ''اسے آخری بار کب دیکھا گیا تھا؟''

''وہ رات کے کھانے کے بعد ایک میٹنگ میں شریک ہوا تھا جو نو بجے ختم ہوگئی تھی۔ اس کے بعد باؤل اپنے ٹریلر ہوم میں چلا گیا پھر کسی نے اسے نہیں دیکھا۔''

''اسے نو اور بارہ بجے کے درمیان مارا گیا ہے۔'' میں نے میکس سے کہا۔

''تمہارا اندازہ درست ہے۔''

''مجھے یہ رپورٹ بھیج دو۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

''اسے کس ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے؟'' اسکائی نے پوچھا۔

''پاپ گن سے۔ اسی لیے کسی نے گولی چلنے کی آواز نہیں سنی۔''

''جس شخص نے اس کی لاش دریافت کی، اس کا کہنا ہے کہ ٹریلر ہوم میں اسٹیریو پوری آواز سے بج رہا تھا۔ اس نے پولیس کو فون کرنے سے پہلے اسے بند کر دیا تھا۔''

''حالانکہ اسے جائے واردات پر کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے تھا۔''

''وہ ٹی وی کا بندہ ہے۔ اسے ان باتوں کا کیا پتا؟''

''یہ بتاؤ کہ باؤل کس سلسلے میں یہاں آیا تھا؟''

''وہ ان تمام شہروں میں جا رہے ہیں جہاں پہلے چھ جیتنے والے رہتے ہیں۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں۔''

''یہ شو کا ساتواں سیزن ہے۔ اس سے پہلے چھ فنکار جیت چکے ہیں۔ دو سال پہلے جیتنے والی شرے فورٹ کا تعلق مورگن سے تھا۔''

''میں نے بھی اس کا نام سنا ہے۔''

''اب تک یہ شو چار شہروں میں ہو چکا ہے اور یہ ان کا پانچواں پڑاؤ ہے۔''

''کیونکہ شرے فورٹ یہاں رہتی ہے۔''

''ہاں۔''

''چھٹا شہر کون سا ہے؟''

''اٹلانٹا۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ کیا اس کی کوئی اہمیت ہے؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن اگر یہ شو اتنا ہی مقبول ہے جیسا کہ تم نے بتایا تو اس کیس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔'' میرے سیل فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار مورگن پولیس چیف چیپل موکلے بول رہا تھا۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' موکلے نے پوچھا۔

''کنونشن سینٹر کے لاؤنج میں۔ مجھے ابھی ابھی پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ ملی ہے۔''

''وہاں کوئی ٹی وی سیٹ ہے؟''

''ہاں۔''

''چینل نائن دیکھو۔''

میں ٹی وی سیٹ کے قریب گیا اور ریموٹ کے ذریعے چینل نائن لگایا۔ میرے سامنے لیلا ایلکس کا چہرہ تھا اور وہ مائک ہاتھ میں تھامے کہہ رہی تھی۔ ''اب اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ بلس کاؤنٹی کنونشن سینٹر میں اسٹار کوئسٹ کے سیٹ پر مارے جانے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ شو کا سب سے متنازع جج نکیل باؤل تھا۔ اسی ذریعے نے...''

''جہنم میں جاؤ۔'' میں بڑبڑایا۔

''ایسی باتیں زیادہ دیر خفیہ نہیں رہتیں۔'' موکلے نے کہا۔ ''تم اس خبر کے نشر ہونے پر لیلا کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔''

''آگے بھی سنو۔ مجھے اس شو کی ایک اور جج ایڈرا کینیڈی کا بھی فون موصول ہوا ہے۔''

''کیا اس نے اعتراف کر لیا؟''

''ہم جیسے لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہوتے۔ اس نے درخواست کی ہے کہ ان تحقیقات میں کسی باہر کے شخص کو بھی شامل کیا جائے۔''

''کیا وہ کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی مدد لینا چاہتی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔''

''اتنے بے صبرے نہ بنو۔ وہ اس معاملے میں بہت سنجیدہ ہے۔ اسٹار کوئسٹ ٹی وی کا سب سے مقبول شو ہے اور مورگن میں اس کا انعقاد ان کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا اس لیے باؤل کے قتل پر ان کا غم وغصہ سمجھ میں آتا ہے۔''

''یہ عورت کیا چاہتی ہے۔ کیا اس کی نظر میں کوئی ایسا نامی گرامی پرائیویٹ سراغ رساں ہے جسے وہ اس کیس کی تفتیش میں شامل کرنا چاہتی ہے؟''

''نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے کلائنٹس میں سے ایک ہے۔''

''تم کرپسٹر کی بات تو نہیں کر رہے؟''

میں نے دوبارہ ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہ

وہاں موجود تھا اور مجمع میں سے گزرتا ہوا جائے وقوعہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ''وہ پہنچ چکا ہے۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔''

''تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔'' موکلے نے کہا۔ ''سٹی کونسل نے نئی بھرتی پر پابندی لگا رکھی ہے۔ اس لیے تمہارا استعفیٰ منظور نہیں ہوسکتا اور میں تمہیں فارغ بھی نہیں کرسکتا۔ نہ ہی کسی دوسرے کو لاسکتا ہوں اس لیے تم ہی اس کیس کی تحقیقات کرو گے۔''

''لیکن کرپیسٹر...... تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ مجھے دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھنا پڑے گی۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کیوں پریشان ہورہے ہو۔ اس نے ہمیشہ پس پردہ رہ کر کام کیا ہے اور اس کا کریڈٹ بھی وہ ڈپارٹمنٹ کو دیتا ہے۔ مجھے تو یہ سوچ کر بھی شرم آتی ہے کہ تم صرف اس لیے اس کی مخالفت کررہے ہو کہ وہ تمہیں پیچھے نہ چھوڑ دے۔''

''مجھے اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اس سے کہیں زیادہ تیز ہوں لیکن اس کے کام کرنے کا طریقہ...... کم از کم میں اسے کنٹرول نہیں کرسکتا۔''

''کیا تم ٹی وی دیکھ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''ایسا لگتا ہے کہ وہ ٹریلر ہوم کی طرف جارہا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اسے راستے میں ہی روک لو لیکن خدا کے واسطے مصلحت سے کام لینا۔ تمہاری ہر حرکت ٹی وی کیمرے کی زد میں آسکتی ہے۔''

''بہت اچھا۔'' میں نے کہا اور کندھے پر لٹکا ہوا ریڈیو مائیکروفون پکڑ کر اعلان کیا۔ ''میں سراغ رساں بوٹ رائٹ بول رہا ہوں۔ میرے آنے تک کسی کو آگے نہ جانے دیا جائے۔''

بوڈی کرپیسٹر دو پولیس والوں کے ساتھ زرد فیتہ کے باہر کھڑا تھا جب میں اور اسکائی وہاں پہنچے۔ بہت سے لوگوں کو شاید اس طرح روکے جانے پر جھنجلاہٹ ہورہی تھی لیکن وہ بالکل پُرسکون اور مطمئن نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''سراغ رساں بوٹ رائٹ۔ تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہورہی ہے۔''

میں نے بادلِ ناخواستہ اس سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''تم ایڈا کینیڈی کو کیسے جانتے ہو؟''

''وہ میری کلائنٹ ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اس کا...... والا انکل باؤل تھا۔''

''ہاں۔''

''کیا تم یہ شو دیکھتے ہو؟''

''نہیں۔''

''تمہیں اس کے لیپ ضرور دیکھنے چاہئیں۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے کوئی بھی مار سکتا ہے۔ تقریباً سب ہی ایسا چاہتے ہوں گے۔''

''تم یہ کس طرح جانتے ہو؟''

''اخبارات پڑھ کر۔ کیا میں جائے وقوعہ دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے زرد فیتہ اوپر اٹھایا تاکہ وہ اندر جاسکے اور آگے بڑھ کر ٹریلر ہوم کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''مرکزی کمرے میں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس کی لاش باتھ روم سے ملی تھی۔''

''شکریہ۔'' اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم بتا سکتے ہو کہ باؤل کتنے عرصے سے اس ٹریلر میں رہ رہا تھا؟''

''ٹور منیجر کے کہنے کے مطابق جب سے انہوں نے چھ شہروں کا دورہ شروع کیا تھا، وہ اسی ٹریلر میں مقیم تھا۔''

''یعنی تقریباً چار ہفتے لیکن یہ کوئی اتنی زیادہ مدت نہیں ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہاں اس کا کوئی سراغ مل سکے۔''

''باتھ روم میں جاکر دیکھو، بہت کچھ مل جائے گا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا اور تم بھی یہ جانتے ہو۔ براہ کرم اب خاموش ہوجاؤ تاکہ میں توجہ سے کام کرسکوں۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، دونوں بازو پھیلائے اور ٹرانس میں چلا گیا۔ یہ منظر میں پہلے بھی کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ وہ آہستہ سے گھوما اور سر ہلانے لگا۔ جیسے کسی کے نظر آنے کا انتظار کررہا ہو۔

''گزشتہ دو تین دنوں میں یہاں بہت زیادہ گرما گرمی رہی ہے۔ منفی جذبات، الزامات اور جوابی الزامات، دھمکیاں اور اسی طرح کی تکلیف دہ باتیں محسوس کررہا ہوں۔''

''کچھ اندازہ ہے کہ کون کس پر جوابی الزام لگا رہا تھا؟''

''شش۔'' اس نے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹریلر ہوم کے پچھلے حصے کی طرف دیکھا۔

''اس سمت میں زیادہ ارتعاش ہے۔''

''وہ بیڈ روم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''پلیز چپ رہو۔'' یہ کہہ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا

باتھ روم کے دروازے تک گیا اور بولا۔ ''یہاں اسے گولی ماری گئی تھی؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ باتھ ٹب میں تھا۔''

''لیکن گولی دروازے سے چلائی گئی تھی۔ قاتل نے باتھ روم میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔''

''میں باتھ روم میں صرف ایک شخص کی موجودگی محسوس کررہا ہوں۔ قاتل کی آمد متوقع تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ مرد تھا یا عورت۔ وہ دروازے سے ٹریلر ہوم میں داخل ہوا۔ وہ اس کا انتظار کررہے تھے اس لیے قاتل کو دیکھ کر انہیں کوئی حیرانی نہیں ہوئی پھر انہوں نے گن دیکھی تو اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ قاتل نے پے در پے کئی فائر کیے اور مسٹر باڈل گولیوں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹب میں جا گرے۔''

''اور کچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''فی الحال اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔''

''بہت خوب، تمہاری آمد کا شکریہ۔ اس کیس میں مدد دینے کے لیے مورگن پولیس کی طرف سے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھے تمہارے جانے کا افسوس رہے گا۔''

''ایک منٹ۔'' اس نے کہا۔ ''میں کہیں نہیں جارہا۔''

''کیا واقعی، تم نے تو کہا تھا کہ ہماری مدد کرنے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا کام ختم ہوگیا۔''

''اگر میں تمہیں نہ جانتا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کررہے ہو۔''

''میرا اندازہ ہے کہ تم روحانیت سے کام لیتے ہو۔''

''بالکل۔ میں یہی کرتا ہوں۔''

''اب میں تمہیں اپنے مشاہدات بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں آنے سے پہلے تمہاری ایڈ اکینیڈی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے تمہیں اس کیس میں مدد دینے کی دعوت دی۔ اس نے تمہیں بتایا کہ نکیل باڈل کا قتل ہوگیا ہے اور اس پر کئی فائر کیے گئے ہیں۔ مرتے وقت باڈل کے جسم پر کپڑے تھے جس کا مطلب ہے کہ وہ غسل نہیں کررہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ باتھ روم سے باہر بھی نہیں آیا۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ ٹریلر ہوم میں داخل ہونے والا شخص بے ضرر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ قاتل کو جانتا تھا یا اس کے آنے کی توقع کررہا تھا۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ قاتل باتھ روم کے باہر کھڑا رہا اور اس نے وہیں سے گولیاں ماریں۔ دروازے کے دونوں طرف اور چوکھٹ پر پاؤڈر کے نشانات نظر آرہے ہیں اور جہاں تک ہاتھ کھڑا کرنے کی بات ہے تو ایسی صورت میں دس میں سے نو آدمی ایسا ہی کرتے ہیں۔

''جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اس ٹریلر ہوم میں دو تین روز تنگی رہی تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ مرنے والا کوئی اچھا آدمی نہیں تھا اور کچھ لوگوں سے اس کے اختلافات ہوسکتے ہیں۔ اب تم میرے روحانی مشاہدات کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟''

''میں لوگوں سے پوچھ گچھ کروں گا۔''

''میں بھی تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تم نہیں جانتے کہ کب مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے جس سے تمہیں اس کیس میں مدد مل سکے۔''

میرے بس میں ہوتا تو اسے باتھ روم میں دھکیل کر اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کردیتا لیکن چیف نے مجھے پرسکون رہنے کے لیے کہا تھا اس لیے بے دلی سے بولا۔ ''جو تم مناسب سمجھو۔''

☆☆☆

ایڈ اکینیڈی نے ٹشو پیپر سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ اس کا مسکارا پھیل گیا تھا اور وہ ایک بدصورت عورت نظر آرہی تھی۔ ویسے بھی اس کے چہرے میں کوئی کشش نہیں تھی اور اسٹیج پر نظر آنے والی خوب صورتی محض میک اپ آرٹسٹ کی مرہون منت تھی۔ کرپسٹر نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''پریشان مت ہو۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہ قتل کسی ایسے فرد نے کیا ہے جسے اس شو سے عداوت ہوسکتی ہے۔ میں نے کرائم سین کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات شدت سے محسوس کی کہ یہ حملہ ذاتی نوعیت کا تھا۔''

''اسی بارے میں تم سے جاننا چاہ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تمہارے علم میں ہے کہ گزشتہ دو دنوں کے دوران مسٹر باڈل کی کسی سے تکرار ہوئی تھی۔''

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اسے کوئی دھمکی تو نہیں ملی تھی؟''

''گو کہ میں اور وہ ٹی وی پر ایک ساتھ نظر آتے تھے لیکن ہمارے درمیان زیادہ قربت نہیں تھی۔ میں اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔''

''ٹی وی پر تم دونوں کیا کرتے تھے؟''

''نیٹ ورک والے چاہتے ہیں کہ ججوں کے درمیان اختلاف دکھایا جائے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ ایک طرح سے ایک ڈراما ہوتا ہے جو فنکاروں کے درمیان مقابلہ تو اصلی

ہوتا ہے لیکن پروڈیوسر اور مصنف ججوں کے درمیان بحث کا ماحول بنا دیتے ہیں تاکہ ناظرین شو میں دلچسپی لیں۔''

''تمہارے اور باؤل کے درمیان بھی اس طرح کے اختلافات ہوتے تھے؟''

''اسکرپٹ کے مطابق وہ مجھے بری نظر سے دیکھتا تھا اور میں ظاہر کرتی تھی کہ اس سے خفا ہو گئی ہوں لیکن یہ صرف اداکاری ہوتی تھی، ویسے تو وہ ہر ایک کو ہی بری نظر سے دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے کمرشل بریک کے دوران میری کلائی بھی پکڑی تھی لیکن دوبارہ ایسی حرکت نہیں کی۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور بولی......'' یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی۔

''کیا؟'' میں نے کہا۔ ''تم نے اس سے کیا کہا؟''

''میں نے اس سے کہا کہ اگر اس نے آئندہ ایسی کوشش کی تو اسے جان سے مار دوں گی لیکن حقیقت میں میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں نے یہ بات صرف اسے ڈرانے کے لیے کہی تھی۔''

''ٹھیک ہے، میں سمجھ گیا۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ گزشتہ شب دس اور بارہ بجے کے درمیان تم کہاں تھیں؟''

میرے منہ سے یہ جملہ نکلتے ہی اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں سمجھ گیا کہ میں نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔ وہ بولی۔ ''اگر بہت زیادہ مجبور کیا گیا تو بتا سکتی ہوں ورنہ نہیں۔''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہم ایک قتل کی تحقیقات کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

کرپسٹر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گیا ایڈا۔ تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ثابت کر سکتی ہو لیکن تمہیں اس جگہ کا انکشاف کرنے میں ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔

''تم قتل کے وقت جس کے ساتھ تھیں اگر اس کا نام ظاہر ہو گیا تو کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے؟''

اس نے دوبارہ سر ہلایا تو کرپسٹر بولا۔ ''اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کے نام کا مخفف بی ٹی ہے۔''

ایڈا نے جذبات سے بے قابو ہو کر سر ہلایا اور ٹشو سے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے اشارے سے مجھے روک دیا۔ جب ہم ایڈا کینیڈی کے ٹریلر سے باہر آئے تو اس نے کہا۔ ''اس کا نام بلنڈا البرٹ ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

اس نے مجھے کاغذ کا ایک ٹکڑا دیا جو کسی نوٹ پیڈ سے پھاڑا گیا تھا اور اس پر کسی نے لکھا تھا۔ ''براہ کرم میرے بارے میں انہیں مت بتانا۔ میرے ساتھ رات گزارنے کا شکریہ۔ بلنڈا۔''

''تمہیں یہ کہاں سے ملا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ اس کے کاؤنٹر پر پڑا ہوا تھا۔ ایڈا اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ اسے ضائع کرنے کا خیال ہی نہیں رہا۔''

''یہ بلنڈا کون ہے؟''

''یہ لڑکی بھی اس مقابلے میں شریک ہے۔ نوجوان اور خوب صورت ہے۔ آواز بھی اچھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ بڑی اسٹار بن سکتی ہے۔''

''اس شو میں شریک ہونے والے اتنا اور جا سکتے ہیں؟''

''ہاں، ان میں سے کئی ایک آسکر، گریمی اور ایمی ایوارڈ جیت چکے ہیں۔ حیرت ہے کہ تم اس معاملے میں بالکل ہی نابلد ہو۔''

بلنڈا البرٹ دبلی پتلی اور طویل قامت تھی۔ جب ہم تھیٹر میں داخل ہوئے تو وہ کسی گانے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ اس کی آواز بڑی صاف اور اچھی تھی اور میں سمجھ سکتا تھا کہ لوگ کیوں اس کی جیت کے بارے میں پرامید تھے۔ میں نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہوئی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا اور بولی۔ ''میں نے ایڈا سے کہا تھا کہ میرے بارے میں تمہیں کچھ نہ بتائے۔''

''اس نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے اپنے ذرائع ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم نکیل باؤل کے قتل کا اعتراف کر لو۔''

''میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے گھوم کر اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

''اگر تم حوالات کی سیر کرنا چاہتے ہو تو دوبارہ مجھے پکڑ کر دکھاؤ۔''

وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ اس نے لڑکی کو دکھانے کے لیے اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میں نے آہستہ سے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا قد تقریباً میرے ہی برابر تھا لیکن وزن میں مجھ سے پچاس پونڈ کم ہو

گا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا نام رینڈی لاک لیئر ہے۔'' کرپسٹر نے کہا۔ ''اور یہ بھی شو میں حصہ لے رہا ہے۔''

''یہ کیا حرکت تھی رینڈی؟'' میں نے پوچھا۔

''تم بلنڈا کو تنگ کر رہے تھے جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ نکیل کے ساتھ کیا ہوا۔ تمہیں اسے تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ اس نے یہ قتل نہیں کیا۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ یہ گزشتہ رات میرے ساتھ تھی۔ میرے ہوٹل کے کمرے میں۔''

''اوہ رینڈی۔'' بلنڈا نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم سب کچھ تباہ کر دو گے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے اور مجھے بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ ہم ایک دوسرے کو چاہتے ہیں لیکن یہ بات کسی کو نہ بتانا۔''

''اس کی وجہ بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''یہ مقابلے کے قوانین کے خلاف ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ شرکا کے درمیان کوئی تعلق قائم ہو۔''

''ٹھیک ہے رینڈی تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔''

رینڈی وہاں سے ہٹ گیا اور میں انتظار کرنے لگا کہ وہ تھیٹر سے باہر چلا جائے۔ وہاں بچا ہوا کے پاس کچھ کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بلنڈا کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرپسٹر بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میں نے جیب سے وہ پرچہ نکالا جو ہمیں ایڈا کے ٹریلر سے ملا تھا اور بلنڈا کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے لکھا تھا؟''

''ہاں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے۔ تم کیوں نہیں چاہتی تھیں کہ ایڈا ہمیں تمہارے بارے میں بتائے۔''

''میں صرف گانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میری ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ سنگر بنوں لیکن یہ بہت مشکل ہے۔ اس شعبے میں نام پیدا کرنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ تیس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد مشہور ہو۔ اگر میں بیس سال کی عمر میں نام نہ بنا سکی تو پھر اسٹار بننے کا خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔''

''تمہاری عمر کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بیس سال کی ہو گئی ہوں، وقت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے جلد از جلد نام بنانا ہے اور اس شو سے یہ موقع مل سکتا ہے۔''

کرپسٹر کھڑا ہو گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم جان گئی ہو کہ یہ مقابلہ جیتنے کے لیے صرف صلاحیت اور کارکردگی ہی کافی نہیں بلکہ کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔''

''تم جانتے ہو؟'' وہ بولی۔

''میں محسوس کر سکتا ہوں۔ اشارے بہت واضح ہیں لیکن وہ کوئی خاص بات نہیں بتا رہے۔ کیا تم پر کوئی دباؤ ڈال رہا ہے؟''

''ہاں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن میں اس بارے میں بات نہیں کر سکتی۔''

''تم نے ایڈا اور رینڈی کو یہ بات بتا دی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے تم گزشتہ رات اس کے ٹریلر میں گئی تھیں۔''

بلنڈا سیدھا ہوتے ہوئے بولی۔ ''اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا۔''

''اسے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ بالکل واضح ہے۔ تم ایڈا کے ٹریلر میں تھیں۔ نکیل بائل کا قتل ہو گیا اور تم وہاں سے واقعہ چھوڑ کر چلی آئیں کہ کسی کو تمہارے آنے کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے ایڈا کو ناول کے بارے میں بتا دیا ہوگا جو کچھ وہ تمہارے ساتھ کر رہا تھا۔''

''میں نے اسے ٹائیک گراہم سے باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔''

''یہ کون ہے؟''

''شو کا میزبان۔'' کرپسٹر نے کہا۔

بلنڈا نے کہا۔ ''ایک دن ٹائیک اور نکیل سیٹ کے پیچھے باتیں کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میں بھی قریب ہی موجود ہوں۔ میں نے نکیل کو کہتے ہوئے سنا کہ وہ ایڈا اور ڈیرک کو نکالنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔''

''یہ ڈیرک کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شو کا تیسرا جج۔'' کرپسٹر نے بتایا۔ ''اس کا اصل نام انتھونی گوتی ہے لیکن سب اسے ڈیرک ہی کہتے ہیں۔''

بلنڈا نے کہا۔ ''وہ نکیل بائل کا اگزیکٹو پروڈیوسر ہے۔ وہ

جسے چاہے فارغ کر سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ایڈا اور ڈیرک کی جگہ ایسے جج لے کر آئے گا جو نوجوان ناظرین کو متاثر کر سکیں۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ نوجوان بڑوں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ دیتے ہیں اور یہ ووٹنگ مقابلے میں شرکاء کے فون نمبروں پر کال کر کے ہوتی ہے۔ اگر آپ مجھے ووٹ دینا چاہتے ہیں تو میرے نمبر پر فون کریں گے۔ اگر رینڈی کو ووٹ دینا ہے تو اس کا نمبر مختلف ہوگا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ ٹول فری نمبر نہیں ہوں گے۔'' کرپیسٹر نے کہا۔

''نہیں۔'' بلنڈا نے کہا۔ ''ہر فون کال کے پیسے چارج کیے جاتے ہیں اور اس آمدنی میں شو کی انتظامیہ کا بھی حصہ ہوتا ہے۔''

''جتنے زیادہ لوگ ووٹ دیں گے۔ شو کی آمدنی میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''اور یہ پیسے ظاہر ہے کہ نکلیل باؤل کی جیب میں ہی جاتے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ موجودہ ججوں کو تبدیل کرنے سے شو کی آمدنی میں اضافہ ہو سکتا تھا؟'' بلنڈا نے سر ہلایا اور ٹشو سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''گزشتہ برس ووٹ دینے والوں میں سب سے بڑی تعداد نوجوانوں کی تھی۔ وہ اپنے سیل فون سے کال کرتے ہیں اور انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ اس ووٹ کی کیا قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔''

''اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔'' بلنڈا نے کہا۔ ''میں نے نکلیل کو کہتے ہوئے سنا کہ نائیک اور شرلے فورٹ کا معاشقہ چل رہا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ اس کی ذاتی زندگی ہے۔ وہ کسی بھی لڑکی سے مل سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں۔'' بلنڈا نے کہا۔ ''یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ مقابلے میں شرکت کر رہی تھی۔''

''تم نے کہا تھا کہ شو کے قوانین کے تحت شرکاء آپس میں ڈیٹنگ نہیں کر سکتے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم جو کچھ بتا رہی ہو۔ اس کا تو یہ مطلب ہے کہ میزبان کے کسی لڑکی سے ملنے پر بھی انہیں اعتراض ہے۔''

''یہ ایک بڑا اسکینڈل بن سکتا ہے۔'' کرپیسٹر نے کہا۔ ''اس سے شو کی شہرت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اسی بنیاد پر اسے بند بھی کیا جا سکتا ہے۔''

''اسی وجہ سے گراہم نے اس تعلق کو خفیہ رکھنے کی کوشش کی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''وہ نقصان سے بچنے کے لیے گراہم کو بھی فارغ کر سکتے ہیں۔''

''اسے اس شو کی میزبانی سے کافی آمدنی ہوتی ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''چھ ہندسوں میں بلکہ سات سے کچھ کم۔''

میں نے بلنڈا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے باؤل کو یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ وہ اس تعلق کے بارے میں جانتا ہے۔''

''ہاں، جب نائیک گراہم نے اس سے کہا کہ وہ ڈیرک اور ایڈا کو فارغ نہ کرے تو نکلیل نے اسے دھمکی دی کہ وہ اس معاملے سے الگ رہے ورنہ وہ اس سے پیچھا چھڑا لے گا اور شرلے کا کیریئر تباہ کر دے گا۔''

''یہ گفتگو کب ہوئی؟''

''تین دن پہلے۔ ہمارے ہورگن آنے سے کچھ دیر بعد۔''

میں نے کرپیسٹر کی طرف دیکھا۔ ہم دونوں میں سے کسی کو بھی اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے روحانی قوت کی ضرورت نہیں تھی۔ سات ہندسوں کی تنخواہ کا نقصان کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے نائیک گراہم سے زیادہ مشتبہ شخص کوئی نہیں ہو سکتا۔

''تم نے بتایا کہ نکلیل تم پر بھی دباؤ ڈال رہا تھا؟'' کرپیسٹر نے کہا۔

''اسے میرے اور رینڈی کے تعلق کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ مجھے بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس نے کئی مرتبہ اپنے ٹریلر ہوم پر آنے کی دعوت دی اور......'' اتنا کہہ کر وہ رک گئی اور دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا جیسے اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اسے شرم آ رہی ہو۔

کرپیسٹر نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ سکتا ہوں کہ کیا ہوا ہوگا۔ اس نے سوچا کہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا لے۔''

بلنڈا نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹائے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اسی لیے تم گزشتہ شب ایڈا کینیڈی کے ٹریلر ہوم چلی گئی تھیں؟''

وہ چند سیکنڈ تک خاموش بیٹھی رہی پھر آہستہ سے بولی۔

"میں نے سوچا کہ اسے نکیل کے جرائم کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ میرے لیے یہی مناسب تھا کہ اسے سب کچھ بتا دوں۔"

"اور تم نے اسے اپنے اور ریڈلی کے تعلق کے بارے میں ہی نہیں بتایا بلکہ یہ بھی کہہ دیا کہ نکیل تمہیں کس طرح بلیک میل کر رہا ہے۔" کرپسٹر نے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کوئی مشورہ دے گی۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ یہ سن کر حیران رہ گئی اور اسے غصہ بھی آیا۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا اور بولی۔ "کیا مجھے یہ سب کچھ بتانا ہوگا؟"

"یہ قتل کی تحقیقات ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور اس میں ہر بات اہمیت رکھتی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتی کہ اس کا یہی مطلب تھا لیکن اس کا کہنا تھا وہ اتنی ناراض ہے کہ نکیل کو قتل کر سکتی ہے۔"

اس سے بات کرنے کے بعد ہم ٹائیک گراہم کی تلاش میں آڈیٹوریم کی طرف چل دیے۔ راستے میں کرپسٹر نے کہا۔ "بلنڈا بھی تو مشتبہ ہو سکتی ہے۔"

"بالکل لیکن وہ بھی ایڈا کینیڈی کی طرح کم درجے کی مشتبہ ہے۔"

"کیونکہ وہ دونوں جائے واردات سے غیر موجودگی کا ثبوت دے چکی ہیں۔"

"اس کے علاوہ ایک بات اور...... کیونکہ ایڈا کینیڈی کو یقین ہے کہ تم دیوار کے پار دیکھ سکتے ہو اور اپنی روحانی طاقت سے قاتل کا پتا لگا لو گے لہٰذا اگر اس نے قتل کیا ہوتا تو وہ تم سے مدد کیوں مانگتی۔ یہ ممکن ہے کہ اس نے بلنڈا کے ساتھ مل کر نکیل کو قتل کیا ہو کیونکہ ان کے پاس اس کا جواز تھا۔ اس کے باوجود میں ایک ایسے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس کے پاس محرک اور موقع دونوں تھے۔"

"اور اس کے پاس گن بھی ہو۔"

"اسے کسی عام گن سے نہیں بلکہ اعشاریہ بائیس کے بے آواز ریوالور سے قتل کیا گیا ہے۔ ہمیں ایسے شخص کو تلاش کرنا ہوگا جس کے پاس یہ گن ہو۔"

ٹائیک گراہم آڈیٹوریم میں پہلی قطار کی ایک نشست پر بیٹھا کافی پی رہا تھا اور اس کی ٹانگ پر ایک کلپ بورڈ رکھا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں آتے دیکھا تو کلپ بورڈ برابر والی نشست پر رکھ کر استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا۔

"تم ہی وہ سراغ رساں ہو جو نکیل کے قتل کی تحقیقات کر رہے ہو؟" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایم برائے بوٹ رائٹ۔ میرا تعلق مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ سے ہے۔" میں نے کہا۔ "بہت سے لوگ مجھے بوائے بھی کہتے ہیں لیکن بہتر ہوگا کہ تم سراغ رساں کہو۔"

"بالکل اور تم یوڈی کرپسٹر ہو۔ میں نے آج صبح تمہیں خبروں میں دیکھا تھا۔ ایڈا نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔"

"اب ہم کام کی بات کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ تم گزشتہ سیزن میں شرلے نورٹ سے پینگیں بڑھا رہے تھے۔ نکیل کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی اور اس نے تمہیں دھمکی دی تھی کہ اگر اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ تمہیں بھی فارغ کر دے گا۔ ظاہر ہے کہ تمہیں سات ہندسوں والی تنخواہ سے محروم ہونا گوارا نہیں تھا۔ اس لیے ہماری نظر میں تم سب سے زیادہ مشتبہ ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ گزشتہ شب نو اور ساڑھے نو کے درمیان تم کہاں تھے؟"

اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ اس نے کچھ بولنا چاہا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس موقع پر کرپسٹر نے مداخلت کی اور بولا۔ "ایڈا کینیڈی نے تمہیں بتایا ہوگا کہ میں لوگوں کے ذہن پڑھ لیتا ہوں۔ ممکن ہے کہ اس نے مبالغے سے کام لیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں بہت سی باتیں محسوس کر سکتا ہوں۔ جب میں شو کا پانچواں سیزن دیکھ رہا تھا تو میں نے تمہارے اور شرلے نورٹ کے درمیان ایک بہت مضبوط تعلق محسوس کیا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟"

"مجھے اس بارے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ شو کے قواعد و ضوابط کے خلاف ہے۔" گراہم نے کہا۔

"بے شک۔" کرپسٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن دل کسی قاعدے قانون کی پابندی نہیں کرتا اس وقت بھی میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم کسی کو تحفظ دینا چاہ رہے ہو۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ نکیل باؤل کو تمہارے اور شرلے کے تعلق کے بارے میں معلوم ہو گیا تھا۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" گراہم نے کہا۔ "یہ سب کچھ خود بخود ہو گیا۔ اس شو میں ہر ہفتے لوگ ووٹنگ کے ذریعے باہر ہوتے رہتے ہیں۔ شرلے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے مشورہ مانگا کہ کس طرح وہ [illegible] تعلق ہے۔ اس طرح ہم قریب آتے

گئے۔ ہم دونوں نے اس تعلق کو چھپانے کی کوشش کی لیکن تنکیل کو کسی طرح پتا چل گیا۔ شرلے کی دوسری البم ایک مہینے پہلے منظرِ عام پر آئی ہے اور کافی مقبول ہو رہی ہے۔ اگر لوگوں کو ہمارے تعلق کے بارے میں پتا چل گیا تو اس کا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔''

''تنکیل یہ بات جانتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے اسے منع کیا کہ ایڈ اکینیڈی اور ڈاگ گوچی کو نہ نکالے۔ اس پر اس نے تمہیں بھی شو سے الگ کرنے کی دھمکی دے دی۔ تم اتنا بڑا نقصان کیسے برداشت کرتے، اس لیے......''

''تم کہنا چاہ رہے ہو کہ میرے پاس اسے قتل کرنے کا جواز تھا؟'' گراہم بولا۔

''لوگ تو معمولی باتوں پر قتل کر دیتے ہیں۔ اب بتاؤ کہ تم گزشتہ شب نو اور بارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''میں ساڑھے آٹھ بجے سے گیارہ بجے تک شو کے لیے دھن بنا رہا تھا۔ اس کی گواہی عملے کے لوگ دے سکتے ہیں۔ گیارہ سے بارہ بجے تک میں نے ایک مقامی ریستوران میں لیلا اینجلس کے ساتھ ڈنر کیا اور اس نے ساڑھے بارہ بجے کے قریب مجھے ہوٹل پر چھوڑا۔''

''کیا تم نے شرلے فورٹ کو باڈل کی دھمکی کے بارے میں بتایا تھا؟''

''میری اس سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ وہ ایک البم کی تیاری کے سلسلے میں لاس اینجلس گئی ہوئی ہے۔ کئی ہفتوں سے میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

☆☆☆

میں اور کرپسٹر مورگن اولیسٹر بار میں لنچ کر رہے تھے کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سے اسکائی بیکس بول رہا تھا۔ ''بوائے، ہم نے پتا چلا لیا ہے کہ تنکیل باڈل کے پاس ایک پستول تھا جس کی رجسٹریشن کیلی فورنیا کی ہے۔ ہم نے آج صبح اس کے ٹریلر ہوم کی تلاشی لی لیکن پستول نہیں ملا۔ ہم نے لاس اینجلس پولیس سے بھی رابطہ کیا ہے کہ وہ اس کے گھر کی بھی تلاشی لیں۔''

''گویا یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی ہی گن سے مارا گیا۔''

''اس کے علاوہ ہم نے ٹریلر ہوم سے فنگر پرنٹس بھی حاصل کر لیے ہیں جو شو کے کئی لوگوں سے ملتے ہیں۔ میں نے ان کی فہرست تمہیں ای میل کر دی ہے۔ وہ چند ہفتوں سے اس ٹریلر ہوم میں اکیلا ہی رہ رہا تھا لیکن اس سے ملنے کے لیے لوگ آتے رہتے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم پولیس کے کر[illegible] ساتھ ہوٹل جاؤ اور اس شو سے متعلق ہر شخص کے کمرے کی تلاشی لو۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ ان ہی لوگوں میں سے کوئی باڈل کا قاتل ہے اور اس نے گن کہیں چھپا دی ہے۔''

''میں اسے تلاش کر لوں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے اسکائی کی بھیجی ہوئی فہرست دیکھی اور کرپسٹر کو مخاطب کر کے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ ڈاگ گوچی کہاں ملے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ تنکیل کے ٹریلر ہوم کے بعد تیسرا ٹریلر اسی کا ہے۔ کیا تم اس سے ملنا چاہ رہے ہو؟''

''ہاں۔''

''اگر برا نہ مناؤ تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔''

''کیا میں تمہیں روک سکتا ہوں؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

گوچی اس وقت قالین پر لیٹا کوئی ورزش کر رہا تھا۔ جب میں نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو وہ بولا۔ ''میں چشمے کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔ تم کون ہو؟''

''مورگن پولیس کا سراغ رساں ایم بوٹے بوٹ رائٹ۔''

''ایک منٹ۔'' یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کی آنکھوں پر چشمہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ''اب میں بہتر طور پر دیکھ سکتا ہوں۔ کیا تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ کہیں میں نے تو تنکیل کو قتل نہیں کیا؟''

''ہم ان سب لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں جن کا اس شو سے کوئی تعلق ہے۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ گزشتہ شب نو اور بارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''یہیں، اسی جگہ پر۔'' گوچی نے کہا۔ ''ڈنر کے بعد میں کہیں نہیں گیا اور جب صبح پولیس آئی تب بھی یہیں تھا۔''

''کیا تم یہاں اکیلے تھے؟''

''بدقسمتی سے۔''

''گویا کوئی شخص تمہاری یہاں موجودگی کی تصدیق نہیں کر سکتا۔''

''کہہ سکتے ہو۔ کیا تمہیں مجھ پر شک ہے؟''

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تنکیل باڈل کا ارادہ تمہیں اگلے سیزن میں باہر کرنے کا تھا۔''

''یہ میرے لیے ایک نئی خبر ہے۔ شاید تم سمجھ رہے ہو کہ اپنی نوکری برقرار رکھنے کے لیے میں نے اسے مار ڈالا۔''

''[illegible] بھی سمجھا جائے گا۔''

''یقین کرو مجھے اس ملازمت کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو خود اس سیزن کے بعد شو چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں اسے اس شو میں رہنے کے لیے نہیں بلکہ کسی اور وجہ سے قتل کرتا۔''

''وہ کیا وجہ ہوسکتی ہے؟''

''ایک نہیں کئی وجوہات ہیں۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔''

''کیا تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''

''ہاں، لیکن یہاں نہیں بلکہ کیلی فورنیا میں ہے۔ تم بے شک اس عارضی گھر کی تلاشی لے سکتے ہو۔ میرے پاس چھپانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

''جبکہ تم بہت کچھ چھپا رہے ہو۔'' کرپسٹر نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ایڈا نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ بہت بولتی ہے۔''

''اس نے کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم تمہاری زبان سے سننا چاہتے ہیں۔''

''میرا نام گوچی نہیں مائیکل جونز ہے۔ میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ میری ماں گرینڈا کی رہنے والی تھی۔ اصلی انٹونی گوچی جمیکا میں رہتا ہے۔ میں اس سے چند سال پہلے ملا تھا لیکن وہ مجھے پہچان نہیں سکتا کیونکہ ہم دوست نہیں تھے۔ میں نے اس کا نام چرا لیا اور لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو کیریبین گلوکار کے طور پر پیش کیا۔ کسی طرح نکیل کو یہ بات معلوم ہوگئی۔ میں دو سال پہلے شو چھوڑنا چاہ رہا تھا لیکن اس نے دھمکی دی کہ اگر میں نے ایسا کیا تو وہ میری اصلیت ظاہر کردے گا۔ چنانچہ مجھے بحالت مجبوری رکنا پڑ گیا۔ اس لیے اگر اس نے مجھے نکالنے کا سوچا تھا تب بھی میں اسے قتل نہ کرتا کیونکہ میں تو خود یہاں سے جانا چاہ رہا تھا۔''

''ایک مسئلہ اور ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''تم یہ پہلے ہی بتا چکے ہو کہ تمہیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ تمہیں اور ایڈا کو نکالنا چاہ رہا ہے اس کے باوجود تمہارے پاس اسے قتل کرنے کی وجہ تھی اور وہ یہ کہ باؤل کے مرنے کے بعد تمہیں روکنے والا کوئی نہ ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اس جگہ کی تلاشی لینے کے ساتھ تمہارا معائنہ بھی کروانا ہوگا۔ اس قتل کو صرف ستر منٹ ہوئے ہیں، اگر تم نے اسے گولی ماری ہے تو تمہارے جسم پر بارود کے ذرات ضرور ہوں گے۔''

''تمہارا [illegible] چاہیے [illegible]۔ میں نے ایک [illegible] تم [illegible]

کیا۔'' گوچی نے کہا۔

اس کے کمرے سے کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہوا۔ لیبارٹری سے بھی تصدیق ہوگئی کہ اس کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات نہیں ملے۔ اس کے باوجود میں نے اسے ہدایت کی کہ تحقیقات مکمل ہونے تک وہ یہاں سے نہ جائے۔

وہاں سے واپس آتے ہوئے کرپسٹر نے مشورہ دیا کہ اس شو سے تعلق رکھنے والے افراد کو ایک جگہ جمع کرلیا جائے۔ وہ اپنی روحانی قوت سے کام لے کر اصل قاتل کو اعتراف جرم پر مجبور کردے گا۔ مجھے اس کے بڑبولے پن پر ہنسی آگئی لیکن اسے ایک موقع دینے کی خاطر میں نے تمام لوگوں کو کنونشن سینٹر کے اسٹیج پر جمع کرلیا۔ وہ سب ایک دائرے کی شکل میں فولڈنگ کرسیوں پر بیٹھے ایک دوسرے کو گھبراہٹ کے عالم میں دیکھ رہے تھے۔ میں اور کرپسٹر اسٹیج پر پہنچے۔ میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ اسٹیج پر بیٹھا ہوا کوئی ایک شخص نکیل باؤل کی موت کا ذمے دار ہے۔ میں مسٹر کرپسٹر کی مدد سے اسے بے نقاب کرنا چاہتا ہوں۔''

کرپسٹر اس دائرے کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھ [illegible] ہال کی روشنیاں گل ہوگئیں البتہ

ایک شوہر

ایک شوہر نے اپنی بیوی کو تیز کار چلانے سے باز رکھنے کی خاطر کہا۔ ''دیکھو بیگم، اگر تم کار تیز چلاؤ گی تو ایکسیڈنٹ ضرور ہوجائے گا۔ حادثے کے بعد اخبار میں خبر چھپے گی پھر اخبار والے تمہاری عمر بھی صحیح صحیح چھاپ دیں گے۔''

بیوی نے شوہر کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور کار آہستہ کرلی۔

پان اور...

پروفیسر صاحب بہت جلدی میں تھے۔ بیگم بولیں کہ پان تو کھاتے جایئے۔ وہ دروازے سے پلٹ آئے اور پان لے کر پھر جلدی سے جانے لگے۔

بیگم نے پھر آواز دی۔ ''ارے اپنے جوتے تو......''

''ابھی جلدی میں ہوں وہ آکر کھالوں گا۔'' پروفیسر نے بغیر رکے کہا۔

رضوانہ سمیع...... کوٹری

اسٹیج پر مدھم روشنی تھی۔ اس ڈرامائی ماحول کا آئیڈیا بھی کرپسٹر نے ہی دیا تھا۔

اس نے اپنے بازو پھیلائے۔ آنکھیں بند کرلیں اور آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا۔ پھر بھرّائی ہوئی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''اشارے بڑے واضح ہیں۔ قاتل ہمارے درمیان ہی موجود ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک سونے کا سکہ نکالا جو سونے کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا اور وہاں موجود لوگوں کو دکھاتے ہوئے بولا۔ ''یہ تعویذ نکیل باڈل کا ہے جو اس کی پیدائش کے وقت اسے پہنایا گیا تھا۔ یہ تیس سال سے زیادہ عرصہ تک پڑا رہا۔ اس کی وجہ سے انسانی جسم سے نکلنے والی مقناطیسی لہریں اس میں منتقل ہوگئیں اور کوئی بھی روحانی ماہر اس کے ذریعے اس کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو پڑھ سکتا ہے۔''

اس سفید جھوٹ پر مجھے ہنسی آگئی کیونکہ کچھ دیر پہلے ہی اس نے یہ سکہ جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا ایک دکان سے خریدا تھا۔ یہ ڈراما اسٹیج کرنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اس سکے کو دائیں بائیں گھمانے لگا پھر اچانک وہ رک گیا اور جس ہاتھ میں اس نے سکہ پکڑا ہوا تھا اسے ایڈا کینیڈی کی طرف کرتے ہوئے بولا۔ ''ایڈا اس مقناطیسی تعویذ کا رخ تمہاری طرف ہوگیا ہے۔ جس طرح مقناطیس کے مخالف سرے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے ہیں بالکل اسی طرح اس سکے کا رخ بھی ان لوگوں کی جانب ہوگا جن سے باڈل کے شدید اختلافات تھے۔''

''میں کبھی اس سے متفق نہیں ہوسکتی۔'' ایڈا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''اس کی مدد سے ہم باڈل کے قاتل تک پہنچ سکتے ہیں۔ ابھی سب کچھ واضح ہوجائے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے جھومنا شروع کردیا۔ وہ دائیں بائیں حرکت کررہا تھا پھر اس نے یوں ظاہر کیا کہ مقناطیسی کشش اسے دائیں جانب کھینچ رہی ہے۔ وہ انتونی گوچی کے پاس جاکر رک گیا۔

''بہت زیادہ نفرت نظر آرہی ہے۔'' اس نے اپنی آواز میں درد سموتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اور مسٹر باڈل کے درمیان شدید ناراضی اور اختلافات تھے۔''

اس سے پہلے کہ گوچی کوئی جواب دیتا۔ کرپسٹر دائرے کے دوسری جانب چلا گیا جیسے کسی نے اسے جھٹکے سے کھینچ لیا ہو۔ وہاں بلنڈا اسمتھ [illegible] رینڈی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ان دونوں کے سامنے وہ سکہ لہرایا اور ایک ہنکارا ابھرا۔ پھر پانچ فٹ دور جاکر ٹائیگ گراہم کے سامنے رک گیا۔

''تم نکیل کو نہیں چاہتے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''تم یہ بات کہہ سکتے ہو۔'' گراہم بولا۔ ''کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اسے قتل کیا؟''

''اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ تم نے اسے قتل نہیں کیا۔ کیا نکیل کو معلوم تھا کہ تمہیں نیٹ ورک کی جانب سے کوئی پیشکش ہوئی ہے؟''

''کوئی اس بارے میں نہیں جانتا تھا۔'' گراہم نے کہنا شروع کیا اور بولتے بولتے رک گیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اسے یہ بات معلوم ہوگئی تھی۔'' کرپسٹر نے کہا۔ ''تم جانتے تھے کہ وہ ایڈا اور ڈاگ گوچی کو نکالنے کی منصوبہ بندی کررہا ہے لیکن تمہیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ تم نے گزشتہ سال ہی اسٹار کوئسٹ سے پانچ سال کا معاہدہ کیا تھا جس کے پورا ہونے میں چار سال باقی ہیں۔ ایسی صورت میں تمہارے لیے دوسرے نیٹ ورک کی پیشکش قبول کرنا مشکل ہوجاتا۔''

''میں......'' گراہم نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے کرپسٹر مڑا اور ایڈا کینیڈی کے پاس رک کر سکہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا پھر بولا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ جس رات نکیل کا قتل ہوا، تم مس ٹالبرٹ کے ساتھ تھیں جبکہ رینڈی کا دعویٰ ہے کہ وہ اس کے پاس تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں جگہ پر موجود ہو۔''

''تم جانتے ہو کہ وہ میرے ساتھ تھی۔'' ایڈا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں میں سے کوئی ایک جھوٹ بول رہا ہے۔'' کرپسٹر نے کہا اور رینڈی کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا پھر اس کی ناک کے پاس سکہ لہراتے ہوئے بولا۔ ''اگر بلنڈا، ایڈا کے ساتھ تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس وقت کہاں تھے جب نکیل کا قتل ہوا؟''

''میں اس کا جواب نہیں دے سکتا۔''

''لیکن تم جواب دے چکے ہو۔'' کرپسٹر نے کہا۔ ''تمہاری پھیلی ہوئی آنکھیں اور تیز ہوتی دل کی دھڑکن اس کا جواب ہے۔ بہرحال تمہیں یہ جان کر افسوس ہوگا کہ ہمیں نکیل باڈل کا [illegible] مل گیا ہے جہاں تم نے

اسے چھپایا تھا۔''

رینڈی اپنی جگہ سے اچھلا۔ کرسی پیچھے کی اور بیرونی دروازے کی طرف لپکا لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسے دو باوردی پولیس والوں نے پکڑ لیا۔ ایک نے اسے مضبوطی سے دبوچا اور دوسرے نے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔

''رینڈی......!'' بلنڈا چلائی۔''نہیں۔''

''کیا تم ہمیں تفصیل بتانا پسند کرو گے؟'' میں نے کرپیسٹر سے کہا۔''اور یہ پستول کا کیا قصہ ہے؟''

''گزشتہ روز جب ہم بلنڈا سے پوچھ گچھ کر رہے تھے تو رینڈی اتنا پریشان ہوا کہ اس نے تقریباً تم پر حملہ کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ جس رات باؤل کا قتل ہوا وہ بلنڈا کے ساتھ تھا۔ جب تم نے پوچھا کہ اس نے جھوٹ کیوں بولا تو اس نے کہا کہ اس نے اسے بچانے کے لیے ایسا کیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اسے کیوں بچانا چاہ رہا تھا۔ بلنڈا کے پاس باؤل کو قتل کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔''

''غالباً اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ باؤل، بلنڈا کو بلیک میل کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ کیا تم نے رینڈی کو یہ بات بتائی تھی؟''

بلنڈا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔''میں نے اسے چار دن پہلے مورگن آتے ہوئے بتایا تھا۔''

''لہٰذا۔'' کرپیسٹر نے کہا۔''جب رینڈی نے جھوٹ بولا کہ بلنڈا قتل والی رات اس کے ساتھ تھی تو وہ اسے نہیں بلکہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ بلنڈا بھی یہی کہے گی اور اس طرح وہ جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی ظاہر کر سکے گا لیکن وہ ایسا نہیں کر سکی کیونکہ ہم پہلے ہی جان گئے تھے کہ اس رات وہ ایڈا کے ٹریلر ہوم میں تھی۔''

بلنڈا اسٹیج سے اتر کر رینڈی کے پاس گئی جو دونوں پولیس والوں کے درمیان سر جھکائے کھڑا تھا۔ وہ بولی۔''تم نے میری خاطر اسے مار دیا؟''

''نہیں۔'' رینڈی نے کہا۔''میں اسے صرف سمجھانے گیا تھا کہ وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دے۔ وہ قہقہہ مارتے ہوئے بولا کہ اس کے پاس دونوں میں کسی جیتنے کا اختیار ہے اور وہ مجھے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اسی ہفتے شو سے باہر کر دے گا۔ یہ کہہ کر اس نے دراز سے اپنا پستول نکال لیا اور مجھے وہاں سے جانے کے لیے کہا۔ مجھے غصہ آ گیا اور ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ میں نے اس سے پستول چھین لیا اور باتھ روم میں دھکیل کر اسے گولی مار دی۔ یہ سب کچھ غیر ارادی طور پر ہوا۔ میں خود نہیں جانتا تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔''

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔''تمہیں وہ پستول کیسے مل گیا۔ میں نے اسے ایسی جگہ چھپایا تھا جہاں کوئی اسے تلاش نہ کر سکے۔''

کرپیسٹر بولا۔''میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا لیکن اب ہم تمہاری مدد سے اسے حاصل کر لیں گے۔''

میں نے مورگن پولیس ڈپارٹمنٹ میں رینڈی کا بیان لیا اور اپنی رپورٹ لکھ ہی رہا تھا کہ کرپیسٹر میرے کمرے میں داخل ہوا۔''مجھے حیرت ہوئی کہ تم اتنی دیر تک کام کر رہے ہو۔''

''میں یہ رپورٹ مکمل کر رہا تھا تاکہ رینڈی کو کل صبح عدالت میں پیش کیا جا سکے۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ مجھے کچھ باتیں پوچھنا ہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں ٹاٹیک کے اور ان کے معاہدے کا کیسے پتا چلا جبکہ اس نے ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''میرے کئی جاننے والے شو بزنس سے وابستہ ہیں اور کامیاب لوگوں کو ہمیشہ اچھی پیشکش ہوتی رہتی ہیں۔ اسٹار کوئسٹ ٹی وی کا بہت مقبول شو ہے اور اس کی وجہ سے ٹاٹیک کی ریٹنگ بھی بڑھ گئی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اسے ہر ہفتے دو تین پیشکش ہوتی ہوں گی جن میں سے کچھ بہت پرکشش ہو سکتی ہیں۔''

''پستول کے بارے میں تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

''میں ان سب کے چہرے پڑھ رہا تھا۔ ان میں رینڈی مجھے سب سے زیادہ پریشان نظر آیا اور جیسے ہی میں نے اس کی دم پر پاؤں رکھا، وہ بلبلا اٹھا اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔''

''تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔''

''نہیں کیونکہ ہمیں یقین تھا کہ نکیل کو اس کے ہی پستول سے قتل کیا گیا ہے جو غائب کر دیا گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ قاتل نے اسے کہیں چھپا دیا ہوگا۔ چنانچہ رینڈی سے اگلوانے کے لیے مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ اگر تم کٹھ پتلیوں کو اپنے اشارے پر نچانا چاہتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ڈوریاں کس طرح ہلائی جاتی ہیں۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کرپیسٹر کو کس خانے میں فٹ کروں۔ وہ سراغ رساں تھا یا مداری۔

خونی ناٹک

مختار آزاد

شک! ایسے چھوٹے سے کنکر کے مانند ہے جسے خاموش جھیل میں پھینکا جائے تو دیر تک ایک کے بعد ایک دائرہ بنتا رہتا ہے... اور یہ دائرے ہر بار پہلے سے زیادہ واضح اور بڑے ہوتے ہیں... اسٹیج کی دنیا سے تعلق رکھنے والے کرداروں کے گرد گھومتی انوکھی کہانی کی پرتیں... ان کا ساتھی قتل ہو چکا تھا مگر قاتل تک رسائی ناممکن تھی... ہر شخص شبہے کی کڑی زد میں تھا... شک ہی حقیقت تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔

ایک بڑے اداکار کی ناکام زندگی کے دردناک اوراق

ایک اسٹیج اداکار کی حیثیت سے مجھے زندگی میں بہت ساری مایوسیاں اور تھوڑی بہت کامیابیاں بھی ملی ہیں۔ ایسے بہت سے کردار ہیں جنہیں میں کرنا چاہتا تھا، اس لیے نہیں کہ اداکار ہوں بلکہ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ میں پیدا ہی اُن کرداروں کو ادا کرنے کے لیے ہوا تھا لیکن وہ مجھے نہیں ملے۔

میں نے ایسے متعدد ڈرامے کیے ہیں جن میں میرے پسندیدہ کردار موجود تھے مگر کبھی ڈائریکٹر کی صوابدید، کبھی تھیٹر مالک کے تعلقات نبھانے کی خواہش اور کبھی ڈرامے پر چھائے نامور اداکاروں یا اداکاراؤں نے کاسٹنگ ڈائریکٹر کو مجبور کیا کہ وہ اُن کے منظورِ نظر اداکاروں کو لیں۔ یوں اکثر وہ کردار مجھ سے تب چھین لیے جاتے جب لبِ بام بس دو چار ہاتھ پر ہی رہ جاتا تھا۔

سال بھر پہلے مجھے ایک ڈرامے کے مرکزی کردار کے لیے چُنا گیا۔ وہ میرا پسندیدہ کردار تھا یعنی ایک مراغرسان کا کردار۔ تین ریہرسل کر چکا تھا، ڈائریکٹر بھی بہت خوش تھا لیکن نہ جانے کیوں مرکزی کردار ادا کرنے والی رادھا کو میں پسند نہ آیا۔ ان کا اعتراض تھا کہ میرے لباس سے پیاز کی بو آتی ہے۔ وہ کئی فلم اور درجنوں اسٹیج ڈرامے کر چکی تھی۔ رادھا کا شوبز انڈسٹری میں نام بن چکا تھا اسی لیے نخرے بھی دکھا رہی تھی۔ رادھا نے ڈائریکٹر کو اتنا پریشان کیا کہ وہ مجھے کٹ کر کے ایک ایسے شخص کو لینے پر مجبور ہو گیا جس کا پورا کیریئر صرف ایک ڈرامے پر محیط تھا۔

مجھے اب تک جو کردار ملے، اُن میں دو چار کو چھوڑ کر لگ بھگ سب کے سب بڑے عامیانہ اور صرف خالی جگہیں پُر کرنے جیسے تھے۔ وہ کردار جن پر اکثر دیکھنے والوں کی تالیاں تک نہیں بجتی تھیں، نہ ہی بعد میں انہیں وہ یاد رہ پاتے تھے۔ ذہنوں پر نقش ہو جانے والے کردار مجھے ملے ہی نہیں۔

کرداروں کے بارے میں اپنی تمام تر مایوسیوں اور دل شکستگی کے باوجود میں نے کبھی اسٹیج کو نہیں چھوڑا۔ کیونکہ مجھے اداکاری کی خواہش تھی۔ اسٹیج پر یہ سب مجھے دیں

ہو جاتا ہے۔ وہیں پہ اٹھتا ہے محشر، وہیں پہ ہوتا ہے روزِ حساب اور وہیں پہ جزا......

اسٹیج کی دنیا بھی سیاست کے کھیل سے کم نہیں۔ یہاں پسند ناپسند فن پر حاوی ہے۔ یہاں بھی چہروں پہ مسکراہٹ اور دلوں میں عناد رکھا جاتا ہے۔ آگے بڑھنے والوں کی ٹانگیں کھینچنا معمول کی بات ہے۔ لوگ شہرت کو اداکار کی فنی حیثیت تسلیم کرنے کا پیمانہ سمجھ لیتے ہیں لیکن اکثر سچا فنکار تو تاریک راہوں میں خاموشی سے مارا جاتا ہے لیکن نقال اور بہروپیے چہار سو راج کرتے پھرتے ہیں۔

اسٹیج پر جھوٹ کو سچ کا لبادہ پہنایا جاتا ہے۔ اسے دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے والے اکثر اداکاروں کی زندگیاں اسی جھوٹ کا نمونہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ جھوٹ اس طرح اُن کے چہرے کی حقیقت ڈھانپ دیتا ہے جیسے میک اپ اصلی چہرہ چھپا کر ایک نئی شکل دیکھنے والوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

دنیا جو دیکھتی ہے، وہی سچ مان لیتی ہے لیکن اگر اسٹیج کی دنیا میں جو نظر آئے، وہ ضروری نہیں کہ سچ ہو۔ جو سچ ہے

وہ اداکار سامنے نہیں آتا بلکہ گرین روم کے پچھلے دروازے سے ہی نظروں میں آئے بغیر باہر نکل جاتا ہے۔ اسٹیج پر تو ویسے ہی اُس وقت پردہ پڑا ہوتا ہے اور جب پردہ اٹھتا ہے تو جو نظر آئے، سو وہی سچ مان لیا جاتا ہے۔ اُسی پر داد ملتی ہے، اُسی پر نوٹ ملتے ہیں لیکن مجھے ان باتوں کی کبھی کوئی فکر نہیں رہی تھی۔ میرے زندگی کا مقصد صرف کردار نبھانا تھا اور وہ بھی تھیٹر کے اسٹیج پر۔ اس کے سوا نہ کچھ سمجھنا چاہتا تھا نہ ہی سمجھانے کی آرزو تھی۔

ایک بار اپنی فنکارانہ زندگی کا تجزیہ کر کے یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ مجھے بڑے کردار کیوں نہیں ملتے۔ جلد ہی اصل بات سمجھ آ گئی۔ اسٹیج کی دنیا میں میرا کوئی گاڈ فادر نہیں تھا۔ کوئی بڑی اداکارہ میرے دامِ الفت کا شکار نہ تھی۔ کسی دھڑے بندی میں شامل نہ تھا۔ کسی ڈائریکٹر کو مجھ سے ذاتی طور پر کوئی بڑا فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا تھا۔ شہر کے ثقافتی حلقوں میں اٹھنا بیٹھنا نہ تھا۔ سرکاری حکام سے مراسم نہ تھے۔ شوبز کی پارٹیوں میں جاتا تو دور کی بات کوئی بلاتا تک نہ تھا۔ ایسے میں صرف ایک امید تھی جو میرے کام آ سکتی

ہم پر تھمی تھی۔ ہمارا تماشا بن جانے کا۔

میں اس کی مجبوری سمجھ سکتا تھا۔ میرے کزن کرشن سے بھی سونی سنگھ کی بہت اچھی دوستی تھی۔ وکیل ہونے کے باوجود اسے فن و ثقافت سے بہت دلچسپی تھی۔ ان حلقوں میں اس کی بہت شناسائی بھی تھی۔ جب سونی سنگھ نے اپنی تھیٹر کمپنی شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو قانونی معاملات پر مشاورت کے لیے کرشن سے مدد لی تھی۔ اگرچہ وہ اپنی ایک چھوٹی سی قانونی فرم چلا رہا تھا جو زیادہ تر جائیداد اور کارپوریٹ سے متعلق معاملات میں ڈیل کرتی تھی لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ کرشن نے ممبئی کی تھیٹر دنیا میں بھی ٹانگ پھنسانے کا فیصلہ کرلیا۔ شاید یہ سونی سنگھ سے اس کی دوستی کا اثر تھا۔ تھیٹر میں کرشن کی شمولیت نے مجھے بھی خوا مخواہ اس معاملے میں ضرورت سے زیادہ گھسیٹ لیا۔ سونی سنگھ یا کرشن دونوں میں سے جب بھی کسی ایک کو ضرورت پڑتی، میں حاضر رہتا۔ اگرچہ اس وقت بھی میں تھیٹر کی دنیا کا حصہ تھا لیکن ان دونوں کے درمیان بیچ بچولن کے کردار نے مجھے بری طرح اس سے جڑے رکھا اور معاملات میں بھی گھسیٹنا شروع کردیا تھا۔

گزشتہ دنوں جب تک سونی سنگھ نے راجندر کو سائن نہیں کیا تھا، تب تک تو یہی امید تھی کہ وہ مرکزی کردار مجھے ہی دے گا۔ ایک دو بار اس نے ایسا عندیہ بھی دیا تھا۔ یہ میری فنکارانہ زندگی کا سب سے بڑا اور اہم کردار ہوتا۔ طویل عرصے کے بعد پہلی بار مجھے نام بن جانے کی امید تھی۔ ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا اور کرشن کی وجہ سے امید تھی کہ اب تھیٹر کے افتتاحی ڈرامے میں مرکزی کردار میرا ہی ہوگا۔ کردار بھی بھرپور جان دار تھا۔ سب کچھ ٹھیک تھا لیکن جب ڈراما لکھا جا چکا اور کاسٹنگ کی باری آئی تو اچانک انکشاف ہوا کہ مرکزی کردار کے لیے راجندر کو منتخب کرلیا گیا اور اس نے ڈراما سائن بھی کردیا ہے۔ یہ میرے لیے جان لیوا انکشاف تھا۔ یہ کم از کم میرے لیے اب تک کے صدموں میں سب سے بڑا صدمہ تھا۔ دل بری طرح ٹوٹ چکا تھا لیکن حسبِ عادت کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیا۔ گرمیاں تھیں، سو مجاش سے بھی ملنا تھا، سو دو ماہ کی چھٹیاں اس کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ تیاریاں مکمل تھیں کہ حالات نے پانسہ بدل دیا۔ ایک فون کال میرے، جہاز اور بل اسٹیشن کے درمیان رکاوٹ بن گئی تھی۔

ایک بار پھر سونی سنگھ کو میری ضرورت پڑ گئی تھی لیکن اب کی بار اس نے بہت دیر کردی تھی۔ ایک تو میرا دل ابھی

کی طرف سے ٹوٹ چکا تھا۔ میں کسی طور اس کے ساتھ فی الحال کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا یہ کہ جب سونی سنگھ کا فون آیا، تب میری روانگی میں بہت تھوڑا وقت باقی بچا تھا۔

''سونی... پلیز میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو، اس وقت میں کہیں جانے والا ہوں۔'' امید تھی کہ وہ سنجیدگی سے میری پریشانیوں پر ضرور غور کرے گا۔

''میرے پاس غور کرنے کا بالکل بھی وقت نہیں۔'' اس نے جھلا کر جواب دیا۔ ''تم میری پریشانی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے اس وقت ایک نام چاہیے یا پھر ایک اداکار...'' وہ لمحہ بھر کو رکا۔ ''اس وقت کہیں بھی کوئی اور فارغ نہیں مل رہا ہے۔ پلیز، پلیز شیام.... تم یہ کرلو۔ تم کرلو گے۔ مجھے واقعی اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے۔ مجھے مایوس مت کرو۔ میں بہت پریشان ہوں۔'' وہ بنا رکے بولے جا رہا تھا۔ اس کے لہجے سے منت و سماجت صاف جھلک رہی تھی۔

مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کہوں، کیا کروں۔ رہ رہ کر غصہ بھی آرہا تھا کہ میں دور رہنا چاہتا تھا، تب تو اسے سوجھا نہیں اب جاتا تو مجھے سے اداکاری کرلینے کو کہہ رہا تھا۔

مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔'' میں نے ٹھہرے، ٹھہرے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''میری پرواز کے اڑان بھرنے میں بہت کم وقت باقی بچا ہے۔ ٹیکسی آنے والی ہے۔ میں ایئرپورٹ کے لیے نکل رہا ہوں...''

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' اس نے میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہل اسٹیشن۔''

''اوہ.....'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''خیر، فی الحال مشکل ہے۔ تم مت جاؤ۔ کھیل کے بعد میں تمہیں آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اور وہاں کے سب سے بہترین ہوٹل میں پندرہ دن ٹھہرنے کا مکمل بل ادا کردوں گا لیکن اس وقت تم آجاؤ۔''

یہ سن کر میں نے کوٹ کی جیب میں رکھے ٹکٹ کو چھوا۔ ''یہ واپس بھی ہوسکتا ہے۔ کچھ کٹوتی کے بعد رقم واپس مل جائے گی۔'' میں نے دل ہی دل سوچا۔ اب میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگا تھا۔

''کیا ہوا..... خاموش کیوں ہوگئے ہو؟'' سونی سنگھ نے اپنی پیشکش کا جواب نہ ملنے پر بے تابی سے پوچھا۔ ''دیکھو..... وہاں میرے کئی بڑے اہم دوست رہتے ہیں، اپنے تعلقات کے ذریعے تمہیں بہت کچھ دلا سکتا ہوں،

وہ بھی اپنا خرچ کیسے؟

اس نے اپنی پیشکش میں مزید اضافہ کر کے میری راہ میں ایک اور رکاوٹ کھڑی کی۔ اگر مزید خاموش رہتا تو بولی مزید بڑھتی لیکن میرے خیال میں پہلے ہی مونی سنگھ بہت کچھ کی پیشکش کر چکا تھا۔ ''او کے...'' میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

ایک لفظ سے جیسے اس کی ساری پریشانی دور ہو گئی۔ ''یہ ہوئی نا بات یاروں والی.....'' مونی سنگھ خوشی سے چلایا۔ ایک لمحے کو لگا جیسے میرے کان کے پردے پھٹ جائیں گے۔ ''بس! فوراً پہنچو۔ باقی بات روبرو بیٹھ کر کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون رکھ دیا۔

ایک گھنٹے بعد میں بلیک باکس تھیٹر بلڈنگ کے سامنے مناسب جگہ پر گاڑی پارک کر کے اتر رہا تھا۔ مونی سنگھ نے مقامی انتظامیہ سے برطانوی دور کی ایک متروک سرکاری عمارت حاصل کر کے، تزئین و آرائش کے بعد وہاں اپنا تھیٹر قائم کیا تھا۔ گوتھک طرز کی وہ عمارت سترھویں صدی کے یورپی طرز تعمیر کا دلکش نمونہ تھی۔

کچھ دور پیدل چلنے کے بعد عمارت کا لکڑی سے بنا بھاری دروازہ سامنے تھا۔ میں نے ہینڈل پکڑ کر کھینچا۔ دروازہ بڑے آرام سے کھلتا چلا گیا۔ اندر نیم تاریک ماحول تھا۔ نگاہوں کے سامنے ہی استقبالیہ ہال تھا۔ پرانے طرز تعمیر کو چھیڑے بغیر معمولی سی تبدیلیاں کر کے استقبالیہ ہال کو تھیٹر لابی کی شکل دے دی گئی تھی۔ چند قدم آگے بڑھائے اور جب میری آنکھیں نیم تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو مجھے راہداری کا راستہ نظر آ گیا۔

''مونی سنگھ.....'' میں نے راہداری میں دو قدم آگے بڑھ کر پکارا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے اور کرشن نے کئی بار مونی سنگھ کو خبردار کیا تھا کہ جب بلڈنگ میں کوئی نہ ہو تو وہ اسے لاک کیے بنا نہ جائے لیکن وہ تو بھلکڑ اور بے پروا تھا۔ اوپر سے اب تک اس نے سیکیورٹی گارڈز بھی نہیں رکھے تھے۔ اس نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ سیکیورٹی کتنی اہم ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جب افتتاح ہو جائے گا تب سیکیورٹی کا معاملہ دیکھیں گے۔ کئی بار پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا کہ اس نے مجھے بلایا اور جب میں پہنچا تو مرکزی دروازہ کھلا تھا اور اندر کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج پھر مجھے بلا کر وہ حسب عادت بنا دروازہ بند کیے کہیں نکل گیا ہوگا۔

اندر کافی اندھیرا تھا۔ دو تین بار پکارنے کے باوجود جب کوئی جواب نہ ملا تو میں نے موبائل فون نکال کر اس کی ٹارچ روشن کی اور تھیٹر ہال کی طرف بڑھنے لگا۔

اندر لابی سے زیادہ تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ''مونی سنگھ.....'' دو تین بار آواز دی مگر جواب ندارد۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اردگرد ڈالی۔

ہال خالی تھا۔ کسی کی موجودگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ مونی سنگھ نے تھیٹر ہال کو عمدہ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نیلے رنگ کی مخملی نشستیں نہایت آرام دہ تھیں۔ نظر آتا تھا کہ مونی سنگھ نے ہال کی تزئین و آرائش اور ناظرین کے لیے اسے آرام دہ بنانے پر بہت زیادہ رقم خرچ کر دی تھی۔ مونی کے تھیٹر کا یہ پہلا افتتاحی ڈراما تھا۔ راجندر کا نام کھیل میں شامل ہونا ہی اس کی کامیابی کی دلیل تھی۔ سارے ٹکٹ ایڈوانس میں ہی فروخت ہو چکے تھے۔ ٹکٹوں کی فروخت سے مونی سنگھ کو بھاری رقم ملی تھی لیکن اس کے بعد راجندر نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر لوگوں کے علم میں یہ بات آ گئی کہ کھیل میں شامل نہیں ہے تو اسٹیج پر پہنچ کر شائقین نے بیچ کھیل میں ہنگامہ کھڑا کر دینا ہے اور اپنے ٹکٹ کی رقم واپس مانگی تب اس تھیٹر کا مستقبل کیا ہوگا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ راجندر کے انکار کے بعد مونی کس ذہنی اذیت سے دوچار رہا ہوگا۔

مونی سنگھ نے جو کردار مجھے آفر کیا وہ راجندر کے لیے تھا اور میں تھیٹر اداکاروں کے لیے بھرتی کا اداکار۔ یہ سوچ کر دانتوں تلے پسینہ آ رہا تھا کہ اگر کردار کے ساتھ انصاف نہ کر سکا تو میرے لیے شاید اتنا برا نہ ہوتا لیکن مونی کی سوچ کا یہ پرندہ پہلی اڑان سے پہلے ہی اپنے پر کٹا بیٹھتا۔ میں نے سر جھٹک کر اپنی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ یہ ایسا موقع تھا جو میری زندگی بدل بھی سکتا تھا۔ اسٹیج کی دنیا کا اگرچہ غیر اہم فنکار تھا لیکن راجندر کا چھوڑا ہوا یہ کردار میری فنکارانہ زندگی پر مثبت اثرات بھی مرتب کرتا۔ کیا ہوگا..... اسٹیج ہو کر ختم ہونے سے پہلے ڈرامے کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا۔

نشستوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالتے ہوئے اسٹیج کے قریب پہنچ گیا۔ روشنی ڈالی۔ پردہ اٹھا ہوا تھا۔ سامنے دو تین کرسیاں رکھی تھیں۔ ان کے برابر ایک ٹرالی میں تیاریوں کا کچھ سامان بکھرا ہوا تھا۔ میں برابر سے ہوتا ہوا سیڑھیوں کی طرف پہنچا۔ ٹارچ کی روشنی میں تھوڑا سا آگے بڑھا۔ دیوار کے ساتھ اصلی نظر آنے والا پلاسٹک کا ایک خوبصورت سا بڑا گلدان رکھا تھا۔ تھوڑا سا آگے بڑھا تو ایک انسانی ٹانگ بنا قدم کے نظر آئی۔ پہلے میں گھبرا گیا لیکن وہ پلاسٹک کی تھی۔ سمجھ

گیا کہ یہ ریہرسل میں استعمال ہونے والا سامان ہوگا۔ تھوڑا سا اور آگے بڑھا تو ہلکی سی ٹھوکر لگی۔ فوراً سنبھل کر فرش پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ پلاسٹک سے بنی ایک انسانی ٹانگ تھی۔ تھوڑا اور آگے بڑھا تو اچانک ایک ہلکی سی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے عین میرے سر پر اسپاٹ لائٹ روشن ہوچکی تھی۔ سچ پوچھو تو لمحہ بھر کے لیے دل دہل گیا تھا۔ بالی وڈ کے کسی جاہل ڈائریکٹر کی گھٹیا ہارر فلم کی طرح کا منظر پیش آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ ادھر اُدھر دیکھتا سونی سنگھ کی آواز گونجی۔ ''شیام...... کیا تم ہو؟'' اگلے ہی لمحے وہ اسٹیج کے بغلی دروازے سے نکل کر میرے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے کندھے پر تھیٹر کمپنی کے بڑے سے لوگو والا سیاہ چرمی تھیلا لٹک رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ ''شکر ہے تم نے اپنا ذہن بدل لیا، ورنہ میں تو بن موت مارا گیا تھا۔''

وہ مجھے سے پریشان محسوس ہورہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے میرا بازو پکڑا۔ ''آؤ......''

''اوہ میرے خدا......'' اچانک سامنے نظر پڑتے ہی میں چلایا۔ جسے میں اندھیرے میں ڈمی سمجھ بیٹھا تھا، وہ حقیقت میں ایک انسانی لاش تھی۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ پریشانی کے عالم میں ایک نظر سونی سنگھ پر ڈالی اور پھر لاش کی طرف دیکھا۔ مردہ پڑے شخص کے سینے میں چاقو دستے تک پیوست تھا۔ اطراف میں بہت سارا خون پھیلا ہوا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں دہل گیا تھا۔ لاش اور خون تو ذرا سے بھی مجھے خوفزدہ کردیتے تھے اور یہ تو سب کچھ حقیقت میں تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس طرح کا حقیقی منظر دیکھ رہا تھا۔ میری حالت بگڑنے لگی تھی۔ سر اٹھا کر سونی سنگھ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بھی حیرانی سے اسی طرف دیکھے جارہا تھا۔

سر سے پاؤں تک خوف میں جکڑ چکا تھا۔ ''کون ہے یہ......'' میری آواز خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔

''اوہ میرے خدا......'' سونی سنگھ کی بھی آواز کپکپارہی تھی۔ ''یہ تو یادیو کمار ہے۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے، اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔

''کانپور والا یادیو کمار......؟'' میں نے فوراً پوچھا۔ لاش کا چہرہ خون میں اس طرح لت پت تھا کہ پہچان نہ سکا۔ ''یہ وہی ہے نا، جس کے بارے میں کرشن نے مجھ سے خبردار کیا تھا کہ اس سے دور ہی رہنا؟''

شوہر

نوبیاہتا سوزی اپنی سہیلی کے کندھے پر سر رکھے رو رہی تھی۔ ''شادی کرکے میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوگئی ہوں۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد لیری نے آج تک مجھ سے پیار کے دو لفظ نہیں کہے۔''

سہیلی نے یہ سن کر ناصحانہ انداز میں کہا۔ ''خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہیں اتنی جلدی اس کی بدمزاجی کا پتا چل گیا۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم اکیلی ہو، خوب صورت ہو۔ تمہیں آسانی سے دوسرا شوہر مل جائے گا۔ پہلی فرصت میں اس سے طلاق لے لو!''

سوزی نے روتے ہوئے کہا۔ ''مشکل تو یہی ہے میں اس سے طلاق نہیں لے سکتی۔''

''کیوں؟''

''لیری میرا شوہر کب ہے...... میری شادی تو ڈاریک سے ہوئی ہے نا!''

مانسہرہ سے احمد بٹ کی تنبیہ

سونی سنگھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے اس کا تھیلا پکڑ کر سہارا دیا۔ ڈر تھا کہ کہیں وہ فرش پر ہی نہ گر جائے۔ ہم کرائم سین پر کھڑے تھے۔ ذرا سی بے احتیاطی پولیس کی نگاہوں میں اصلی قاتل سے ہٹا کر خود ہمارے اوپر مرکوز کرادیتی۔ میں چاہتا تھا کہ جو کچھ جیسا ہے، پولیس کے پہنچنے تک اُسے ویسا ہی رہنا چاہیے۔

کرشن نے انٹرنیٹ پر یادیو کے بارے میں پوری طرح ریسرچ کرکے سونی سنگھ کو ہدایت کی تھی کہ اسے اس شخص سے خود کو دور رکھنا چاہیے۔ اس کا کردار مشکوک تھا۔ یادیو کا کانپور میں پلاسٹک کی چیزیں تیار کرنے کا کارخانہ تھا۔ وہ وہاں کافی عرصہ رہا لیکن کاروبار میں نقصان کے باعث اسے کارخانہ بند کرنا پڑا اور وہ کسی نئے بزنس کی تلاش میں یہاں آگیا تھا۔ بعد میں مقامی انتظامیہ کے ساتھ تیزی سے اس کا میل جول بڑھنے لگا۔ کچھ عرصے سے شہر کے بڑے اور اہم سماجی حلقوں میں افواہیں گرم تھیں کہ اس نے بڑے بڑے اور بااثر افسران کو نہایت مہنگے تحائف دیے تھے۔ اسے کرپٹ سیاستدانوں کے گھروں پر بھی آتا جاتا دیکھا گیا تھا۔ مجھے یاد ہے اس پر کرشن نے کہا تھا ''یہ اس کی انویسٹمنٹ ہے، جس سے دو نمبر دھندے کی بُو آتی ہے۔''

اس نے سر اوپر کیا اور گھبرائے ہوئے سونی سنگھ کی [illegible] ابھی تک اسے خود سے الگ نہیں کیا

تھا کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کرشن نے اکثر اوقات سوہنی سنگھ سے کہا تھا کہ وہ اس سے بچے ورنہ کسی مشکل میں بھی پھنس سکتا ہے اور اب وہ شاید پھنس چکا تھا۔

میں کرشن کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ سوچتا بہت ہے۔ قوتِ فیصلہ کی کمی کے سبب کسی نتیجے پر پہنچنے میں اسے بڑی دیر لگتی ہے لیکن ایک بات ہے، جب وہ کوئی فیصلہ کر لیتا ہے تو پھر اس کا ذہن تبدیل کرانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوتا۔ سچ بات تو یہی ہے کہ ہمیشہ اُس کا فیصلہ سو فیصد درست ثابت ہوتا تھا۔ یادیو کے بارے میں بھی وہ اپنی ایک رائے قائم کر کے سوہنی سنگھ کو اُس سے آگاہ کر چکا تھا۔

میں نے جی کڑا کر کے ایک بار پھر لاش کی طرف دیکھا۔ اُس کے جسم سے بہنے والا خون جم چکا تھا۔ میرے ذہن میں متعدد سوالات جنم لے رہے تھے۔ یہ کس نے کیا، کیوں کیا، اس بے دردی سے کیوں مارا گیا اور یہاں کیوں مارا گیا؟ فی الحال ان سوالوں کے جوابات کم از کم میرے پاس تو نہ تھے۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن اس طرح کی اذیت ناک موت کا تو کم از کم حقدار ہرگز نہیں تھا۔

''شیام......'' سوہنی سنگھ نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کرشن کا مشورہ اپنی جگہ لیکن تھیٹر چلانا اتنا آسان کام نہیں اور وہ بھی اس ڈیجیٹل دور میں۔ بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ مجھے بھی بہت ساری مشکلات کا سامنا تھا اور اب بھی ہے۔'' یہ کہہ کر اُس نے لاش کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ ''اب لگتا ہے کہ یہ تھیٹر چل ہی نہیں پائے گا۔'' اس کی آواز بھرّا رہی تھی۔ تھیٹر کھولنا شاید اس کی زندگی کا سب سے بڑی تمنا تھی۔ یہ خواہش جلد پوری ہونے والی تھی لیکن یادیو کے قتل سے سب کچھ بدلتا نظر آ رہا تھا۔

میں نے بڑی ہمت کر کے لاش پر سے اپنی نظریں اٹھائیں اور اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''کیا کرشن یہ بات جانتا ہے کہ یادیو اب تک تھیٹر کے معاملات میں شامل رہا ہے؟''

یہ سن کر وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا اور بنا جواب دیے نظریں نیچے کر لیں۔ اس کے چہرے پر شرمندگی اور پیش آنے والی ممکنہ پریشانیوں کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''تم نے اسے کرشن کی نظروں سے کس طرح بچا کر اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا؟ کرشن بہت سمجھدار ہے۔ وہ ابھی تک تمام معاملات دیکھتا تھا۔'' سوہنی سنگھ نے شرمندہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''ہم نے کئی اکاؤنٹ بنا رکھے تھے۔ میں نے منیجر کو سختی سے تاکید کی تھی کہ تمام دفتری دستاویزات میں غلطی سے بھی یادیو کا نام نہیں آنا چاہیے۔ مجھے ڈر تھا کہ کرشن کو یہ پتا چلا تو معاملہ گڑبڑ ہو سکتا تھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ تھیٹر سے لاتعلقی اختیار کرے۔''

مجھے سوہنی سنگھ کی وضاحت پر رتی بھر بھی یقین نہ تھا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ اس طرح کی چالاکی کرنے والا بندہ ہی نہ تھا۔ خود ہی سوچو کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کسی شخص کے ساتھ کافی عرصے سے کام کر رہے ہوں اور ایک دن سب کے سامنے کھڑے ہو کر کہیں کہ میں تو اسے جانتا تک نہیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ جس طرح سوہنی سنگھ نے کرشن کو اندھیرے میں رکھا، وہ چال یادیو نے ہی سکھائی ہوئی ہوگی۔ اس کی چالاکیوں کے قصے تو سبھی جانتے تھے۔

ہم دونوں ہی خاموش کھڑے تھے۔ سوہنی سنگھ تو جیسے سکتے میں تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے موبائل فون نکال کر پولیس ہیلپ لائن کا نمبر ملایا۔

''آؤ......'' فون کرنے کے بعد سوہنی کا ہاتھ تھاما۔ ہم اسٹیج سے نیچے اتر کر سامنے کی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جب تک پولیس نہیں آ جاتی، ہم دونوں کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ ورنہ یہ ویسا ہی ہوتا کہ آ بیل مجھے مار......

تقریباً تین گھنٹے کے بعد پولیس نے ہم دونوں کے بیانات لینے کے بعد صرف مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ اُسے روک لیا تھا۔ میرے پاس ہل اسٹیشن کا ائیر ٹکٹ دیکھ کر پولیس افسر چونکا تھا۔ یہ دیکھ کر وہ مطمئن نظر آیا کہ فلائٹ کا وقت گزر چکا تھا لیکن پھر بھی مجھے سختی سے تنبیہ کی کہ پولیس کی اجازت بغیر شہر سے باہر ہرگز نہ جاؤں۔

یہاں سے نکل کر میں سیدھا اپنے گھر گیا۔ کچھ کھا پی کر جان میں جان آئی تو کرشن سے ملنے کے لیے اُس کے گھر راج مینشن کی طرف چل دیا۔ جو کچھ ہوا، میں اُسے تفصیل سے بتانا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ مینشن بظاہر کرشن کی ملکیت تھا لیکن تکنیکی طور پر وہ اُس کی ہی نہیں میری بھی پراپرٹی تھی۔ وہ دراصل ایک فیملی ٹرسٹ کا گھر تھا، ایک ایسا فیملی ٹرسٹ جسے راج شرما نے قائم کیا تھا تاکہ خاندان کے تمام لوگ احساسِ ملکیت کے ساتھ اُن کے بعد بھی اُسی پر پیار محبت کے ساتھ رہ سکیں۔

راج منشن کی بڑی بیٹی میری نانی تھی اور کرشن اپنے دادا کا اکلوتا پوتا۔ کرشن کے دادا میرے نانا تھے۔ وہ ریلوے کے ریٹائرڈ چیف انجینئر تھے۔ انہوں نے ساری زندگی صرف ایک ہی کام کیا، ریل گاڑی کے لیے لائن بچھانے کا۔ انہیں ریل گاڑی سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ مینشن کو بلندی سے دیکھو تو وہ کسی ریل گاڑی کے انجن اور اس کے پیچھے لگے ایک ڈبے کے مانند نظر آتا ہے۔ انہوں نے گھر کا تعمیراتی نقشہ خود ڈیزائن کیا۔ برطانوی دور کے آخری دنوں میں تعمیر شدہ عجیب و غریب نقشے کا حامل یہ گھر کئی ریاستوں میں مشہور تھا۔ اب تو لوگ دور، دور سے اسے دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ میری سگی خالہ جنہیں ہم انجو آنٹی کہتے تھے، نے پوری زندگی باپ کی دہلیز پر ہی بسر کی تھی۔ انہوں نے شادی نہیں کی تھی۔ کرشن کی ماں بچپن میں فوت ہو گئی تھی، انجو آنٹی نے ہی بھتیجے کو پالا پوسا تھا۔ راج مینشن خاندانی گھر تھا۔ نانا کے بعد جب تک آنٹی زندہ رہیں، گھر اور زمینوں کی دیکھ بھال ان کے ہی ذمے تھی۔

انجو آنٹی دنیا سے رخصت ہوئیں تو اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ کر گئی تھیں۔ ان کی وصیت میں چند نایاب کتابیں، کچھ زمین، سونا، چاندی اور تھوڑی بہت نقدی میرے لیے بھی تھی۔ تھوڑی بہت صرف کرشن کو ملنے والے ترکے کے مطابق، ورنہ وہ اتنی زیادہ تھی کہ شاید مجھے زندگی بھر کم از کم پیسے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

راج مینشن کی دوسری منزل پر کرشن کا دفتر تھا، جسے وہ اسٹڈی کہتا تھا۔ وہ ایک اچھے وکیل کے ساتھ، ساتھ زبردست قسم کا تفتیش کار بھی تھا۔ وہ مجھ سے کئی سال بڑا تھا۔ اس کی وجہ سے ہی مجھے اپنی زندگی پورے سکون اور آزادی کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ میں ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا لیکن والدین کے بعد کرشن نے کبھی مجھے تنہائی کا احساس ہونے نہ دیا۔ اس نے ہمیشہ مجھے والدین کا پیار اور بڑے بھائی کی شفقت دی۔ اس سے میری دوستی بھی تھی اور اسے میں دوست کے ساتھ، ساتھ اپنا سرپرست بھی سمجھتا تھا۔ میری زندگی میں کبھی ایسا کچھ نہ رہا، جسے کبھی کرشن سے چھپانے کی کوشش کی ہو۔

اگرچہ اس وقت شاید میں ایسا نہیں سوچتا تھا لیکن اب تہ دل سے تسلیم کرتا ہوں کہ عمر کی تیسری دہائی کے اولین برسوں میں میرے پاس جو کچھ تھا، میرے ہم عمر اس کی خواہش کیا کرتے تھے۔ اتنی چھوٹی عمر میں شاندار زندگی بسر کرنے کے پیچھے میری کوششوں سے زیادہ کرشن کا کردار اہم رہا تھا۔ انجو آنٹی کے ترکے سے میرا حصہ دلانے میں وہ پیش، پیش رہا تھا۔ یوں کہیے کہ اس نے اپنے حصے کا بھی بہت کچھ مجھے ہی دلوا دیا تھا۔ آنٹی کی وصیت کرشن کی ہی تیار کردہ تھی اور یہ باور کرنا کیسے ممکن ہے کہ جو کچھ مجھے ملا، وہ اس کی مرضی کے بغیر ملا ہوگا۔

میں کرشن کی اسٹڈی میں داخل ہوا تو مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ لمحہ بھر کو اس نے مجھے غور سے دیکھا اور آنکھیں مسلیں۔ ''تم......'' وہ تقریباً چلایا۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو، تمہیں تو اس وقت جہاز میں ہونا چاہیے تھا۔''

اس نے مجھے جواب دینے کا موقع ہی نہ دیا۔ ''سب خیریت تو ہے، کیا کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' وہ سخت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

''سب ٹھیک ہے......'' میں آگے بڑھ کر اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھا اور گہری سانس لے کر فیصلہ کرنے لگا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔ میں سب کچھ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتا تھا۔

''تم گئے کیوں نہیں؟'' مجھے خاموش دیکھ کر کرشن نے تشویش بھرے لہجے میں پھر دریافت کیا۔

''بات یہ ہے کہ میں ائرپورٹ کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ موتی سنگھ کا فون آ گیا......'' اس کے بعد میں نے ڈرامے سے راجندر کی لاتعلقی، اس کردار کے لیے موتی سنگھ کی پریشانی، پھر میرا حامی بھر لینا اور یادیو کی لاش دریافت ہونے اور پولیس کو دیے گئے بیان تک کی ساری روداد اسے سنا دی۔

کرشن چپ چاپ سنتا رہا۔ کسی وکیل کی طرح اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

''یادیو تھیٹر کمپنی کے مالی معاملات میں بھی شامل تھا۔'' میں نے اپنی دانست میں ایک بڑا انکشاف کیا لیکن کرشن کا چہرہ بدستور بے تاثر رہا۔ مجھے لگا کہ اسے یہ سن کر کوئی تعجب نہیں ہوا۔

کافی دیر تک کمرے میں خاموشی رہی۔ آخر کرشن نے سر اٹھایا اور گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ ''تم مجھے یہ بتاؤ، پولیس کا کیا کہنا ہے؟''

''کچھ خاص نہیں...... بس میرا بیان لیا اور گھر بھیج دیا۔''

''اور وہ......؟''

میں سمجھ گیا، اس کا اشارہ موتی سنگھ کی طرف تھا۔ ''وہ میرے جانے تک وہیں پولیس کے ساتھ تھا۔ میں نکل رہا تھا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تب مجھے موتی سنگھ نے کہا کہ اس کا انتظار نہ کروں۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور منی بار کی طرف بڑھا۔ کچھ دیر بعد پلٹا اور ایک گلاس میری طرف بڑھایا۔ ''پریشان مت ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ ایک گھونٹ بھرا اور لیپ ٹاپ کھول کر کچھ ٹائپ کرنے لگا۔

کافی دیر ہوگئی۔ وہ بدستور کچھ ٹائپ کیے جا رہا تھا۔ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ مجھے لگا جیسے وہ یہ بھول ہی گیا ہو کہ میں بھی وہیں بیٹھا ہوں۔

آخرکار اس نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھائیں، گلاس تھاما اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر چند لمحوں تک میری طرف دیکھتا رہا۔ ''اس قتل سے متعلق انٹرنیٹ پر چند رپورٹیں پہلے سے ہی موجود ہیں۔''

میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ قتل تو آج صبح کسی وقت ہوا تھا، پھر یہ کون سی رپورٹیں ہیں جن کا ذکر کرشن کر رہا ہے۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

کرشن نے گہری سانس لینے کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''ایک رپورٹ کا کہنا ہے کہ یادیو کے معاملے میں اے سی پی کو شامل کرنے پر بھی زور دیا گیا۔ اس پر الزام ہے کہ وہ مصنوعات کی تیاری میں زہریلے مواد کا حامل خام مال استعمال کرتا رہا ہے اور تلف شدہ زہریلے مواد کو ٹریٹمنٹ کے بعد کسی محفوظ مقام پر دفن کرنے کے بجائے براہ راست دریا میں پھینک رہا تھا جس سے آبی آلودگی اور انسانی صحت کے سنگین خطرات جنم لے رہے ہیں۔''

یہ بات کسی حد تک درست ہی تھی۔ اسے دھندے کے گر آتے تھے۔ ایک بار یادیو نے کرشن کو بھی ایک قیمتی گھڑی بطور تحفہ پیش کی تھی، جس پر اسے شدید حیرت ہوئی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہیں یہ رشوت نہ ہو۔ اس کا خدشہ کسی حد تک درست تھا۔ شہر کی کئی بااثر شخصیات کو یادیو کی جانب سے اُن کی حیثیت کے مطابق قیمتی تحفے دینے کی افواہیں ہفتوں گردش کرتی رہیں۔

جب سے یادیو تھیٹر کی دنیا میں آیا تھا، تب سے وہ خاصی معروف شخصیت بن گیا تھا۔ ویسے بھی تھیٹر کی آڑ میں بہت سارے بااثر لوگ کالے دھن کو سفید کرنے یا کروانے کا دھندا کرتے تھے۔ اسی لیے کرشن نے موتی سنگھ کو مشورہ دیا تھا کہ یادیو سے فاصلہ بنائے رکھے۔ اسی دوران مجھے خیال آیا کہ کرشن کے بقول وہ دو نمبر دھندوں میں شامل تھا۔ اس معاملے میں بااثر لوگوں نے بھاری رشوتیں بھی وصول کی ہوں گی۔

اب جبکہ ہندوستان ٹائمز کی اطلاع کے مطابق اس کے خلاف تحقیقات کا کہا جا رہا ہے تو یقیناً وہ سیاسی یا سرکاری شخصیات جنہوں نے اس سے مال بٹورا ہوگا، کسی صورت نہیں چاہیں گے کہ اس معاملے میں، کسی مقام پر یادیو ان کا نام لے۔ وہ سفید پوش جرائم پیشہ اپنی گردن بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتے تھے۔ چاہے وہ اُس کا قتل ہی کیوں نہ ہو۔ یہ خیال آتے ہی میرے ذہن میں اسٹیج کے فرش پر پڑی، خون میں ڈوبی یادیو کی لاش گھوم گئی۔ مجھے جھرجھری آگئی۔ گلاس چھلک گیا۔

کرشن نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھائیں۔ ''کیا ہوا...؟'' میرے ہڑبڑانے پر اس نے چونک کر پوچھا۔

''بس ذرا گلے میں پھندا سا لگ گیا تھا۔'' میں نے بات بنائی۔

''او کے......'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ لیپ ٹاپ پر نظریں گاڑ کر بیٹھ گیا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں جلدی جلدی ادھر سے اُدھر تھرک رہی تھیں۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور آنکھیں موند لیں۔ ایک بار پھر میرے تصور میں یادیو ابھر آیا۔ کوئی شخص اس کے سینے میں بڑا سا چاقو گھونپ رہا تھا۔ دستے پر سرخ رنگ کا ایک لوگو یا شاید کمپنی کا ٹریڈ مارک بنا ہوا تھا۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ ویسے ہی نشان والے چاقوؤں کا ایک سیٹ کرشن کی ہاؤس کیپر شیلا جوشی کچن میں استعمال کرتی ہیں۔

میں نے آنکھیں کھولیں۔ کرشن بدستور لیپ ٹاپ میں منہمک تھا۔ میں نے ایک بڑا سا گھونٹ بھرا اور خالی گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ کر ایک بار پھر سوچوں میں گم ہوگیا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ایسا شخص جس سے بھاری تحائف اور رشوتیں وصول کی گئی ہوں، صرف اس خدشے پر اُسے کیوں کوئی قتل کرائے گا کہ کہیں اُس کے جرائم میں اُن کا بھی نام نہ آجائے۔ ویسے بھی اب تک، سب کچھ صرف مفروضے اور امکانات کی حد تک تھا۔ یادیو کے خلاف کہیں بھی باقاعدگی سے سرکاری سطح پر کوئی تحقیقات شروع نہیں ہوئی تھیں یا اگر کی جا چکی تھیں تو اُن کا باضابطہ اعلان نہیں کیا گیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ خون کسی ایسے شخص نے کیا ہو جو نہ صرف اس کے بہت قریب ہو بلکہ یادیو خود بھی اُس پر اندھا اعتماد کرتا ہو۔ اچانک ایک اور خیال میرے ذہن میں آیا۔ مجھے یاد آیا کہ تھیٹر کے معاملات میں یادیو کے شامل ہونے کا سن کر کرشن کو کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ہر اُس بات سے واقف رہتا تھا، جس کا کوئی نہ کوئی تعلق اُس

کے [illegible] ہوتا ہے [illegible] اس بات سے بھی بخوبی واقف تھا۔ مجھے لگا کہ تھیٹر کے معاملات میں یادیو کی شمولیت کا سن کر کرشن کو سخت افسوس ہوا ہوگا کیونکہ اس نے سونی سنگھ کو سختی سے تنبیہ کی تھی، وہ اسے تھیٹر سے ہر صورت دور دیکھنا چاہتا ہے۔

اچانک پیٹ میں درد کی ایک لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ دوپہر سے ہی کچھ گڑبڑ محسوس تو ہو رہی تھی لیکن اتنی بڑی پریشانی میں الجھا ہوا تھا کہ تکلیف کا احساس ہی نہ رہا۔ ویسے یہ میرا بہت پرانا مسئلہ تھا۔ جہاں ذرا سی ٹینشن ہوئی، پیٹ میں درد کی لہریں اٹھنا شروع ہو جاتی تھیں۔ دوپہر کے مقابلے میں اس بار درد کی یہ لہریں زیادہ تکلیف دہ محسوس ہو رہی تھیں۔ پہلو بدلا لیکن درد کم نہ ہوا۔ میں نے کرشن پر نظر ڈالی۔ وہ لیپ ٹاپ میں گم تھا۔ آہستہ سے اٹھا۔ میرا خیال تھا کہ ذرا چہل قدمی کرلوں۔ ہو سکتا ہے تکلیف میں افاقہ آ جائے۔ اسٹڈی سے ہال کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف دو قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ پیچھے سے آواز آئی۔

’’اب تم کہاں چل دیے؟‘‘ کرشن پوچھ رہا تھا۔

’’ذرا چہل قدمی کرلوں۔‘‘

کرشن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسٹڈی سے سیدھا لان میں آیا۔ چہل قدمی کرتے وقت میرا دماغ یادیو کے سینے میں پیوست چاقو اور اس پر بنے لوگو پر اٹکا ہوا تھا۔ یقیناً ایسے چاقوؤں کے سیٹ ممبئی کے سیکڑوں گھروں میں ہو سکتے ہیں لیکن کرشن کے گھر میں ہونے کا ایک خاص مطلب تھا۔ ان لوگوں کا یادیو سے کچھ لینا دینا نہ تھا، وہ شاید اسے جانتے تک نہ ہوں لیکن کرشن یادیو کو ناپسند کرتا تھا۔ بات یہیں تک نہیں تھی۔ تھیٹر کے قیام میں کرشن کی بڑی خدمات شامل تھیں۔ منع کرنے کے باوجود یادیو، سونی سنگھ کی وجہ سے تھیٹر کے معاملات میں عمل دخل رکھتا تھا۔ اس لیے کرشن کے کچن میں اُس جیسے چاقوؤں کا سیٹ ہونا شبے کی کھڑکی کھولتا تھا۔

بظاہر اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ یادیو کو کرشن نے قتل کیا ہوگا۔ ویسے بھی اگر اُس کے نزدیک ایسی ہی کوئی سنجیدہ بات ہوتی تو وہ کسی بھی وقت اس معاملے پر سونی سنگھ سے بات کر سکتا تھا۔ سونی سنگھ کا زیادہ تر وقت تھیٹر میں ہی گزرتا تھا اور کرشن کے لیے اُس کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ اگر کرشن، یادیو کی تھیٹر کے معاملات میں مداخلت سے آگاہ تھا تو [illegible]

[illegible] اتنا، وہ دونوں اپنے اپنے موقف کا اظہار کر سکتے تھے لیکن ایسا نہ تھا کہ کوئی حل نہ نکلتا اور نوبت یادیو کی موت تک جا پہنچتی۔ میں نے سر جھٹکا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا ہال کے وسط تک پہنچ گیا۔

کچن نگاہوں کے سامنے تھا۔ شلپا سوری ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ’’ارے تم......‘‘ اس نے چونک کر کہا۔ ’’تمہیں تو گھنٹوں پہلے اڑان بھر لینی چاہیے تھی۔‘‘

میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ایک بار پھر پیٹ میں شدید اینٹھن محسوس ہوئی۔ قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ وہ بولی۔

’’یہ لو......‘‘ انہوں نے چاکلیٹ بسکٹ سے بھری پلیٹ اٹھائی۔ ’’ابھی ابھی اوون سے نکالے ہیں، بہت خستہ ہیں۔‘‘

میں کچن میں داخل ہوا اور پلیٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ’’اچھے ہیں۔‘‘ ایک بسکٹ اٹھا کر تھوڑا سا کھایا۔ میری نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹکتی ہوئی کاؤنٹر پر آکر تھم گئیں۔ سامنے کاؤنٹر پر رکھے لکڑی کے خوب صورت بکس میں مختلف سائز کے چاقوؤں کا ایک سیٹ رکھا تھا۔

’’شیام......‘‘ شلپا سوری کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ’’کیا کوئی پریشانی ہے؟‘‘

میری نگاہیں اب بھی چاقو والے باکس پر جمی تھیں۔ ایک بار پھر مجھے یادیو کے سینے میں پیوست چاقو یاد آ گیا۔ ویسا ہی چاقو، ویسے ہی پھل پر بنے ہوئے نشان والا چاقو......

میری نگاہیں اس باکس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

’’کیا ہوا شیام......‘‘ شلپا سوری کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔ ’’تمہارا چہرہ زرد پڑ رہا ہے۔‘‘

میں نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

’’شیام...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟‘‘

میں نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دو قدم آگے بڑھ کر میرے قریب آئی۔ ’’یہاں بیٹھو......‘‘ انہوں نے کرسی گھسیٹ کر مجھے بٹھایا۔ ’’میں پانی لاتی ہوں۔‘‘

میں نے ادھ کھایا بسکٹ پلیٹ میں رکھا اور دونوں کہنیاں ڈائننگ ٹیبل پر ٹکا کر سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ مجھے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا سوچ رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم تیزی سے پسینے میں نہاتا جا رہا ہو۔

شلپا سوری نے گلاس تھمایا تو پانی پیتے ہوئے میرے [illegible] تھوڑا سا پانی بسکٹ کی پلیٹ پر بھی

چٹنک گیا۔

اسی دوران کرشن کچن میں داخل ہوا۔ ''کیا چل رہا ہے؟''

جب کبھی راج سینشن میں رہنا پڑتا تو میری پسندیدہ جگہ سٹنگ روم تھی جو کچن کے ساتھ ہی تعمیر کیا گیا تھا۔ کچن کے عقب میں دو سرونٹ کوارٹرز تھے۔ جن میں سے ایک کو آنٹی انجو نے کچن اسٹور اور دوسرے کو ملازمین کے لیے سٹنگ روم بنا دیا تھا۔ شلپا موسی کے سوا اب کوئی اور ملازم تھا نہیں، وہ بھی صرف دن کے اوقات میں ہی وہاں رہتی تھیں۔ سٹنگ روم میں ہی اُن کے لیے ایک آرام دہ بستر بھی لگا دیا تھا، جہاں وہ دن کے فارغ وقت میں کچھ آرام کر لیتی تھیں۔

کرشن نے جب میری طبیعت بگڑتے دیکھی تو بازو سے تھام کر سٹنگ روم میں لے آیا۔ مجھے دو تین بار قے آ گئیں۔ پیٹ میں زور کے مروڑ اٹھنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد شلپا موسی نے مجھے پودینہ، سونف اور ادرک کا قہوہ بنا کر پلایا۔ کچھ دیر بعد طبیعت میں بہتری محسوس ہوئی لیکن کمزوری بہت ہو رہی تھی۔ کافی دیر آ رہے تھے۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے مجھے ڈائریا ہوا تھا تب بھی سینشن میں ہی رہا تھا۔ کرشن نے مجھے بیڈ پر لٹا دیا۔ ''جب تک طبیعت سنبھلی نہیں گھر مت جانا۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ کمزوری سے میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

دوسرے دن سو کر اٹھا تو لگ رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ میں نے موبائل فون آن کیا۔ سونی سنگھ کا میسج آیا ہوا تھا۔ وہ ریہرسل کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ میں اٹھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ نہا کر نکلا تو تکلیف کا احساس تک نہ تھا۔ کچن میں ڈائننگ ٹیبل پر ناشتا کرتے ہوئے میں ریہرسل اور یادیو کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ ریہرسل اہم تھی لیکن اس سے بھی اہم بات یہ تھی کہ یادیو قتل کیس کی تفتیش کتنی آگے بڑھی۔

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سونی سنگھ داخل ہوا۔ ''گڈ مارننگ...... کیا چل رہا ہے؟'' اس نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی تمہارے پاس ہی آنے کا سوچ رہا تھا۔'' میں مسکرایا۔ ''کل رات طبیعت خراب رہی۔ گھر بھی نہ جا سکا۔''

''تمہارے گھر گیا تھا۔ تالا دیکھا تو سمجھ گیا کہ اس وقت کہاں مل سکو گے۔'' اس نے شلپا موسی کے ہاتھ سے چائے کا مگ تھامتے ہوئے کہا۔

''کل شام ایک بار پھر طبیعت بہت خراب ہو گئی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''شلپا موسی نے سونف، پودینے اور ادرک کا قہوہ دو بار پلایا، تب کہیں جا کر سویا اور اب ناشتے کے قابل ہوا ہوں۔''

''تم اس کا نم کر مذاق اڑا رہا۔ لگتا ہے تمہارا معدہ کمزور پڑ گیا ہے۔'' سونی سنگھ کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

''باقی باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ پولیس تم سے کیا پوچھ رہی تھی۔'' جیسے ہی شلپا موسی کچن سے سٹنگ روم کی طرف گئیں، میں نے فوراً پوچھا۔

''بس یہی...... '' سونی سنگھ نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''یادیو کے بارے میں بتاؤ۔ جتنا کچھ میں جانتا تھا، وہ سب بتا دیا لیکن ان کی سوئی تو اس پر ہی اٹکی رہی...... اور کچھ۔ اب میں انہیں اور کیا بتاتا۔''

''تم نے اس کے ساتھ مل کر اور کیا کچھ کیا تھا؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

''اور کیا کرتا تھا......'' سونی سنگھ نے میری طرف دیکھا۔ ''پس پچھلے دنوں بہت پریشان تھا راجندر کو لے کر۔ یادیو کیا اسے میرے پاس لے کر آیا تھا۔'' اس نے کچھ میں رکھتے کیا، چھپاتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت بھی الجھنوں میں جکڑا محسوس ہو رہا تھا۔

''کیا وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتے تھے؟'' مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یادیو اور راجندر کے درمیان سیکڑوں میل کا فاصلہ تھا پھر ان میں ایسے قریبی تعلقات کس طرح پیدا ہو گئے کہ وہ اسے سونی سنگھ کے کھیل میں کام دینے تک لے آیا۔

''یادیو کی موت دو سال پہلے راجندر کی واقف کار تھی۔ دونوں نے دہلی میں کچھ اسٹیج ڈرامے اکٹھے کیے تھے۔'' سونی سنگھ نے بتایا۔

''تو وہ بھی اسٹیج اداکارہ ہے؟''

''کبھی تھی۔'' سونی سنگھ نے تصحیح کی۔ ''یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ اب تو وہ خاصی جانی پہچانی فیشن ڈیزائنر ہے۔ شاید اسی نے یادیو کو راجندر سے متعارف کرایا ہوگا۔'' اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ مجھے بہت کچھ بتانا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پا رہا۔ شاید وہ کسی مصلحت کا شکار ہو رہا تھا۔

''کیا یادیو اور راجندر کے درمیان کوئی کھنچاؤ چل رہا تھا؟'' مجھے اس بات کا خدشہ ان دونوں کے مزاجوں کے پیش نظر تھا۔ جہاں تک میں راجندر کو جانتا ہوں وہ کھلنڈرا، ضدی اور لاابالی طبیعت کا مالک تھا اور یادیو بھی کوئی نرم خو،

مونی سنگھ کچھ دیر کسی سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر فرش پر گڑی نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ”ہاں..... اُن دونوں کے درمیان کچھ کشیدگی تو تھی۔“

اسٹیج کی دنیا میں ایسا ہونا عام بات ہے۔ ساتھ کام کرنے والے الگ مجگ سبھی لوگوں کے باہمی تعلقات بظاہر بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن درونِ خانہ کبھی کو کبھی سے کچھ نہ کچھ شکایتیں ضرور ہوتی ہیں۔ ایک نادیدہ تناؤ درمیان میں برقرار رہتا ہے۔ اگر ان دونوں کے بیچ بھی ایسا تھا تو یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ایک اگر تھیٹر کی دنیا کا بڑا نام تھا تو دوسرا کاروباری حلقوں اور طاقتور سیاسی اداروں میں مضبوط جڑیں رکھتا تھا۔ ”ویسے تم کچھ جانتے ہو ان کے درمیان کس بات پر کشیدگی پائی جاتی تھی۔“ میں نے قتل کی وجہ جاننے کے لیے اسے مزید کریدنا چاہا۔

”میرا خیال ہے.....“ مونی سنگھ نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ”شاید یادیو کے پاس اُس کی کوئی ایسی کمزوری ضرور ہوگی، جس کی وجہ سے ہی وہ میرے کھیل میں کام کرنے کو تیار ہوا ورنہ تو مجھے توقع نہیں کہ اس نے ایسا صرف دوستی کی خاطر کیا ہوگا۔“

”ایسا کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے صوفے کا کشن اٹھا کر گود میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے علم نہیں“ مونی سنگھ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”بس! ایسا محسوس کر رہا ہوں۔ یقین نہیں، یہ صرف میرا اشک ہے۔“

”یہ بات تم نے پولیس سے کہی تھی؟“

مونی سنگھ نے سر ہلایا اور مسکرایا۔ ”نہیں ویسے بھی اگر کچھ ایسی بات ہوئی تو پولیس خود ہی جلد حقیقت کا پتا چلا لے گی۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ ”اچھا اب میں چلتا ہوں۔ ایک ضروری کام سے کہیں جانا ہے۔“ اس نے سیاہ تھیلا اٹھا کر کندھے پر لٹکایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ ہلایا۔ ”ارے سنو! ریہرسل کے لیے چلے جانا، میں کہیں جا رہا ہوں، واپسی پر ریہرسل میں پہنچوں گا..... بائے۔“

مونی سنگھ کے جانے کے چند منٹ بعد شلپا موسی کچن میں آگئیں۔ ”اوہ.....“ چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”شکر ہے بھگوان کا، وہ چلا گیا۔“ نہ جانے کیا بات تھی کہ مونی سنگھ انہیں بالکل بھی پسند نہیں رہا تھا۔

میں نے مسکرا کر پوچھا کیا تھا.....

تھیں۔ ناشتے کے لیے سینڈوچ اور چیز آملیٹ کے ساتھ تھوڑی بنا دی ہے، فریج میں رکھی ہیں۔ جاتے ہوئے ساتھ لے جانا۔“ انہوں نے نہایت شفقت سے کہا۔ ”ویسے اب طبیعت بالکل ٹھیک لگ رہی ہے۔“

”جی ہاں۔“ یہ کہتے ہوئے میں اٹھا۔ مونی سنگھ نے کہا تھا کہ ریہرسل کے لیے تھیٹر پہنچ جاؤں، وہیں سارے اداکار وہیں ملیں گے۔

ساڑھے دس بجے کے قریب گھر سے نکلا۔ تھیٹر پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ ہال کی طرف گیا۔ وہ بدستور کل جیسی حالت میں تھا۔ پولیس کی زرد ربن سے لگ رہا تھا کہ کرائم سین کو ابھی تک کلیئر نہیں کیا گیا تھا۔

لابی میں واپس آیا تو کل رات کی تکلیف کے باعث کافی کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ میں سینڈوچ کھا کر فارغ ہی ہوا تھا کہ ایک ساتھی کے تیج سے پتا چلا کہ ریہرسل کے لیے سارے اداکار ایک پارک میں جمع ہو رہے ہیں۔ مونی سنگھ نے صبح ذکر کیا تھا کہ اگر پولیس نے اسٹیج تھیٹر نہیں کھولا تو وہیں کسی پارک میں ریہرسل ہوگی۔ وہاں ان کے اچھے تعلقات تھے، انتظامیہ نے انہیں ریہرسل کی اجازت دے دی تھی۔

مجھے یقین نہ تھا لیکن جب وہاں ریہرسل شروع ہوئی تو تمام ساتھی بہت پُرجوش تھے۔ مونی سنگھ نے ایک ساتھی اداکارہ کو کردار کی بابت کچھ سمجھانا شروع کیا۔ وہ بہت اچھے طریقے سے سب کچھ کر رہی تھی۔ لابی اتنی پریشان کن حالات میں بھی مونی سنگھ اسٹیج پروان چڑھانے کی سوچ سے رتی بھر بھی غافل نہیں تھا۔

ریہرسل شروع ہوئے ایک گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ مونی سنگھ بھی پہنچ گیا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور اپنی اسسٹنٹ سے تمام تر معلومات لینے لگا۔ کچھ دیر بعد گہری تنقیدی نگاہوں سے ریہرسل کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بہت اچھا اور محنتی ڈائریکٹر تھا۔

”اب ہم پندرہ منٹ کا وقفہ لیں گے۔“ مزید آدھا گھنٹے کی ریہرسل کے بعد مونی سنگھ نے اعلان کیا۔ ”لابی میں چائے کافی کا انتظام ہے۔ سب وہیں پر چلتے ہیں۔“

جب سب باہر جانے لگے تو وہ میری طرف آیا۔ ”تم کچھ سست لگ رہے ہو۔“ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے گزشتہ رات کی طبیعت خرابی کا اثر شاید اب تک باقی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”جلدی جان لے۔ تم بہت اہم کردار

اداکر نہیں..... میرے تھیٹر کی عزت کا سوال ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

میں نے آہستہ آہستہ قدم بڑھائے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ جولی میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ اچانک وہ میرے برابر آکر کھنکھاری۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ جولی، مونی سنگھ کی بیک وقت چیف اسسٹنٹ اور اسٹیج منیجر ہونے کے علاوہ تھیٹر کی منجھی ہوئی اداکارہ بھی تھی۔ اب تک وہ کئی ڈراموں میں مرکزی کردار کرچکی تھی۔ مونی اس پر بہت زیادہ انحصار کرتا تھا۔

"کل جو کچھ ہوا، اس کے بعد بھی مونی کا آج یہاں آکر کام کرنا بڑی بات ہے۔" جولی نے کہا۔ "راجندر کا کام کرنے سے انکار اور یادیو کی لاش..... سمجھ سکتی ہوں، وہ کتنا پریشان رہا ہوگا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں لابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"میں سمجھ سکتی ہوں کہ اسٹیج پر اچانک ایک لاش کو دیکھنا تم دونوں کے لیے کتنا بڑا دھچکا ہوگا۔" جولی نے ہمدردانہ لہجے میں گفتگو شروع کی۔ "لیکن یہ بات مجھے نہیں آئی کہ یادیو کی بیوہ سے مونی کی [illegible] سے اُسے کیا [illegible] گا۔" یہ بتاتے ہوئے اس کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔

میں نے کہا تو کچھ نہیں البتہ بھنویں چڑھا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا جولی جانتی تھی کہ اس کی یادیو کی بیوہ سے کوئی بات چیت ہوئی ہے۔

جولی نے مسکرا کر دیکھا۔ "ہاں..... یادیو کی [illegible] سے مونی سنگھ کی تلخ کلامی ہوئی ہے۔ وہ تمہارے آنے سے پہلے یہاں آئی تھی۔ تب مونی سنگھ یہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ لال بھبوکا ہورہا تھا اور پھر خود بھی کہیں چلا گیا۔" یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا۔ ہم لابی میں پہنچ چکے تھے۔

"میں لنچ آرڈر کرنے جارہی ہوں، تم کچھ خاص لینا چاہو گے؟" وہ جان چکی تھی کہ میرا پیٹ کل رات سے خراب تھا۔

"شکریہ۔" میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "شاید مونی نے آتے ہوئے میرے لیے کھچڑی بنادی تھی، وہی کھاؤں گا۔" یہ کہتے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "ویسے تو کچھ محسوس نہیں ہورہا لیکن پھر بھی ابھی احتیاط ہی بہتر رہے گی۔"

"اوکے۔" [illegible] کہتے ہوئے وہ [illegible] کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے [illegible]

چائے کے وقفے کے بعد دو گھنٹے مزید ریہرسل کرنے کے بعد جسمانی حالت جواب دینے لگی تھی۔ مجھ سے زیادہ دیر کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا تھا۔ ایک کونے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کل سے اب تک کسی ایک لمحے کے لیے بھی یادیو میرے دماغ سے محو نہیں ہوا تھا۔ میں اس کے قتل سے پردہ اٹھانا چاہتا تھا، کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن میری جسمانی کمزوری راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ بڑی مشکل سے ریہرسل کررہا تھا۔ ڈیڑھ بجے ہوں گے کہ گھنٹی بجی۔ خدا کا شکر کہ اسسٹنٹ نے ریہرسل ختم کرنے کا اعلان کردیا۔

"آج کے لیے بس اتنا ہی، باقی کل کریں گے۔" میگا فون پر جولی کی آواز گونجی۔ میں نے محسوس کیا کہ مونی سنگھ مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

جولی میری طرف پلٹی۔ وہ ایک اچھی اداکارہ کے ساتھ بہترین کامیڈین بھی تھی۔ اس نے گول گول دیدے گھما کر مجھے دیکھا۔ میں نے بمشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔ پیٹ میں ایک بار پھر ہلکی سی اینٹھن محسوس ہورہی تھی۔

"جلدی کرو..... وہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھی۔ "راجندر والا کردار کررہے ہو، بڑا جاندار کردار ہے، جان لگا کر کرنا ہوگا لیکن تم تو ابھی سے مردہ بنے جارہے ہو۔"

مونی سنگھ بھی قریب آچکا تھا۔ اس کے کندھے سے سیاہ تھیلا لٹک رہا تھا اور ہاتھ میں نوٹ بک تھی۔ "تم خود کو ٹھیک کرلو جلدی سے۔" اس نے نوٹ بک سیاہ تھیلے میں رکھتے ہوئے کہا۔ "آج کافی ریہرسل ہو گئی ہے، وہ کل پوری کرلیں گے۔ کل ٹھیک نو بجے [illegible]۔"

جولی کو ہمیشہ سے شکایت رہی تھی کہ وہ بہت سخت گیر ہے۔ ڈنڈے کے زور پر کام کرانا چاہتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مونی سنگھ کو اپنا رویہ بدلنا چاہیے ورنہ مشکلات اس کا سر توڑتی رہیں گی۔

"اگر یہ اسی طرح کرتا رہا تو پھر آئندہ اس کے ساتھ کوئی کام کرنا نہیں چاہے گا۔" مونی کے جاتے ہی جولی بولی۔ "اتنی صبح ریہرسل کے لیے آنا ذرا مشکل ہوتا ہے مگر مونی سنگھ کو یہ سمجھ ہی نہیں آتا۔" اس نے شکایتی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بات مکمل کی۔ "ڈائریکٹر کو ڈائریکٹر رہنا چاہیے لیکن وہ تو ڈکٹیٹر بن جاتا ہے۔"

میں مسکرایا۔ "چلو..... چلتے ہیں۔"

[illegible] کے بعد میں [illegible] کی طرف ہی [illegible] کرتے ہوئے بھی کمزوری کا

احساس ہو رہا تھا۔ گھر کے سامنے پہنچ کر گاڑی روکی۔ اترنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار ہارن بجایا کہ کرشن ہوگا تو آ کر مجھے سہارا دے کر اندر لے جائے گا۔ کافی دیر تک کوئی نہیں آیا تو خود ہی بڑی مشکل سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ گھر میں شلپا موسی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ سیدھا سٹنگ روم گیا اور بیڈ پر جا کر لیٹ گیا۔ تقریباً گھنٹا بھر بعد کرشن کی آواز پر آنکھ کھلی۔

''شیام.... خیریت تو ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''تمہارے موبائل پر کئی بار کال کی لیکن تم فون نہیں اٹھا رہے تھے۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

اسی دوران شلپا موسی میرے لیے گرما گرم سوپ لے آئیں۔ مجھے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ سوپ کی مہک سے میری آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ ''فون کی رنگ ٹون بند کی تھی، واپسی پر آن کرنا بھول گیا۔'' سوپ کا پیالہ تھامتے ہوئے جواب دیا۔

''اور تمہاری ریہرسل کیسی رہی؟'' کرشن نے پوچھا۔

میں نے اسے مختصر طور ریہرسل کی روداد اور سونی کی ذہنی حالت کے بارے میں بتایا۔ ''آج تو وہ ریہرسل بھی ٹھیک سے نہیں کروا پا رہا تھا، ذہنی طور پر سخت پریشان لگ رہا تھا۔''

یہ سن کر کچھ دیر وہ خاموش رہا اور پھر ٹھہرے لہجے میں کہنے لگا۔ ''کم از کم میرے لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ سونی کا پیشہ ورانہ مستقبل تھیٹر کی کامیابی پر منحصر ہے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے لیے یادیو جیسے شخص کی سرپرستی ضروری ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔

یادیو جیسے آدمی سے یہ توقع تو ہرگز نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ بھائی بندی میں کسی کے لیے کچھ کر سکے۔ مجھے وہ سب کچھ اچھی طرح یاد ہے جو کرشن نے اسے خبردار کرنے کے لیے کہا تھا مگر وہ اس کے برعکس کرتا رہا اور اب مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اسی لیے میں نے پوچھا۔ ''تو پھر وہ بدلے میں سونی سنگھ یا اس کے تھیٹر سے کیا چاہتا تھا۔''

''میں نے اب تک کاغذات کے حوالے سے جو معلومات حاصل کی ہیں، اس کے مطابق یادیو تھیٹر کے بورڈ میں کافی زیادہ نشستیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک شرط بھی لگا دی تھی۔''

کرشن کی بات جاری تھی کہ میں نے قطع کلامی کی۔

''شرط....؟'' میرا لہجہ سوالیہ تھا۔

کرشن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اگر اختیاراتی تقسیم کے دوران سونی سنگھ والی پارٹی کو مطلوبہ حد تک نہیں ملے گا تو پھر اسے تھیٹر کا اختیار رکھنے والے بورڈ میں یادیو کو اتنی زیادہ نمائندگی دینا پڑتی کہ حقیقت میں وہ اس کا ایک ماتحت بن کر رہ جاتا۔''

''مطلب کہ یادیو تھیٹر کا سرپرست نہیں تھا بلکہ یہ ایک بزنس ڈیل تھی۔'' میں نے سوپ کا مگ سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کرشن سے کہا۔ گرم سوپ سے اڑتی بھاپ میں کرشن کا چہرہ دھندلانے لگا تھا۔ میں نے آنکھیں صاف کیں اور پھر اس کی طرف دیکھا۔ ''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آ رہی۔ اگر یادیو تھیٹر کو نا کام کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ راجندر کو کیوں لے کر آیا۔ وہ تو ایک ایسا اداکار ہے کہ جس کے نام پر ہی ٹکٹ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتے ہیں۔

کرشن خاموش رہا۔ وہ میری بات سن کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کنفیوژن کا شکار ہے۔ بطور اداکار اسٹیج پر اپنے کردار نبھاتے ہوئے بیک وقت چہرے پر دو تاثرات طاری کرنے میں بڑی مشکل سے کامیاب ہوتا تھا لیکن اس وقت مجھے حیرت تھی کہ بنا کسی کوشش کے کرشن کے چہرے پر دو تاثرات طاری تھے۔ کوئی عام آدمی سمجھے یا نہ سمجھے لیکن ایک اداکار ان باتوں کو بڑی آسانی سے بھانپ لیتا ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کرشن نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''تم اتنے یقین سے یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ ڈراما سائن کرنے کے لیے یادیو ہی راجندر کو لے کر آیا تھا؟''

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''آج صبح سونی سنگھ یہاں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ اسے یادیو پر شک ہے کہ وہ راجندر کو بلیک میل کر رہا تھا اور اسی دباؤ پر وہ اپنا پرانا ڈراما دوبارہ لکھ کر اسٹیج کیے جانے میں کردار ادا کرنے پر رضامند ہوا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے توقف کیا اور کچھ سوچا۔ اسٹیج پر پڑے پردے ایک، ایک کر کے میری نگاہوں کے سامنے سے اٹھتے جا رہے تھے۔ ''کرشن میں سمجھ گیا۔''

وہ میری طرف متوجہ ہوا اور سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''راجندر نے ہی یادیو کو قتل کیا ہے کیونکہ ڈراما سائن کرانے کے بعد اب وہ اسے کھیل سے علیحدہ کرنے کی سازش کر رہا تھا۔'' میں نے پُرجوش لہجے میں بات مکمل کی۔

''لیکن کیوں....؟''

''راجندر کے نام پر سارے ٹکٹ ایڈوانس میں

فروخت ہوگئے۔'' میں نے قیافے لگانا شروع کیے۔ ''جب لوگوں کو پتا چلے گا کہ وہ تو کردار کر ہی نہیں رہا تو پھر......''

''لوگ اپنے ٹکٹ واپس کردیں گے۔'' کرشن نے جلدی سے بات مکمل کردی۔

''بالکل یہی۔'' میں نے تائید کی۔ ''موہن سنگھ کی ضد پر ڈراما ہر حال میں اسٹیج ہوگا تو جب ہال ہی نہیں بھر سکے گا تو پھر یادیو کی بالادستی تو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گی۔''

''لیکن راجندر اسے کیوں قتل کرے گا؟'' کرشن نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ اس کی بلیک میلنگ سے تنگ آچکا ہو۔''

''لیکن شیام...... راجندر تو اس وقت پونا میں اپنے فارم ہاؤس پر ہے۔'' کرشن کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ میری بات ماننے پر آمادہ نہیں۔

''ضروری نہیں کہ وہ یہاں آنے کا اعلان بھی کرتا۔'' میں نے اس کی چبھتی نگاہوں کو نظرانداز کرکے بظاہر شک کی بنیاد پر کڑیاں ملانا شروع کیں۔ ''بہت سارے ایسے طریقے ہیں کہ وہ کسی پر بھی اپنی پونا سے غیرموجودگی ظاہر کیے بغیر بہت خاموشی سے یہاں آسکتا تھا۔ رازداری کے ساتھ یادیو سے مل کر اسے موقع پاتے ہی قتل کرکے فرار ہوسکتا تھا۔''

''کئی طریقے......'' کرشن نے میرے ہی لفظ کو میرے خلاف بطور طنز کا تیر استعمال کیا تھا۔

''ہاں کئی طریقے......'' میں نے الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔ ''جیسے کہ وہ کار کے ذریعے رات کی تاریکی میں سفر کرکے یہاں پہنچ سکتا تھا اور روپ بدل کر کھلے عام گھوم پھر بھی سکتا تھا۔ وہ اداکار ہے۔ مختلف کرداروں کا سوانگ بھرنے میں ماہر اور وہ اپنے کرداروں کو نبھانا بھی خوب جانتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے یہ سب کرنے میں کیا مشکل ہوسکتی تھی۔'' یہ کہہ کر میں نے جان بوجھ کر کچھ توقف کیا۔

میری بات سن کر کرشن سوچ میں پڑ گیا۔ ''میرے کلب میں بھی کچھ افواہیں گرم تھیں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''ایک دوست مجھ سے کہہ رہا تھا، یادیو نے اسے بتایا ہے کہ وہ کانپور میں اپنے بند کیے گئے کارخانے کو یہاں منتقل کرکے دوبارہ صنعتی پیداوار شروع کرنے کا سوچ رہا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کیا اور تھوڑا سوچنے کے بعد کہنے لگا۔ ''اگر وہ ایسا ہی کرنا چاہتا تھا تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر فلمی دنیا کے تھیٹر میں اپنا سرمایہ کیوں لگا رہا تھا۔ اسے صنعت ہی لگانی تھی تو پھر ممبئی میں وہ آرٹ کے سرپرست کے طور پر اپنا تشخص قائم کرنے کی کوشش کیوں کر رہا تھا۔''

''بات تو سچ ہے، سوال تو بنتا ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا اور بستر پر نیم دراز ہوگیا۔ کمزوری بڑھنے لگی تھی۔ آنکھوں کے سامنے ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ مجھے اپنے شہر سے بہت محبت ہے۔ اس کا قدرتی ماحول آلودگی سے پاک ہے۔ شہر کے بیچوں بیچ بہنے والا دریا صنعتی آلائشوں سے پاک ہے۔ ''جو ہوا، وہ اچھا ہوا۔'' میں نے زیرلب خودکلامی کی۔ ''اگر یادیو کا یہی منصوبہ تھا تو دریا کو آلودہ کرنے والے کے ہاتھوں سے کم از کم یہاں کا دریا تو مزید گندہ ہونے سے بچ گیا۔'' میں نے آنکھیں موند لیں۔ اتنی دیر باتیں کرکے ذہن تھک سا گیا تھا۔

کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ سٹنگ روم کا شیشے کا سلائڈنگ ڈور کھلا اور بند ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ کرشن تو نہیں چلا گیا مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت مہذب اور شائستہ مزاج کا انسان ہے۔ مجھے خدا حافظ کہے بغیر وہ نہیں جا سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ سمجھا ہو کہ میں سو گیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے دماغ پر دھند چھا رہی ہو۔ میں نے محسوس کیا کہ کمرے میں کچھ ایسا ہے جسے صرف میں ہی محسوس کر رہا ہوں۔ ''یہ بات کرشن کو بتانی چاہیے۔'' میں نے سوچا۔ بالکل ایسا ہی میں نے یادیو کی لاش دیکھنے سے کچھ دیر پہلے بھی محسوس کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ''کیا اب ایک اور لاش دیکھنے والا ہوں۔'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔ یہ سوچتے ہی مجھ پر جیسے کپکپی طاری ہوگئی ہو۔ اسی خوف کے عالم میں میرا دماغ تاریک ہوتا چلا گیا۔

آنکھ کھلی تو سٹنگ روم میں دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ ''تو کیا میں کل شام سے اب تک سوتا رہا ہوں۔'' یہ خیال آتے ہی میں جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔ واقعی میں جس حالت میں تھا، اسی میں سو گیا تھا۔ سائڈ ٹیبل پر سوپ کا ادھ بھرا پیالہ اب تک رکھا ہوا تھا۔

میں باتھ روم سے فارغ ہوکر کچن میں چلا گیا۔

شلپا سوئی ناشتا تیار کر رہی تھیں۔ ''گڈ مارننگ مسٹر شیام......'' وہ مسکرا کر بولیں۔ ''آجائیں ناشتا تیار ہے۔''

میں ڈائننگ ٹیبل پر گیا، کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ نہانے کے بعد دماغ اور جسم دونوں ہلکے پھلکے ہوگئے تھے...... [illegible] نہیں ہو رہی تھی۔

یہ لو۔'' انھوں نے میرے سامنے ناشتا رکھا۔ ''آملیٹ اور فرنچ ٹوسٹ۔'' میری طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے اب تمہارا پیٹ بالکل ٹھیک ہوگیا ہوگا۔ کمزوری دور کرنے کے لیے انڈا ضروری ہے۔'' یہ کہتے ہوئے دودھ کا گلاس بھی سامنے رکھ دیا۔

ناشتے کے بعد گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا آٹھ بج رہے تھے۔ موتی سنگھ وقت کا بہت پابند تھا۔ اس نے ریہرسل کے لیے نو بجے بلایا تھا۔ ''وقت بہت کم ہے۔'' میں خود کلامی کرتے ہوئے اٹھا۔ ''تھینک یو موسی جی۔'' اور یہ دیکھے بغیر کہ کرشن ابھی گھر پر ہے یا نہیں، کچن سے سیدھا باہر نکل آیا۔

جب جم پر پہنچا تو موتی سنگھ پہلے سے ہی وہیں موجود تھا۔

مجھے نظر پڑتے ہی مسکرایا۔ ''امید ہے آج تمہاری طبیعت بالکل ٹھیک ہوگی۔ ہمیں پورا دن ریہرسل کرنی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سیاہ تھیلا نیچے رکھ کر اس میں سے اسکرپٹ فائل نکالی۔ ''چلو شروع کرو۔ ایکٹ نمبر دو، سین پہلا۔''

جولی اور دوسرے ساتھی فنکاروں کی آمد سے پہلے ہی میں اپنے سین کا بڑا حصہ مکمل کر چکا تھا۔ موتی سنگھ بدستور پریشان ہو رہا تھا۔ میری پوری ریہرسل کے دوران وہ بار، بار کرسی پر پہلو بدلتا رہا۔

تھوڑی دیر میں، باقی کے فنکار بھی اس کے سامنے کھڑے تھے۔ موتی سنگھ نے گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر ان کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولنے لگا۔ ''کل کتنی تاکید کی تھی کہ سب وقت پر پہنچ جانا لیکن اس کے باوجود شیام کے سوا سب لیٹ آئے ہیں۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔'' وہ بڑی رکھائی سے بول رہا تھا۔ ''تمہارے لیے یہ صرف ایک ڈراما ہوسکتا ہے لیکن میرے لیے یہ اس سے بھی کہیں بڑھ کر ہے، اس لیے پلیز......'' اس نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

جولی نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''لیکن ابھی تو نو بجے ہیں اور ہم سب موجود ہیں۔ ہمیں نو بجے شروع کرنا تھا اور سب تیار ہیں ریہرسل کے لیے۔'' یہ کہہ کر چند لمحے خاموش رہی۔ ''ہمیں باتیں سنانے سے بہتر ہے کہ اپنی گھڑی کا ٹائم درست کرلو۔'' اس کا لہجہ شکایتی تھا۔

موتی سنگھ نے جھلائے انداز میں ہاتھ جھٹکا۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' لگتا تھا کہ اس نے بچے ہوئے اداکاروں کے جولی کے جملے کو سن لیا تھا۔

اسی دوران موتی سنگھ کا موبائل فون بج اٹھا۔ ''ہیلو......'' وہ بولا۔ ''میں تمہیں ریسٹورنٹ میں ملوں گا دوپہر میں...... ہاں... نہیں، نہیں...... دیر ہو تو آنے کی زحمت ہی مت کرنا۔'' وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔ ''اوکے...... گڈ بائے۔'' اس نے فون بند کر کے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

وہ ہماری طرف مڑا تو میں نے بھویں چڑھا کر اشارے میں پوچھنا چاہا کہ کون تھا لیکن اس نے نظر انداز کر دیا۔ میرے اندر موجود حسِ سراغرسانی چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ ضرور فون کرنے والی عورت یادیو کی بیوہ ہی ہوگی۔ میں موتی سنگھ سے اس خیال کی تصدیق چاہتا تھا لیکن اس نے ایسا کوئی موقع ہی نہیں دیا کہ میں کچھ پوچھ سکتا۔

''ٹھیک ہے......'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیگ کا تھیلا کھول کر کاغذات کا ایک پلندا باہر نکالا۔ ''ایکٹ ون پر پہلے میرے نوٹس سن لیں۔''

موتی سنگھ سامنے بیٹھے اداکاروں کو ایکٹ سے متعلق سمجھا رہا تھا کہ اس کا موبائل فون ایک بار پھر بج اٹھا۔ فون اٹھا کر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا۔ میں اسے غور سے دیکھے جا رہا تھا۔ کالر آئی ڈی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر سخت پریشانی کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ اگر کہوں کہ اس کا منہ فق ہوگیا تھا تو یہ کچھ زیادہ غلط نہ ہوگا۔

''پولیس کا فون ہے۔ ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے فون اٹینڈ کر کے کانوں سے لگایا اور اس طرف بڑھنے لگا جہاں دور تک کوئی نہ تھا۔

اسے جاتا دیکھ کر جولی نے مجھے کہنی ماری۔ ''یہ کل رات سے چل رہا ہے۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے معاملہ بہت خراب نظر آرہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے موبائل فون نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ وہ ایک میسج تھا۔ ''جولی، پیاری جولی...... کیا تم جانتی ہو کہ اب تمہارے دن گنتی کے ہی رہ گئے ہیں۔''

میں درست لیکن کرشن غلطی پر تھا۔ یادیو کو راجندر نے ہی قتل کیا تھا۔ اب وہ موتی سنگھ کے بعد ہمارے تھیٹر کی سب سے اہم شخصیت جولی کو دھمکا رہا تھا۔ اس ڈرامے میں جولی پہلے راجندر کے ساتھ مرکزی کردار ادا کرنے والی تھی اور وہ اب اُسی کو دھمکانے پر اتر آیا تھا۔ میں تیزی سے بہت سارے زاویوں پر سوچ رہا تھا۔ جولی کو ملنے والا دھمکی آمیز پیغام کم از کم میرے لیے سنگین تشویش کا سبب تھا۔ ''کیا وہ

پاگل ہوگیا ہے۔''میں زیرلب بڑبڑایا۔ ان میں باتوں کی الجھن، الجھن کے درمیان کسی نے یقیناً میری بڑبڑاہٹ نہیں سنی ہوگی۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور جولی کا ہاتھ پکڑا۔ ''چلو...... ہمیں فوراً پولیس کے پاس جاکر سب کچھ بتانا ہوگا۔ تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ تمہیں پولیس پروٹیکشن کی اشد ضرورت ہے۔''

یہ سن کر جولی چند لمحوں تک مجھے دیکھتی رہی اور پھر بڑے پیار سے میرا ہاتھ سہلاتے ہوئے بولی۔ ''شیام تم کس بارے میں بات کررہے ہو؟ یہ صرف راجندر کی بیمار حس مزاح ہے اور کچھ نہیں۔ یہ میسج لکھتے وقت وہ بہت زیادہ نشے میں ہوگا اور کچھ نہیں......'' یہ کہہ کر میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''پلیز...... تم فکر نہ کرو۔ ایسا کچھ بھی نہیں۔''

''نہیں......'' میرا لہجہ سخت تھا۔ ''تم نہیں جانتی ہو، وہ بہت خطرناک ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اسی نے قتل کیا ہے اور اب وہ تمہیں......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

یہ سن کر جولی زور سے ہنسی۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو۔ یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''یونا میں بے شمار... یادیو کو یہاں کیسے قتل کرسکتا ہے۔'' یہ کہہ کر مجھے بازو سے کھینچا۔ ''چلو بیٹھ جاؤ۔ لگتا ہے یادیو کی لاش دیکھنے سے تمہارے دماغ پر بڑا اثر پڑا ہے۔ لگتا ہے تم اب تک اس صدمے سے باہر نکل نہیں سکے ہو۔'' اس کے لہجے سے پیار امڈ رہا تھا۔

''تم یقین کرو۔'' میں نے اٹل لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''ہرگز یہ مذاق نہیں۔ یادیو کو راجندر نے ہی قتل کیا ہے۔''

جولی پھر ہنسی۔ ''شیام...... وہ یونا میں اپنے فارم ہاؤس پر ہے۔ دور بیٹھا ہوا ہے۔ ایک بڑا آدمی ہے، دنیا میں اس کا نام ہے۔ وہ کس طرح قتل کرکے خود کو پھنسانا چاہے گا۔'' اس کا لہجہ نہایت سنجیدہ تھا۔ وہ کوشش کررہی تھی کہ کسی طرح میں اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال پھینکوں۔ ''چلو بیٹھو۔''

میں شکست خوردہ انداز میں اس کے برابر بیٹھا تھا لیکن کسی طور یہ باور کرنے کو تیار نہ تھا کہ یادیو کے قتل میں راجندر کا کوئی لینا دینا نہ تھا۔ میری نظر میں وہ بدستور اس کا قاتل تھا۔

کچھ دیر بعد مونی سنگھ لوٹا اور ایک بار پھر ہم ریہرسل میں مصروف ہوگئے۔ ''اچھا...... تو ہم کہاں تھے شیام۔'' میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہاں یاد آیا۔ اس

معالج

مرزا بہت دنوں سے بے روزگار تھے اور سخت پریشان بھی۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنا مطب کھول لیں۔ مرزا بولے کہ وہ طب یا حکمت کی ابجد بھی نہیں جانتے، اس پر دوستوں نے تسلی دی کہ شہر کے ہزاروں اشتہاری طبیب کچھ نہ جاننے کے باوجود خوب مال کما رہے ہیں۔ مرزا نے نیم دلی سے گھر کے ایک کمرے میں مطب کھول لیا۔ شیشے کی چند بوتلوں میں رنگا رنگ پانی بھر کر باہر بورڈ لگا دیا۔ چند روز سناٹا رہا۔ مشاورت ہوئی پھر ایک بینر کا ظہور ہوا جس پر درج تھا۔ ''ہر مرض کا شرطیہ علاج۔ فیس پانچ سو...... فائدہ نہ ہو تو ہزار روپے دوں گا۔'' یہ مضمون کام کر گیا۔ دھندا چل نکلا۔ حیلے بہانوں سے اپنے ہزار بچا کر مرزا پانچ سو کی کس ڈکارتے رہے۔

ایک قریبی نیم حکیم کو ان کا یہ دھندا پسند نہیں آیا کیونکہ اس کا کام چوپٹ ہورہا تھا۔ ایک روز وہ مرزا کو چونا لگانے کا مصمم ارادہ کرکے ان کے نام نہاد مطب پر پہنچا اور اپنی زبان کا ذائقہ ختم ہوجانے کی شکایت کی۔ مرزا نے اسے کسی مولیشی کی طرح خوب جانچا پرکھا پھر آواز لگائی۔ ''بیگم...... 18 نمبر دوا دینا۔'' اندر سے ان کی بیگم نے شیشی پکڑائی۔ مرزا نے گلاس میں دوا گھول کر حکیم صاحب کو دی۔ انہوں نے پیتے ہی برا سا منہ بنایا۔ ''یہ کیا...... یہ تو مٹی کا تیل ہے!'' مرزا اچھل پڑے۔ ''ذائقہ لوٹ آیا...... نکالو پانچ سو روپے!'' حکیم جی بہت جھنائے، پانچ سو کا خسارہ ان کے لیے روگ بن گیا۔ کچھ دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اپنی یادداشت میں خرابی کا شکوہ لے کر پھر مرزا کے پاس پہنچے تاکہ ہزار روپے وصول کرکے اپنا خسارہ پورا کرسکیں۔ مرزا نے معائنے کے بہانے پھر ان کی درگت بنائی اور پرانی ہانک لگائی۔ 18 نمبر سنتے ہی حکیم جی بے اختیار بول اٹھے۔ ''18 نمبر تو وہی مٹی کا تیل ہوگا، ذائقے والا۔'' مرزا جیت گئے۔ ''دیکھا! یادداشت بھی لوٹ آئی۔'' اب خسارہ ہزار کا ہوگیا۔ حکیم جی نے عہد کرلیا کہ اب وہ مرزا کے داؤ میں نہیں آئیں گے۔ اندھے بنے رہیں گے۔ وہ اپنی بینائی ضائع ہونے کی شکایت لے کر پہنچے۔ مرزا نے ان کی آنکھوں میں انگلیاں مارنے کے بعد مایوسی سے کہا۔ ''تمہارا علاج میرے پاس نہیں ہے...... یہ لو ہزار روپے!''

''بے ایمان!'' حکیم جی تڑپ کر بولے۔ ''اندھا سمجھ کر سو روپے کے نوٹ کو ہزار کہہ رہا ہے۔''

''خوب...... بینائی بھی لوٹ آئی۔ نکالو پانچ سو۔'' مرزا نے سو کا نوٹ حکیم جی سے جھپٹ لیا۔

کراچی سے نہال خرم کا تعاون

نے ایک پیپر کھولا اور نکات بیٹھے ہوئے ایک پیر کا۔ یہ دیکھو..... اس نے اسکرپٹ میری نگاہوں کے سامنے کیا۔

''اس مقام پر تمہیں دبنگ لہجے میں یہ ڈائیلاگ بولنا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پڑھ چکا ہوں اور اس ڈائیلاگ کی تین بار ریہرسل بھی کی ہے۔'' اس کی حالت بتارہی تھی کہ ذہنی طور پر وہ شدید انتشار کا شکار ہے۔

''او کے..... تم اپنی تیاری جاری رکھو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ ایک دوسرے اداکار کی طرف بڑھ گیا۔

ہم سب تن دہی سے ریہرسل میں مصروف تھے، اسی دوران چائے کا وقفہ ہوگیا۔ میں شدید تشویش کا شکار تھا۔ اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ دوپہر کو لنچ پر کس سے ملنے والا ہے، پولیس نے کیوں فون کیا تھا مگر لاکھ کوشش کے باوجود ایسا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ سوا بارہ بج رہے تھے جب موتی سنگھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تنہا جم سے باہر نکل گیا۔ میں مایوسی سے اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

جولی کو ملنے والا پیغام دیکھنے کے بعد بڑھنے والی میری بے چینی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اگرچہ وہ اسے مذاق سمجھ رہی تھی لیکن میری نظروں میں وہ سنجیدہ دھمکی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن لگ رہا تھا کہ کرشن کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کرسکوں گا۔ ویسے بھی پوری زندگی میں نے تن تنہا صرف اداکاری کی ہے، کرشن کی مدد کے بغیر بھی کچھ نہیں کیا تھا۔ میرا ذہن راجندر کے بے گناہ ہونے کو تیار ہی نہ تھا۔

لنچ بہت عمدہ تھا۔ کبھی کبھی مجھے بہت رشک آتا تھا کہ قدرت نے جولی کو کتنی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ بہترین سنجیدہ اداکار، بہترین منتظم، بہترین مزاحیہ اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین میزبان تھی، اسے لوگوں کی پسند یا ناپسند کو سمجھنا آتا تھا۔ ریہرسل پر آرڈر کیا جانے والا کھانا اس نے اپنی مرضی سے منگایا تھا لیکن وہاں موجود کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس میں اس کی پسند کی کوئی چیز نہیں۔ ''شکریہ جولی.....'' میں کھانے کی پلیٹ بھر کر پلٹا تو سامنے وہ نظر آگئی۔

''جی بھر کے کھاؤ.....'' وہ پیار بھرے انداز میں مسکرائی۔ ''دیکھا تمہارے پسندیدہ سینڈوچز بھی منگوانا نہیں بھولی تھی۔'' اس نے میری پلیٹ میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا تھا..... شکریہ خوب صورت آنکھوں والی جولی۔'' میں نے رومینٹک انداز میں کہا۔

''خدا کا شکر ہے تم راجندر کے زیراثر سے تو نکلے۔'' میں مسکرا دیا۔

اکتانے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ..... کمل کی طرف بڑھ گئی۔

سہ پہر تک اس دن کی ریہرسل مکمل ہوگئی۔ نئی اور صبح کے مقابلے میں موتی سنگھ خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے نہ صرف کام میں بھرپور دلچسپی ظاہر کی بلکہ فنکاروں کے ساتھ بھی اچھے رویے سے پیش آتا رہا۔ میرے لیے یہ خوشگوار تبدیلی تھی لیکن جو حالات درپیش تھے، ان میں کچھ، کچھ عجیب بات بھی لگ رہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ صبح جو اس کا مزاج تھا اور اب جو رویہ ہے، اس میں اتنی جلدی تبدیلی کی وجہ کیا ہوسکتی ہے۔ کیا پولیس نے اسے شک کے دائرے سے نکال دیا یا پھر کچھ اور بات ہے۔ لاکھ ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود اس وقت کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے اسکرپٹ فائل بیگ میں رکھتے ہوئے سب کو مخاطب کیا۔ ''آج بہت اچھا کام ہوا، کل بھی اسی جذبے سے کام کریں گے۔'' وہ مطمئن ہدایت کار کی طرح بول رہا تھا۔ ''تو کل آج ٹھیک نو بجے دوبارہ یہیں ملیں گے۔''

''مگر تم اپنی گھڑی کا وقت ٹھیک کرلینا۔'' کسی نے بیچ میں لقمہ دیا۔ ''ورنہ تاخیر کا ریکارڈ بناؤ گے۔''

موتی سنگھ نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اپنا سیاہ تھیلا اٹھا کر کندھے سے لٹکایا اور باہر نکل گیا۔

میں نے جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹیں اور اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے باہر نکلا۔ اگرچہ دوپہر کو لنچ پر وہ یادو کی بیوی کے ساتھ تھا لیکن ان کے درمیان ایسی کیا بات چیت ہوئی جو صبح کو بیزار اور غائب دماغ نظر آنے والا موتی سنگھ واپسی پر اس قدر خوش مزاجی سے پیش آرہا تھا، کام میں بھی اس کی پوری دلچسپی قائم تھی۔ میں اس سے مل کر یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ صبح پولیس نے اسے کیوں فون کیا تھا۔ ان سے کیا بات چیت ہوئی تھی۔ جیسے ہی میں باہر سڑک پر پہنچا، وہاں موتی سنگھ کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ میں نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک کلومیٹر آگے تک گیا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر میں نے کرشن کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ گھر پہنچا تو وہ اپنی اسٹڈی میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

''آؤ آؤ..... بڑی لمبی عمر پائی ہے تم نے۔ ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔'' کرشن نے بڑے خلوص سے اپنی عادت کے مطابق مجھے گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔

''میں بھی کچھ منطقی بات ہی کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے کرسی پر بیٹھا اور پھر سونی سنگھ کے بدلتے مزاج، پولیس کا فون، بیچ پر جانے، جولی کو ملنے والے دھمکی آمیز میسج سمیت تمام تر تفصیلات اور جزئیات سمیت اس کے گوش گزار کرنے لگا۔

وہ بڑے تحمل اور پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔ بات مکمل ہونے کے بعد کرشن کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''تم بتا رہے تھے کہ تمہاری دوست جولی اس میسج کو سنجیدگی سے نہیں لے رہی ہے؟'' اس کے چہرے پر خاصی سنجیدگی طاری تھی۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اس کا خیال ہے کہ وہ مذاق ہے۔ یہ میسج راجندر نے نشے کی حالت میں بھیجا ہوگا۔''

وہ خاموشی سے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر کچھ دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ''تمہاری دوست شاید ٹھیک ہی کہتی ہے۔'' اس نے لیپ ٹاپ میری طرف گھمایا اور انگلی سے اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

یہاں ایک ٹی وی چینل کی بریکنگ نیوز تھی۔ ''معروف اسٹیج اداکار راجندر نشے سے چھٹکارا پانے کے لیے بحالی مرکز میں داخل۔''

میری نظریں اسکرین پر جمی تھیں۔ خبر کسی حد تک یہ ثابت کرتی تھی کہ وہ بظاہر یادیو کے قتل میں ملوث نہیں مگر نہ جانے کیوں یہ بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ خبر کی تفصیلات میں بتایا گیا تھا کہ معروف فلم ڈائریکٹر سبھاش یوگی نے اپنی اگلی فلم کے مرکزی کردار میں راجندر کو کاسٹ کیا تھا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی تھی کہ شوٹنگ شروع ہونے سے قبل ہی اسے بے تحاشا شراب پینے اور دوسرے نشوں کی لت سے چھٹکارا پانا ہوگا۔ اسی لیے وہ بحالی مرکز میں داخل ہوا ہے۔

ایک بم میرے دماغ میں بجلی کوندی۔ ''سنو کرشن......'' میں نے بڑے جوش سے کہا۔ ''سارا معاملہ صاف ہوچکا۔''

کرشن نے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر چکی تھیں۔

''بات یہ ہے کہ شوٹنگ زیادہ تر بیرون ملک ہونی ہے۔ اسے ایک تو ممبئی سے باہر رہنا ہوگا۔ ڈراما سائن کرچکا تھا لیکن اس کے لیے ڈرامے سے زیادہ یوگی جیسے شہرت یافتہ ڈائریکٹر کی فلم اہم تھی۔ اسی لیے وہ خفیہ طور پر یادیو سے بھی پہنچا، یادیو سے ملا اور فلم کے لیے بحالی مرکز میں داخل ہونے کا بتایا ہوگا۔'' میں جوشیلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''اب اس کے پاس بحالی مرکز اور شوٹنگ کے درمیان بالکل بھی وقت بچا نہ ہوگا۔ اس نے یادیو سے کہا ہوگا کہ وہ کھیل چھوڑنا چاہتا ہے اور وہ اسے روکنے کے لیے بلیک میل کر رہا ہوگا۔''

''لیکن پہلے تم یہ بھی کہیں کہہ چکے ہو کہ یادیو یہ بھی چاہتا تھا کہ راجندر ڈرامے سے علیحدہ ہو؟'' کرشن نے میری بات بیچ میں کاٹی۔

''بالکل ٹھیک ....'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''دراصل یادیو ہی راجندر کو لایا اور وہی یہ چاہتا تھا کہ جب ڈراما شروع ہو تب وہ اس میں شامل نہ ہو۔ وہ عین وقت پر اس کی علیحدگی چاہتا تھا لیکن راجندر وقت سے پہلے علیحدہ ہو رہا تھا۔ ایسے میں سونی سنگھ کے پاس بھی متبادل انتظام کے لیے کوئی وقت بچتا تھا۔ وہ میڈیا کے ذریعے یہ وضاحت کرسکتا تھا کہ راجندر کیوں علیحدہ ہوا۔ شاید لوگ اس کی بات مان لیتے اور شو فلاپ نہ ہوتا۔ اگر شو فلاپ نہ ہوتا تو پھر یادیو کا منصوبہ فلاپ ہوتا ہی تھا۔'' یہ کہہ کر میں نے کرشن کی طرف غور سے دیکھا۔ ''اب بھی دیکھ لو کہ یادیو تھیٹر کے بورڈ میں ضرورت سے زیادہ حصہ مانگ رہا تھا۔ شو کامیاب ہونے کا مطلب ہوتا کہ بورڈ پر گرفت سونی سنگھ کی ہی رہتی۔'' یہ کہہ کر میں مسکرایا۔

''جیسا تم کہہ رہے ہو، اگر سب ویسا ہے تو صورت حال بڑی گمبھیر اور پیچیدہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے کرشن واقعی بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

اس وقت یادیو کے باتیں راجندر کے بلیک میل ہونے کی بات نہیں کی تھی۔ اگر وہ یہ بھی شامل کر دیتا تو صورت حال مزید پیچیدہ نظر آتی۔ کرشن اور میرے درمیان اب تک یادیو کی باتیں اور اس کے حرکات کے حوالے سے تمام تر گفتگو قیاس، اسپیکولیشن اور امکانات پر انحصار کرتی تھی۔ تھوڑا آگے ہوا اور کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر کرشن کی جانب سر جھکایا۔ ''میرا خیال ہے کہ یادیو کے نہ ماننے پر راجندر کو بھی صورت حال اپنے خلاف جاتی لگی ہوگی۔ شاید گمبھیر سچویشن سے چھٹکارے کے لیے اس نے جان چھڑانا ہی مناسب سمجھا اور موقع محل دیکھتے ہوئے خاموشی سے قتل کیا اور نو دو گیارہ ہوگیا۔ جس رازداری سے آیا ہوگا، اسی طرح خاموشی سے واپس اپنا چلا گیا۔ کسی کو کانوں کان کچھ پتا نہ چلا اور یوں راجندر صاف بچ گیا۔ اگر پتا بھی چل جاتا تو ٹی وی کی یہ خبر ہے نا، بحالی مرکز والی۔'' لیپ ٹاپ کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر کے لیے ہمارے درمیان بات شروع ہوئی۔ ''پکا کام

کر گیا۔ وہ سانپ بھی مر گیا، بڑا اٹھی بھی نہ ٹوٹی۔“ یہ کہہ کر میں نے گہری سانس لی۔

کرسی کی پشت سے سر ٹکائے کرشن کچھ دیر گہری سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر گردن سیدھی کر کے میری طرف دیکھا۔ ”ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے، جس پر یادیو اُسے بلیک میل کر رہا ہوگا۔“ اس نے پوچھا۔

میں خاموش رہا۔

”ممکنہ طور پر ایسا کیا ہو سکتا ہے جس کا دنیا کو تو کوئی علم نہیں مگر یادیو اُس بات سے آگاہ تھا اور وہ اتنی اہم بات تھی کہ آخر راجندر کو اس سے گلوخلاصی کی صرف ایک ہی صورت نظر آئی۔“ مجھے خاموش پا کر کرشن نے کہنا شروع کیا۔ ”وہ ہجوم میں رہنے والی مشہور شخصیت ہے۔ وہ جہاں جاتے، کیمرے کی نگاہیں اس پر لگی ہوتی ہیں۔ اخبار والے اس کی معمولی سے معمولی بات کی بھی ٹوہ سونگھتے پھرتے ہیں لیکن حیرت ہے کہ یادیو کے ہاتھوں وہ جس بات پر بلیک میل ہو رہا ہوگا، اُسے تو چھوڑو، اس کے ساتھ تعلقات کی بھنک بھی کسی صحافی کو نہیں پڑی ورنہ تو جیسا انٹرنیٹ پر ساتھی یہ دو نمبری صحت کار کے ساتھ ایک اداکار کے گہرے تعلقات...... خبر تو بنتی ہے نا۔“

کرشن خاموش ہوا۔ شاید وہ میرا ردِعمل بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں خاموش بیٹھا رہا۔

”اگرچہ عام طور پر اس کا رویّہ بہت بُرا ہوتا ہے لیکن پھر بھی......“ کرشن نے ہونٹ بھینچ کر سانس لی اور کنپٹی کو انگلی سے دباتے ہوئے ایک بار پھر بات شروع کی۔ ”میرا خیال ہے کہ اس کے بارے میں شاید ایسی کوئی بات نہیں جسے دنیا پہلے سے نہ جانتی ہو۔“

میں، کرشن کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں نے دلیل کے بغیر یادیو کے ہاتھوں راجندر کے بلیک میل ہونے کا خدشہ ظاہر کیا تھا وہ بھی ایک روز پہلے لیکن اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ جب تک منطقی جواز تلاش نہیں کر لیتا، کبھی اس امکان کو تسلیم نہیں کرے گا۔ وہ منطق کے بغیر بات تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، اس کی رائے ایک طرف لیکن میں اپنے شک سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ ہم دونوں اپنی، اپنی جگہ خاموش بیٹھے تھے۔ میں نے کرشن کی رائے سے اتفاق نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور جیسے ہی کچھ بولنا چاہا، اس کے لینڈ لائن فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو......“ کرشن نے فون اٹھایا اور جیسے ہی اگلے کی بات سنی، اس کی بھنویں چڑھ گئیں۔ ”نہیں، نہیں...... مجھے نہیں لگتا کہ میرا کزن اس کردار میں دلچسپی رکھتا ہوگا۔“ اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”ہرگز نہیں...... اس کا تو میں تصور تک نہیں کر سکتا۔ تم اس سے خود ہی بات کیوں نہیں کر لیتے۔“ یہ کہہ کر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا۔ ”رپورٹر......“ اور ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

”راجندر نے موتی سنگھ کے جس کردار کو چھوڑا ہے تو کیا اب وہ آپ کرنے جا رہے ہیں، سنا ہے کہ اس کھیل سے راجندر کو آپ نے ہی الگ کروایا ہے۔“ ہیلو سنتے ہی رپورٹر نے سانس لیے بنا ہی سوال جڑ دیے۔ اس نے اپنا تعارف تک کرانے کی زحمت نہ کی۔ ”کیا آپ یہ کردار نبھا سکیں گے؟“

میں تھیٹر کے بہت سے نقادوں کو جانتا تھا۔ شوبز اور جرائم کی رپورٹنگ کرنے والے کئی صحافیوں سے بھی تعلقات ہیں لیکن فون کرنے والے کی آواز پہلی بار سن رہا تھا۔ اس نے راجندر کو کھیل سے الگ کروانے کا جو الزام مجھ پر لگایا تھا، اسے سن کر تو میرا خون ہی کھول اٹھا۔ ”یہ کردار راجندر نے خود چھوڑا ہے، میرا اس سے لینا دینا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس کردار میں میری کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے تو موتی سنگھ کی دوستی پر اپنی قیمت ادا کر کے یہ کردار کرنے کی حامی بھری ہے ورنہ تو......“ میں رپورٹر کو چھیدوں پر بل اسٹیشن جانے کا پروگرام کینسل کرنے کے بارے میں بتانا ہی چاہتا تھا کہ اس نے قطع کلامی کی۔

”میں نے تو یہ سنا ہے کہ آپ نے راجندر کو کھیل سے باہر کر کے یہ کردار حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ کوششیں کی تھیں؟“

”کس نے کہا ہے یہ......“ میرا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ ”اور مسٹر...... ذرا یہ بتاؤ تم خود کون ہو؟“ میرے لہجے سے اندر کا غصہ ابل رہا تھا۔

”شاید آپ نے میرا بلاگ پڑھا ہو، برائٹ لائٹس ممبئی۔“ اس نے نام بتانے سے گریز کرتے ہوئے جواب دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اس طرح کے مرچ مسالے والے کچھ بلاگ عام طور پر چٹخارے کے لیے سوشل میڈیا پر ضرورت سے زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور پھر سچ ہو یا جھوٹ، اس سے قطع نظر چٹ پٹی خبریں شائع کرنے والے اخبارات گپ بازی پر مشتمل اس طرح کے بلاگز کو خبر کا ذریعہ ظاہر کر کے ایسی ایسی باتیں شائع کر دیتے ہیں کہ جس کی خبر متعلقہ شخص کے فرشتوں تک کو نہیں ہوتی لیکن عام لوگ اسے

نہایت سنجیدگی سے قبول کر لیتے ہیں۔ مجھے بھی فون کرنے والے شخص کا بلاگ کچھ اسی طرح کا لگا تھا۔

''میں پھر وہی کہوں گا، یہ کس نے کہا ہے کہ راجندر کو میں نے ڈرامے سے نکلوایا ہے۔''

''سوری سر! میں اپنی خبر کا ذریعہ نہیں بتا سکتا اور نہ ہی آپ مجھ سے یہ جاننے کا حق رکھتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''میں نے تو صرف تصدیق کے لیے فون کیا ہے نہ کہ اپنی خبر کا ذریعہ بتانے کے لیے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اس خبر کی تصدیق نہیں کرتا۔ میں نے اسے نہیں نکلوایا۔ وہ ایک بڑی فلم میں اہم کردار کی وجہ سے خود ڈراما چھوڑ کر گیا۔ اگر تم واقعی ایک رپورٹر ہو تو پھر یہ بات تمہارے علم میں ہونی چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے میرے لہجے سے طنز نمایاں تھا۔

مجھے جواب کے بجائے ایک کلک سنائی دی۔ فون کٹ گیا تھا۔ ریسیور رکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری انگلیاں ٹھنڈی پڑ رہی تھیں۔ بنا کسی قصور کے میرا نام، شہرت اور بے داغ کردار پر انگلیاں اٹھ رہی تھیں اور میں اسے روکنے کے لیے خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہا تھا۔ نئے شروع ہونے والے تھیٹر کے پہلے ڈرامے میں نہایت جاندار مرکزی کردار ادا کرنے جا رہا تھا۔ ڈرامے میں میرا کردار ایک ایسے شخص کا تھا جو سماج میں نیک نامی رکھتا ہے لیکن اسے قتل کے ایک جھوٹے مقدمے میں پھنسا دیا گیا تھا۔ دو دن ریہرسل کے بعد اب خود کو اس کردار میں کسی حد تک ڈھال چکا تھا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی میری حقیقی زندگی کو جھوٹے الزام کی زد میں لا کر مجھ پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے۔ میں واقعی بہت پریشان تھا۔ اس فون کال نے دماغ کو منتشر کر دیا تھا۔ مجھے ٹھنڈے پسینے چھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سخت ٹینشن میں تھا۔ شاید اسی لیے ایک بار پھر پیٹ میں ہلکی ہلکی اینٹھن اٹھنے لگی۔

''شیام......'' مجھے خاموش دیکھ کر کرشن نے پکارا۔ ''کون تھا وہ رپورٹر؟''

''وہ رپورٹر نہیں بلاگر تھا۔''

کرشن نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''برائٹ لائٹس ممبئی کا بلاگر۔'' میں نے وضاحت کی۔ ''اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔ میں اس بلاگ کا نام بھی پہلی بار سن رہا تھا۔''

تجربہ

نفسیات کی کلاس میں عملی تجربہ کیا جا رہا تھا۔ ایک چوہے کے سامنے چاول رکھے گئے اور نزدیک ہی ایک چوہیا بٹھا دی گئی۔ چوہے کو چھوڑا گیا تو وہ سیدھا چاولوں کی طرف لپکا۔ پروفیسر نے مسکرا کر اپنے شاگردوں سے کہا۔ ''دیکھا تم نے... اس تجربے سے ثابت ہوا کہ بھوک جنس سے زیادہ طاقت ور ہے۔''

دوسری مرتبہ پروفیسر صاحب نے چاولوں کی جگہ باجرہ رکھ دیا اور وہی عمل دہرایا۔ اسی طرح پروفیسر نے تین چار مرتبہ مختلف اقسام کی اشیا چوہے کے سامنے ڈالیں۔ وہ ہر دفعہ کھانے کو ہی دوڑا۔ چوہیا پر توجہ نہ دی تو پروفیسر نے بڑے متانت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ تجربات ثابت کرتے ہیں کہ بھوک کی خواہش ہر جذبے پر غالب ہوتی ہے۔''

ایک لڑکے نے اٹھ کر کہا۔ ''سر! ایک مرتبہ چوہیا بدل کر بھی دیکھ لیں!''

بے خبر

ایک اجاڑ اور ٹوٹی پھوٹی عمارت کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک صاحب نے ایک زرد رو راہ گیر سے پوچھا۔ ''سنا ہے اس کھنڈر نما عمارت میں مدتوں سے بدروحیں رہتی ہیں۔''

زرد رو شخص بے زاری سے بولا۔ ''پتا نہیں، آپ کسی اور سے پوچھ لیں۔ مجھے تو مرے ہوئے صرف تین سال ہوئے ہیں۔''

لاہور سے انجم خان کی ناراضی

''کیا یہ چھوڑ رہا تھا؟''

جواب میں ساری بات تفصیل سے اس کے گوش گزار کر دی۔

کرشن کی پیشانی پر بھی بل پڑ چکے تھے۔ ''خیر...... پریشان مت ہو اور جب تک یہ معاملہ چل رہا ہے، تم یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

دوسرے دن صبح میں شلپا موتی کے بنائے ہوئے ناشتے کو مائیکرو ویو اوون میں گرم کر کے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ رہا تھا کہ کرشن بھی کچن میں آ گیا۔

''گڈ مارننگ......'' اس نے اورنج جوس جگ سے گلاس میں انڈیلا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''کیسے ہو؟'' میں بھی اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

''بہت اچھا......''

ابھی پہلا ہی لقمہ لیا تھا کہ کرشن بولا۔ ''نہایت بری خبر ہے ایک اور اداکار قتل ہو گیا ہے۔''

''کیا......'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جولی......

میں نے کہا بھی تھا کہ اسے پولیس پروٹیکشن کی ضرورت ہے۔" لاش کا سن کر میں تخت پریشان ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں جولی کا دلکش چہرہ اور پرکشش سراپا گھوم رہا تھا۔

"اطمینان رکھو......" کرشن اٹھا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "جولی خیریت سے ہوگی۔"

"او، خدایا...." میں نے پانی کا گلاس اٹھایا اور کرشن کی طرف دیکھا۔ "پھر تم کس کی بات کر رہے تھے، کس کی لاش ملی ہے۔"

"شیلا یادیو......"

"یادیو کی بیوہ......" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

کرشن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کرشن کا کہنا تھا کہ علی الصباح پولیس کو شہر کے مضافاتی علاقے سے گزرنے والی سڑک کے کنارے بظاہر حادثے کا شکار ایک کار ملی ہے۔ جس کے اندر ایک عورت کی لاش تھی۔ پولیس کے مطابق وہ شیلا یادیو کی لاش ہے۔ اگرچہ اسے حادثہ قرار دے رہی ہے لیکن ساتھ ہی اس کا کہنا ہے کہ اتنی جلدی کوئی حتمی رائے قائم کرنا مشکل ہے تا وقتیکہ تفتیش مکمل نہ ہو جائے اور اس کی بنیاد پر کوئی حتمی رائے قائم نہ ہو۔

کرشن کا یہ بھی کہنا تھا کہ اس نے اپنے چند ذرائع سے رابطہ کیا ہے تا کہ کچھ پتا چل سکے کہ حقیقت کیا ہے لیکن اب تک انہوں نے کوئی اطلاع نہیں دی ہے۔ "پولیس کا بیان اپنی جگہ لیکن مجھے یہ حادثہ نہیں لگتا، چاہے کتنا ہی یہ حادثہ ہو مگر نہ جانے کیوں میں اسے تسلیم نہیں کر پا رہا ہوں۔" اس کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچا ہے۔

ہم دونوں خاموشی سے ناشتا کر رہے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ میری طرح کرشن بھی اسی واقعے پر سوچ بچار کر رہا ہوگا۔

یادیو کی موت سیدھا سادہ قتل تھا لیکن میں شرط لگا سکتا تھا کہ شیلا بھی حادثے کا شکار نہیں ہوئی۔ میری خواہش تھی کہ کرشن کے ذرائع سے شیلا کے بارے میں ملنے والی خبر سن کر ہی جاؤں لیکن گھڑی پر نظر پڑی تو ساڑھے آٹھ ہونے والے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر آیا اور جم چلا آیا۔ سونی سنگھ کو وقت سے پہلے پہنچنے کی عادت تھی۔ چاہتا تھا کہ سب سے پہلے پہنچوں تا کہ اس سے پہلے جم سے کال والی باتوں اور شیلا کی موت پر بات کر سکوں۔ جم پہنچا تو سونی سنگھ کہیں نظر نہ آیا۔ ریہرسل ہال میں داخل ہوا تو وہاں بھی اندھیرا چھایا تھا۔ لائٹس آن کیں۔ مجھے اب بھی یقین تھا کہ سونی سنگھ پہنچنے ہی والا ہوگا۔ میں اس کے منہ سے بہت کچھ سننے کا خواہشمند تھا۔ کئی سوالات میرے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ میں اسے بلاگر کے ساتھ فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانا چاہتا تھا تا کہ اس کا بھی عندیہ لے سکوں کہ کس نے بلاگر تک راجندر کو نکال باہر کرنے کی جھوٹی خبر پہنچائی ہوگی۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ یہ خبر پہنچانے والا کون ہو سکتا ہے۔

ایک بار پھر میرے تصور میں یادیو کی خون آلود لاش گھوم گئی۔ یقیناً راجندر نے فلم میں کام کرنے کے لیے یہ قتل کیا ہے۔ یادیو اسے کھیل بیوپار کر جانے نہیں دیتا لیکن یہ بات مجھے پریشان کر رہی تھی کہ آئینے کی طرح کھلی زندگی گزارنے والے راجندر کا وہ کون سا راز تھا جس پر بلیک میلنگ سے چھٹکارے کے لیے قتل کی حد تک جا سکتے؟ کرشن نے بھی یہی سوال کیا تھا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی تھی کہ جس سے میرے خدشے کی تائید ہو سکے لیکن پھر بھی مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ایسا ہی ہے۔ یادیو جیسے بلیک میلر کے ہاتھوں میں ضرور راجندر کی کوئی دکھتی رگ دبی ہوئی تھی۔

میں سوچوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی نے میرے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ "ہیلو......"

"تم کہاں ہو شیام؟" سونی سنگھ نے میری آواز سنتے ہی کہا۔ آواز سے تخت پریشان لگ رہا تھا۔

"جم میں اور کہاں ہوں گا اس وقت۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں میرا میسج نہیں ملا تھا کیا؟"

میں نے کانوں سے فون ہٹا کر اسکرین پر دیکھا۔ وہاں ایک بنا پڑھا میسج کا اشارہ موجود تھا۔ "سوری...... دیکھا نہیں ہے۔"

"تم جم میں کیا کر رہے ہو، ہم سب تو تھیٹر میں ہیں۔"

"اوکے...... میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جب میں تھیٹر میں داخل ہوا تو ڈرامے کی پوری کاسٹ سونی سنگھ کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ اپنے موبائل فون پر شیلا کی موت کے بارے میں ملنے والا ایک میسج بہ آواز بلند پڑھ رہا تھا۔ میں بھی سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

"اوکے...... اب ہم پہلے ایکٹنگ کی ریہرسل کریں گے۔" سونی سنگھ نے [illegible] کے بطور ڈائریکٹر حکم صادر

کیا۔ وہ شدید جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔ آخر اس نے غصہ بیچاری جولی پر اتارا۔ ''تمہیں اپنی آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔'' معلوم نہیں وہ کس بات پر شدید برہم ہو رہا تھا۔ ''تم نے تو شاید مجھے پریشان کرنے کی ٹھان لی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اسکرپٹ فرش پر پھینکا اور پاؤں پٹختا ہوا تھیٹر ہال سے باہر نکل گیا۔ اس کے چلانے سے سب سہم گئے۔ کسی میں ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت نہ تھی۔

آخر جولی نے ہی اس خاموشی کو توڑا اور کرسی پر پڑی اس کی جیکٹ اٹھا کر پہنی۔ ''وہ بادشاہ سلامت لوٹ آئے تو بتا دینا، مجھے کام تھا اس لیے جا چکی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے آگے بڑھی۔ ''بتا دینا کہ اب یہ میری ہو چکی۔'' اس نے جیکٹ کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد مونی سنگھ لوٹ آیا۔ جولی ہال میں نہیں تھی مگر اس نے کچھ نہیں پوچھا، نہ اس کے اور نہ ہی اپنی جیکٹ کے بارے میں۔ ایک بار پھر ریہرسل شروع ہوگئی۔ تمام ساتھی خوفزدہ تھے۔ ہر کسی کو عزت پیاری تھی۔ جیسا وہ کہہ رہا تھا، سب ویسا ہی کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد اسٹیج منیجر نے لنچ بریک کا اعلان کر دیا۔

لنچ بریک کے ساتھ ہی مونی ایک بار پھر اپنا سیاہ تھیلا سنبھال کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ جولی پر جس طرح چلایا تھا اس نے میرا موڈ خراب کر دیا تھا۔ اگرچہ میں اس سے تنہائی میں مل کر بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا لیکن اس واقعے کے بعد میرا دل کھٹا ہو گیا تھا۔ اس کے پیچھے جانے کا من ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں باقی ساتھیوں کے ساتھ ریستوران کی طرف چلا گیا۔

لنچ سے فارغ ہوا تو ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں بے مقصد سڑک پر گشت کرنے لگا۔ روڈ سائڈ کیفے پر رک کر کافی پی۔ دو بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ تھیٹر پہنچا لیکن خلاف توقع دروازہ بند تھا اور اس پر ایک نوٹس چسپاں تھا۔ ''دوپہر کی ریہرسل کینسل کی جا چکی ہے۔ ہم سب کل صبح ٹھیک نو بجے یہیں پر دوبارہ ملیں گے۔''

اگر کوئی دوسرا وقت ہوتا تو یہ نوٹس پڑھ کر میں غصے میں آجاتا مگر اس وقت مجھے یہ آدھی چھٹی نعمت لگی۔ میں شیلا کی موت کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا اور کرشن کے سوا کوئی اور نہ تھا جو مجھے اس بارے میں کچھ بتا سکتا۔ اگرچہ میں اپنے گھر جا کر کپڑے بدلنے کے بعد کرشن کی طرف جا سکتا تھا لیکن تجسس کے مارے گھر جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور جلد ہی سے کزن اپارٹمنٹ کی اور راج پیلس کی طرف چل دیا۔

''تو کیا کچھ معلوم ہو سکا اب تک؟'' میں نے اندر داخل ہوتے ہی سوال داغ دیا اور کرسی گھسیٹ کر پشت نکالی۔ حسب توقع کرشن اسٹڈی میں موجود تھا۔

میری بے تابی دیکھ کر وہ مسکرایا اور معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ ''ہیروئن۔''

''کیا.....'' میں اس کے یک لفظی جواب سے کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

''شیلا بظاہر اپنے شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی۔'' کرشن نے گمبھیر لہجے میں بتایا۔ ''اس کے بیگ سے ہیروئن اور کچھ دوسری منشیات کی بڑی مقدار برآمد ہوئی ہے۔''

میرے لیے یہ بہت بڑا انکشاف تھا۔ ''تو کیا یہ حادثہ تھا؟'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''مطلب یہ کہ شیلا نشے کی حالت میں ڈرائیونگ کر رہی تھی اور حادثہ پیش آ گیا؟''

''بظاہر تم ایسا کہہ سکتے ہو لیکن پولیس ایسا نہیں کہہ رہی۔'' یہ کہہ کر کرشن نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''پولیس اس کی موت کو مشکوک قرار دے رہی ہے۔''

میں خاموش بیٹھا تھا۔ میرے کزن کا شمار شہر کی معروف اور اہم ترین شخصیات میں ہوتا تھا۔ اب اس نے جو معلومات حاصل کی ہیں، وہ ضرور درست ہوں گی۔ بعض اوقات کرشن کے پاس اپنے ذرائع سے ایسی اطلاعات تک پہنچ جاتی تھیں، جن کے بارے میں شہر کے بڑے سے بڑے اخبار نویس کو بھی بھنک نہیں پڑتی۔

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کرشن نے ایک بار پھر بولنا شروع کیا۔ ''حیرت کی بات یہ ہے کہ منشیات استعمال کرنے کے حوالے سے شیلا کا ماضی بالکل بے داغ ہے۔ اس کے جاننے والوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتی تھی اور خود کو فٹ رکھنے کے لیے باقاعدگی سے جم جاتی تھی۔ پولیس نے اس کے قریبی جاننے والوں سے بھی بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ کسی چیز کے حوالے سے کوئی تربیت لے رہی تھی لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ کس چیز کی تربیت۔''

کرشن کی بات نے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''صرف دو دن پہلے اس کے شوہر کا بے دردی سے قتل ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے اندر کا دکھ کم کرنے کے لیے منشیات میں پناہ لی ہو۔'' یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''شاید اس نے کچھ زیادہ ہی لے لی تھی اور اسی حالت میں وہ ڈرائیونگ کر رہی ہو گی کہ گاڑی پر قابو نہ رکھ سکی اور حادثہ ہو گیا۔''

میری بات سن کر کرشن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ''تم شیلا سے کبھی ملے نہیں نا، اس لیے اُس کا مزاج بھی نہیں جانتے لیکن جو جانتے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ اسے شوہر کی موت کا کوئی صدمہ نہیں تھا۔''

اس کی بات سن کر مجھے جھٹکا لگا۔ ''تم اسے جانتے تھے؟''

کرشن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں تو نہیں البتہ میرے ذرائع اُس سے اچھی طرح واقف تھے۔''

''تو تم......'' اچانک مجھے احساس ہوا کہ براہِ راست کرشن کو مخاطب کر رہا ہوں۔ ''معاف کیجیے گا، میرا مطلب ہے کہ تمہارے ذرائع سمجھتے ہیں کہ پہلے تو کسی نے انہیں نشہ آور ادویات دیں یا ہیروئن پلائی۔ اس کے بعد شیلا کو کار کے پیچھے کچلا اور پھر گاڑی کو ٹکر مار کر الٹایا اور حادثے کا رخ دے دیا۔''

کرشن پوری توجہ سے میری بات سن رہا تھا۔

''ویسے تو یہ خیال ہی احمقانہ ہے، قتل کا یہ منصوبہ کچھ بہتر نہیں کہلایا جا سکتا لیکن پھر بھی......'' میں نے بات ادھوری چھوڑ کر گہری سانس لی۔ ''اگر یہ تھیوری درست ہے تو پھر مقتولہ کو اس کی لاعلمی میں نشہ دیا جا سکتا ہے، جس پر اسے حد سے زیادہ اعتماد ہو اور ایسا شخص صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔

کرشن نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''تمہارے خیال میں وہ شخص کون ہو سکتا ہے۔''

''راجندر بیدی......'' میں نے فوراً جواب دیا۔

''لیکن شیام......'' کرشن نے مجھے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''راجندر اس وقت بحالی مرکز میں داخل ہے اور وہ بھی یہاں سے کافی دور پونا میں۔''

''یہ تو ہم ویب سائٹ پر شائع خبر کی بنیاد پر کہہ رہے ہیں نا۔'' میں نے کرشن کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''پونا یہاں سے چند گھنٹوں کی دوری پر ہے اور کسی کو کیا پتا کہ وہ حقیقت میں کہاں ہے؟'' یہ کہہ کر میں معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

کرشن کی تیوری پر بل پڑ چکے تھے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر لیپ ٹاپ کھول کر مصروف ہو گیا۔ ''وہ بحالی مرکز میں ہی ہے۔'' اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

میں خاموش رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے لیپ ٹاپ میری طرف موڑا۔ ''یہ دیکھو......''

ہندوستان ٹائمز کی ویب سائٹ پر نیوز ہیڈ لائن لگی ہوئی تھی۔ ''اداکار راجندر بیدی کو کل بحالی سینٹر سے فارغ کر دیا جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو شیام، وہ وہاں پر نہ اب ہے، نہ پہلے تھا۔'' کرشن نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ اس معاملے میں پہلی بار وہ میری رائے سے متفق نظر آ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں یہ پتا کرنا پڑے گا کہ شیلا کی موت کے وقت دراصل وہ کہاں تھا؟''

کرشن نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں نے اپنے بیگ سے لیپ ٹاپ نکالا اور آن کرتے ہوئے کرشن کو مخاطب کیا۔ ''تمہارے ذرائع اس بارے میں اگر ہماری کوئی مدد کر سکیں تو تمہیں ان کا تعاون ضرور حاصل کرنا چاہیے۔'' یہ کہتے ہوئے میں سٹنگ روم کی طرف چل دیا۔

آن لائن ہونے سے پہلے جولی کو فون کیا۔ وہ اپنے فلیٹ پر تھی۔ میں نے یاد دہانی کرائی کہ اسے کھڑکی اور دروازے اچھی طرح بند رکھنے چاہئیں۔ ویسے بھی شیلا کی موت کا سن کر وہ کافی پریشان تھی۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ مجھے اس کی آواز سے لگا کہ وہ مشورے پر عمل کرنے میں سنجیدہ ہے۔

اس کے بعد میں نے انٹرنیٹ اور اپنی ڈائری کی مدد سے ایک فہرست تیار کی اور راجندر کے ایجنٹ سے لے کر ان تمام لوگوں کو فون کیے جہاں امکانی طور پر وہ موجود ہو سکتا تھا۔ اس کام میں دو گھنٹے لگ گئے۔ کہیں سے اس کی موجودگی کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ دو ڈھائی گھنٹوں کی اس مشقت سے میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ ٹانگیں صوفے پر پھیلائیں اور نیم دراز ہو کر ایک بار پھر جولی کا نمبر ملایا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اسے راجندر کا کوئی میسج وغیرہ تو نہیں ملا۔

''نہیں شیام...... بس وہی ایک میسج ملا، اس کے سوا نہ کوئی میسج آیا نہ مسڈ کال۔'' جولی نے بتایا اور گلا صاف کرتے ہوئے بولی۔ ''بہتر ہے کہ اسے کسی تفریحی مقام کے شاندار سے ریزورٹ میں تلاش کرو، بڑا عیاش ہے وہ۔ اگر وہ بحالی مرکز میں نہیں تو کہیں عورتوں کے جھرمٹ میں شراب پی رہا ہو گا۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دی۔

تفریحی ریزورٹ اور خواتین کے جھرمٹ کا سن کر میں افسردہ ہو گیا۔ میں بھی اسی انداز میں چھٹیاں منانا چاہتا تھا لیکن قسمت دیکھیے کہ سب کچھ ہونے کے باوجود کہاں پھنسا

بیٹھا تھا۔ ”ٹھیک ہے..........“ میں نے جولی کو ہدایت کی۔ ”کھڑکی، دروازے بند رکھنا اور اگر وہ کوئی میسج بھیجے یا کال کرے تو فوراً مجھے بتانا۔“

”اوکے شیام...... میرے بارے میں اتنا فکر مند ہونے کا شکریہ۔“

فون بند ہو چکا تھا۔ میں جولی کو خود حفاظتی کے مشورے دے رہا تھا اور خود ان پر عمل کرنے سے بہت دور تھا حالانکہ گزشتہ روز باگر کے فون اور صبح شیلا کی موت کے بعد مجھے بھی خطرے کا احساس کر لینا چاہیے تھا۔

کرشن سحر خیز تھا۔ منہ اندھیرے جاگنے کا عادی اس لیے جب بھی میں اس کے یہاں ٹھہرتا، الارم نہیں لگاتا تھا۔ اُسے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے کس وقت جاگنا چاہیے۔ ہمیشہ وہ مجھے وقت پر بیدار کر دیتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ آ کر مجھ پر جھک جاتا اور آہستہ آہستہ کہتا رہتا۔ ”شیام...... شیام...... ارے شیام۔ اٹھ بھی جاؤ۔ وقت ہو گیا۔“

دن بھر کی سخت ریہرسل کے بعد سہ پہر کو سستایا بھی نہیں۔ اوپر سے رات کو کرشن نے شطرنج کی بساط سجالی۔ رات گیارہ بجے لیٹا تو دماغ اور جسم، دونوں تھکن سے چور ہو رہے تھے۔ لیٹا تو پھر کام سے گیا۔ اکثر رات کو پانی کے لیے اٹھ جاتا تھا مگر لگتا ہے کہ اس رات سارے گھوڑے بیچ کر سو یا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں کہ کیا وقت ہو رہا ہو گا لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ کوئی مجھ پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ میرا نام پکار رہا ہے۔ ذہن کے کسی دور دراز گوشے نے مجھے آنکھیں کھولنے کا حکم دیا مگر نیند سے بوجھل پپوٹوں کی جھالر کھلنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کون ہے۔ ذہن کے کسی حصے نے اپنا کچھ کام کیا تو احساس ہوا کہ شاید صبح ہو رہی ہے اور کرشن مجھے جگا رہا ہے۔ بہت دقت سے آنکھیں کھولیں۔ دماغ بھی شاید اب تک پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں تک کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میرے سینے کو آہستہ، آہستہ تھپتھپا کر میرا نام لینے والا یہ کون ہے۔ اگر کرشن تھا تو پھر وہ کرشن جیسا کیوں نہیں دکھ رہا تھا۔ چند لمحوں تک کچھ سمجھ نہیں آیا لیکن جب آنکھیں نیم تاریک کمرے میں دیکھنے کی عادی ہوئیں اور حواس نے کچھ کام شروع کیا تو یک دم سمجھ گیا، وہ کرشن نہیں تھا اور نہ ہی صبح ہوئی تھی۔ وہ راجندر بیدی تھا۔ رات ابھی باقی تھی۔

کمرے میں ٹیبل لیمپ کی ہلکی سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ چہرے کی رنگت اڑی ہوئی، بکھرے بال، نیم وا آنکھیں، بے ترتیب مسلا ہوا لباس، منہ سے شراب اور نہ جانے کس، کس نشے کی آتی بدبو...... میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ ”کیا اب میرا نمبر لگ گیا۔“ یہ سوچتے ہی میرا جسم سرد پڑنے لگا۔ سمجھا کہ کسی بھی وقت سینے میں بڑا سا چاقو دستے تک پیوست ہونے والا ہے لیکن مجھے جاگتا دیکھ کر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور ایک قدم پیچھے ہٹا۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ چاہتا تو نیند میں ہی میرا کام تمام کر کے نکل لیتا مگر وہ یہ کیا کر رہا ہے۔ کیا اسے بیداری کے عالم میں اپنے شکار کو موت کی وادی میں دھکیلنا پسند ہے۔ ایسا ہے تو پھر راجندر قاتل ہی نہیں خطرناک نفسیاتی مریض بھی ہے، میرے ہی نہیں ہر انسان کے لیے خطرہ۔ راجندر کی شکل میں اپنی دانست میں موت کو سامنے کھڑا دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو چکے تھے لیکن یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اپنا خوف ظاہر نہیں ہونے دوں گا اور نہ ہی کسی میمنے کی طرح شیر کا آسان نوالہ بنوں گا۔ میں بچاؤ کے لیے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

مسٹر راجندر...... ”خوف پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کرتے ہوئے میں نے سرد لہجے میں اس کا نام لیا اور آہستہ سے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

وہ برابر میں رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

مجھے اطمینان ہوا کہ وہ جلد بازی میں شاید وار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ”اس وقت ان حالات میں تم یہاں۔“ میں یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر ہرگز خوفزدہ نہیں۔ میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

”شیام...... “ اس نے کمزور آواز میں کہنا شروع کیا۔ اس کا لب و لہجہ میرے لیے حیران کن تھا۔ ”وہ مجھے مارنا چاہتا ہے، پلیز پلیز شیام...... میرے دوست...... پلیز تم مجھے بچا لو۔“ صوفے پر نیم دراز راجندر مجھ سے التجا کر رہا تھا۔

میری فہرست میں وہ کم از کم دو افراد کا قاتل تھا۔ اسے یوں اپنی جان بخشی کی بھیک مانگتا دیکھ کر میں سخت حیران تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا اعتماد بڑھا۔ ”ضرور ضرور، میں تمہاری مدد کروں گا لیکن راجندر...... تمہیں کون مارنا چاہتا ہے، تمہاری زندگی لینے کی کسی کو کیا ضرورت۔ ویسے کون ہے وہ؟“

”مجھے نہیں پتا۔“ راجندر نے کمزور آواز میں کہنا شروع کیا۔ ”بس وہ قاتل ہے اور مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس شہر میں تم میرے قریبی جاننے والے ہو، اسی لیے تمہارے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔“

میں کچھ دیر پہلے سخت خوفزدہ تھا لیکن اس صورت حال نے مجھے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ بڑی مشکل سے قہقہہ روک پایا۔

راجندر نے ایک انگلی اپنے بکھرے بالوں میں پھراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو شیام..... اب اس کی فہرست میں اگلا نام میرا ہے۔''

جہاں تک میرا تعلق ہے تو راجندر میرے نزدیک ایک جنونی قاتل تھا اور اب فہرست کے مطابق اگلا نشانہ جولی بننے والی تھی، جس کا ثبوت اس کی طرف سے جولی کو بھیجا گیا دھمکی آمیز میسج تھا مگر یہ خود کو ہی اگلا شکار گردان رہا تھا۔ مجھے یہ بات کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ ''ویسے تمہارا خود اپنی فہرست سے متعلق کیا خیال ہے؟'' میں نے معنی خیز انداز میں ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میری فہرست؟''

''میں وہ میسج پڑھ کر سنا سکتا ہوں جو تم نے جولی کو بھیجا تھا۔''

یہ سنتے ہی راجندر کا رنگ فق ہوگیا۔

''تم نے اپنے میسج میں اس سے کہا تھا کہ تمہارے دن گنتی کے رہ گئے ہیں۔'' میں جو کہنا چاہتا تھا، کہہ دیا۔

وہ ہکا بکا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جنہیں سمجھنے سے قاصر رہا۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔

مجھ سے اس کا چپ رہنا برداشت نہ ہوا۔ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تو کیا یہ کہنا چاہتے ہو کہ وہ میسج تم نے اسے نہیں بھیجا تھا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا.....'' اس نے حیران نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''میں اسے کیوں دھمکاؤں گا۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے، میں اسے پسند کرتا ہوں، دل سے اس کا احترام کرتا ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامتے ہوئے جواب دیا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ وہ چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی طرف سے غافل پاکر میں نے جلدی سے موبائل فون نکالا اور کرشن کو مدد کا میسج کر کے فون جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ وہ بدستور اپنے ہی خیالوں میں گم تھا۔

''کافی پیو گے؟''

اس نے میری طرف دیکھے بنا ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں کچن میں گیا اور کافی بنا کر پلٹا۔ ''یہ لو.....'' مگ اس کی طرف بڑھایا۔

مگ تھامتے ہوئے راجندر نے اپنا ہاتھ ہلکے سے ٹیبل... سب آتے تھے۔ ...دیوار کی طرف دیکھا۔ صبح کے ساڑھے چار ہورہے تھے۔ میں نے گھونٹ بھرا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''اچھا تو یہ بتاؤ کہ وہ کیوں تمہیں مارنا چاہتا ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے فوراً جواب دیا۔ ''لیکن اس نے پہلے یادیو کو قتل کیا پھر شیلا کو اور اب وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر میری طرف دیکھا۔ ''لوگ کہہ رہے ہیں کہ شیلا نشے کی عادی تھی، اس حالت میں کار چلاتے ہوئے حادثے کا شکار ہوئی لیکن ایسا نہیں تھا، وہ نشہ نہیں کرتی تھی۔ اسے نشے سے سخت نفرت تھی۔ وہ میری لت چھڑانے کے لیے برسوں سے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ بحالی مرکز کی مدد لوں تو بھلا وہ خود اس کی عادی کیسے بن سکتی تھی۔ کسی نے اس کی موت کی سازش تیار کی اور اب وہی طرح طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں میری شیلا.....'' لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے شاید ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔

''وہ ایسا کیوں سمجھ رہے ہیں کہ تم کچھ جانتے ہو؟'' میں نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

''کیونکہ کل رات میں شیلا کے ساتھ تھا۔'' یہ کہہ کر راجندر کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے لگا کہ شاید کچھ غلط کہہ گیا ہے اس لیے جلدی سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''یادیو کے قتل کے بعد وہ یہاں ممبئی میں بالکل تنہا تھی۔ لاش پولیس کی تحویل میں ہے۔ وہ اسے قانونی کارروائی کی تکمیل اور لاش ملنے تک یہیں رکنا تھا۔ یہی سوچ کر میں اس کے پاس پہنچا تھا کہ مشکل وقت میں سہارا دے سکوں۔ آخر وہ جوڑا میرا دوست تھا۔ ہم برسوں سے واقف کار تھے۔ ایسی مشکل میں دوست ہی دوست کے کام آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے کافی مگ پر نظریں جمادیں۔

میں خاموش بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے نظریں اوپر اٹھائیں اور میری طرف غور سے دیکھا۔ ''انہیں علم ہوگا کہ کل رات میں شیلا کے ساتھ تھا، شاید اسی لیے وہ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں کچھ نہ کچھ جانتا ہوں مگر سچ یہ ہے کہ مجھے کچھ پتا نہیں۔'' اس کے لہجے سے بے بسی کا اظہار ہورہا تھا۔

''تو کیا یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ ڈرامے سے علیحدگی اختیار کرنے کے لیے تم نے یادیو کو قتل نہیں کیا؟''

اس نے کنفیوزڈ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔ ''میں کیوں یادیو کو قتل کروں گا؟''

''شاید وہ تمہارے کچھ رازوں سے واقف تھا اور بلیک میلنگ بھی کر رہا تھا؟'' میں نے براہِ راست وہ بات کہہ دی جو پچھلے دو دن سے مجھے سخت پریشان کیے جا رہی تھی۔

''لعنت ہے......'' اس نے جھلا کر کہا۔ ''نہ جانے کیوں تم ایسی بات کہہ رہے ہو۔ میری پوری زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے، کچھ نہیں ایسا جسے میں چھپاؤں۔ ساری دنیا میرے متعلق ہر بات اچھی طرح جانتی ہے۔'' وہ اتنا اونچا بول رہا تھا کہ آواز پورے سٹنگ روم میں گونج رہی تھی۔

لہجے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ میری بات سن کر اسے دلی صدمہ پہنچا ہے۔

''شیام...... میرے الفاظ یاد رکھنا۔'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو کہا، وہی سچ ہے۔''

اسی دوران ایک آہٹ سنائی دی۔ کرشن کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے کندھے پر بائک دھری تھا۔ اس نے دستے اس طرح مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ لمحہ بھر میں اپنے دشمن پر حملہ کر سکے۔ وہ بڑے چوکنے انداز میں اندر داخل ہوا لیکن ہم دونوں جس طرح پرسکون بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔ کرشن کی اشرفی بالکل ڈرامائی تھی۔ اس نے میرا میسج فوراً دیکھ لیا تھا۔

''آجاؤ......'' میں نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

کرشن دو قدم آگے بڑھا۔ اس کی نظریں راجندر پر جمی تھیں۔ اس کے پیچھے، پیچھے دو پولیس افسر بھی کمرے میں داخل ہوئے۔

میں سمجھ گیا کہ مدد کا پیغام دیکھتے ہوئے اس نے پولیس کو بھی فون کر دیا ہوگا۔ پولیس کو دیکھ کر راجندر کے چہرے پر حیرانی کے آثار تھے۔ اس نے میری طرف دیکھا لیکن میں نے نظریں ملانے کے بجائے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

پولیس والے آگے بڑھ کر اسے گرفت میں لینے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن جس انداز میں ہم دونوں اطمینان سے صوفے پر بیٹھے تھے، اسے دیکھ کر پولیس والے بھی شاید چکرا کر رہ گئے ہوں گے۔ وہ ایک طرف کھڑے تھے۔

کرشن آگے بڑھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سمجھایا کہ سب خیریت ہے۔ راجندر اگر خود کو خطرے میں محسوس کر رہا تھا تو یقیناً پولیس کو دیکھ کر اسے اطمینان ہوا ہوگا۔ ''میرے خیال میں اب تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' میں نے مسٹر راجندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے اطمینان سے میری طرف دیکھا۔ کچھ دیر پہلے کے مقابلے میں اب وہ اتنا مطمئن نظر آ رہا تھا۔

''لیکن پولیس کیسے پہنچی؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں نے بلائی ہے راجندر۔'' کرشن نے آگے بڑھ کر اس کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''تم سے دوستی نہ ہوتی اور شیام کو نہ جانتا ہوتا تو شاید مدد کے لیے یہاں نہیں پہنچتا۔'' راجندر نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دونوں پولیس والے بھی اسے پہچان چکے تھے۔ وہ ہندوستان کا معروف اداکار تھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟'' ایک افسر نے کرشن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مسٹر راجندر کا خیال ہے کہ ان کی جان خطرے میں ہے اور کوئی انہیں قتل کرنا چاہتا ہے اسی لیے وہ یہاں آئے تھے۔'' میں نے مداخلت کرتے ہوئے انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

میری بات سن کر راجندر نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن مسٹر...... میں نے پولیس والوں کی

سرداری

سردار جی بڑے دکھی لہجے میں کہہ رہے تھے۔ ''ستیاناس ہو اپنی کرکٹ ٹیم کا... میں ان کی وجہ سے دو سو روپے ہار گیا!''

''وہ کیسے؟'' ان کے ساتھی نے حیرت سے کہا۔ ''شام کو تم سو روپے کو رو رہے تھے۔ اب دو سو کیسے ہو گئے؟''

''یار! صبح ٹی وی پر میچ کی جھلکیاں آ رہی تھیں۔ میں نے بھارت کی ٹیم پر پھر سو روپے لگا دیے۔ ان کی وجہ سے اپنے پورے دو سو ڈوب گئے۔''

کباڑی

وہ دونوں ریستوران میں بے فکری سے چائے پینے میں مصروف تھیں کہ عمر رسیدہ عورت نے آگے جھک کر اپنی جواں سال ساتھی سے سرگوشی کی۔ ''سامنے والی میز پر بیٹھا ہوا آدمی بار بار میری طرف دیکھ رہا ہے!''

جواں سال لڑکی نے مڑ کر اس آدمی پر ایک نگاہ ڈالی اور بے نیازی سے بولی۔ ''میں اسے جانتی ہوں، کباڑی ہے۔ ہر جگہ پرانے اور ناکارہ مال کی تلاش میں رہتا ہے۔''

لاہور سے انجم خان کی ناراضی

طرف دیکھ کر کہنا شروع کیا۔ ''فی الوقت یہ نشے میں ہیں نیند کا خمار ان کے سر پر ہے اور وہ خود کو غیر محفوظ تصور کر رہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ انہیں حفاظت سے ان کی رہائش گاہ تک پہنچا دیا جائے۔''

''گھر نہیں ہوٹل۔'' راجندر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بہت تھکا ہوا ہوں۔ اکیلے ہوٹل تک پہنچنے میں جان کو خطرہ ہے۔''

''یہ معروف اداکار ہیں۔'' کرشن نے بیچ میں مداخلت کی۔ ''اگر پولیس انہیں لے کر ہوٹل پہنچے گی تو کوئی اسکینڈل کھڑا ہو سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ ٹیکسی منگوائی جائے اور پولیس دور رہ کر باحفاظت ٹیکسی کو ہوٹل تک پہنچائے۔''

یہ سن کر راجندر نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ ''ٹھیک رہے گا۔''

کرشن نے فون کر کے ٹیکسی منگوائی اور کچھ دیر بعد وہ پولیس کی حفاظت میں تاج ہوٹل چلا گیا۔

جو حالات پیش آئے وہ حیران کن تھے لیکن اس کے باوجود وہ میری فہرست میں وہ بدستور مشکوک تھا۔ راجندر نے جس انداز سے جولی کو بھیجے گئے میسج سے لاتعلقی ظاہر کی وہ میرے لیے بھی حیران کن تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نمبر جولی کے فون ڈائریکٹری میں محفوظ تھا پھر یہ کیسے ہوا کہ اس کے نمبر سے بھیجے گئے میسج کا خود اسے علم نہیں۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں بہت سارے سوالات جنم لینے لگے تھے۔

صبح ہو چکی تھی، دن کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ کرشن نے مجھے ساتھ لیا اور اسٹڈی میں آ گیا۔ اس نے اپنے لیے اسکاچ کا گلاس بھرا اور میں نے فریج میں رکھا سوفٹ ڈرنک کا آخری کین اٹھا لیا۔ اس سچویشن سے وہ بھی خاصا کنفیوز نظر آ رہا تھا۔ میں نے تفصیل کے ساتھ نیند سے آنکھ کھلنے، راجندر کو اپنے سامنے کھڑا پانے اور پولیس کے آنے تک کی کہانی تفصیل سے سنا دی۔

''ہم نے اب تک کیا کیا ہے شیام؟'' کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے کرشن نے کافی دیر کی خاموشی توڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''اگر یادیو بلیک میل نہیں کر رہا تھا تو پھر راجندر کے پاس اسے قتل کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔''

میں نے کچھ سوچا۔ ''اب تو صرف ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے۔'' میں اب بھی راجندر کو شک کے دائرے سے باہر نکالنے کو تیار نہ تھا۔

کرشن نے چونک کر دیکھا۔ ''اب اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ راجندر، یادیو کی بیوی کو حاصل کرنا چاہتا ہو۔'' یہ کہہ کر کچھ دیر توقف کیا۔ ''کچھ دیر قبل اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میری شیلا کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ خود کو اس کا ذمے دار سمجھتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ نادم نظر آ رہا تھا۔''

''میری شیلا......'' کرشن نے ذومعنی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ شیلا کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔'' کرشن نے استفسار کیا۔

''شاید...... ویسے شیلا نے ہی اُسے اپنے شوہر سے متعارف کرایا تھا۔''

میری بات سنتے ہی کرشن کی دونوں بھویں اوپر کو تن گئیں۔ ''شیلا اور راجندر ایک دوسرے کو کس طرح جانتے تھے؟''

''کسی زمانے میں شیلا بھی اداکاری کرتی تھی۔ بہت پہلے دونوں نے دہلی میں دو چار اسٹیج ڈرامے اکٹھے کام کیا تھا۔''

''شیلا اداکارہ بھی تھی؟'' کرشن کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔ ''شیام...... یہ ساری باتیں تم کیسے جانتے ہو اور کب سے یہ سب تمہارے علم میں ہے؟'' کرشن نے وکیلوں کی طرح جرح کے انداز میں پوچھا۔

میں مسکرایا۔ ''مجھے یہ سب باتیں سونی سنگھ سے پتا چلی تھیں۔ تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن موقع نہ مل سکا۔''

کرشن نے سر ہلایا۔

میں اپنے ان سارے شکوک کا اظہار کرشن سے کرنا چاہتا تھا لیکن کہتے کہتے یہ سوچ کر رکا کہ صورت حال کا ایک نیا ڈراما اس سوز حقیقت بن کر سامنے آ چکا ہے۔ ایسے میں کسی ٹھوس ثبوت کے بنا اپنی رائے کا اظہار کرشن کو مزید کنفیوز کر سکتا تھا۔ پہلے ہی وہ اس کہانی میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔

میں نے سامنے دیکھا۔ کرشن کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے گہری سوچ میں گم تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسکاچ کا گلاس بدستور موجود تھا۔ دیوار پر نظر ڈالی۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کرے کی خاموش فضا میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ کھڑکی پر نظر ڈالی۔ باہر دن کا اجالا پھیلنے لگا تھا۔

مجھے 'لوگوں کا دشمن' ڈراما یاد آ گیا۔ یہ ڈراما بڑی پیچیدہ سوچوں کا عکاس تھا۔ اس کھیل کا مرکزی کردار اخلاقی مخمصے کا شکار تھا۔ وہ دہری پریشانی کا شکار تھا۔ اگر وہ اپنے شہر میں پانی کی سپلائی ان میں پائی جانے والی آلودگی کو بے نقاب کرتا تو

ان سے نہ صرف اُن کا خاندان بلکہ پورے شہر کے لوگ سنگین مالی بحران سے دوچار ہوسکتے تھے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر آلودہ پانی کا استعمال بہت ساری زندگیوں کو موت سے ہمکنار کرنے کی وجہ بن سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس سارے معاملے میں بھی کچھ ایسی ہی دو دھاری صورت حال پیدا ہوچکی ہو۔ کہیں راجندر نے خود ہی تو کرائے کے کسی قاتل کے ذریعے یہ سب کچھ تو نہیں کروا دیا۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے سمجھا ہو کہ اب یہی چھٹکارے کا واحد حل باقی بچا ہے یا پھر کہیں یادیو کو اپنے ہی ماضی کے گناہوں نے تو اس مقام پر لا کے کھڑا نہیں کر دیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اُس نے ضمیر کے بوجھ سے مجبور ہوکر سوچا ہو کہ اب یہی چھٹکارے کا بہترین راستہ ہے اور اس نے کسی کرائے کے قاتل کے ذریعے نہ صرف اپنا قتل کرایا بلکہ شیلا کو بھی اوپر کی دنیا میں اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ حقیقت کیا ہے، وہ اب تک صرف اوپر والے کو پتا تھی۔

راجندر شک کے دائرے میں تھا لیکن کچھ دیر پہلے کی صورتِ حال نے شک کی جھیل میں ایک ایسا کنکر پھینک دیا کہ دائرے بڑھتے جارہے تھے اور شک کے پھیلتے دائرے میں اور بہت سے لوگ آتے جارہے تھے لیکن اب تک یہ صرف شک تھا۔ جب تک حقیقت سامنے نہیں آتی شک ہی حقیقت تک پہنچنے کا واحد راستہ تھا۔

''شیام...... کیا تم سن رہے ہو؟''

میرے کانوں سے کرشن کی آواز ٹکرائی تو آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ میرے پاؤں فرش پر پھیلے ہوئے تھے اور کرسی پر نیم دراز حالت میں تھا۔ جلدی سے آنکھیں ملتا ہوا سیدھا ہوا اور خجالت سے ہنس پڑا۔ ''لگتا ہے ذرا سی غنودگی آگئی تھی۔''

''کچھ دیر پہلے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ شیلا نے اداکاری کا سلسلہ کیوں ترک کر دیا تھا مگر تم تو......'' اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بات ادھوری چھوڑ دی۔

''یہ تو مونی سنگھ نے نہیں بتایا تھا۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ اُس نے محسوس کیا ہو کہ اداکاری کی نسبت فیشن ڈیزائننگ کا شعبہ زیادہ پُرکشش ہے۔ بہرحال مونی کا ہی کہنا تھا جب اس نے راجندر سے شادی کی تو وہ فیشن ڈیزائنر تھی۔''

کرشن نے لیپ ٹاپ کھولا اور کچھ ٹائپ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے اسکرین سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ''شیلا بھاسکر...... شادی سے پہلے کا نام یہی تھا نا؟ شیلا راجندر...'' یہ کہہ کر کچھ دیر خاموش رہا۔ ''وہ خوب صورت تھی، پُرکشش بھی لیکن اسے زیادہ شہرت نہ مل سکی۔ وہ اپنے کریئر سے غیر مطمئن تھی۔ ویسے بھی اسے کاسٹ کے اندر دوسروں کے مقابلے میں کم حیثیت ملتی تھی۔ اسی لیے وہ شوبزنس سے دلبرداشتہ ہوئی۔ اس کی مایوسی میں اس کے ساتھیوں کو بری الذمہ قرار دینا مشکل ہوگا۔''

''اوہ...... تو یہ وجہ تھی شوبز سے علیحدگی کی۔'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اسے مرکزِ نگاہ بننا پسند رہا ہوگا۔''

کرشن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے لیکن آگے سنو......'' یہ کہہ کر اس نے کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''فلمی نقادوں کے مطابق وہ پُرکشش اور متناسب جسم کی مالک تھی لیکن اداکاری اس سے کوسوں دور تھی۔ وہ کسی بھی کردار کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی تھی۔ اسی لیے بہت جلد ڈائریکٹرز نے اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ جس پر وہ دلبرداشتہ ہوکر اداکاری تو چھوڑ گئی لیکن شوبز کی دنیا کو نہ چھوڑ سکی اور فیشن ڈیزائنر بن گئی۔ وہاں میں اس نے خاصا نام بنایا اور پھر شہرت پھیلتی چلی گئی۔''

یہ بات درست ہے کہ اکثر میری رائے بہت مختلف ہوتی ہے اور مونا درست بھی ہوجاتی ہے لیکن خوش قسمتی سے آج تک کسی نے اپنی ناکامی کا الزام 'منحوس' کہہ کر مجھ پر نہیں لگایا۔ کئی دفعہ ایسا ہوچکا کہ کسی اسٹیج ڈرامے کو بھی 'ممکنہ کامیاب ترین' قرار دے رہے تھے لیکن میری رائے تھی کہ خرچہ پورا ہوجائے تو بڑی بات ہوگی۔ بعد میں جو ہوا، کئی دفعہ مجھے لوگوں سے منہ چھپانا پڑا، وہ بھی اُن کی وجہ سے نہیں اپنی زبان سے نکلنے والی 'کالی رائے' کی شرمندگی سے بچنے کے لیے۔

یہ پیشگوئی نہیں، صرف حسیات کا کمال ہے۔ اس کا سبب صرف ایک ہی ہے۔ میں چیزوں، باتوں، واقعات اور ان کے رونما ہونے کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر تسلسل سے دیکھنے کا عادی ہوں۔ میرے مشاہدے کی ہی بات ہے کہ ایک بار میں نے قتل ہوجانے کا کردار ادا کیا۔ پورے ڈرامے میں سب سے زیادہ تالیاں صرف اُس وقت ہی بجی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے کردار ادا کرنے سے پہلے بہت تیاری کی۔ قاتلانہ حملوں میں بچ جانے والوں کے تاثرات پڑھے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ جب گولی لگتی ہے اور موت سامنے کھڑی نظر آئے تو دماغ کیا سوچتا ہے اور جسم کس طرح دماغ کے خوف کے ساتھ ہم آہنگ ہوکر کے اپنی حرکات و سکنات تشکیل دیتا

ہے۔

یہی بات ہے کہ یادیو کی لاش اب تک میرے ذہن پر حاوی تھی اور جب تک اس قتل کا عقدہ حل نہیں ہو جاتا، میرا ذہن اسے لمحہ بھر کے لیے بھی فراموش نہیں کر پائے گا۔ یہ میرا نفسیاتی اور ذہنی مسئلہ ہے۔ میرا یادیو اور اس کے قتل سے کوئی لینا دینا نہیں لیکن یہی مذکورہ وجہ تھی کہ میں نے اپنے تخیل میں کرشن کا موتی سنگھ اور اس کے تھیٹر سے رشتہ جوڑا۔ اب کرشن میرا کزن ہے تو یوں یہ مسئلہ میرا بن گیا۔ اسی لیے نہ تو میں راجندر کو بے گناہ ماننے کو تیار تھا اور نہ ہی کرشن کو اس سارے معاملے سے صرف نظر کا موقع دے رہا تھا۔

"شیام....." کرشن نے پرجوش آواز میں پکارا۔ اس کے چہرے پر بے صبری کے آثار نمایاں تھے۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم اس معمے کا ایک اور ٹکڑا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

مجھے یقین نہ تھا کہ وہ کیا پانے میں کامیاب ہوا۔ خالی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"موتی سنگھ کے تھیٹر میں یادیو کی دلچسپی کے بارے میں ہم غلطی پر تھے۔"

میں نے بھویں اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔ ہم نے پہلے یہ سمجھا تھا کہ شہر میں اپنا کارخانہ لگانے کا خواہشمند یادیو تھیٹر کے معاملات میں شامل ہو کر علاقے میں نیک نامی حاصل کرنے اور بااثر لوگوں کے ساتھ تعلقات بنانا چاہتا تھا۔ یہ شوبز کا شہر ہے یہاں کی فضاؤں میں فلم اور آرٹ آکسیجن کی طرح شامل تھی اور لوگوں کے لیے اس کی اہمیت زندہ رہنے کے لیے لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔ ایک نئے قائم ہونے والے تھیٹر کو استحکام بخشنے کی کوششوں میں سہارا دینے سے لوگوں میں یادیو کا قد بڑھتا اور وہ شہر والوں کے لیے قابل قبول حیثیت اختیار کر جاتا۔ اس سے اس کی نیک نامی اور شہرت میں قابل قدر اضافہ ہوتا۔

کرشن نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور اس سوال کا جواب دینا شروع کیا جو میرے ذہن میں تھا لیکن پوچھ نہ سکا۔

"یہاں شیلا کے پس منظر سے کوئی واقف نہیں، ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے لیے شوبز کی دنیا میں واپسی کا ایک موقع حاصل کرنا چاہتا ہو۔"

"میرے خیال میں بہتر ہے کہ اس معاملے پر ہم مزید گفتگو ڈنر پر کریں۔" میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے ریہرسل پر جانا ہے۔" فی الحال میں اب اس پر مزید گفتگو کے موڈ میں نہ تھا۔

"ٹھیک ہے، بہتر ہے کہ تب تک بہت کچھ پتا چل جائے گا۔" کرشن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ اس معاملے کو حل ہونے کے لیے اب زیادہ وقت درکار ہوگا۔"

شیلا موسی نے بہت عمدہ ناشتا بنایا تھا۔ فارغ ہو کر سیدھا تھیٹر پہنچا۔ دوپہر تک ریہرسل پیک اپ کر دی گئی اور جب لنچ کے بعد لوٹا تو شام ڈھل رہی تھی۔ بیڈ روم میں آرام کر رہا تھا کہ کرشن آگیا اور ہم دونوں اسٹڈی میں آکر بیٹھ گئے۔

"کچھ اور پتا چلا؟" میں نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

کرشن نے کچھ اس انداز سے سر ہلایا کہ سمجھ نہ سکا کہ ہاں کہہ رہا ہے یا ناں۔ میں خاموش بیٹھ گیا۔ وہ کسی فائل میں منہمک تھا۔

شام کے سات بج رہے تھے۔ ہم دونوں کافی دیر سے خاموش تھے۔ اب تک نہ تو اس نے کوئی خاص بات بتائی تھی اور نہ ہی میں نے راجندر کے حوالے سے کچھ کہا تھا۔

اچانک اسٹڈی کے دروازے سے ویٹر بھگت رام نمودار ہوا۔ "ڈنر تیار ہے۔"

"ارے واہ..." ہم دونوں کے منہ سے ایک وقت نکلا۔

ہر جمعے کی رات کرشن کا ڈنر شہر کے مشہور اور معروف ترین زی ریسٹوران سے آتا تھا، جہاں اختتام ہفتہ کی شام نہایت شاندار امریکن کھانا بنایا جاتا تھا۔ بھگت رام وہیں کام کرتا تھا۔ ہر جمعے کی شام وہی کھانے کی ڈلیوری دینے آتا تھا۔ زی ریسٹوران کا مالک ہائی اسکول کے زمانے سے ہی کرشن کا بہت اچھا دوست تھا۔ چند برس قبل وہ نہایت سنگین مسائل سے دوچار ہو گیا تھا لیکن کرشن نے بھرپور مدد کی اور وہ مشکلات سے نکل گیا۔ شکریے کے طور پر کئی سالوں سے ہر جمعے کی شام کرشن کا ڈنر ریسٹوران سے آتا تھا۔ کھانا پیش کرنے کے لیے اسٹاف بھی ریسٹوران سے آتا تھا۔ کرشن کو بھگت رام کی عادات بہت پسند تھیں۔ اب کافی عرصے سے وہی ڈنر لے کر آ رہا تھا۔ کٹلری بھی ریسٹوران کی ہوتی تھی۔ وہ احساس ہی نہیں ہونے دیتا تھا کہ ہم ریسٹوران میں ڈنر کر رہے ہیں یا اپنے گھر پر۔ میں اکثر جمعے کی شام کرشن کے ساتھ ہی ڈنر کرتا تھا۔ پچھلے دو تین دن سے وہیں پر تھا ورنہ تو ڈنر پر آنے کے لیے کرشن ہر جمعے کی صبح ہی یاد دہانی کا فون کر دیتا تھا۔

بھگت رام کھانا لگا رہا تھا۔ میں ڈائننگ ٹیبل پر کرشن کے مدمقابل بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش خوراک اور اچھے

تھا۔ ان کا ولدادہ تھا لیکن اس وقت میرا ذہن یادیو، شیلا اور راجندر کی گتھی سلجھانے میں ادھر سے ادھر بھٹک رہا تھا۔

جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، مجھے اس سے غرض نہیں تھی کہ تھیٹر میں شمولیت سے یادیو کیا حاصل کرنا چاہتا تھا، مجھے اس سے غرض تھی کہ یادیو کو کس نے قتل کیا، شیلا کی موت سازش ہے یا حادثہ...... کسی نے یہ قتل کیا یا کروایا اور ایسا کون ہو سکتا ہے جو یادیو کا اتنا بڑا دشمن بن گیا کہ جان لے کر ہی ٹلا۔ یادیو کیا ایک خراب صنعت کار تھا، کیا اس نے دریا کو آلودہ کیا یا اپنے جرائم کی پردہ پوشی اور دو نمبر دھندوں کے لیے بااثر حکام کو رشوتیں دیں......؟ اگر سی بی آئی تحقیقات کر رہی ہے جیسا کہ بعض اخبارات کا کہنا تھا تو یہ سچ جلد یا بدیر سامنے آجائے گا۔ فی الوقت تو مسئلہ قاتل کا تھا۔

''کھانا شروع کرو......'' کرشن نے بے صبری سے کہا۔

میں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پلیٹ اٹھائی۔ ہمیشہ کی طرح کھانا بہت لذیذ تھا۔ سوچوں میں گھرا ہونے کے سبب کھانے میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بڑی کوشش کر کے میں نے سر سے خیالات کی آندھی کو جھٹکا اور کھانے پر توجہ دینا چاہی۔ اس دوران کئی بار اس معاملے پر کرشن سے بات کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن کھانے میں اس کی محویت دیکھ کر خاموش رہا۔

ڈنر کے بعد کرشن کوئی خاص بات کیے بغیر اسٹڈی میں چلا گیا۔ ہمیشہ وہ مجھے ساتھ چلنے کو کہتا تھا لیکن اس بار ایسا نہ کیا۔ میں نے بھی شاید ضرورت سے زیادہ کھانا کھا لیا تھا۔ اس لیے اسٹڈی کے بجائے بیڈ روم میں جانا ہی مناسب سمجھا۔ وقت اتنا زیادہ نہیں ہوا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے بستر پر لیٹنے کی جلدی ہو رہی تھی۔ شاید پُر ذائقہ کھانے کا خمار اثر دکھا رہا تھا۔ واقعی خمارِ گندم کے آگے واقعی ہر خمار ہیچ ہے۔

دوسری صبح موبائل فون کی میسج ٹیون سے آنکھ کھلی۔ فون اٹھایا۔ کئی میسجز آچکے تھے۔ سب میں بس ایک ہی اطلاع تھی کہ آج کی ریہرسل منسوخ کر دی گئی ہے۔ جولی نے اپنے میسج میں بتایا کہ موتی سنگھ پیٹ کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ یہ سن کر دل چاہا کہ ابھی جا کر اس کی عیادت کروں لیکن.. فی الوقت مجھے اپنے پیٹ کی پوجا کرنی تھی۔ جب چند روز پہلے میں پیٹ کی تکلیف میں مبتلا ہوا تو میری دیکھ بھال کے لیے کرشن اور مسز گریفن موجود تھیں لیکن موتی سنگھ بے چارہ تکلیف کی اس گھڑی میں تنہا تھا۔ افسوس بے چارہ موتی سنگھ......

لوڈشیڈنگ کے فائدے

☆ بجلی کے بل میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ آپ جس بل کو زیادہ سمجھتے ہیں، درحقیقت وہ کم ہوتا ہے۔ لوڈشیڈنگ نہ ہو تو بل آپ کو چیخیں مارنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

☆ ٹی وی بند ہو جاتا ہے جس سے پورے گھرانے کا اخلاق بہتر ہوتا ہے۔ تربیت کا اس سے بہتر اور سستا ذریعہ کوئی نہیں۔

☆ بچوں کی مشکوک سرگرمیاں رک جاتی ہیں کیونکہ ان کو موبائل کی بیٹری چارج کرنے کے زیادہ مواقع نہیں ملتے۔

☆ ملک میں بے روزگاری کی شرح میں کمی آتی ہے۔ جنریٹر، یو پی ایس، بیٹری، ٹارچ، لالٹین، لیمپ، چراغ اور موم بتیاں بیچنے والوں کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ مرمت (آپ کی نہیں، مذکورہ اشیا کی) کرنے والوں کی آمدنی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ بچت کی عادت کو فروغ ملتا ہے۔ بجلی ہونے کے باوجود اکثر سب کچھ بند رکھنے کو دل چاہنے لگتا ہے تاکہ بل دیکھ کر بلبلانے کی نوبت نہ آئے۔

☆ گھر والوں میں باہمی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اندھیرے میں ٹٹول کر چلنے کے سبب وہ اجالے میں بھی سنبھل کر چلتے ہیں تاکہ کسی اور سے نہ ٹکرا جائیں اور اسے زخمی نہ کر دیں۔

☆ قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر حال میں صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

☆ بندہ شکر گزار بن جاتا ہے۔ بجلی جانے کے بعد جب بھی آتی ہے، سب یک زبان ہو کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ دن میں چند رہ بیس دفعہ ایسا ہوتا رہے تو ہر شخص عادی شکر گزار بن جاتا ہے۔

☆ صابر و شاکر ہونے کی بنا پر فی الفور جنت نشین ہو جانے کے قوی امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔

☆ چھوٹے جرائم میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے کیونکہ اندھیرے میں کوئی بھی گھر سے نکلنا پسند نہیں کرتا۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی جائے گا، وہاں بجلی نہیں ہوگی۔ مجرم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہ جاتے ہیں۔

☆ تخلیقی کاموں میں رکاوٹ ضرور پڑتی ہے لیکن ایک شعبے میں اس کا زبردست فائدہ ہوتا ہے۔ بہبود آبادی کے محکمے کا کام ہلکا ہو جاتا ہے، آبادی کنٹرول میں رہتی ہے۔

☆ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے سبب سے انفرادی بینائی کو شدید افاقہ ہوتا ہے۔ فرد وہ سب دیکھنے لگتا ہے جو ہمیں قوم کی حیثیت سے قطعاً نظر نہیں آتا۔

☆ مذکورہ فوائد کی بنا پر ''سال کے 365 دن، ہر گھنٹے لوڈشیڈنگ'' ہمارا قومی مطالبہ ہونا چاہیے۔ وزارتِ بجلی اس نعرے کو اپنا موٹو بھی بنا سکتی ہے۔

ہر جا گلی، ہو دراہ بن گیا ہے

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
گھر کے عقبی حصے میں ادرک، پودینہ اور سونف لگی ہوئی تھی۔ سوچا کہ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی یہ چیزیں لے کر مونی سنگھ کے پاس جاؤں گا اور اسے ان کا قہوہ پلاؤں گا۔ آخر کو وہ میرا پرانا دوست تھا۔ اس وقت مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے تھی۔ ارادہ تھا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس بھی لے جاؤں گا۔ اگر اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ناشتے کے دوران جب کرشن کو مونی سنگھ کی طبیعت کے بارے میں بتایا تو اس نے بھی پریشانی کا اظہار کیا۔ وہ یہ سن کر خوش تھا کہ میں اس کی تیمارداری کے لیے جانے والا ہوں۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں مونی سنگھ کے اپارٹمنٹ کے لیے تیزی سے لمبی چوڑی اور تقریباً خالی سڑک پر کار دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔

بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر کار پارک کی اور مونی سنگھ کو فون ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا۔ میں سامنے کے رخ پر بلند و بالا عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازے پر الیکٹرانک سسٹم نصب تھا۔ لاک کھلوانے کے لیے مونی سنگھ کے فلیٹ پر انٹرکام کیا۔ ''ہائے مونی سنگھ......''

''کیا تم ہو شیام......'' کچھ دیر بعد اس نے انٹرکام اٹینڈ کیا۔ اس کی آواز نقاہت زدہ تھی۔

''ہاں...... دروازہ کھولو۔''

''اوکے......'' اس کے ساتھ ہی انٹرکام بند ہوا اور ایک آواز کے ساتھ گیٹ کا لاک کھل گیا۔

اندر داخل ہوا سامنے ایک زینہ تھا۔ اوپر چڑھا اور دائیں ہاتھ کو مڑا تو تیسرا فلیٹ اس کا تھا۔ ہینڈل پکڑ کر گھمایا تو دروازہ کھلتا چلا گیا۔ جیسے ہی اندر داخل ہوا لاؤنج سامنے تھا۔ نظروں کے آگے دریا کا مسحور کن منظر تھا۔ لاؤنج کی بڑی سی کھڑکی شیشے کی تھی۔ لمحہ بھر کو خیال آیا کہ یہاں سے طلوع آفتاب کا منظر کتنا حسین دکھائی دیتا ہوگا۔

''شیام...... کیا تم آگئے؟'' مونی سنگھ کی آواز سنائی دی۔

''ہاں......'' یہ کہتے ہوئے میں آگے بڑھا۔ بائیں ہاتھ پر بڑا سا کچن اور اس سے متصل بیڈروم تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہ تکیے سے پیٹ دبائے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔

''ہیلو......'' مجھے دیکھتے ہی اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ آواز سے بہت کمزور محسوس ہو رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں لیٹے رہو......'' اسے اٹھنے سے روکا۔ مجھے تین روز پہلے کی اپنی تکلیف یاد آگئی۔

''بہت تکلیف ہے۔'' مونی سنگھ کی آواز سے ڈائریکٹر والی معمول کی گھن گرج مفقود ہو چکی تھی۔

میری نظر سائیڈ ٹیبل پر پڑی۔ پانی کا گلاس خالی تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کہتا، میں نے جلدی سے گلاس اٹھایا اور کچن میں جا کر پانی بھر کے گلاس دوبارہ وہیں رکھ دیا۔ اس کے بعد واپس کچن میں گیا۔ مجھے اس کے لیے شلپا موسی کا آزمودہ قہوہ تیار کرنا تھا۔ اس دوران میری نظر کچن کاؤنٹر پر بیسن کے قریب رکھے لکڑی کے باکس پر پڑی۔ یہ ویسا ہی تھا جیسا میں کرشن کے کچن میں دیکھ چکا تھا۔ باکس میں چھوٹے بڑے چاقوؤں پر مشتمل ایک سیٹ رکھا تھا۔ ان کے دستے پر بھی ویسا ہی لوگو بنا ہوا تھا، جیسا میں نے یادیو کے سینے میں پیوست چاقو کے دستے پر دیکھا تھا۔ مجھے محسوس کیا کہ شاید چاقوؤں کا یہ سیٹ بہت مشہور ہو چکا تھا یا بہت سستا تھا کہ ہر گھر میں موجود تھا۔ کرشن کے بعد یہاں ان کی موجودگی سے سوچ رہا تھا کہ شاید ہر دوسرے تیسرے گھر میں چاقوؤں کا یہ سیٹ موجود ہوگا۔

میں آگے بڑھا اور چاقوؤں کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ مکمل سیٹ تھا۔ ان میں ویسا چاقو بھی تھا جسے دستے تک یادیو کے سینے میں پیوست دیکھا تھا۔

میں پلٹا اور کیتلی میں پانی بھر کر ابلنے کو رکھ دیا۔ کچھ دیر میں قہوہ تیار ہو چکا تھا۔ میں اسے ٹھنڈا کرتے ہوئے بیڈروم میں لے گیا۔ بڑے آرام سے اس کے تکیے علیحدہ کیے اور سہارا دے کر بٹھایا۔ ''ایک ایک گھونٹ کر کے پی لو، بڑا آزمودہ نسخہ ہے۔''

مونی سنگھ نے گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کا اشارہ کیا اور منمناتی آواز میں کہا۔ ''ذرا میرا سیاہ تھیلا پکڑانا......'' وہ خاصا نحیف محسوس ہو رہا تھا۔

کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں، سیاہ تھیلا وہاں نہ تھا۔ میں لیونگ روم کی طرف گیا۔ آئیوری صوفے کے قریب، فرش پر بچھے قالین کے اوپر سیاہ تھیلا کھلا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو آئی پوڈ پھسل کے نکل گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا تو اسکرین آن ہوگئی۔ وہاں ایک میسج تھا۔ ''مزید سکون کی ضرورت ہے کیا؟'' مرلی منوہر، مونی سنگھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں اس نام سے واقف تھا۔ اس نے کئی برس تک ممبئی میں اسٹیج پلے رائٹر کی حیثیت سے نام کمانے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی ڈراما کامیاب نہ ہوا۔ اس کی [illegible] لوگ

تھک ہار کر بیٹھ گئے لیکن وہ نہ رکا۔ ایک کے بعد ایک ڈراما لکھتا رہا۔ ناکامیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بمبئی کی تھیٹر اور فلمی دنیا میں وہ کم از کم جانا جانے لگا تھا مگر کوئی بھی اس کے لکھے ڈرامے یا فلم اسکرپٹ پر رسک لینے کو تیار نہ تھا۔ اچانک ایک خیال میرے دماغ میں گونجا۔ میں نے وہ میسج ایک بار پھر پڑھا۔ ''کہیں برائٹ لائنس ممبئی کا بلاگر یہی تو نہیں؟'' بہرحال، منوہر ایک رائٹر تھا اور لکھنا بھی جانتا تھا، وہ بلاگر بھی ہوسکتا تھا۔ آئی پوڈ کو واپس سیاہ تھیلے میں ڈالا اور بیڈ روم میں چلا آیا۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر مونی سنگھ نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ سیاہ تھیلا اس کے برابر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''بہت شکریہ......'' مونی سنگھ نے بدقت تمام کہا۔ ''شاید تمہیں یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہ پڑے، جولی نے فون کیا تھا، وہ پہنچنے والی ہوگی۔''

میں مسکرا دیا۔ ''اس وقت تمہیں دوستوں کی ضرورت ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ ''تم واقعی سچے دوست [illegible]

میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ مونی سنگھ سے بہت کچھ پوچھوں گا لیکن اس کی حالت دیکھ کر سارے سوال زبان تلے ہی خاموش بیٹھے رہے۔ یہ ان سوالوں کے جوابات سننے کا موقع نہ تھا۔

کچھ دیر مونی سنگھ کے پاس ٹھہر کر میں واپس [illegible] چل دیا۔ فی الحال میں اس قابل نہ تھا کہ جو کچھ محسوس کر رہا تھا، اسے بیان بھی کرسکوں۔ بطور اداکار مجھے اوپر والے نے اس صلاحیت سے نوازا ہے کہ کردار کے احساسات اور ان کی وجوہات کو دوسروں سے زیادہ درست انداز میں محسوس کرسکوں، اسی سے اداکاری میں جان پڑتی ہے۔ شاید یہی سبب تھا کہ مونی سنگھ سے یادیو، شیلا، راجندر یا ان سے جڑے کچھ اور سوالوں کے بارے میں پوچھنے کے بجائے چند رسمی باتیں کرکے خاموش ہورہا تھا۔

اس وقت بھی میں یادیو قتل کیس کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں اس کیس میں اتنے موڑ آئے تھے کہ میں تو کم از کم چکرا کر رہ گیا تھا۔ کرشن بھی کنفیوز تھا۔ ہم دونوں کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پائے تھے۔ کرشن کی اطلاعات کے مطابق پولیس بھی گتھی سلجھانے میں ناکام رہی تھی۔ وہ بھی ادھر سے ادھر تفتیش کے گھوڑے مسلسل دوڑا رہے تھے لیکن معاملہ بظاہر تاریکی میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک بار گتھی سلجھ گئی تو سب سامنے آجائے گا۔ [illegible] جولی کو راجندر کے فون سے بھیجے گئے دھمکی آمیز میسج کے۔

میں نے دریا کنارے ایک کافی شاپ پر کار روکی، کافی لی اور موبائل سے راجندر کا نمبر ملانے لگا۔ وہ تین بار ٹرائی کیا لیکن فون اٹینڈ نہ ہوا۔ مجھے امید پیدا ہوئی کہ ہوسکتا ہے کہ وہ کرشن کے گھر پر میرا انتظار کر رہا ہو۔ پہنچا تو مایوسی ہوئی، وہ آیا ہی نہ تھا۔ میں نے فریج کھولا۔ وہ بھی خالی تھا۔ ایک بار پھر مایوسی ہوئی۔ پیٹ کے چوہوں کو تسلی دیتا ہوا کچن کی طرف بڑھا تو شاندار مہک نے استقبال کیا۔ شلپا موسی کو بیکنگ کا بہت شوق تھا۔ اس وقت بھی وہ مفن تیار کر رہی تھیں۔ کچن کاؤنٹر پر پلیٹ میں کئی گرما گرم مفن تیار رکھے تھے۔ میں نے ایک پلیٹ اٹھائی، دو مفن رکھے۔ دودھ سے گلاس بھرا اور ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد کرشن بھی کچن میں داخل ہوا۔ ''شکر ہے، جلدی لوٹ آئے۔'' وہ کرسی گھسیٹ کر سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ ہمیں راجندر کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے دو گھونٹ دودھ پی کر گلاس ٹیبل پر رکھا۔ ''اسے یہ بتانا ہی پڑے گا کہ جولی کو میسج کس نے بھیجا تھا؟''

کرشن نے دوسری پلیٹ سے دوسرا مفن اٹھایا۔ ''میرا خیال ہے کہ جولی کو راجندر کے فون سے بھیجا گیا میسج یادیو کے منصوبے کا حصہ تھا۔ شاید راجندر اپنی جگہ درست ہے: ممکن ہے کہ اب اگلا نشانہ وہی ہو۔''

یہ سن کر میں نے بھنویں چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ کیس نہایت پیچیدہ ہورہا تھا۔ پولیس نے تو اب تک کچھ نہیں کہا لیکن ہمارے اندازوں نے گتھی الجھا کر رکھ دی تھی۔ سیدھا سادہ قتل بہت پیچیدہ رخ اختیار کرچکا تھا۔ ایک اداکار کی زندگی پُرلطف ہوتی ہے لیکن جب سے میں نے چھٹیاں منسوخ کرکے مونی سنگھ کے کھیل میں کردار ادا کرنے کی حامی بھری تھی، تب سے میری زندگی مشکل تر ہوتی جارہی تھی۔ سوچ سوچ کر دماغ تھک چکا تھا۔

''میرا خیال نہیں کہ یادیو دراصل یہ چاہتا تھا کہ راجندر اس ڈرامے میں کردار ادا نہ کرے۔'' مجھے خاموش دیکھ کر کرشن نے خود ہی مزید کہنا شروع کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ یادیو ہی راجندر کو لے کر آیا ہوگا تاکہ مونی سنگھ اس کی امیدوں پر پورا اترنے کے لیے زیادہ تندہی سے کام کرسکے۔''

''اور جب راجندر اچانک ہی وقت پر دورا پڑے یا دنیا چھوڑ جائے تو موہنی سنگھ کا بھٹا بیٹھ جائے اور وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائے..... ہے نا۔'' میں نے قطع کلامی کر کے لقمہ دیا۔

''شاید.....'' کرشن نے آہستہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یادیول سے یہی چاہتا تھا کہ راجندر ہو یا نہ ہو مگر شو کسی طور پر بھی کامیاب نہیں ہونا چاہیے۔'' کرشن نے کیس کی بکھری کڑیوں کو دوبارہ جوڑ کر تجزیہ بنانا شروع کیا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ چاہتا ہو کہ افتتاحی شب کو راجندر اسٹیج پر موجود ہو لیکن حاضرین کی تعداد پھر بھی کم رہے۔'' یہ کہہ کر کرشن نے مفن کا باقی ٹکڑا نگلا اور دو گھونٹ پانی پی کر دوبارہ گویا ہوا۔ ''اگر راجندر جیسے بڑے اداکار کی موجودگی کے باوجود حاضرین کی تعداد پہلے سے طے شدہ ہدف کے مطابق نہ ہوئی تو اس کی صورت میں بھی بورڈ آف ڈائریکٹرز کی کئی نشستوں پر یادیو کے منظور نظر قابض ہوجاتے، یوں وہ ایم ایل ٹی کا کنٹرول حاصل کر لیتا۔ دراصل وہ دکھا کچھ اور رہا تھا مگر حقیقت میں کنٹرول دوسرا کھیل رہا تھا۔''

تھیٹر کمپنی چلانا آسان کام نہیں ہے۔ یہ اکثر مالی بحرانوں کا شکار رہتی ہیں اور نہ صرف اداکار بلکہ خود مالکان تک بھی یہی مثال ہوتی ہے کہ کنواں کھودا، پیاس بجھائی۔ کبھی کبھار تو کنواں کھودنے کے باوجود بھی پانی نہیں ملتا۔ ناظرین کو اپنے ڈرامے کی طرف راغب کرنا، تشہیر کے لیے میڈیا کی منت سماجت، گرانٹس کے لیے سرکاری محکموں کے پیچھے دوڑنا بھاگنا، ٹیکس ادائیگی کی پیچیدگیاں..... ایک نہیں درجنوں مسائل ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں نے کہا۔ ''ایم ایل ٹی جیسا درد سر پالنے کے لیے یادیو سازشوں کے اتنے پاپڑ کیوں بیل رہا ہوگا؟''

کرشن نے میری طرف بغور دیکھا اور کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''شیام..... میرا خیال ہے کہ وہ اپنی بیوی سے بے انتہا پیار کرتا ہوگا۔ اسے ڈر ہوگا کہ کہیں کبھی وہ اسے چھوڑ کر نہ چلی جائے۔ اسی لیے وہ اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے تھیٹر کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہوگا اور موہنی کے تھیٹر کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد شیلا اس کی مختارِ کل بن سکتی تھی۔ یہ ان کے رشتے کو زیادہ مضبوط کرسکتا تھا۔'' یہ کہہ کر وہ رکا اور کچھ توقف کے بعد کہنا شروع کیا۔ ''وہ اپنی بیوی کو خوش کرنا چاہتا ہوگا۔ سمجھتا ہوگا کہ تھیٹر کا کنٹرول حاصل کر کے شیلا اپنے ادھورے خواب کو دوبارہ پورا کرنے کی کوشش کرسکتی ہے۔ بدلے میں اسے بیوی کے دل میں مزید جگہ لے سکتی تھی۔'' یہ کہہ کر وہ رکا۔ ''ایک بات اور.....''

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔

''اس کے لیے یادیو کو بہت زیادہ وقت کی ضرورت نہ تھی۔'' کرشن نے کہنا شروع کیا۔ ''پہلے شو کے بعد ہی وہ جولی کی چھٹی کرا کے اس کی جگہ شیلا کو لانا چاہتا ہوگا۔''

میں نے کچھ سوچا اور پھر اسے مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔ ''بطور اداکارہ، انٹرنیٹ پر موجود ناقدین کی رائے اس کے بارے میں زیادہ اچھی نہیں۔ تقریباً تمام جائزوں کا یہی کہنا ہے کہ تمام تر خوب صورتی اور کشش کے باوجود شیلا کبھی اچھی اداکارہ کے طور پر تسلیم نہیں کی گئی تو پھر یہاں اس کی کامیابی کی دلیل کیا تھی جو یادیو اتنا بڑا قدم اٹھانے چل دیا تھا۔'' یہ کہہ کر میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ''ویسے بھی جہاں تک میں موہنی سنگھ کو جانتا ہوں، وہ بہت پروفیشنل ڈائریکٹر ہے۔ اسے اپنے کام پر کسی قسم کا سمجھوتا قبول نہیں اور پھر وہ شیلا جیسی اداکارہ کو مرکزی کردار کیسے دے سکتا ہے جبکہ وہ جولی کو اس کردار کے لیے ہر لحاظ سے مکمل سمجھتا ہے۔''

''ایسے صرف تھیٹر اور برائے نام ڈائریکٹر کی ضرورت تھی۔''

کرشن کی بات سن کر مجھے غصہ آیا مگر خاموش رہا۔ تھیٹر کی دنیا میں موہنی سنگھ کا نام احترام سے لیا جاتا ہے، ناقدین کی بھی رائے ہمیشہ اس کے موافق رہی ہے۔ اسے اپنے نام کی بہت فکر رہتی تھی اور کبھی بھی مرکزی کردار کے لیے کسی کمزور اداکارہ کو قبول نہیں کرسکتا تھا تاوقتیکہ وہ بہت دباؤ اور مجبوری دونوں کا بیک وقت شکار نہ ہوجاتا۔ اس کے باوجود بھی اسے جاننے والے کہہ سکتے ہیں کہ ایسی صورتِ حال میں بھی اس کے منہ سے انکار نکل سکتا ہے۔ ''وہ ہمیں سب چھوڑ کر فی الحال یہ پتا لگانا ہے کہ جولی کو دو پیغام بھیجنے سے راجندر کی مراد کیا تھی، وہ کیا مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا، کیا اس پیغام کا مقصد وہی تھا جو لکھا تھا کہ تمہاری زندگی کے گنتی کے دن باقی رہ گئے ہیں۔''

کرشن نے سر ہلا کر مجھ سے اتفاق کیا۔ ''اٹھو..... ہمیں چند فون کرنا ہوں گے۔''

کچھ دیر بعد ہم دونوں اسٹڈی میں بیٹھے تھے۔ کرشن اس بڑے اداکار کا پتا چلانے کے لیے فون ملا رہا تھا جو کم از کم میرے نزدیک مشتبہ تھا وہ بھی قتل اور دھمکی دینے کے سنگین الزامات میں۔

''میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں کچن میں چلا آیا۔ شیلا موہنی اب تک ناشتا تیار کرنے میں جتی ہوئی تھیں۔ میں

ایک بٹن دبانے کے لیے آگے بڑھا تو چاقوؤں کا باکس اپنی جگہ رکھا تھا لیکن اب بھی اس سیٹ میں سے ایک بڑا چاقو غائب تھا۔ باکس دیکھتے ہی یادیو کے سینے میں دستے تک پیوست چاقو نگاہوں میں گھوم گیا۔ خوف کی ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی تک اترتی محسوس ہوئی۔

اسی دوران شلپا موسی باہر گئیں تو میں نے جلدی، جلدی یہ پتا چلانے کی کوشش کی کہ وہ بڑا چاقو کہاں ہے۔ سب سے پہلے بیسن میں دیکھا۔ الماریاں کھول کر ان میں جھانکا، درازیں کھولیں مگر وہ چاقو کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے کرشن سے اس چاقو کی گمشدگی کی بات سرسری طور پر کی تھی۔ وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا لیکن اب مجھے پتا چل چکا تھا کہ وہ چاقو کس نے غائب کیا ہوگا۔

مجھے بہت کچھ یاد آچکا تھا۔ یادیو کے قتل سے ایک روز پہلے میں کرشن کے گھر پر تھا۔ کچن میں بیٹھا ناشتا کررہا تھا کہ موتی سنگھ اچانک نمودار ہوا۔ وہ کرشن سے ملنے پہنچا تھا مگر وہ گھر پر نہ تھا۔ مسز گریشن موتی سنگھ سیٹ گئی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کے لیے کافی تیار کی اور ہاتھ دھونے کے لیے واش روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ واپس جانے کے لیے تیار تھا۔

میں جلدی سے اسٹڈی میں پہنچا، کرشن فون پر مصروف تھا۔ ”کچھ دیر میں آتا ہوں۔“ یہ کہہ کر پلٹا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر تیزی سے باہر پہنچا۔ چند منٹوں بعد میں اپنی ہنڈا دوڑاتا ہوا موتی سنگھ کے گھر جارہا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ جب اس کے گھر پر خود چاقوؤں کا وہی سیٹ موجود تھا تو پھر اس نے یادیو کو قتل کرنے کے لیے کرشن کے کچن سے چاقو کیوں چرایا تھا؟

میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں اڑ کر اس تک پہنچنا چاہتا تھا لیکن سڑک پر ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ کئی جگہ ٹریفک جام ہورہا تھا۔ میں نے مین اسٹریٹ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ آگے جا کر موڑ کاٹا اور لبرٹی ایونیو پر آگیا۔ یہ سڑک آگے جا کر موتی سنگھ کے گھر جانے والی بڑی سڑک پر ختم ہوجاتی تھی۔

دن کا وقت تھا لیکن اس کے باوجود بلڈنگ کے اطراف چہل پہل نہ ہونے کے برابر تھی۔ موتی سنگھ کی بلڈنگ کے سامنے پارکنگ میں صرف چند کاریں موجود تھیں، ان میں سے ایک کار جولی کی بھی تھی۔

میں نے کار اس طرح پارک کی کہ موتی سنگھ کے فلیٹ کی کھڑکی سے کوئی نہ تو میری کار دیکھ سکے اور نہ ہی مجھے بلڈنگ کی طرف آتا دیکھ پائے۔ بچتا بچاتا گیٹ تک پہنچ گیا لیکن ایک مشکل آن کھڑی ہوئی مگر میرے زرخیز دماغ نے اس کا بھی حل نکال لیا۔ جب تک موتی سنگھ اندر سے لاک نہ کھولتا میں گیٹ کے اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا اور گیٹ کھولنے کے لیے الیکٹرانک چابی یا کی کارڈ میرے پاس تھا نہیں۔ اس طرح ایک اوٹ میں کھڑا ہوگیا کہ آتے ہوئے کسی بھی شخص کو دیکھ سکوں۔ تقریباً دس منٹ بعد ایک نوجوان جوڑا، اُلفت میں سرشار اور ایک دوسرے میں گم، جھومتا جھامتا گیٹ کے قریب آتا دکھائی دیا۔ میں نے جلدی سے موبائل فون نکالا اور اسے آف کرکے کانوں سے لگالیا اور دوسرے میں بٹوا اس طرح پکڑ لیا جیسے کی کارڈ نکالنے والا تھا مگر فون کی وجہ سے ہاتھ خالی نہیں ہے۔ میں فون پر باتیں کرتا ہوا گیٹ کی طرف پہنچا۔ اس دوران نوجوان نے اپنی کی کارڈ نکالا اور اگلے ہی لمحے گیٹ کھل گیا۔ میں بدستور فون پر جھوٹ موٹ کی باتیں بناتا ہوا، ان کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔ ”تھینک یو......“ اندر داخل ہوکر میں نے فون کان سے ہٹا کر ان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

جواباً وہ دونوں بھی مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ وہ سمجھے کہ شاید میں اسی بلڈنگ میں رہتا ہوں لیکن فون پر مصروف ہونے کی وجہ سے ہاتھ خالی نہ تھے اس لیے کارڈ نہ نکال سکا۔ وہ دونوں گراؤنڈ فلور کی راہداری میں اُلٹے ہاتھ پر مڑ گئے اور میں زینے کی طرف چلنے لگا۔ موتی سنگھ کو اطلاع دیے بغیر میں بلڈنگ کے اندر داخل ہوچکا تھا۔

میں نے فون جیب میں رکھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا موتی سنگھ کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے ہینڈل تھام کر آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ بے آواز اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ میں نے آہستہ سے اندر قدم رکھا۔ لاؤنج میرے سامنے تھا اور جو منظر وہاں تھا، اس نے میرے اوسان خطا کردیے۔

آئیوری صوفے پر راجندر نیم دراز حالت میں بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم سے بہنے والے خون نے صوفے کو گلابی کرنا شروع کردیا تھا۔ فرش پر بھی بہت سارا خون پھیلا ہوا تھا۔ لاؤنج میں ہر طرف سے بساند اٹھتی محسوس ہورہی تھی۔ جولی کھڑکی کے ساتھ سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر بھی خون لگا ہوا تھا۔

موتی سنگھ اطمینان سے میری طرف مڑا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا چاقو تھا۔ ”شیام...... تم بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے ہو۔ جولی نے راجندر کو قتل کردیا ہے۔ یہ بالکل پاگل ہوگئی

تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے چاقو چھین لیا ہے۔ ورنہ تو شاید یہ مجھے بھی......'' وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

میں کچھ کہے بنا، اپنے حواس پر مکمل قابو رکھتے ہوئے آگے بڑھا اور خون آلود فرش سے بچتے بچاتے جولی تک پہنچا۔ اسے سہارا دیا تو وہ میرے گلے لگ گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ نیم سکتہ حالت میں تھی۔ ''موتی سنگھ...... ہمیں یہاں پر کچھ مدد کی ضرورت ہے۔''

یہ سن کر اس نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ مسکرایا۔ ''ہاں، ہاں...... کیوں نہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گاؤن کی جیب سے موبائل نکالا، اسکرین دیکھی اور کال ریسیو کرکے کہنے لگا۔ ''تم ابھی وہیں ٹھہرو، میں کال کرتا ہوں۔''

اس دوران میں موتی سنگھ کے چہرے کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ میں اسے کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ کن حالات میں اس کے تاثرات کیا ہوتے ہیں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ اگر بہترین ڈائریکٹر تھا تو میں پیدائشی اداکار۔ لوگوں کے تاثرات کا مشاہدہ میری عادت ہے۔ سمجھ گیا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ یہ پرانی ترکیب تھی اور کچھ دیر پہلے بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے میں خود اس کا استعمال کرچکا تھا۔ وقت بہت نازک تھا۔ نہ کچھ کہا اور نہ ہی تاثرات سے یہ ظاہر ہونے دیا کہ اس کا جھوٹ پکڑا جا چکا ہے۔

موتی سنگھ نے فون جیب میں ڈالا۔ اس کی نگاہیں مجھ پر تھیں۔

میں نے جولی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیا اور اسے ساتھ لیتا ہوا دروازے کی سمت ایک قدم آگے بڑھایا۔ ''اسے سیڑھیوں سے نیچے لے کر جا رہا ہوں۔'' میرا لہجہ ایسا تھا کہ اس ساری صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے جیسے اس کی مدد کرنے کا پورا ارادہ رکھتا ہوں۔

ہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جولی اور خود کو بچانے کے لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا۔

جیسے ہی دوسرا قدم آگے بڑھا، موتی سنگھ میری طرف لپکا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور صاف ظاہر تھا کہ وہ مجھ پر وار کرنے والا تھا۔ جیسے ہی وہ جھپٹ کر میری طرف آیا، میں نے جولی کو ایک جھٹکے سے موڑا اور اپنے جسم سے اسے ڈھال فراہم کردی۔ موتی سنگھ اپنی ہی روانی میں آگے نکل گیا لیکن اس کا چاقو میرے دائیں بازو سے رگڑ کھاتے گزرا۔ تکلیف کا احساس ضرور ہوا لیکن دماغ پوری طرح کام کررہا تھا۔ مجھے جولی کو ہر حال میں اس کے وار سے بچانا تھا۔ میں نے جوابی وار کے لیے لمحہ بھر میں فیصلہ کرلیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر سنبھلتا اور مجھ پر دوبارہ وار کرنے کی کوشش کرتا یا میں اس پر جھپٹتا، ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور اگلے ہی لمحے زوردار آواز گونجی۔ ''ہینڈز اپ......'' سامنے دو پولیس والے کھڑے تھے۔ انہیں پوری صورتِ حال سمجھنے میں بمشکل تیس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ کچھ دیر بعد موتی سنگھ فرش پر بیٹھا تھا۔

بعد میں کرشن نے مجھے بتایا کہ جس طرح میں موتی سنگھ کے گھر جانے کا کہہ کر نکلا، اس سے وہ پریشان ہوگیا تھا۔ کافی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا ہوا ہوگا لیکن کچھ سمجھ نہ آیا۔ اچانک خطرے کا احساس ہوا اور سی پی کمشنر کو فون کیا۔ وہ کرشن کا بہت اچھا دوست تھا۔ کرشن نے اسے ساری صورتِ حال بتائی تو اس نے فوراً موتی سنگھ کے گھر کا پتا نکالا اور پھر وہاں گشت پر موجود پولیس والوں کو فلیٹ پر پہنچ کے معاملہ دیکھنے کی ہدایت کی۔ یہ سن کر ایک دم مجھے خیال آیا۔ میں نے اندر آتے ہوئے گیٹ میں ایک لوکنگ کارڈ پھنسایا تھا تاکہ وہ لاک نہ ہوسکے۔ اگر یہ حرکت نہ کرتا تو شاید پولیس والے بروقت اندر داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ کرشن اور میری سوچ بہت ملتی جلتی ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ کسی اہم معاملے پر ہم دونوں سوچتے رہے اور جب ایک دوسرے کو بات بتائی تو مماثلت سے دونوں ہی حیران ہوئے۔ شاید یہی اس دن کام آگئی ورنہ شاید جولی یا شاید میں یا پھر ہم دونوں بھی اس دنیا سے بھیجے جا چکے ہوتے۔

موتی سنگھ کے وار سے میرے بازو پر ہلکا سا کٹ آیا تھا لیکن جولی کے بازو اور کلائی پر لگنے والا زخم گہرا تھا۔ اسے سترہ ٹانکے لگے۔ راجندر کے جسم پر تو چاقو کے کئی گھاؤ تھے۔ بڑی بے دردی سے اس کے جسم میں چاقو گھونپے گئے تھے لیکن یہ اس کی قسمت تھی کہ کوئی وار دل یا جسم کے کسی ایسے حصے پر نہیں لگا تھا کہ جو ہلاکت ثابت ہوسکتا۔ البتہ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسے بروقت اسپتال پہنچا دیا گیا، جس کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی۔ راجندر اسپتال میں تھا۔ اسی دوران ایک فلم کمپنی نے اس پورے واقعے پر ایک فلم بنانے کا اعلان کردیا، جس میں جولی اور راجندر کو مرکزی کردار ادا کرنے تھے۔ اسکرپٹ کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ کمپنی کو صرف راجندر کی اسپتال

سے واپسی کا منتظر تھا۔

بعد میں پتا چلا کہ راجندر کی وجہ سے ہی جولی کی زندگی بچ پائی تھی۔ اصل میں تو قتل جولی کو ہونا تھا، راجندر بیچ میں آیا تو جولی کی جان بچاتے، بچاتے اسے بھی اپنا خون بہانا پڑ گیا تھا۔ جولی نے مجھے بتایا کہ دراصل راجندر نے اسے نہیں بلکہ اس نے اُسے بچایا تھا۔ جولی کا کہنا تھا کہ وہ راجندر اور ایک دوسرے شخص کے ساتھ موتی سنگھ سے ملنے آئی تھی۔ وہ یادیو کے قتل کے بعد راجندر اور موتی سنگھ کے درمیان پیدا ہونے والی غلط فہمی دور کرانا چاہتی تھی۔ موتی سنگھ اس ملاقات پر رضامند تھا لیکن جب وہ فلیٹ میں داخل ہوئی تو موتی سنگھ نے اچانک راجندر پر بلّہ بول دیا۔ جس کی وجہ سے اُس کا دوسرا ساتھی فلیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی باہر بھاگ گیا۔

میں نے جولی سے پوچھا تھا۔ ''دوسرا شخص کون تھا؟''

وہ مسکرا کر جواب گول کر گئی ''ایک بے ضرر انسان...... بہتر ہوگا کہ اس کا ذکر نہ کریں۔ اس کہانی میں وہ کہیں نہیں تو بیچ میں لانے کا کیا فائدہ۔''

میں نے بھی نام جاننے پر زور نہ دیا لیکن میرے ذہن میں دو نام گونجے تھے۔ پرنس لاکس ممبئی اور مرلی منوہر...... ممکن ہے ایسا نہ ہو، شاید ہو بھی سکتا ہے۔ لمحہ بھر کو میرے دل میں احساسِ رقابت جاگا تھا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے جولی اور اس سے جڑے نامعلوم مرد کے لیے رقابت کے احساس کو دماغ سے باہر کا راستہ دکھا دیا۔ پل اسٹیشن پر حسیناؤں کے جھرمٹ میں چھٹیاں گزارنے کا خیال جولی سے زیادہ دلکش محسوس ہو رہا تھا۔

موتی سنگھ کا حلفاً کہنا تھا کہ اس نے یادیو کو قتل نہیں کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اُسے شیلا نے قتل کیا تھا کیونکہ وہ جولی کا مرکزی کردار اُسے دینے کے حق میں نہیں تھا۔

''ویسے بھی اُسے یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ مجھے پیشہ ورانہ طور پر تباہ کردے۔ میں یادیو کے حق میں تھا۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ شیلا اس کی جگہ لے۔'' یہ باتیں اُس نے تب کہی تھیں جب میں اور کرشن اُس سے ملاقات کے لیے ممبئی سینٹرل جیل گئے تھے۔ ''جب شیلا پہلی بار ریہرسل پر آئی تھی، تب میں نے سوچا تھا کہ اگر دوبارہ آئی تو اسے قتل کردوں گا، وہ مجھے برباد کرنے پر تلی تھی لیکن اس کے بعد وہ کبھی تھیٹر نہیں آئی۔''

''لیکن جولی کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟'' میں نے موتی سنگھ سے ایک موقع پر پوچھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے خاموشی سے منہ دوسری طرف کرلیا تھا۔ اس کے چہرے پر اندر کا دکھ صاف نظر آ رہا تھا۔ جولی کے ذکر پر اس کی پلکیں رفتہ رفتہ نم ہو رہی تھیں۔

موتی سنگھ کی گرفتاری کے دو ماہ بعد میں موتی سنگھ سے ملنے جیل گیا۔ اس سے پوچھا کہ ''کرشن کے کچن سے چاقو کیوں چرایا تھا؟''

یہ سن کر وہ سخت حیران ہوا۔ ''شیام...... ہم سب دوست تھے، تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ بھلا کرشن کو کہیں پھنسا کر مجھے کیا ملتا؟''

موتی سنگھ کا اصرار تھا کہ شیلا کے قتل میں بھی اس کا کوئی ہاتھ نہیں لیکن پولیس یہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ پولیس کی سرتوڑ کوشش تھی کہ یادیو اور شیلا کا قتل موتی سنگھ پر ثابت کرسکے لیکن ایک بھی ایسا ثبوت نہ مل سکا جسے عدالت میں ثابت کیا جاسکے۔ نہ ہی دونوں میاں بیوی میں سے کسی ایک کے قاتل کا بھی پتا چلا۔

چھ ماہ بیت گئے۔ سردیاں شروع ہونے والی تھیں۔ کرشن نے موتی سنگھ کے لیے ممبئی کے سب سے بہترین کریمنل وکیل کا انتظام کیا۔ سارا خرچ برداشت کیا لیکن موتی سنگھ بچ نہ سکا۔ البتہ انتھک کوشش کے باوجود پولیس شیلا اور یادیو کے قتل کو عدالت میں موتی سنگھ پر ثابت نہ کرسکی۔ جس پر یہ الزام اُس پر سے خارج کردیا گیا۔ اسے جولی اور راجندر پر جان لیوا حملہ کرنے کے جرم میں پچیس سال کی سزا سنا کر دہلی کی تہاڑ جیل بھیج دیا گیا۔ رفتہ رفتہ یادیو اور شیلا کا کیس بھی سرد خانے میں چلا گیا۔

اس پورے عرصے کے دوران موتی کے تھیٹر کا معاملہ ٹھپ پڑا رہا۔ سزا کے بعد موتی سنگھ نے ایم ایل ٹی کا مختارِ کل کرشن کو نامزد کردیا تھا۔

وہ خزاں کی ایک اُداس شام تھی۔ جمعہ کی شب زی ریستوران سے ڈنر آنے والا تھا۔ کرشن نے مجھے بھی بلالیا تھا۔ باتوں، باتوں میں کرشن نے کہا۔ ''یکم جنوری سے تھیٹر کو فعال کرنے کی تیاریاں شروع کردی گئی ہیں۔ چیف منسٹر مہاراشٹر نے ہمارے لیے دو کروڑ روپے کی خصوصی گرانٹ منظور کرلی ہے۔ اب آگے چل کر تھیٹر کے ساتھ، ساتھ ایک ایکٹنگ انسٹی ٹیوٹ بھی بنے گا اور یہ سب بہت جلد مکمل ہوگا۔''

میں نے ستائشی نگاہوں سے کرشن کو دیکھا۔ ''کمال کیا تم نے تو۔''

کرشن میری تعریف کو نظرانداز کر گیا۔ ''ہم وہی ڈراما

اسٹیج کریں گے جسے موتی سنگھ نے لکھا تھا۔ مرکزی کردار تم اور جولی کرو گے۔"

"کیا.....!" میں نے حیرت سے کہا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ موتی سنگھ کے بعد ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ "تو اب تھیٹر کون چلائے گا؟"

کرشن مسکرایا اور انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارے ساتھ مل کر۔ تم چیف ایگزیکٹو آفیسر بھی ہو گے۔"

مجھے کچھ خاص خوشی نہ ہوئی۔ میرے لیے یہ حیران کن بات نہ تھی۔ قانونی طور پر وہ اس کا مجاز تھا، جو چاہتا کرسکتا تھا۔

اس کے بعد ایک بار پھر یادیو، شیلا، راجندر اور موتی سنگھ کا تذکرہ چھڑ گیا۔ میں ایک بار پھر پرانا کھاتا کھول بیٹھا تھا۔ "یہ نہیں چل سکا کہ کیا کچھ ہوا ہے اس ڈرامے کی آڑ میں اور یہ سب کس نے کیا تھا؟"

کرشن مسکرایا۔ "اس حوالے سے آج تک تم اپنے امکانات سناتے رہے، آج قیاس اور امکانات پر مبنی ایک کہانی میں تمہیں سناتا ہوں۔" یہ کہہ کر میری طرف غور سے دیکھا۔ "تو بات یہ ہوئی کہ موتی سنگھ، جولی کو چاہتا ہوگا لیکن بیچ میں یادیو آ گیا۔ شیلا ڈرامے میں نہیں پورے کا پورا تھیٹر چاہتی ہوگی اور یادیو ان سے چھٹکارا۔ اسی لیے عیاش راجندر کو لے آیا مگر اسے کہاں پرانی محبوبہ اور حال کی بوڑھی حسینہ کے جال میں پھنسنے والا تھا۔ اسے جولی کے ساتھ مرکزی کردار کیا ملا، وہ تو اسی پر دل ہار بیٹھا۔ اب کوئی بھی جولی کا عاشق جو اسکینڈل کے خوف سے دنیا کے سامنے آنے سے ڈرتا ہوگا۔ اس نے یہ دیکھا تو اپنا پیار بچانے کی کوشش کی۔ یادیو کاروباری تھا۔ وہ جولی کے بدلے تھیٹر کو زیادہ پسند کرتا۔ معاملات طے کرنے کے لیے جولی کے گمنام عاشق نے یادیو کو بلایا اور اس کی جان لے لی۔ اسی نے کسی طریقے سے ایک فون سم حاصل کی اور جولی کو بتایا کہ وہ نمبر راجندر کا ہے۔ یوں اسے راجندر کا میسیج مل گیا۔ قتل کی گتھی سلجھانے والے شیام کپلا گر نے فون کر کے جھٹکا دیا۔ رہی سہی کسر اس مشروب نے پوری کردی، جس سے وہ پیٹ کے مرض میں مبتلا ہوگیا اور اسے خود اپنی فکر کھانے لگی۔ اب رہی شیلا تو وہ شوہر کے مرنے کے فوراً بعد موتی سنگھ سے تھیٹر میں پارٹنرشپ مانگنے لگ گئی تھی۔ وہ شوہر کی لاش پولیس تحویل سے ملنے سے پہلے ہی تھیٹر سے متعلق قانونی کارروائی مکمل کرنے پر زور دے رہی تھی۔ موتی سنگھ پریشان تھا اور شیلا بھی ہو چکا تھا۔ عاشق نامراد نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور کسی کے ایک کرائے کے قاتل سے شیلا کا مشکوک انداز میں خاتمہ کرادیا۔ رہ گیا موتی سنگھ۔ اس پر باور ہو چکا تھا کہ راجندر، جولی کو تھیانا چاہتا ہے، وہ اتنا پریشان تھا کہ اس نے راجندر کو دیکھتے ہی حملہ کردیا۔ جولی بیچ بچاؤ میں پھنس گئی اور پھر پولیس پہنچ گئی۔"

یہ کہہ کر وہ کچھ دیر کو رکا۔ "کچھ آیا سمجھ میں......" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے سوال کردیا۔

میں نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیے۔ "کاش اس دن موتی سنگھ کا فون کچھ دیر بعد آتا۔" میں بڑبڑایا۔ "تفریح کے لیے جانا تو ہوا، الٹا چکرا کے رکھ دیا تھا اس سارے جھمیلے نے۔"

"ایک بات یاد رکھنا۔" کرشن نے میری طرف دیکھا۔ "کتابوں کے صفحۂ اول پہ لکھا ہوتا ہے نا کہ اس کہانی کے تمام کردار فرضی ہیں اور ان سے کسی قسم کی مماثلت محض اتفاقیہ ہوگی۔" یہ کہہ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرا دیا۔ "کچھ سمجھے کہ نہیں؟"

"بہت کچھ۔" میرا انداز بھی ذو معنی تھا۔

"ہیلو......" اچانک کمرے میں جانی پہچانی آواز گونجی۔

میں دروازے کی طرف پشت کیے بیٹھا تھا۔ چونک کر سر اٹھایا۔ سرخ ساڑھی میں ملبوس دو آتشہ بنی جولی اسٹڈی میں داخل ہو رہی تھی۔

کرشن تیزی سے آگے بڑھا اور اسے بانہوں میں تھام لیا۔ "ہیلو ڈارلنگ۔"

میں سخت پریشان تھا۔ دماغ ماؤف تھا۔ جولی اداکارہ تھی لیکن اس سے پہلے اسے اتنا تیار بھی نہ دیکھا تھا۔ دوسری حیرانی کی بات یہ تھی کہ وہ مینشن میں کیسے...... اس سے پہلے اسے کبھی یہاں نہیں دیکھا تھا اور یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ جولی اور کرشن اتنے قریبی دوست ہیں۔ میرے لیے یہ سب کچھ بہت حیران کن تھا۔ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔

کرشن اسے بانہوں میں لیے میری طرف بڑھا۔ "اس سے ملو......"

"تم......" جولی حیران تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی حیرانی اداکاری نہیں تھی۔

"شیام...... ہم دونوں اگلے ہفتے شادی کرنے والے

ہیں۔''

''کیا۔۔۔۔۔'' کرشن کا یہ اعتراف سن کر تو میں حیرانی سے اچھل پڑا۔ میرے لیے فرائی ڈے سرپرائز ڈے بن گیا تھا۔

''جولی اپنے خوابوں میں ہمیشہ خود کو تھیٹر کی مالک اور ڈائریکٹر بنا دیکھا کرتی تھی۔'' کرشن نے اسے پیار سے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''اب موتی تھیٹر... کہلائے گا جولی، کرشن تھیٹر۔''

مجھے لگا جیسے دماغ ماؤف ہو رہا ہو۔

اسی دوران اسٹڈی کے دروازے سے بھگت رام نے جھانکا۔ ''ڈنر تیار ہے سرکار......''

کرشن چونکا۔ ''جولی تم ڈائننگ ہال میں چلو، ہم وہیں آتے ہیں۔''

''اوکے ڈارلنگ......'' یہ کہہ کر وہ لچکتے ہوئے اسٹڈی سے نکل گئی۔

میں سخت پریشان تھا۔ کرشن اپنے لیے ڈرنک بنانے لگا۔

''تم لو گے؟''

''نہیں......'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کرشن ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو......''

''میری کہانی میں راجندر قاتل تھا اور تمہاری کہانی میں گمنام قاتل کون ہے؟'' میں بہت کچھ سمجھ گیا تھا مگر پھر بھی کرشن سے پوچھ لیا۔

''جنگ، محبت اور کاروبار میں سب کچھ جائز ہے۔''

''شاید......'' یہ کہہ کر کچھ سوچا۔ ''ایک اور بات......'' کرشن نے سوالیہ نگاہوں سے مسکراتے ہوئے دیکھا۔

''اب اور کیا......''

''سچ کیا ہے؟''

''ہر سچ کہنے کے لیے نہیں ہوتا۔ کچھ سمجھا جاتا ہے۔''

''اور اس کہانی میں جھوٹ کیا ہے......''

''وہی جس کی دلیل یا ثبوت نہ ہو۔'' کرشن معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''تمہیں میری کہانی میں ایسا جھوٹ ملا جسے سچ ثابت نہ کرسکوں۔''

''تم ان دونوں کے بیچ کہاں ہو؟''

''جہاں ثابت کرسکو۔'' یہ کہہ کر کرشن نے مجھے گھورا۔ ''کہیں ثابت کرسکتے ہو؟''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ہرگز نہیں......'' وہ میرے سامنے آکر کھڑا ہوا اور گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔ جو ثابت ہوسکے وہ سچ، چاہے جھوٹ ہی کیوں نہ ہو مگر جسے تم ثابت نہ کرسکو وہ جھوٹ چاہے سچ ہی کیوں نہ ہو لیکن......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکا اور پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔ ''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا۔ اب آگے کی سوچو۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو جو ثابت نہ ہوسکے وہ سچ نہیں صرف جھوٹ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں اٹھا۔

''کہاں جارہے ہو، ڈنر کر کے جانا۔''

میں نے مسکرا کر سر ہلایا۔ ''اسی کے لیے جارہا ہوں۔''

میں تھیٹر کے اسٹیج پر بڑا اور جاندار کردار ادا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا کہ میں تو دنیا کے اسٹیج پر کرشن کے لکھے ڈرامے میں اہم کردار کررہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اسٹیج کے جھوٹ کا سب کو پتا ہوتا ہے۔ زندگی کے اسٹیج پر کھیلے گئے ناٹک میں سچ، جھوٹ کی تمیز بھی مشکل تو کبھی ناممکن ہوجاتی ہے۔ ٹھیک کہا کرشن نے ''جو ثابت ہو، جھوٹ بھی سچ......''

میں اسٹڈی سے نکل کر لان میں آیا۔ کانٹر اب بھی لکڑی کے باکس میں تمام چاقو ترتیب سے رکھے تھے لیکن ایک چاقو غائب تھا۔ اب کوئی شک نہیں بلکہ یقین تھا کہ وہ یادو قتل کیس میں آلہ قتل کے طور پر پولیس کی تحویل میں ہے اور شاید وہیں رہنا اس کا مقدر تھا۔

ڈرامے اور تھیٹر کو اوڑھنا بچھونا سمجھنے والے موتی سنگھ کے مقدر میں صرف خزاں تھی، لاکھ کوشش کے باوجود وہ بہار کی بادِ صرصر کو چھو نہ سکا۔ اس کے خواب تشنہ ہی رہ گئے تھے، البتہ جولی اور کرشن کی زندگی میں بہار آنے والی تھی، وہ بہار جس کا سپنا شاید قدرت نے حادثاتی طور پر دیکھا تھا۔ موتی سنگھ تھیٹر اور اس سے جڑے متعدد کردار ماضی کا حصہ تھے۔ نئے سال کا پہلا سورج 'جولی، کرشن تھیٹر' کا تھا۔

موتی سنگھ اور اس کا تھیٹر خزاں رت میں قصۂ پارینہ بنتے جارہے تھے۔ سوچ رہا تھا کہ دنیا کے اسٹیج پر خونی ناٹک کا پردہ گرا یا میری آنکھوں پہ پڑے پردے اٹھ گئے تھے۔

میں کسی جھوٹ کو سچ ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے سر جھکا اور ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ اس ڈرامے میں تو ایک بار پھر میرا کردار صرف بھرتی کا تھا لیکن شاید آگے کوئی بڑا کردار منتظر ہو۔ میں نے ایک بار پھر نئی امید کو جنم دے دیا تھا۔ اب میں اگلے ڈرامے کے کردار پر سوچ رہا تھا۔

◆●◆

انسان کے اعمال اس کے اردگرد ہی رہتے ہیں... چاہے وہ نیک ہوں یا بد... وہ اپنے عمل کے مضبوط جال میں جکڑا رہتا ہے... کچھ ایسے ہی کرداروں کے نفس و فطرت کے گرد الجھی تحریر... ہر کردار کا باطن اس کے ظاہر پر غالب تھا... وقت کی گردشوں میں چھپے واقعات کی کڑیاں... ایک کڑی ٹوٹی تو اس سے جڑی دوسری کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹتی چلی گئیں۔

مکافاتِ عمل کی پروردہ...... سرورق کی دل شکن کہانی......

آسودہ حال لوگوں کی اس کالونی کے بالکل اختتام پر بنا ہوا دو کمروں پر مشتمل گھر دور سے ہی خستہ حال لگتا تھا۔ شاید اسی لیے کسی نے اس گھر پر دوسری نظر نہیں ڈالی تھی ورنہ اپنی کالونی پر لگے اس بدنما دھبے کو غائب کرنے کی کوشش بہت سال پہلے ہی کی جا چکی ہوتی۔ ویسے بھی وہ گھر کالونی کے آخر میں ہونے کی وجہ سے بے ضرر تھا۔ کسی کو اس کے وہاں ہونے یا نہ ہونے سے کوئی اعتراض تھا بھی نہیں مگر حنا کو بہرحال تھا۔ اسے تو اپنے اس عسرت زدہ گھر میں ہونے پر

بھی اعتراض تھا۔

وہ جب بھی کالج سے واپس آتی، اس گھر تک پہنچتے پہنچتے اس کے وجود سے زیادہ اس کی روح تک تھک جاتی تھی۔ عالی شان بنگلوں کے پورچ سے نکلنے والی چمکتی گاڑیاں روز ہی اس کے احساسات پر ایک تازیانہ سا لگاتی تھیں۔ وہ یہاں سے نقاب میں گزرتی اور واپس آتی تھی ورنہ اسے بے ضرر اور ایک گھٹیا سے کپڑے کے تھان میں لپٹا وجود سمجھنے والے ایک نظر تو ٹھٹک کر ضرور دیکھتے۔ وہ اس ایک نظر کی تمنائی نہیں تھی بلکہ خود بھی ایک ایسی ہی نظر بن جانے کی خواہش میں وہاں سے گزرتی تھی۔

بلاشبہ وہ حد سے زیادہ حسین تھی۔ اس کا پورا وجود قیامت خیز تھا اور اس قیامت خیزی کا ان ماں بیٹی دونوں کو اندازہ تھا اس لیے حسن کو فی الوقت نقاب میں چھپانا ضروری تھا۔ اس کا قد اس کے ارادوں کی طرح ہی دراز تھا۔ ارادے اونچے ہوں تو قد بھی اونچا لگنے لگتا ہے۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ ایک اچٹتی نگاہ بڑے اور عالیشان گھروں پر ڈالتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ بڑے گھر اس کے حوصلے اور ارادوں کو روز نئی تازگی دیتے تھے۔ لیکن گھر تک پہنچ کر بے پناہ تھکن اس کے وجود میں سرائیت کر جاتی۔ بڑے گھروں کو دیکھنے سے جو تازگی وہ اپنے اندر اتارتی آتی تھی، اپنے چھوٹے کچے گھر کو دیکھ کر وہ ایک بھیانک اور تلخ کڑواہٹ میں ڈھل جاتی۔ لوہے کے زنگ آلود، جگہ جگہ سے ٹوٹے دروازے کو کھٹکھٹاتی وہ اس گھر میں روز کی طرح داخل ہوئی۔

''آ گئی میری حور بیٹی۔'' اس کی ادھیڑ عمر لیکن چست بدن والی ماں روز کی طرح اس کی بلائیں لینے لگی۔ وہ کتابیں ایک طرف رکھ کر اپنے وجود سے لپٹے چادر نما تھان کو اتارنے لگی۔

''اماں تمہیں کتنی دفعہ کہا ہے یہ مجھے حور شور نہ کہا کرو۔'' وہ اکتاہٹ سے بولی اور کمرے میں پڑی واحد میز کے پاس رکھی ٹوٹی اور قدرے ادھڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تو کسی حور سے بھی زیادہ پیاری ہے، اس دنیا کی کہاں لگتی ہے۔'' ماں پیار سے اس کا گال چھو کر بولی۔

''کاش تو نے اس دنیا جیسا ہی پیدا کیا ہوتا تو آج لوگوں کا جھوٹا تو نہ کھا رہی ہوتی۔'' وہ میز پر پڑی قورمے اور بریانی سے بھری پلیٹوں کو دیکھ کر بیزاری سے بولی۔

''نہ بیٹا ایسا نہیں کہتے ساری دنیا امیر لوگوں سے تھوڑا ہی بھری ہے۔ ہمارے جیسے گھروں میں رہنے والوں کو کہاں ایسے مہنگے کھانے نصیب ہوتے ہیں۔''

''ہوتے تو جھوٹے ہیں نا، تو مجھے کسی دن تو گھر کا بنا کھانا کھلا دیا کر، تنگ آ گئی ہوں میں یہ قورمہ بریانی کھا کھا کر۔''

''تیرے لیے میں جھوٹا تھوڑا ہی لاتی ہوں، کھانا پکتے ہی سب سے پہلے تیرے لیے نکال لیتی ہوں۔''

''اماں آج میرے انٹر کے پیپرز ختم ہو گئے ہیں، اب دو ڈھائی ماہ کی چھٹیاں ہیں۔'' وہ ایک دم سے بات بدلتے ہوئے بولی۔

''تو......؟'' ماں کے چہرے پر ایک دم سے تاریکی پھیل گئی۔

''تو کیا، میں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ میں ان چھٹیوں میں تیرے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولی اور پھر اسی اطمینان سے بریانی کھانے لگی۔ ماں نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر بولی تو جیسے برسوں کی تھکن اس کے لہجے میں سمٹ آئی۔

''میں نے ساری عمر لوگوں کے گھروں میں اس لیے کام نہیں کیا کہ تو پڑھائی چھوڑ کر......''

''پڑھائی نہیں چھوڑوں گی، بے فکر رہو۔ بس تم مجھے کل سے ساتھ لے جایا کرو، اگر مجھے اچھا لگا تو میں کسی اور بنگلے میں نوکری ڈھونڈ لوں گی۔'' وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔

''میں نے ایک ایک روپیہ جوڑ کر تجھے اس لیے نہیں پڑھایا کہ تو لوگوں کے برتن مانجھے۔ میں تجھے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔''

''ڈاکٹر بننے کے لیے بہت پیسے چاہئیں اماں، یہ قورمے، بریانی کی پلیٹیں کھانے سے ڈاکٹر نہیں بن جاؤں گی۔''

''میں کراؤں گی سب انتظام، تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیا انتظام کرے گی تو، کیا ڈاکا ڈالے گی۔ ڈاکٹر بننے کے لیے ہزاروں نہیں لاکھوں روپے چاہیے ہوتے ہیں جو تو ساری عمر خواب میں بھی نہیں جوڑ سکے گی۔'' وہ پلیٹ کھسکاتے ہوئے نفرت سے بولی۔

''میں مالک سے بات کروں گی، کچھ نہ کچھ بندوبست وہ کر ہی دیں گے اتنے امیر ہیں اور دل کے بھی بڑے سخی ہیں۔''

''تو ٹھیک ہے، کل تک بات کر کے دیکھ لے اگر تیرے سخی مالک نے رقم دے دی تو ٹھیک ہے، میں میڈیکل میں داخلہ لے لوں گی ورنہ پرسوں سے تیرے ساتھ جایا

کروں گی۔" وہ کہہ کے کمرے میں چلی گئی اور ماں کا چہرہ بے بسی کی مکمل تصویر بن گیا۔ اسے خود بھی کم ہی یقین تھا کہ مالک اسے اتنے پیسے دے دے گا مگر وہ پھر بھی ناامید ہونا نہیں چاہتی تھی۔ پرسوں آنے میں ابھی ایک دن باقی تھا۔ وہ دن اس کی بیٹی کی زندگی کو تاریکی سے اجالوں یا پھر مزید تاریکی میں لے جانے والا تھا۔ اس کی نیند اڑ گئی۔ بیٹی جوان ہو اور خوب صورت بھی تو نیند ویسے بھی ضرورت کی آتی ہے۔ مگر آج یہ ضرورت بھی اڑ گئی تھی۔ وہ سونا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ پرسوں تک صرف اپنے مالک سے امداد لینے کے بارے میں نہیں سوچ رہی تھی بلکہ شجاع احمد کے پاس جانے کا سوچ رہی تھی۔ پچھلے اٹھارہ سالوں سے وہ ان کے پاس نہیں گئی تھی مگر اب جانا چاہتی تھی۔

اٹھارہ سال پہلے جب وہ خود بمشکل اٹھارہ کی تھی، اس کی جوانی پر پہلی نقب شجاع احمد نے ہی لگائی تھی۔ نقب جائز طریقے سے لگی تھی مگر وہ اس کی بیٹی کو قبول نہ کر سکا۔ وہ بارے خوف کے وہاں سے بھاگ آئی تھی اور یہی اس کی غلطی تھی۔ کتنا عرصہ ادھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد اس کچرا کنڈی میں رہنے کا آسرا ملا تو اس نے اپنی بنیادیں یہیں مضبوط کرنا شروع کر دیں۔ دو چار اچھے گھروں کا کام کر کے اپنے کھانے اور رہنے کا جو سہارا ملا، وہ اسے ہی غنیمت سمجھی لیکن اب ان سب غلطیوں کی تلافی کا وقت آ گیا۔ اس کی بیٹی کو اس کا جائز مقام حاصل کرنے کا حق تھا۔ وہ پچھلے اٹھارہ سالوں سے اسے لوگوں کا بچا کھچا اور جھوٹا کھانا کھلاتی آئی تھی لیکن اب بیٹی مزید جھوٹا کھانا نہیں چاہتی تھی تو اس میں برائی ہی کیا تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو کام والی بنتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ آج وہ ایک کام والی کی بیٹی تھی تو یہ اس کا نصیب نہیں تھا۔ اس کا نصیب یہ تھا کہ وہ ایک جدی پشتی رئیس کی اولاد تھی اور اب وہ بیٹی کا نصیب بدل دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

رئیس شجاع احمد کی شجاعت، حسن و مردانگی کے قصے اب قصۂ پارینہ ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی جگہ اب اس کے بھتیجے سالار نے لے لی تھی۔ وہ جوان تھا، ذہین تھا۔ شجاع احمد نے پرانے وقتوں میں جو کام کیے تھے وہ نئے زمانے میں نئے انداز سے کر رہا تھا۔ کاروبار کی دنیا میں چچا کی طرح جھنڈے گاڑ رہا تھا۔ چچا جسمانی طور پر تو بوڑھا ہو چکا تھا لیکن کاروباری دنیا میں اس کی ذہانت کا کوئی متبادل نہیں تھا۔ وہ چچا بھتیجا مل کر بزنس کی دنیا کے ٹائیکون بن چکے تھے۔ شجاع احمد نے بہت دیر سے شادی کی۔ ایک ہی بیٹا پیدا ہوا۔ وہ بھی ذہنی و جسمانی طور پر معذور تھا۔ بیوی نے اگلے دس سال اسی آس میں گزار دیے کہ شاید کوئی نارمل بچہ پیدا کر سکے لیکن جب یہ آس حسرت بن گئی تو اس حسرت نے اس کی جان لے لی۔ شجاع احمد چاہتا تو بچے کی خاطر اور شادی کر لیتا لیکن نہیں کی، وہ جان چکا تھا کسی کی بددعا کے حصار میں ہے چاہے جتنی بھی شادیاں کر لے صحت مند بچے پیدا نہیں کر سکے گا اسی لیے اس خواہش کا گلہ گھونٹ کر اپنے دو ننھے بھتیجوں کی پرورش کرنے لگا۔ اس کے بھائی اور بھابی کار ایکسیڈنٹ میں مارے گئے۔ اس ایکسیڈنٹ کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا مگر یہ کوئی کیسے جان سکتا تھا۔ اسے دو عدد صحت مند بیٹے بغیر شادی کے مل چکے تھے۔ یہ اس کی بہترین پلاننگ تھی۔ وہ اپنی محنت سے بنائی بزنس ایمپائر کو اپنے بھائی کے ہاتھ کیسے لگنے دے سکتا تھا اس لیے انہیں اس دنیا سے بھیجنا ہی عقل مندی تھی۔ اب وہ تھا اور اس کے بھتیجے۔ ایک بھتیجا لندن میں شادی کرنے کے بعد اسے اپنی زندگی سمجھ بیٹھا تھا۔ یہ بھی شجاع احمد کی پلاننگ میں شامل تھا۔ جائداد کے وارث ایک سے زیادہ ہوں اچھا ہے لیکن بزنس چلانے والا ہاتھ ایک ہی ہونا چاہیے۔ یہی بزنس کی کامیابی ہے۔ ذہنی طور پر بھی سالار اپنے دوسرے بھائی سے چار ہاتھ آگے تھا اسی لیے شجاع احمد اسے آگے ہی آگے بڑھاتا چلا گیا۔ سالار کی شکل میں دوسرا شجاع تیار ہو چکا تھا۔ اور اب بیٹھ کر کھانے کے دن آ گئے تھے لیکن کھاتے کھاتے اسے ہچکی لگ چکی تھی وہ جان گیا کہ غافل رہے گا تو اس ہچکی کا مرض جان لیوا ہو جائے گا۔ اس کے جاسوس اسے سالار کی سرگرمیوں سے مسلسل آگاہ کرتے رہتے تھے۔

کچھ عرصہ پہلے بدنام گلی کی بے نام حسینہ کی زلفوں کا اس پر اثر ہو گیا تھا۔ یہ اثر اترنے کے بجائے مزید پُراثر ہو چکا تھا۔ بات پسندیدگی اور تحفے تحائف تک رہتی تو شجاع احمد قطعی برا نہ جانتا۔ ایسے کام جوانی میں وہ بھی کر چکا تھا لیکن نئی اطلاعات کے مطابق وہ اس حسینہ کو بزنس پارٹنر بنانے جا رہا تھا۔ اپنے کچھ شیئرز کے حقوق اسے دے کر بزنس میں حصے دار بنانے والا تھا۔ یہ بات شجاع احمد جیسے بندے کے لیے قطعی قابل قبول نہیں تھی۔ یہ پہلی ہچکی نہیں تھی اس سے پہلے بھی، وہ شجاع احمد کے منع کرنے کے باوجود ان کے جوانی کے زمانے کے ناپسندیدہ آدمی سے ایک بزنس ڈیل بھی کر چکا تھا۔ شجاع احمد خاموش رہنا نہیں جانتا تھا لیکن سالار نے انہیں یہ کہہ کر خاموش کروا دیا کہ وہ کمال نامی اس آدمی کو بزنس کی دنیا سے ہمیشہ کے لیے آؤٹ کرنا چاہتا ہے اس لیے

اس کا بھرپور ساتھ دیتا تھا اور بھرپور ساتھ دے گا۔ شجاع احمد نے سر ہلاتے ہوئے بھتیجے کی تعریف کا اقرار کرتے ہوئے بولا۔

یہ بات مطمئن نہیں کر سکتی تھی، وہ جانتا تھا کمال اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا لیکن وہ یہ بھی جان رہا تھا کہ سالار اپنے تجربے سے بھی کچھ سیکھے اس لیے خاموش ہو گیا۔ جانتا تھا کمال جیت جائے گا لیکن بزنس میں کبھی کبھار گھاٹا کھانے سے تجربات کو پختگی ملتی ہے۔ نقصان چونکہ ممکنہ تھا اس لیے کمال کے بازی جیت لینے پر شجاع احمد کو صبر کے گھونٹ پینے پڑے۔ سالار کو شرمندہ ہونا چاہیے تھا۔ ماضی کے سارے کارناموں کے پیچھے شجاع کا ہاتھ تھا اس لیے اسے کامیابی ملتی رہی۔ پہلی مرتبہ ناکامی پر اسے شجاع احمد کی سرپرستی میں دوبارہ چلے جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ گزشتہ کامیابیوں نے اس کی کمر کے خم نکال دیے تھے اس لیے وہ جھکنا بھول چکا تھا۔ شجاع احمد اس کی معافی کا انتظار ہی کرتا رہا اور اب یہ دوسرا صدمہ تھا۔

پہلے بزنس میں گھاٹا اور اب ایک بزنس پارٹنر، وہ بھی ایک گمنام عورت۔ شجاع احمد کو غصہ دلانے کے لیے یہ کافی تھا۔ اس وقت وہ اپنے کمرائے خاص میں سالار کا منتظر تھا۔ اب بات کرنے کا وقت آ چکا تھا۔ یہ میٹنگ ان دونوں کے درمیان تھی۔ سالار کی آمد کا اسے اندازہ ہو چکا تھا۔ سالار کی ایک گاڑی کے ساتھ جب چھ عدد دوسری گاڑیاں جو سیکیورٹی گارڈز سے بھری ہوئی تھیں، رکتی تھیں تو ٹائروں کے بریکس کی آوازیں دور تک اس کی آمد کا اعلان کرتی تھیں۔ پہلے یہ آوازیں سن کر شجاع احمد کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔ سینہ پھول جاتا تھا لیکن اب صورت حال برعکس تھی۔ اس کے پورے وجود میں شدید غصے کی لہریں اٹھ رہی تھیں جنہیں وہ بمشکل دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلیو کلر کے تو پیس سوٹ میں چمچماتے جوتوں اور گلاسز کے ساتھ وہ اپنے باڈی گارڈز کو باہر رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے میٹنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کی گوری رنگت اور آنکھیں بالکل اپنے باپ وقار احمد جیسی تھیں۔ سر اٹھائے سینہ پھلائے جب وہ سامنے آیا تو شجاع کو وقار کی جھلک نظر آنے لگی۔ وہ حیران تھا آج سے پہلے اسے سالار میں وقار کی رتی بھر جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ آج وہ سامنے کھڑا تھا تو جیسے اسے للکار رہا تھا کہ مجھ سے تم... بھاگ نہیں سکتے۔

"سلام چچا جان۔" وہ بانہیں پھیلائے سینے سے لگنے کو تیار تھا۔ شجاع احمد نے بمشکل اپنے تاثرات نارمل کیے اور اسے سینے سے لگایا۔

"کیا حال ہے سالار، کہاں تھے پچھلے تین دن

"نہیں نہیں بس تفریح کا موڈ تھا، عفیفہ کے ساتھ رہا۔ اس کی کمپنی میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا۔" اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے وہ بے نیازی سے بولا۔

"ایسی کمپنی کو اپنے کام پر حاوی نہیں ہونے دیتے میرے بچے، عفیفہ جیسی لڑکیوں کو ضرورت سے زیادہ خود پر سوار کرو گے تو ذہن آرام پرستی کی طرف زیادہ مائل ہوگا، اچھا بزنس مین اپنی ہر ترجیح بزنس کو ہی دیتا ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے اسی لیے عفیفہ کو اپنا بزنس کا پارٹنر بنانے والا ہوں، بہت ذہین لڑکی ہے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری ہے اس کے پاس۔"

شجاع احمد نے ایک گہری سانس لی۔ "تو تمہیں اس پر مکمل بھروسا ہے؟"

"بالکل۔" وہ بھرپور اعتماد سے بولا۔ شجاع احمد مسکرانے لگا۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے بھتیجے یقیناً تم نے کچھ بہتر ہی کیا ہوگا۔" بولا تو سالار کا چہرہ کھل اٹھا۔

"مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی، آئی لائیک یو۔" سرونگ ڈش سے چکن اسپرنگ رول لیتے ہوئے بولا۔ اسی وقت ملازم نے ایک عورت کے آنے کی اطلاع دی۔

"کون ہے؟" وہ اچنبھے سے بولا۔

"خود کو پرانی ملازمہ بتا رہی ہے۔ ایک ڈرائیور رسول بخش کی بیوی ہے۔"

"ریشم!" بے ساختہ شجاع احمد کے منہ سے نکلا۔ پھر اس نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی کوشش کی لیکن شاید ناکام رہا۔ اس کا چونکنا سالار سے چھپا نہ رہ سکا۔

"کون ریشم؟" وہ چائے کا سپ لیتے ہوئے بولا۔

"تھی ایک پرانی ملازمہ۔" وہ قدرے نخوت سے بولا۔ "اسے بٹھاؤ کچھ دیر بعد ملوں گا اس سے۔" ملازم سر ہلا کر باہر جانے لگا جب سالار نے اسے روک لیا۔

"اسے یہیں لے آؤ میں بھی اس پرانی ملازمہ سے ملنا چاہتا ہوں، گھر میں کوئی بھی پرانا ملازم نہیں رہا۔"

"کیا ضرورت ہے کمینوں کے منہ لگنے کی، آئی ہوگی پیسے مانگنے۔"

"تم جاؤ اسے یہیں بھیج دو۔" وہ ملازم سے بولا پھر شجاع احمد کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "میں فارغ ہی ہوں اور کوئی خاص ضروری بات نہیں ہے۔ ریشم سے ملنے میں کیا حرج ہے، یہاں بابوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں وہاں اسے

بھی کچھ دے دیں گے۔ ہوسکتا ہے بابا کی جوانی کا کوئی قصہ ہی سنا دے۔" وہ آنکھ مارتے ہوئے ہنس کر بولا۔ شجاع احمد کو نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانا پڑا۔ ریشم کمرے میں داخل ہوئی تو شجاع احمد نے خود کو بہت پیچھے ماضی میں کھڑے پایا۔

"سلام صاحب۔" وہ اپنی لرزتی پلکیں اٹھا کر شجاع احمد کو ایک نظر دیکھتے ہوئے دوبارہ سے جھکاتے ہوئے بولی۔

"خیریت ریشم کوئی کام تھا کیا؟" شجاع احمد کڑے تیوروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اٹھارہ سال پہلے اس عورت کی زلفوں کا وہ شکار ہوا تھا اور اب اٹھارہ سال بعد وہ نہ جانے کس شکار کی تلاش میں آئی تھی۔

"جی وہ......" وہ ایک نظر جھجکتے ہوئے سالار پر ڈال کر خاموش ہوگئی۔

"بولیے ریشم خاتون کس کام سے آئی ہیں آپ، کیا پیسے چاہئیں؟"

"نہیں صاحب پیسے نہیں کچھ اور لینے آئی ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں شجاع احمد پر نظریں جما کر بولی۔ اٹھارہ سال پہلے وہ ان نظروں سے نظریں نہیں ملا پاتی تھی اور اب بھی یہی حال تھا۔ ٹانگیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے لیکن وہ خود کو مضبوطی سے جمائے کھڑی تھی۔

"اپنی بیٹی کا حق لینے آئی ہوں۔" وہ خشک گلا تر کرتے ہوئے بولی۔

"کون سا حق؟" سوال شجاع احمد کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔ ریشم نے پھر سے سالار پر نظر ڈالی۔ وہ شاید اس کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ وہ یقیناً شجاع احمد کا بیٹا تھا ویسا ہی سرخ و سفید تھا۔ بات کرنے سے پہلے اس نے اپنے پلو کے پیچھے سے ایک تصویر نکال کر شجاع احمد کی طرف بڑھا دی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اپنے خون کو دیکھ کر شاید وہ اسے خالی ہاتھ نہ لوٹائے۔ بات میں وزن ہو تو دوسرا اسے سننے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔ شجاع احمد نے چند لمحے اس تصویر کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر اسے پھاڑ دیا۔ وہ تصویر کے دو حصے کرنے کے بجائے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگا۔ سالار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس غصے کی وجہ پوچھنا چاہ رہا تھا لیکن خاموش رہ کر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

"اسے پھاڑنے سے حقیقت نہیں بدلے گی صاحب جی۔" ریشم نے بے خوفی سے کہا۔ "خون ہے یہ آپ کا۔"

شجاع احمد جانتا تھا یہ اسی کا خون ہے جو تصویر میں کھڑی نوجوان لڑکی اسی کا پرتو تھی۔ ویسی ہی رنگت ویسے ہی نقوش جیسے دیکھ کر کوئی بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ اس کا خون تھی۔ لیکن وہ اس خون کو قبول کرنے پر نہ اٹھارہ سال پہلے تیار تھا نہ اب۔ سالار نے اس مرتبہ چونک کر اس خاتون کو دوبارہ دیکھا۔ "کس کی بات کر رہی ہیں یہ؟" اس مرتبہ وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"ابھی کے ابھی یہاں سے دفع ہو جاؤ اور دوبارہ آنے کی ہمت نہ کرنا ورنہ میرے ملازم اتنے ہی ٹکڑے کریں گے جتنے اس فراڈ تصویر کے کیے ہیں۔" وہ سالار کے سوال کو نظرانداز کر کے غصے سے پھنکارتے ہوئے بولا۔

"وہ ڈاکٹر بننا چاہتی ہے مگر پیسے نہیں ہیں اگر نہ بن سکی تو لوگوں کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔" وہ اپنی جگہ سے ہلے بغیر سنجیدگی سے بولی۔

"خاور! اسے ذرا باہر کا رستہ سمجھاؤ، پاگل خاتون ہے۔" شجاع احمد نے اپنے ملازم کو آواز دے کر حکم دیا۔

"ٹھیک ہے میں بھیک نہیں مانگوں گی لیکن تم یہ برداشت کر لینا کہ تمہاری بیٹی کی عزت نیلام ہونے جا رہی ہے کیونکہ وہ بھی تمہاری طرح ضدی اور خودسر ہے۔" ریشم خاور کے ہاتھ کو جھٹک کر خود ہی چلی گئی۔

"یہ کیا سلسلہ ہے ڈیڈ؟" سالار کپ ملازم کو دیتے ہوئے حیرانی سے بولا۔

"کچھ نہیں، وہ کچھ نہیں رہے بلیک میل کرنے کی کوشش کر رہی ہے نہ جانے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اور حق کا دعویٰ میرے سامنے کر رہی ہے۔" شجاع خشک لہجے میں بولا۔ سالار نے مزید سوال کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ڈیڈ کا غصہ تو دکھ رہا تھا لیکن غصے سے زیادہ پریشانی جھلک رہی تھی۔ یعنی اس عورت سے وابستہ کہانی میں کچھ صداقت کا خدشہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ زیرلب مسکرانے لگا۔

"تو ٹھیک ہے چلتا ہوں میں پھر حنیف کے ساتھ کچھ معاملات طے کرنے ہیں، دوبارہ ملاقات کے لیے حاضر ہوں گا نئی اطلاعات کے ساتھ۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے بولا۔ شجاع احمد نے ایک نظر اس پر ڈالی اور اسے الوداع کرنے لگا۔

☆☆☆

"نیامت۔" گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سالار نے اپنے ایک خاص بندے کو آواز دی۔

"سر۔" وہ ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔

"ابھی جو خاتون اندر سے نکلی ہے، اس کا پیچھا کرو پتا کرو کہاں رہتی ہے اور کن کے ساتھ رہتی ہے مکمل ڈیٹا اور

"ڈاور کے سر۔"

"چلو۔" اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس کی گاڑی کے آگے تین اور پیچھے دو گاڑیاں خاص رفتار سے چل پڑیں۔ اس کی گاڑی کے روانہ ہوتے ہی شجاع احمد پارکنگ میں موجود اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔ ڈرائیور نے آکر پچھلا دروازہ کھول دیا۔

"تمہیں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔" وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

"اماں۔" دروازے سے اندر آکر ریشم جیسے ہی آکر بیٹھی اور بھل بھل رونے لگی۔ وہ تیزی سے ماں کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا، کیوں رو رہی ہے تو اماں؟" وہ پریشان ہوگئی۔

"وہ اب بھی ویسا ہے اس دن کی طرح آج بھی دھتکار دیا۔" ریشم بکھرے لہجے میں روہانسی ہوکر بولی اور بیٹی کو گلے لگا لیا۔

"کون، کس کی بات کر رہی ہے تو؟"

"کسی کی نہیں۔" ریشم اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے خود کو سنبھالنے لگی۔ "ایسے ہی بس آنسو آگئے۔"

"آنسو ایسے ہی تو نہیں آتے اماں..... کوئی وجہ ہوتی ہے، کسی نے تو تجھے اتنا گہرا دکھ دیا ہے۔ میں نے تجھے آج تک روتے نہیں دیکھا۔ بتا نا اماں کون ہے جس نے تجھے دکھی کیا؟" وہ اصرار کرنے لگی ریشم نے جھکی جھکی نگاہوں سے اپنی اس خوب صورت لیکن بدقسمت بیٹی کو دیکھا۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ آج سے پہلے ان کے دروازے پر کسی نے دستک نہیں دی تھی، چونکنا لازمی تھا۔

"میں دیکھتی ہوں۔"

"نہیں۔" ریشم کا دل ایک دم خوف سے بھر گیا، اس نے بے اختیار اسے روکا۔ "تو اندر جا اور باتھ روم جا کر کنڈی لگا لے جب تک میں نہ کہوں نکلنا مت، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔" ریشم کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ وہ ابھی شجاع احمد سے مل کر آرہی تھی۔ یقیناً اس کے ہی آدمی پیچھا کرتے آئے تھے۔ ریشم کے حواس مختل ہونے لگے۔

"میں کیوں بند کرلوں خود کو، کون ہے آخر دروازے پر؟" حنا جارحانہ انداز میں بولی آج سب کچھ عجیب ہو رہا تھا، پہلے ماں کا رونا اور اب جارحانہ انداز میں اسے باتھ روم میں بند ہونے کی تنبیہہ کرنا۔ اسی وقت پھر سے دستک ہوئی۔ ریشم نے اسے کمرے کی طرف دھکیلا اور دوبارہ وہی تلقین کرتی دروازے کی جانب بڑھی۔ حنا پہلے تو ہکا بکا کھڑی رہی پھر بے اختیار باتھ روم کی جانب چل پڑی لیکن اس کے کان باہر کی آوازوں پر ہی تھے۔ ریشم نے جھجکتے ہوئے دروازہ کھولا لیکن باہر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

☆☆☆

عفیفہ نے دو پیگ تیار کیے اور کمال اور سالار کے سامنے رکھ دیے اور خود جا کر ایک پیگ اپنے لیے تیار کرنے لگی۔ وہ چلتی پھرتی سرور کی بوتل تھی کمال اور سالار کی نظریں بیک وقت اس کے دلکش سراپا پر تھیں۔ کمال سے بزنس میں گھاٹا کھانے کے باوجود سالار اس کے ساتھ تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک وجہ تو اس کی قیامت خیز بیٹی عفیفہ تھی۔ بیٹی سوتیلی تھی لیکن محبت وہ سگے باپ سے بھی زیادہ کرتا تھا۔ عفیفہ نے سالار کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا تھا۔ سالار کا کمال کی طرف رجحان صرف عفیفہ کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ کمال نے اسے کچھ ایسے ٹھوس شواہد مہیا کیے تھے جن سے علم ہوا تھا کہ اس کے ماں باپ کی موت ایک حادثہ نہیں بلکہ شجاع احمد کی چال تھی۔ کمال نے اسے بڑی چالاکی سے اپنے جال میں پھنسایا تھا۔ بزنس میں خسارے کی بھاری رقم سالار کو لوٹا دی اور اپنے منیجر کو اسے دھوکا دینے کے الزام میں نوکری سے نکال دیا۔ سالار اس کے خلوص اور دیانت داری سے متاثر ہوا۔ زیادہ متاثر اس کی سوتیلی بیٹی نے کیا تھا۔ وہ اس کی ہر خطا بھلا کر اپنے سرے سے تعلقات استوار کرنے لگا۔ کمال نے ابھی اس کی رہی سہی ہمدردیاں اس کے ماں باپ کی موت کو ایک پلاننگ ثابت کرکے جیت لیں۔ سالار، چچا کو رقم کی اس واپسی کے بارے میں نہیں بتا سکا۔ اس طرح چچا، کمال اور اس کے تعلق کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ وہ انہیں کبھی بھی یہ پتا نہیں چلنے دینا چاہتا تھا کہ عفیفہ کمال کی بیٹی ہے۔ اس لیے اس نے باقاعدہ پلاننگ سے عفیفہ کا ایک مخصوص طبقے سے تعلق ظاہر کیا تاکہ چچا متوجہ نہ ہوں اور وہ کمال اور عفیفہ کے ذریعے اپنے چچا سے بدلہ لے سکے۔

وہ جوان تھا اور جوانی بہکنے کے لیے ہوتی ہے، وہ ہر طرح سے بہک رہا تھا۔ ایک طرف شراب تھی عفیفہ جیسا شباب تھا اوپر سے کمال کی چالیں۔ وہ پرانے زمانے کا آدمی تھا۔ نئے زمانے اور نئے لوگوں کو اپنی انگلیوں کے اشارے پر چلانے کے سارے ہتھکنڈے جانتا تھا۔ وہ شروع سے شجاع احمد کا حریف تھا اب دوست نہیں بن سکتا

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

تھا، اسے کھلنے کا صحیح وقت آن پہنچا تھا۔ اس کی ساری دولت سالار کے ذریعے اپنے قبضے میں کر کے وہ بہت سے فائدے اٹھانے والا تھا۔

''میں عفیفہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں انکل۔'' سالار نے خالی گلاس میز پر رکھتے ہوئے ایک متوقع بات کی۔ عفیفہ نے اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر ایک خاص ادا سے اسے دیکھا۔ سالار اسے ہی دیکھ رہا تھا، ہولے سے آنکھ ماری۔ کمال نے ہوشیاری سے اسے نظرانداز کر دیا۔

''ہاں کیوں نہیں، یہ تم دونوں کا آپس کا معاملہ ہے مل بیٹھ کر فائنل کر لو۔ بس اطلاع دے دینا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے یہ میرے لیے قابلِ فخر بات ہوگی کہ مرحوم وقار کا بیٹا میری دامادی میں آئے۔''

''لیکن میں شادی چوروں کی طرح چھپ کر نہیں کروں گی سارے شہر کو علم ہونا چاہیے۔'' عفیفہ بھویں اچکا کر بولی۔ وہ حق پر تھی۔ لیکن سالار کی پریشانی واضح تھی وہ ایسا کسی صورت نہیں کر سکتا تھا۔ عفیفہ ایک چبھتی ہوئی نظر اس پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

''میں جانتی ہوں تمہارے انکار کی وجہ۔'' وہ ہونٹوں کو دبا کے مسکرا کر بولی۔ سالار نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میرا تعلق ایک بدنام گلی سے ہے یہی بتایا ہے نا تم نے اپنے چچا جان کو؟''

''ایسا اس لیے کرنا پڑا تاکہ تمہارے بیک گراؤنڈ کا انہیں علم نہ ہو سکے۔ انکل کمال کے ساتھ چچا بزنس کرنے کے لیے کبھی بھی تیار نہ ہوتے۔ میں نے انہیں بتایا کہ تمہارا تعلق اس محلے سے ہے لیکن تم معصوم ہو اور پڑھی لکھی بھی ہو، میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور اپنا بزنس پارٹنر بنانا چاہتا ہوں۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے اس جھوٹ پر وہ مطمئن ہو جائیں گے، انہیں شک ہو چکا ہے کہ تم نے میرے بارے میں جھوٹ بولا ہے۔''

''کیسے؟'' وہ حیران ہوا۔

''بابا کو کال کر کے انہوں نے وارن کیا ہے کہ مجھے تم سے دور رکھیں۔'' وہ بولی تو سالار نے ایک گہری سانس لے کر خود کو صوفے کی ٹیک سے لگا لیا۔

''وہ تمہاری سوچ سے زیادہ چالاک اور زیرک ہے۔'' کمال آہستگی سے بولا۔ ''میں اسے جوانی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ وہ اپنے ذہن میں کوئی بھی شک نہیں رہنے دیتا، بات کی تہہ تک پہنچ کر رہتا ہے۔ تمہارے عفیفہ کے متعلق یہ بودا سا تعارف دینا بھی کوئی مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔'' کمال نے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔ ''دیکھو بیٹا مجھے غور سے دیکھو، میں وہ انسان ہوں، جو ہمیشہ بزنس کی دنیا میں رہا ہے۔ میرے پاس وسیع تجربہ ہے۔ بزنس کی دنیا میں میرے کئی دوست ہیں جو مجھ پر اعتماد کرتے ہیں، میری بات کو سنتے ہیں۔ میں تم سے تمہیں نقصان پہنچانے کے لیے نہیں ملا ہوں، مجھے مزید دولت بھی نہیں چاہیے، میں صرف تمہارا حق دلانا چاہتا ہوں، اس طرح مجھے تھوڑی ذاتی خوشی ملے گی کہ شجاع احمد کو میں نے بالآخر جھکا دیا لیکن اگر تم اور عفیفہ مل کر بزنس کی دنیا میں نام پیدا کرو تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ شجاع نے ساری عمر گناہ کیے، اس کے گناہوں کی سزا اسے ملنی چاہیے۔ میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔ آئندہ مجھ سے مشورہ کرنا چاہو تو مجھے دلی خوشی ہوگی۔''

سالار یک دم سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔

''چلتا ہوں اجازت دیجیے۔'' اس کا دھیان اپنی گھڑی پر تھا۔

''تو میں سمجھوں کہ تم نے میری بات کو غلط انداز میں نہیں لیا ہوگا۔'' کمال اس کے اچانک اٹھنے پر بولا۔

''نہیں انکل بس ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے پھر ملاقات کے لیے حاضر ہوں گا۔'' وہ خوش گوار لہجے میں بولا اور اٹھ گیا۔ کمال کے اشارے پر عفیفہ اسے رخصت کرنے چلی گئی۔

''تم نے کچھ زیادہ کر دیا۔'' عفیفہ کی واپسی پر کمال نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ انگور کھاتے ہوئے پیگ بنانے لگی پھر مسکراتے ہوئے آ کر اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

''اب یہ جلد ہی اپنے فیصلے سے آگاہ کرے گا، میں چاہتی ہوں یہ کام اب بس نمٹ جائے، جس انداز میں آپ کرنا چاہ رہے ہیں بہت ٹائم لگے گا مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں جان میں نے تم پر بہت بوجھ ڈال دیا ہے بس یہ آخری کام ہو جائے تو پھر ساری عمر بیٹھ کر عیش کرنے کے دن ہوں گے۔'' وہ لگاوٹ سے بولا۔ اس کی لگاوٹ ایک باپ جیسی نہیں تھی سوتیلے جیسے بھی نہیں تھی، کچھ الگ تھی۔ عفیفہ نے میٹھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ساری دنیا کے سامنے اس کا سوتیلا باپ تھا لیکن بند کمرے میں اس کے جسم و جان کا مالک۔ مسکراتے ہوئے اس نے عفیفہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ کچھ دیر وہ اسی کیفیت میں رہی پھر الگ ہوتے ہوئے بولی۔

"مجھے ایک ضروری میٹنگ کے لیے جانا ہے سویٹ ہارٹ شام کو ملاقات ہوگی۔"

"ایزیو وش، مجھے بھی کچھ اہم کام نمٹانے ہیں۔"

کمال اٹھتے ہوئے بولا۔

پچپن برس کی عمر میں بھی وہ پینتالیس سال کا دکھائی دیتا تھا۔ عفیفہ کے علاوہ بھی اس کی کئی گرل فرینڈز تھیں جن سے وہ بلا جھجک تعلق رکھتا تھا۔ لیکن عفیفہ کی پوزیشن سب سے مضبوط تھی۔ وہ اس کی دوسری بیوی کے ایکس ہسبینڈ کی بیٹی تھی۔ جوانی کے زمانے میں عفیفہ کی ماں اور کمال ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر کمال کے باپ نے یہ شادی نہ ہونے دی لیکن باپ کی وفات کے بعد اسے یہ موقع مل گیا۔ جب عفیفہ کے باپ نے بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور بیرون ملک چلا گیا۔ عفیفہ تب بارہ سال کی تھی۔ وہ بالکل ایک ماں جیسی تھی جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھی، اپنی ماں کی جوانی کی یادگار کے طور پر ہر وقت سامنے نظر آنے لگی۔ کمال اسے نہ چاہتے ہوئے بھی مڑ کر دیکھتا رہتا۔ اس نے عفیفہ کی ماں کو جوانی میں چاہا تھا اب وہ جوانی نہیں رہی تھی لیکن عفیفہ تھی جو... جوان ہو رہی تھی۔ آہ یہ جوانی بھی کتنی دیوانی کر دینے والی ہے۔ محبوبہ سامنے تھی لیکن جوان نہیں رہی تھی اور جو جوان تھی وہ محبوبہ نہیں، اس کی بیٹی تھی۔ لیکن یہ بیٹی کمال کی نہیں تھی اور یہی بات حوصلہ افزا بھی تھی۔ پانچ سال نہ جانے اس نے اس عورت کے ساتھ کیسے گزارے کہ اب پانچ منٹ گزارنے مشکل لگ رہے تھے۔ سترہ سال کی عفیفہ کی تیکھی ادائیں اور قاتل جوانی سے وہ کب کا قتل ہو چکا تھا اب دل بس اسے حاصل کرنے کی جستجو میں تھا۔ لیکن ماں کے ہوتے اس کو حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لیے خاموشی سے منصوبہ بندی کرنے لگا۔ جب منصوبہ بندی خاموشی سے ہوتی ہے تو نتائج اکثر ہولناک ہوتے ہیں۔

عفیفہ کی ماں کو سوئمنگ کا شوق تھا، وہ بلاناغہ سوئمنگ کلب جاتی تھی۔ ایک دن سوئمنگ پول میں اس کی لاش ملی۔ کسی نے اس کا گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا اور یہ دورانِ سوئمنگ ہوا۔ وہاں چند اور بھی خواتین تیراکی کر رہی تھیں لیکن کوئی بھی قاتل کو نہ دیکھ سکا۔ وہ کب پول میں آیا، کب گیا کوئی نہ بتا سکا لیکن کمال کی جان اپنی بیوی سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ اب آزاد تھا، ہرنی جیسی کم سن دوشیزہ عفیفہ ساری دنیا کے لیے اس کی سوتیلی بیٹی تھی لیکن گھر کے اندر وہ صرف اس کی دل بستگی کا سامان بن چکی تھی۔ سترہ برس کی عمر سے ستائیس کی ہوتے تک وہ صرف کمال کے تصرف میں رہی۔

اب ایک دوسرا قدردان آپہنچا تھا۔ بالآخر پنچھی کے پنجرے سے نکلنے کے دن آگئے۔ اگرچہ وہ اس گھر میں ایک قیدی کی زندگی نہیں گزار رہی تھی۔ کمال نے اسے دنیا کی ہر سہولت دی تھی۔ وہ آزادی سے کہیں بھی آجا سکتی تھی لیکن اپنے سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ......

اس کے گارڈز ہی اس کے لیے سیکیورٹی کیمروں کی طرح تھے، عفیفہ کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا سب کمال کو تفصیل سے معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اس کی طرف سے بے فکر تھا۔ عفیفہ کے ذریعے اس نے اپنے رکے کئی کام سیدھے کیے تھے۔ لوگ اسے کمال کی ساری دولت کی اکلوتی وارث سمجھ کر کچھ زیادہ ہی اہمیت دیتے تھے۔ کچھ پیار سے لٹتے تھے اور کچھ مکاری سے لیکن لوٹنا اس نے بھی کر تھا۔ لوٹ کا مال اس قدر اکٹھا ہو چکا تھا کہ اب اپنے ملک میں چھپانے کی جگہ کم پڑنے لگی تھی اسی لیے اس نے سوئٹزرلینڈ شفٹ ہونے کا سوچا تھا۔ جہاں اس ملک کے دوسرے لٹیروں کو پناہ دی وہیں ایک لٹیرا اور سہی۔ مختلف حربوں سے چھپائی دولت کو واپس کرنے کا کمال کا کوئی پلان نہیں تھا اور اب ملک سے جاتے جاتے اس نے ایک آخری چھوٹا اپنے پرانے دشمن شجاع احمد کو لگانے کا ارادہ کرلیا۔ ایک شجاع احمد ہی رہ گیا تھا جس نے اسے ہمیشہ نیچا دکھایا تھا اب اسے جھکانے کا وقت آگیا تھا۔ سب کچھ اس کی مٹھی میں تھا، وقت، حالات اور سالار اور چوٹ لگانے والی عفیفہ ہو تو اس کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگتا تھا۔ وہ کمال کی دریافت تھی اور اس ہیرے کو اس نے برسوں تراشا تھا۔ اب اسے کیش کرانے کا صحیح وقت آن پہنچا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے عفیفہ کو الوداع کہا اور اب خود تیار ہونے لگا۔ اسے آج کچھ خاص لوگوں سے بزنس کے سلسلے میں ملنا تھا جو اس کا پیسا سوئٹزرلینڈ میں انویسٹ کرنے میں مددگار ثابت ہوتے۔

عفیفہ نے ٹائم دیکھا اور تیزی سے وارڈ روب کی جانب بڑھی۔ میٹنگ کے پیشِ نظر اس نے ایک مناسب لباس نکالا اور اگلے پانچ منٹس میں وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی خود کو چار چاند لگا رہی تھی۔ چاند چہرہ وہ خود تھی اب میک اپ اس کے حسن کی تابانیوں کو چار گنا بڑھا رہا تھا۔ لپ اسٹک کا فائنل کوٹ کر کے اس نے اپنے بھرے، بھرے ہونٹوں کو آپس میں ملایا اور شیشے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھ کر سرعت سے وہاں سے ہٹ کر اونچی ایڑی کے سینڈل پہننے لگی۔ ایڑھی دیکھ کر وہ ہنس دی وہ جانتی تھی اس کی ساری ایڑیوں کے اندر ہائی پاور کے وائس

ریسیورز لگائے تھے۔ ان ریسیورز کے ذریعے کمال اپنی سے بھی عفیفہ کی گفتگو سن سکتا تھا۔ اس طرح اسے بزنس سے متعلقہ معاملات میں صرف عفیفہ کی رپورٹ پر انحصار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی انسٹرومنٹس اس کے لباس، جیولری حتیٰ کے ہینڈ بیگز کی خفیہ جگہوں پر لگے تھے۔ جیسے کہ خفیہ کیمرے اس کے ہینڈ بیگز میں ڈی ٹیکٹرز اس کے لباس میں اور بے ہوش کر دینے والا جادوئی سفوف اس کے لاکٹ اور انگوٹھی میں ہر وقت بھرا ہوتا تھا، وہ چلتی پھرتی ایک خطرناک ہتھیار تھی۔ انہی آلات کی مدد سے اس نے بہت سے لوگوں کو بلیک میل بھی کیا تھا۔ وہ اب ایک گھاگ شکاری بن چکی تھی۔ لانگ کوٹ پہن کے اس نے ایک گہری نظر کمرے پر ڈالی۔ ایسا وہ احتیاط کے پیشِ نظر کرتی تھی تاکہ اس کی بے پروائی میں کوئی اہم چیز کسی ملازم کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ دروازہ بند کرتے ہوئے باہر کھڑے گارڈز کو دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر مسکرائی۔ یہ گارڈز اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ وہ برسوں سے ان کے ساتھ کی عادی تھی۔ ہنسی اسے ان کو الو بنانے کی وجہ سے آتی تھی۔ وہ روز ہی انہیں الو بناتی تھی۔ انہیں ہی کیا ان کے گارڈ اور کمال کو بھی بناتی تھی۔ کمال کے خیال میں وہ ہر وقت اس کی نظروں میں رہتی تھی، چھپاں نہیں ہوتی تھی۔ ہاں اس کے گارڈز کی نظروں میں رہتی بھی اور یہ حقیقت بھی تھی۔ گھر سے باہر وہ گارڈز کی نظروں سے اوجھل نہیں رہتی تھی اور گھر کے اندر کمال کی، حتیٰ کے اس کا بیڈروم بھی محفوظ نہیں تھا وہاں پر بھی خفیہ کیمرے سارے دن کی موویز بناتے کمال کو جب بھی فرصت ملتی وہ ان موویز کو بیٹھ کر ضرور دیکھتا تھا۔ یہ بات عفیفہ اچھی طرح جانتی تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی چالاک ہوگئی تھی۔ اس نے ایسی تراکیب ڈھونڈ لی تھیں جن سے وہ کمال کو بے وقوف بنا سکتی تھی۔ آج رات وہ اپنے کزن فیصل سے ملنے والی تھی۔ وہ بھی اپنے ہی گھر اور اپنے ہی کمرے میں تمام کیمروں اور ریسیونگ ڈیوائسز کے باوجود یہ پہلی بار نہیں تھا۔ پچھلے دو سالوں سے وہ لوگ مل رہے تھے اور کمال کو شک بھی نہیں گزرا تھا۔ اسی بات نے عفیفہ کا اعتماد بڑھا دیا تھا۔ اور وہ اپنی اونچی ایڑھی کے سینڈل کھٹ کھٹ کرتی گارڈز کے سامنے سے گزر کر پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی میں آبیٹھی۔ ڈرائیور نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی سٹارٹ کی اور اگلے ہی لمحے وہ گیٹ سے باہر تھے۔

☆☆☆

''ہاں نیامت، کیا رپورٹ ہے؟'' اپنے سامنے ہاتھ باندھے مؤدب کھڑے نیامت سے اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''سر ریشم اپنی بیٹی کے ساتھ کالونی میں واقع ایک چھوٹے سے گھر میں رہ رہی تھی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا اور پھر ایک بندے کو گھر کی نگرانی پر چھوڑ کر آ گیا۔ میں آپ سے فوراً ملنا چاہتا تھا لیکن آپ میٹنگ میں تھے اس دوران میں نے سوچا اپنے بھی دو چار کام نمٹا آؤں اسی چکر میں......''

''مختصر بات کرو نیامت تمہارا چہرہ جو کہانی سنا رہا ہے، وہ بتاؤ۔'' سالار اس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

''سر چار گھنٹے پہلے تک ہر چیز ٹھیک تھی۔ وہ عورت اسی مکان میں اپنی بیٹی کے ساتھ تھی پھر نہ جانے کیا ہوا ایک دم سے وہاں آگ بھڑک اٹھی۔ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ اسے روکنا مشکل ہو گیا۔ ہمارے آدمی نے پہلے خود آگ بجھانے کی کوشش کی پھر قریبی گھروں سے مدد مانگی لیکن سوائے ایک گھر کے چوکیدار کے کوئی مدد کو نہ آیا۔ آگ اتنی زیادہ تھی کہ ان دونوں کے بس سے باہر ہو گئی۔ فائر بریگیڈ والے دو گھنٹے بعد پہنچے جب تک سب کچھ جل کر خاکستر ہو گیا......''

''اور یہ تم مجھے اب بتا رہے ہو؟'' سالار نے دوبارہ ٹوکا اور غصے سے بولا۔

''سر مجھے جیسے ہی علم ہوا میں وہاں پہنچا اور حالات کو سمجھنے کی کوشش......''

''شٹ اپ یو بلڈی ایڈیٹ۔ ایک عورت اور اس کی بیٹی کی نگرانی کا کام دیا تھا وہ بھی نہ ہو سکا۔''

''معافی چاہتا ہوں سر۔''

''ماں بیٹی کا کیا بنا؟'' وہ دھاڑ کر بولا۔

''سر ان کی جلی ہوئی نعشیں ملی ہیں۔'' نیامت ڈرے ڈرے لہجے میں ندامت سے سر جھکا کر بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' نیامت تقریباً بھاگتا ہوا باہر نکل گیا جیسے اسے سالار کے فیصلے کے بدل جانے کا ڈر ہو۔ سالار نے موبائل اٹھایا اور آفس سے باہر نکل آیا۔ لفٹ کے ذریعے وہ گراؤنڈ فلور پر آیا تو باوردی ملازم پہلے سے گاڑی لیے کھڑا تھا۔ نیامت کے آنے سے پہلے ہی وہ ڈرائیور کو گاڑی لگانے کا کہہ چکا تھا۔ اس کا ارادہ اپنے چچا سے ملنے کا تھا۔ ان سے عفیفہ والا معاملہ ڈسکس کرنا چاہتا تھا لیکن اب پلان بدل چکا تھا۔ اس کا موڈ بگڑ چکا تھا اس کا

رخ ایک کیفے کی جانب ہو گیا۔ وہ اکثر اس کیفے میں بیٹھتا تھا، کبھی اکیلا کبھی دوستوں کے ساتھ۔ اس کی زندگی میں بھونچال آگیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک زندگی پورے جوبن پر تھی۔ وہ اسے پورے دل سے جی رہا تھا لیکن جب سے اسے پتا چلا اس کے جان سے پیارے چچا ہی اس کے ماں باپ کے قاتل تھے تب سے زندگی میں جیسے بڑے بڑے نکیلے کانٹے اگ آئے تھے۔ وہ جب بھی ان کو دیکھتا، اسے ان میں صرف ایک قاتل کا چہرہ نظر آتا۔ زندگی نے بڑی بے دردی سے اسے حقیقت کی دنیا میں لاکھڑا کیا تھا۔ ایک کارنر ٹیبل دیکھ کر وہ بیٹھ گیا۔ گلاس وال سے باہر رواں ٹریفک زندگی کی علامت تھی لیکن اس کی زندگی جیسے رک گئی تھی۔ ہر انسان بے اعتبار لگنے لگا تھا۔ اس کا کسی پر اعتبار کرنے کو دل ہی نہیں مانتا تھا۔ چچا نے اگر اسے دھوکا دیا تھا تو انکل کمال پر بھی یقین کرنے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ اس نے پہلے بزنس میں دھوکادہی کی پھر پیسا لوٹا دیا اب اس کا خیرخواہ بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایک کافی۔'' ویٹر کے پوچھنے پر اس نے گلاس وال سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

''اور ایک میرے لیے ودکریم۔'' ایک چنچل سی لڑکی اس کی ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے تیزی سے بولی۔ وہ قدرے حیرانی سے اس خوامخواہ میں نازل ہونے والی حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔

''ایسے کیا بھئی؟'' وہ لڑکی شوخی سے بھویں اچکا کر بولی۔ ''نظر نہیں آ رہا کوئی اور ٹیبل خالی نہیں ہے؟'' وہ اپنے شولڈر بیگ سے ایک خاکی لفافہ نکال کر کھولتے ہوئے اس میں سے نکلنے والی تصویروں کو منہ بنا بنا کر دیکھ رہی تھی۔ چاہتے ہوئے بھی وہ اس سے نظر نہ ہٹا پایا۔ لڑکی کا چہرہ کافی جانا پہچانا لگ رہا تھا لیکن اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے پہلے کہاں ملا تھا۔

''یہ دیکھو۔'' وہ ایک تصویر اس کی طرف بڑھا کر بے تکلفی سے بولی۔ ''اس شہر کے سب سے مہنگے اور مشہور فوٹوگرافر نے لی ہے مگر میری شکل دیکھی ہے جیسے کسی مگرمچھ کو دیکھ لیا تھا۔ فوٹو کھینچنے کا اینگل ہی اس کا غلط تھا اور یہ دیکھو'' وہ ایک اور تصویر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے بولی۔ ''میری ناک کتنی پھولی آئی ہے اور آنکھوں کے نیچے حلقے ایسے محسوس ہو رہے ہیں جیسے میں انیس کی نہیں اکتالیس کی ہوں۔'' وہ دونی آواز میں بولی۔ سالار نے اب اسے تفصیلاً دیکھا۔ لڑکی کا بیگ، ڈریس اور موبائل سب قیمتی تھے۔ وہ یقیناً کسی امیر فیملی کا حصہ تھی۔ وہ باقی کی پانچ چھ تصویریں بھی مختلف تبصروں کے ساتھ اسے دکھا رہی تھی۔ ویٹر دونوں کی کافی لایا تو لڑکی خاموش ہوئی ورنہ وہ اسے بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

''یہ کسی اچھے فوٹوگرافر نے نہیں اتاری ہیں، عام سے کیمرے سے لی گئی ہیں۔ تمہیں یقیناً کسی نے بے وقوف بنا کر لوٹا ہے۔'' کافی کا گھونٹ بھر کر وہ دوبارہ سے باہر دیکھنے لگا۔

''تم یہ کس بنا پر کہہ سکتے ہو، تمہیں کیا پتا کسی اچھے نے لی ہیں یا۔''

''اس شہر کیا ملک کے بھی اچھے اور نامور فوٹوگرافرز کو میں اچھی طرح جانتا ہوں، یہ ان میں سے کسی کے بھی ہاتھوں سے لی گئی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کسی نے تمہیں بے وقوف بنایا ہے۔''

''بار بار مجھے بے وقوف کہہ رہے ہو ثابت کرو یہ اچھے فوٹوگرافر نے نہیں لیں۔'' وہ غصے سے بولی۔

''میں ان فوٹوگرافرز کی بات کر رہا ہوں جن کی مارکیٹ میں ساکھ ہے ایک نام ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے میں نے کسی بے نام فوٹوگرافر سے اتروائی ہیں؟'' وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ سالار نے اس مرتبہ اسے گھور کر دیکھا..... وہ دونوں اپنی اپنی کافی بھلائے بحث میں مصروف تھے۔ تصویروں کو غصے سے دوبارہ لفافے میں ڈالتے ہوئے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''ایک اچھا فوٹوگرافر جب تصویر دیتا ہے تو اپنا نام ضرور لکھتا ہے لیکن ان میں سے کسی بھی تصویر پر کوئی نام نہیں لکھا ہوا۔'' وہ سنجیدگی سے بولا تو وہ ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی پھر تیزی سے اپنا بکھرا سامان سمیٹنے لگی اور پھر اس پر ایک آخری نظر ڈال کر چلی گئی۔ سالار نے ایک مرتبہ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے باہر اپنی گاڑی میں بیٹھنے تک دیکھا۔ کافی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ گاڑی کی جانب تھا آج گھر جانے کا موڈ نہیں تھا۔

عفیفہ جب سے اس کی زندگی میں آئی تھی، کافی تبدیلیاں لائی تھی۔ وہ اس پر دل سے اعتبار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے اعتبار ضروری تھا اعتماد بھی ہوتا جب اسے اچھی طرح پرکھ لیتا ہے۔ وہ خوب صورت تھی، ذہین تھی، بزنس کی کافی باریکیوں اور اونچ نیچ کو جانتی تھی ایسا لائف پارٹنر خوش قسمت لوگوں کا نصیب ہوتا ہے لیکن وہ اس شادی پر دل سے خوش نہیں تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ

سب چچا کو تباہ کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ اس میں اس کی اپنی خوشی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ شجاع احمد اس کا آئیڈیل تھا۔

☆☆☆

بچپن سے جوانی تک اس نے صرف اسے ہی آئیڈیلائز کیا تھا اور اب یہ آئیڈیلزم کا بت پاش پاش ہو چکا تھا۔ انکل کمال نے جو ثبوت پیش کیے تھے، وہ سو فیصد صحیح تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی ویڈیو تھی جس میں اس کا چچا ایک کنٹریکٹر کو اس کے ماں باپ کے قتل کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کر رہا تھا۔

”یہ لو نعیم تمہارے منہ مانگے معاوضے کی ایڈوانس رقم، میں آج رات کو ہی لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ صبح ناشتے میں مجھے وقار اور اس کی بیوی کی حادثاتی موت کی خبر ملنی چاہیے ورنہ تم جانتے ہی ہو میرے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اپنی سانسیں گننا شروع کر دو اگر مجھے دھوکا دینے کے بارے میں سوچا بھی تو......“ نوٹوں کا بریف کیس کھولتے ہوئے نعیم نامی اس کلر سے بولتا ہوا وہ اس کا چچا تو ہرگز نہیں لگ رہا تھا وہ کوئی انتہائی ظالم شخص تھا جس کے نزدیک رشتے ناتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سالار نے یہ ویڈیو کئی بار دیکھی تھی جیسے اس حقیقت کو جھٹلا دینا چاہتا ہو...... حقیقت جھٹلانے سے بدلتی نہیں اس کے ماں باپ اسی حادثاتی موت کا شکار ہوئے تھے جس کو اس کے چچا نے پلان کیا تھا۔ یقیناً یہ ویڈیو کلر نے شجاع احمد کو مستقبل میں بلیک میل کرنے کے لیے بنائی ہو لیکن یہ کسی نہ کسی طرح کمال تک پہنچ گئی تھی۔ اب وہ عفیفہ سے شادی کر کے اسے اپنے بزنس میں پارٹنر بنا کر اس کی اور اپنی دولت سے اپنا مستقبل مزید سنوار سکتا تھا۔ اس طرح شجاع احمد کو ہار بھی ہو جاتی، لیکن اتنی آسان ہار وہ شجاع احمد کو دینا نہیں چاہتا تھا۔ کمال پر اسے رتی بھر یقین نہیں تھا۔ تو کیا وہ عفیفہ پر اعتبار کر سکتا تھا۔ اگر وہ اور عفیفہ مل جاتے تو ان دونوں بڈھوں سے انہیں نجات مل جاتی۔ لیکن شجاع احمد کے لیے وہ کچھ الگ سے پلان کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کا چچا بزنس سے ہٹ کر باہر سے غیر قانونی اسلحہ امپورٹ کرتا تھا۔ شجاع نے اسے ان کاموں سے الگ رکھا تھا اور اپنے تئیں ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی لیکن سالار بھی اسی کا بھتیجا تھا۔ ایسے ظاہر کرتا جیسے کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس نے اپنے جاسوس بچے اس معاملے میں انوالو کیے ہوئے تھے۔ بظاہر وہ شجاع احمد کے ورکرز تھے لیکن وفادار وہ سالار کے تھے۔ اگر وہ اس بارے میں پولیس کو اطلاع کر دیتا تو بھی اس کا وہ انتقام نہ ہوتا جیسا وہ پلان کر رہا تھا۔ وہ شجاع احمد سے ایسا بدلہ لینا چاہتا تھا ایسا بدلہ جو اس کی روح کو سکون بخش سکتا اس کے لیے اسے ایک قابلِ اعتماد پارٹنر کی ضرورت تھی۔ اس نے بالآخر فیصلہ کر لیا کہ وہ عفیفہ کو پہلے اعتماد میں لے گا پھر اسے سب کچھ بتا دے گا اسے یقین تھا وہ اس کا ہی ساتھ دے گی۔

☆☆☆

تین بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب عفیفہ نے ایک جھٹکے سے لحاف ہٹایا اور پھرتی سے بیڈ سے اتر کر اپنی الماری کی جانب بڑھی۔ الماری کھولتے ہی اس نے خفیہ خانے سے ایک گھڑی نما آلہ نکالا۔ اس نے اس کے اوپر لگے بٹنوں کو خاص انداز میں دبایا تو آلے کے چاروں طرف سے نیلے رنگ کی شعاعیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ یہ شعاعیں اتنی طاقتور تھیں کہ آدھے کلومیٹر تک کی رینج میں موجود ہر ڈیوائس کو وقتی طور پر جیم کر دیتی تھیں۔ اس طرح اس کے کمرے اور پورے گھر میں لگے کیمرے اپنا کام چھوڑ دیتے۔ فیصل مخصوص راستے سے گھر میں داخل ہو کر اس کے کمرے میں آ جاتا تھا۔ اس کے کمرے میں آتے ہی وہ شعاعوں کی رینج کم کر دیتی۔ اس طرح صرف کمرے کی ڈیوائسز جیم رہتی اور باقی گھر کے کیمرے اپنی سابقہ حالت میں کام کرنے لگتے۔ رات کے اس وقت میں چار پانچ منٹ کے لیے کیمروں کے جیم ہونے کا کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا اور کسی کو کبھی شک بھی نہیں ہوا تھا۔ لیٹ نائٹ جاگنے والے بھی اس وقت سو جاتے ہیں چوکیدار بھی بالآخر اونگھنے لگتے ہیں۔ اس لیے ان دونوں نے ملنے کا یہی وقت منتخب کیا ہوا تھا۔ تاکہ وہ سکون سے ایک دوسرے سے بات کر سکیں۔ گھر سے باہر وہ چوری چھپے ملنے کا رسک لے سکتی تھی لیکن یہ زیادہ دیر چلنے والا نہیں تھا اس لیے انہوں نے بہتر یہی جانا کہ ملنے کی مناسب جگہ گھر تھا۔ فیصل نے بلیک مارکیٹ سے اس کے لیے یہ گھڑی نما ڈیوائس حاصل کی تھی۔ اس طرح دونوں ابھی تک کم سے کم خطرے میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے بہ آسانی ملنے لگے تھے۔

آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے فیصل نے لاک بھی کر دیا اور پھر پلٹ کر عفیفہ کی طرف بڑھا۔ وہ اپنی دونوں بانہیں وا کیے محبت پاش نظروں سے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کی بانہوں میں سما گیا۔

”ہفتہ یوں گزرتا ہے جیسے سال۔“ وہ اسے پیار کرتے ہوئے وارفتگی سے بولا۔

”جن کا ضمیر مر جائے ان کے دن تھوڑے رہ گئے سویٹ ہارٹ۔“

وہ اس کے سینے سے سر ٹکائے ہوئے گہری سانس لے کر بولی۔ ''اس گدھے کو اپنے تلوے چاٹنے پر مجبور کر دوں گی۔ چور کے سو سال ختم ہونے والے ہیں پھر ہمارا وقت ہوگا اور ساری ایمپائر بھی ہماری۔'' فیصل باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس قیمتی وقت سے فائدہ اٹھانے لگا۔ کافی دیر تک پیار کا خمار سر چڑھ کر بولتا رہا پھر وہ دونوں تھک کر ایک دوسرے کی بانہوں کی قید میں آ گئے۔

''کاش وقت یہیں تھم جائے اب تم سے ایک پل بھی دور ہونے کو دل نہیں مانتا، بڑی مشکل سے خود کو کنٹرول کرتا ہوں لیکن کچھ عرصہ مزید ایسے ہی رہا تو دل پسلیوں کے حصار سے نکل آئے گا۔'' فیصل نے اس کے کانوں میں پیار سے سرگوشی کی، وہ مزید سمٹ گئی۔ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ کمال نے اگرچہ اس کے جسم کو کئی بار گدھوں کی طرح نوچا کھسوٹا تھا لیکن اس کے دل پر حکمرانی صرف فیصل کی تھی۔ وہ اس کا ماموں زاد تھا۔ جب عفیفہ کی ماں زندہ تھی، وہ اپنے والدین کے ہمراہ ان سے ملنے آتے تھے۔ عفیفہ کو وہ شروع سے ہی پسند تھا۔ ماں کی موت کے بعد کمال نے ان سے ملنا جلنا بند کر دیا۔ ماموں خود ہی عفیفہ سے آ کر مل لیتے پھر ایک دن کمال نے اسے بھی گھر آنے اور عفیفہ سے کوئی بھی تعلق رکھنے سے روک دیا۔ عفیفہ کا ماموں چاہتا تو عفیفہ کو اپنے پاس رکھ سکتا تھا کیونکہ وہ کمال کی سگی اولاد نہیں تھی لیکن اس کے مالی حالات اسے ایسا کرنے کی اجازت نہ دے سکے۔ عفیفہ جن سہولیات زندگی کی عادی ہو چکی تھی، وہ اسے کبھی بھی نہیں دے سکتا تھا اس لیے صرف عفیفہ کے روشن مستقبل کی خاطر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے بعد کئی سال عفیفہ کا ماموں سے اور فیصل سے ملنا نہ ہو سکا۔ دو سال پہلے اس کے ماموں کی اچانک ڈیتھ پر کمال نے اسے چند گھنٹوں کے لیے جانے کی اجازت دے دی۔ اس کی فیصل سے دوبارہ ملاقات ہوئی، وہ جوان ہو چکا تھا۔ بچپن کی محبت نے دوبارہ سے انگڑائیاں لینا شروع کر دیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور نہ ہو سکے۔ پہلے وہ چوری چھپے موبائل پر باتیں کرتے تھے پھر فیصل نے اسے یہ انوکھی ڈیوائس دی تو ان کی زندگی سے خوف و خطرہ جیسے ٹل گیا۔ وہ اب... بہ آسانی ایک دوسرے سے ملنے لگے تھے۔ عفیفہ کے حالات کا فیصل کو علم تھا۔ عفیفہ نے اسے اپنی زندگی کے سارے راز بتا دیے سوائے اپنے اور کمال کے ناجائز تعلق کے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اسے صرف اس بنا پر چھوڑ دے۔ اسے ہر حال میں کمال کی قید سے نکلنا تھا اس کے لیے اسے تھوڑا سچ اور تھوڑا جھوٹ سے کام لینا پڑا۔ وہ عفیفہ کو اس کے چنگل سے چھڑوانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ عفیفہ اور اس نے مل کر کمال کو کنگال کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے بعد وہ یہ ملک چھوڑ دیتے اور کسی بھی دوسرے ملک جا کر ایک نئی زندگی شروع کرتے۔ اس منصوبے کی کامیابی کا سارا دارومدار وقت کے صحیح استعمال پر تھا۔ اور ان دونوں کو اس... خاص وقت کا شدت سے انتظار تھا۔ ایک مرتبہ وہ اس چانس کو مس کر دیتے تو پھر زندگی بھر یہ موقع شاید نہ ملتا۔ ان دونوں کو پتا بھی نہیں چلا اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ فیصل گرفتہ دل کے ساتھ اپنے جاگرز پہننے کے بعد جیکٹ پہننے لگا۔ جیکٹ کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی سی شیشے کی بوتل نکالی۔ اس میں پانی جیسا کوئی محلول تھا۔

''صرف ایک قطرہ روزانہ۔'' وہ بوتل اسے تھما کر بولا۔ عفیفہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ ''یہ کہاں سے لیا تم نے؟''

''فضول سوال۔'' وہ سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں جانم۔'' وہ پیشانی کا بوسہ لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ عفیفہ نے جلدی سے گھڑی کی ٹائمر کی رینج بڑھا دی۔ اور پھر ٹھیک پانچ منٹ بعد ٹائمر کو آف کر کے دوبارہ سے اسے الماری میں رکھ دیا۔ صبح کے چھ بجنے والے تھے۔ چونکہ موسم سرما تھا اس لیے باہر ابھی روشنی نہیں ہوئی تھی لیکن آدھے گھنٹے تک سورج نکلنے کے بعد عفیفہ کو اپنا بستر چھوڑنا تھا۔ سات بجے وہ کمال کے ساتھ ایکسرسائز کرتی تھی اور پھر آٹھ بجے ناشتے کے بعد دونوں کو آفس جانا ہوتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پرسکون انداز میں لیٹ گئی۔ کمال کے سامنے وہ خود کو فریش شو کرنا چاہتی تھی۔ اس نے پچھلے ہفتے فیصل کو ایسی خاص دوا لانے کو کہا تھا۔ جسے وہ کمال کے کھانے میں شامل کر کے اسے اعصابی طور پر کمزور کرنا چاہتی تھی۔ ایسا وہ اس لیے چاہتی تھی تاکہ کمال کی قوت فیصلہ کمزور ہو جائے، یہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے کرنا چاہتی تھی۔ کمال چونکہ ذہنی و جسمانی طور پر کافی مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ اپنے سارے اہم فیصلے خود کرتا تھا لیکن عفیفہ چاہتی تھی کہ وہ اسے بھی اپنے فیصلوں میں شامل کرنا شروع کر دے۔

☆☆☆

حنا ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب یوسف صاحب نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اس وقت اخبار پڑھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر اخبار

سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا۔

''بیٹھو بیٹا۔'' وہ بیٹھ گئی تو وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے وہ انہیں کل کی رپورٹ دینے لگی۔

''میری ملاقات ہوئی تھی اس سے، اسے مجھ پر شک نہیں ہوا۔ وہ یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ میں وہی لڑکی ہوں جو مر چکی ہوں اور جس دن مروں اس سے اگلے ہی دن زندہ بھی ہو جاؤں اور ہنستے مسکراتے اس سے گپ شپ بھی کرنے لگوں۔'' وہ قدرے سپاٹ لہجے میں بولی۔ یوسف صاحب نے بیٹھے بیٹھے سائڈ چینج کی۔ وہ اس کی اداسی کو محسوس کر سکتے تھے۔

''یہ کرنا بہت ضروری تھا ورنہ وہ تم پر شک کرتا۔ تم اس سے ایک انجان لڑکی کے طور پر ملی ہو جو بہت زیادہ لاابالی قسم کی ہے شوخ ہے خوب صورت بھی ہے۔ اسے بچپن سے ایسی ہی لڑکیاں پسند رہی ہیں۔''

''لیکن آپ جانتے ہیں میں ایسی نہیں ہوں، شوخ ہونا تو ایک الگ بات ہے آج تک میری زندگی میں کوئی شوخ و چنچل لمحہ بھی نہیں گزرا، میرے پاس سے تو ہوا بھی کم ہی گزرتی ہے۔'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے افسردگی اور دکھ سے بولی۔ یوسف صاحب نے محسوس کیا اس کی آنکھیں بھی جھلک گئیں۔

''میں جانتا ہوں تم بہت بہادر لڑکی ہو، ورنہ آج کل کے دور میں یوں اس طرح اکیلے رہنا بہت مشکل ہے۔ تمہاری ماں کی ہمت کو بھی میں داد دیتا ہوں لیکن مشکلوں اور سختیوں کا دور اب ختم ہو گیا ہے، تمہیں تمہارا حق مل رہا ہے، اس حق کا تم نے برسوں انتظار کیا ہے......''

''میں نے کسی حق کا کبھی انتظار نہیں کیا، میں نے ہمیشہ یہی سوچا کہ میرا باپ مر چکا ہے۔ ماں لوگوں کے گھر کام کر کے میرا پیٹ پالتی رہی اور مجھے پڑھاتی رہی، اس کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور اب ایک باپ ملا بھی ہے تو اسے اپنا مطلب ہے وہ شاید ساری عمر مجھ سے نہ ملتا اگر اسے اپنا مطلب نہ ہوتا۔ لیکن آپ لوگ بے فکر رہیں، میں نے سالار کو ذرہ برابر شک نہیں ہونے دیا، اپنی نیچر سے ہٹ کر ایک ایسی لڑکی کا کردار ادا کیا جو اس کی آئیڈیل تھی۔ ایسا میں صرف اس لیے نہیں کر رہی کہ مجھے دولت کی آرزو ہے یہ میں صرف اپنا کیریئر بنانے کے لیے کر رہی ہوں تاکہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکوں اور جہاں تک حق کی بات ہے تو اسے مجھ سے اب کوئی چھین نہیں سکتا چاہے وہ کتنا بھی مضبوط ہو۔'' وہ سخت لہجے میں بولی تو یوسف صاحب کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ اپنے باپ کے جیسے لگ رہی تھی اسی کی طرح بلند ارادے اور لہجے کی مضبوطی۔ وہ یقیناً ان کی امیدوں پر پورا اترنے والی تھی۔ سالار کا عفیفہ اور کمال کی طرف جھکاؤ بہت بڑھ چکا تھا۔ شجاع احمد اپنی برسوں سے کھڑی کی گئی ایمپائر یوں آسانی سے کسی کے ہاتھوں میں جانے نہیں دے سکتا تھا خاص کر کمال جیسے دشمن کو تو بالکل بھی نہیں چنانچہ اسے جیسے ہی اپنی بیٹی کے بارے میں علم ہوا اس نے تصویر کو فوراً پھاڑ دیا ایسا بھی اس نے سالار کی وجہ سے کیا اگر سالار وہ تصویر دیکھ لیتا تو وہ اسے غائب کروا دیتا، دولت ایسی ہی چیز ہے جس کی وجہ سے بیٹا باپ کا اور بھائی کا قتل بھی کروا دیتا ہے۔ شجاع احمد کو بھی حالات ایسے دوراہے پر لے آئے تھے جہاں بیٹی اسے کسی گمشدہ خزانے کی طرح لگی تھی۔ وہی بیٹی جس کو برسوں پہلے وہ دھتکار چکا تھا اپنی انا، خاندانی وقار کے خم میں آج وہی بیٹی اسے وہ سہارا لگی جو ڈوبنے والے کو درکار ہوتا ہے۔ اولاد کے معاملے میں وہ ساری عمر ترستا ہی رہا تھا۔ ایک ہی معذور بیٹا تھا جو اپنے کمرے میں ملازموں کے سہارے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اس نے برسوں پہلے ریشم کو اپنے وجود اور اپنے خاندان سے دور پھینک دیا تھا۔ ریشم اس کے سامنے گڑگڑائی بھی تھی لیکن اس وقت وہ ایک جابر حکمران تھا، ریشم بیچاری تو کمزور تھی صرف بددعا ہی دے سکتی تھی اور وہی دے کر چلی گئی۔ اس کے بعد وقت نے ثابت کر دیا کہ وہ کبھی ایک نارمل بچے کا باپ نہیں بن سکے گا۔ اس نے اس پر ہار نہیں مانی اپنے بھتیجوں کو تیم کر کے ان کا سرپرست بن گیا اس طرح گھر کی دولت گھر میں رہنے والی تھی۔ مگر اب ایسا ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ کمال جیسا کھلاڑی میدان میں تھا جس کی ساری زندگی دھوکے اور فراڈ سے بھری ہوئی تھی۔ کمال سے زیادہ خطرناک اس کی سوتیلی بیٹی لگ رہی تھی۔ جس نے آج کل سالار کا ہر لمحہ اپنے نام کر لیا تھا۔ وہ شاید عفیفہ کو بدنام گلی سے آنے والی حسینہ ہی سمجھتا رہتا اگر اسے ایک گمنام کال نہ آتی جس میں اسے کسی نے بتایا کہ عفیفہ کمال کی بیٹی ہے۔ یہ شجاع کے لیے ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔ سالار عنقریب اس کے ہاتھوں سے نکلنے والا تھا، یہ بات اس کی برداشت سے باہر تھی۔ ایسی صورت حال میں جبکہ وہ مایوس ہو چکا تھا، ریشم اندھیرے میں کسی کرن کی طرح نمودار ہوئی۔ اس سے ملتے ہی شجاع کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ اس کی دولت کی مالک اس کی اپنی بیٹی زندہ تھی۔ وہ ڈوب رہا تھا اور وہ اسے بچانے آ گئی۔ بیٹی نے بڑھاپے

میں بھی بیٹوں جیسا حوصلہ دیا تھا۔ وہ جیسے پھر سے جوان ہو گیا۔ اس کے دماغ نے تیزی سے منصوبہ بندی شروع... کر دی۔

☆☆☆

حنا کمرے میں آئی تو ماں کو آئینے کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ بہت خوش ہو کر اپنے نئے کپڑے دیکھ رہی تھی۔

''حنا میں نے کہا تھا نا کہ ہمارے دن بدلیں گے، مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا، میں اس بڑے گھر میں کسی مالکن کی طرح ہوں اور نوکر میرے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔'' حنا خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''اماں مجھے تو یہ کوئی چکر لگتا ہے، کتنے سالوں سے ابا کو میری یاد نہیں آئی اور اب وہ مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہا ہے۔ یہ امیر لوگ اپنے مطلب کے لیے ہی اتنا جھکتے ہیں، یہ نہ ہو ہم نہ گھر کے رہیں نہ گھاٹ کے۔'' حنا جیسی سمجھ دار اور ذہین لڑکی اس ہمارے ماحول سے ابھی تک مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ دو دن کے اندر ان کی اچانک قسمت بدل گئی تھی۔ اس کی ماں جو لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی، آج ایک مالکن کے روپ میں کھڑی تھی۔ یہ روپ اگرچہ اس پر کچھ زیادہ سج نہیں رہا تھا لیکن یہی حقیقت تھی۔

''ماں تو نے مجھے بتایا نہیں ابا جیسے گورے چٹے خوب صورت مرد نے تجھ سے شادی کیسے کر لی۔'' ریشم نے اس کے سوال پر خود کو آئینے میں پھر سے دیکھا اور جیسے کھو سی گئی۔

''تب میں سترہ سال کی تھی شجاع صاحب نئے نئے باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ میں تو ڈرتے ہوئے ان کو دیکھتی بھی نہیں تھی گھر کے کام ابا اور اماں کرتے تھے، وہ دونوں مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتے تھے میں بس پڑھنے جاتی تھی اور آ کر اماں کے کام میں تھوڑی بہت مدد کر دیتی تھی۔ ایک دن میں اماں کے ساتھ لان میں پھولوں کے گلدستے بنا رہی تھی۔ یہ گلدستے رات کے فنکشن کی تیاری کا حصہ تھے جو کہ شجاع صاحب کے آنے کی خوشی میں بڑی بیگم اور بڑے صاحب کر رہے تھے۔ میں نے آسمانی رنگ کا... جوڑا پہنا ہوا تھا۔ رنگ میرا سانولا تھا لیکن سبھی کہتے تھے مجھ میں بہت کشش ہے میں اپنے ہی دھیان میں بڑی چاہت کے ساتھ پھول اکٹھے کر رہی تھی جب اچانک شجاع صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں پہلے تو ڈر گئی پھر چونک کر اماں کو دیکھا وہ شاید کسی کام سے اندر گئی تھیں۔ ارد گرد کوئی نہ تھا اسی لیے اس نے میرا ہاتھ یوں پکڑا اور پھر مجھ سے پیار بھری باتیں کرنے لگا۔ میری تعریفوں نے مجھے بھی آسمان پر پہنچا دیا۔ بس پھر مجھے پتا ہی نہ چلا ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے، بہت زیادہ قریب......

''پھر اماں ابا اور گھر کے ایک اور راز دار ملازم کی موجودگی میں نکاح ہو گیا پھر ہمارا ہنی مون ہوا وہ اماں ابا سے پوچھ کر مجھے مری لے گیا۔ ہم وہاں دو ہفتے رہے، وہ دن میری زندگی کے یادگار دن تھے میں جیسے دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ ایک لمحہ بھی مجھے خود سے الگ نہیں کرتا تھا۔ مری سے واپس آ کر بھی وہ مجھے اکثر کہیں نہ کہیں گھمانے پھرانے لے جاتا تھا۔ مجھے اچھے اچھے کپڑے اور زیورات بھی دلاتا، مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی تھی۔ میری سب سے بڑی خواہش وہ خود تھا اور مجھے کچھ اور کی تمنا بھی نہیں تھی۔''

''یہ شادی یقیناً ابا نے اپنے ماں باپ سے چوری چھپے ہی کی ہوگی۔''

''ظاہری بات ہے، وہ اس شادی کی کبھی اجازت نہ دیتے لیکن میرے باپ کی خواہش بھی تھی کہ اب جلد از جلد شجاع صاحب اپنے والدین کو یہ بات بتا دیں چاہے مگر وہ ٹال دیتا تھا۔ اس ٹال مٹول میں تین مہینے گزر گئے اور پھر اس گھر میں شجاع صاحب کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ان تیاریوں میں اماں اور ابا بھی شامل تھے وہ بہت پریشان رہنے لگے تھے اماں تو اکثر روتی رہتی پھر شادی کے دن قریب آ گئے جب اچانک یہ انکشاف ہوا کہ میں امید سے ہوں۔ اماں نے یہ بات شجاع صاحب کو بتائی وہ ہتھے سے اکھڑ گیا۔ اماں کو گھر سے نکالنے کی دھمکی بھی دی۔ میں نے بھی شجاع صاحب کی منت سماجت کی لیکن تب شاید نئی خوب صورت بیوی آنے کے چکر میں، میں انہیں بہت پرانی اور بری بھی لگنے لگی۔ وہ کہتے تھے کہ مجھ سے ان کا تعلق صرف دل لگی کی حد تک تھا۔ شادی سے دو دن پہلے ہماری بہت بحث ہوئی۔ میں نے رو رو کر التجا کی کہ وہ یہ شادی نہ کرے اور اگر کرنا بھی چاہتا ہے تو مجھے بھی اپنائے لیکن اس دن وہ ڈر گیا وہ یقیناً اپنے نئے مستقبل میں پڑنے والے میرے جیسے غلیظ دھبے سے ڈر گیا۔ اس دن اس نے ہمیں گھر سے ہی نکال دیا۔ میں ٹوٹ گئی، بہت بددعائیں بھی دیں لیکن ہمیں رہنے کے لیے ایک اور گھر ڈھونڈنا پڑا۔ میں اب بڑے... گھروں میں رہنے سے ڈرنے لگی۔ اس لیے اماں ابا نے کرائے پر ایک گھر لیا۔ تیری پیدائش کے کچھ عرصے بعد باری باری اماں ابا اس دنیا سے چلے گئے۔ انہیں میرا غم کھا گیا اور غموں نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ لیکن مجھے تو غم بھی نہ کھا سکا۔ مجھے زندہ

رہنا تھا تیرے لیے اور پھر میں نے اپنی زندگی کا ہر گز تجھے بنا لیا تو بہت خوب صورت تھی اور لوگ تجھے میری بیٹی نہیں سمجھتے تھے۔'' وہ بات کرتے کرتے ہنسنے لگی۔ اس کی آنکھوں کی نمی حنا سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''اماں تو نے ابا کی محبت میں دوسری شادی نہیں کی نہ......''

''ہاں وہ دور ہو کے بھی تیری شکل میں ہر وقت میرے پاس ہی رہا ہے، میں نے ناحق اسے بددعائیں دیں، وہ آج بالکل اکیلا رہ گیا ہے۔''

''بددعاؤں والی بات اپنی جگہ اماں لیکن انسان جو بوتا ہے وہی اسے کاٹنا پڑتا ہے۔ اس نے ایک مظلوم عورت پر ظلم ڈھایا خود کیسے سکون میں رہ سکتا ہے، یہ مکافاتِ عمل ہے کم از کم اس بات کے لیے خود کو مجرم نہ ٹھہراؤ۔'' وہ بولی اسی وقت ملازم اسے بلانے آ گیا۔ اس کی ٹریننگ کی پہلی کلاس تھی۔ یوسف صاحب نے ہائی سوسائٹی کے مطابق اس کی گرومنگ کلاسز کا اہتمام بھی گھر میں ہی کر لیا تھا۔ اس نے ملازم کو چینج کر کے آنے کا کہا اور خود واش روم میں گھس گئی۔ [illegible] ابھی تک بیڈ کے کونے پر کسی ماضی کے سفر میں گم تھی۔ اٹھارہ سال بعد وہ ایک مرتبہ پھر سے شجاع احمد کی زندگی میں ایسے آئی تھی۔ درمیان کا وقت جیسے آیا ہی نہ ہو۔ آج شجاع کو آنا تھا اور وہ خود کو اچھا سا تیار کرنا چاہتی تھی۔ سالوں پہلے کی محبت جیسے پھر سے کروٹیں لینے لگی۔

☆☆☆

عفیفہ، سالار کے ساتھ اس کی ایک پروڈکٹ کی شوٹنگ دیکھنے آئی تھی۔ شوٹنگ کے لیے ملک کی نامور ماڈل کو لیا گیا تھا۔ وہ آج کچھ زیادہ ہی نخرے دکھا رہی تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے بھی اسے ہی ہائر کیا تھا۔ اس دفعہ وہ معاوضہ بھی دگنا مانگ رہی تھی حالانکہ یہ ڈیل نہیں ہوئی تھی پھر بھی سالار اسے اس کی ڈیمانڈ کے مطابق دے رہا تھا۔

''وہ دوسری ماڈل کا کیا ہوا، ارینج ہوگئی؟'' سالار کو پچھلے کئی ہفتوں سے ایک نئے چہرے کی تلاش تھی۔ وہ ایک ایسی ماڈل سے کام لینا چاہتا تھا جو لوگوں کے لیے نئی ہو، معصوم ہو، خوب صورت اور چنچل بھی ہو لیکن شوبز میں اسے ایسا پُرکشش کوئی چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا اس نے عفیفہ کو بھی یہ سب بتایا تھا کہ وہ اس مرتبہ ایک نئی لڑکی کو متعارف کروائے گا۔ اس کی پروڈکٹس کے لیے کام کرنے والی ماڈلز راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتی تھیں۔ عفیفہ کے سوال پر سالار کو بے ساختہ وہ شوخ لڑکی یاد آئی جو کچھ دن پہلے اس کی گاڑی پر آ کر بیٹھی تھی لیکن وہ نہ اس کا نام جانتا تھا نہ پتا۔ اپنی بے دھیانی پر وہ مسکرایا، عفیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''مسکرانے کی وجہ کہیں وہ نیا چہرہ تو نہیں ہے؟''

عفیفہ کے پوچھنے پر سالار نے اسے ساری بات بتائی۔

''پھر تمہیں روز اس کیفے میں بیٹھنا چاہیے شاید وہ دوبارہ بھی آ جائے۔''

''صحیح کہا تم نے، اس چہرے کے لیے یہ کچھ زیادہ نہیں ہوگا۔''

''تو پھر تو کسی بھی چہرہ ہی ہونا چاہیے، دل نہیں۔''

عفیفہ تیکھی ادا سے بولی تو سالار بے ساختہ مسکرا دیا۔ پچھلے کافی دنوں سے وہ کھل کر ہنسا بھی نہیں تھا۔ اندر باہر ایک گھٹن سی تھی۔

''کوئی مسئلہ ہے کیا، تم ٹھیک نہیں لگ رہے؟'' عفیفہ کی چالاک نگاہوں سے اس کی اداسی چھپی نہ رہ سکی۔

''تم جانتی ہو عفیفہ۔'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ عفیفہ کے لبوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بہت ضروری ہے نا؟'' وہ آہستگی سے بولی۔

''کیا یہ ضروری نہیں ہے؟'' وہ بولا تو عفیفہ نے گہری سانس لی۔ ماں باپ کے قتل والی بات پھانس بن کے اٹکی ہوئی تھی اس کے۔

''تم بدلہ لینا چاہتے ہو؟''

''وہ میرے ماں باپ تھے عفیفہ۔'' وہ ضبط سے بولا۔ ''یہ زندگی کچھ نہیں اگر میں ایک ظالم کو اس کا ظلم یاد نہ کرا سکوں۔''

''میں تمہیں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں میرا خیال ہے کہیں بیٹھ کر بات کرنی چاہیے۔''

''شام کو چائے اکٹھے پیتے ہیں۔'' وہ ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولا۔ عفیفہ اسے بائے کہہ کر اپنی گاڑی کی جانب بڑھی اسی وقت اسے کمال کی کال آئی۔

''تم نے شام کا وقت کیوں رکھا، وہ ابھی بھی بات کر سکتا تھا۔''

''ابھی اسے ٹرانس میں لینا مشکل ہوتا کمال ڈارلنگ، اس کا سارا دھیان اپنی شوٹنگ میں رہتا جبکہ میں اسے شادی کے لیے کنوینس کرنا چاہتی ہوں شادی اب جلد از جلد ہو جانی چاہیے۔'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''شادی سے زیادہ … اس کا اعتماد جیتنا ضروری ہے۔''

"ایک ہی بات ہے۔ اچھا مجھے اور بھی بہت کام ہیں۔" اس نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ کمال نے لائن کاٹ دی۔

"بچ۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میری کتیا مجھے آنکھیں دکھانے لگی ہے۔" وہ ڈرنک کا گلاس ٹیبل پر رکھ کر بولا پھر اس کی نظر اپنی گرل فرینڈ پر پڑی تو ٹھٹک گیا۔ اس کا خود سے آج کل کنٹرول ختم ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اہم باتیں اپنی گرل فرینڈز کے سامنے نہیں کرتا تھا مگر آج کل کر رہا تھا۔ اس نے لڑکی کو جانے کو کہا، وہ اپنے کپڑے اٹھا کر باتھ روم میں چلی گئی اور ٹھیک دو منٹ بعد اس کے کمرے سے۔ جیسے جیسے اس ملک کو چھوڑنے کے دن قریب آرہے تھے، اس کے اعصاب شل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ٹھیک بیس منٹ بعد عفیفہ اس کی بانہوں میں تھی۔ دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

"اگر تم مجھے چیٹ کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہو تو اپنی موت کو دعوت دو گی۔"

"تم میری پہلی اور آخری محبت ہو کمال تمہیں دھوکا دے کر کہاں جاؤں گی؟" وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔ "اگر تمہیں میرا یقین نہیں تو ابھی مجھے اپنے ہاتھوں سے موت دے دو۔" وہ اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن پر رکھ کر بولی۔

"جیسے دشمن سے محبت نہیں نفرت ہو سکتی ہے اس کا باپ میری ماں کا قاتل ہے یہ بات میں روز یاد رکھتی ہوں وہ دراصل قاتلوں کا خاندان ہے۔" اس کی آنکھوں میں نفرت تھی..... کمال کی روح میں سکون اترا یا وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

عفیفہ بھی نہ چاہتے ہوئے اس کے پہلو میں آگئی۔ شام ہونے میں کافی وقت تھا۔

☆☆☆

سالار کیفے میں بیٹھا عفیفہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ وقت سے پہلے آگیا تھا۔ یہ لاشعوری عمل تھا اور اب وہ ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا یہ انتظار تب ختم ہوا جب عفیفہ ایک شوخ رنگ کے لباس میں اٹھلاتی بل کھاتی اس کے پاس آئی۔

"ہیلو ہیرو۔"

"ہائے۔" وہ ویٹر کو کافی کا آرڈر دینے لگا۔

"تم شاید کسی اور کا انتظار کر رہے ہو۔ اس کی نظریں ابھی بھی آنے والوں پر تھیں۔" عفیفہ مسکراتے ہوئے

لگی۔

''ہدایت پر عمل کر رہا ہوں فقط۔''

''شادی کب کر رہے ہو مجھ سے؟'' وہ اچانک بولی۔

''ابھی نہیں..... مجھے کچھ وقت چاہیے، میں اس خوب صورت وقت کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونا چاہتا ہوں۔''

''میرے ساتھ خود کو اسٹرونگ محسوس کرو گے۔''

''ابھی چچا جان اس کی اجازت نہیں دے رہے، انہیں قائل بھی کرنا ہے، نہ کیا تو مجھے میرے بنیادی شیئرز نہیں ملیں گے۔ میں چاہتا ہوں شادی میں ان کی مرضی بھی شامل ہو۔'' وہ بولا جبکہ عفیفہ خاموشی سے کافی پی رہی تھی۔ وہ دراصل کمال کا ہدایت نامہ سن رہی تھی جو اسی خاص سیٹنگز میں اس کے کان میں بجتا رہتا تھا۔ وہ وائرلیس ہیڈفون کے ذریعے اسے گائیڈ کر رہا تھا۔

''ہونہہ، اس کا مطلب ہے کہ شادی کافی عرصے کے لیے ملتوی سمجھوں، یقیناً تمہارے چچا جلدی راضی نہیں ہوں گے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی راضی ہی نہ ہوں۔''

''نہیں خیر ایسی بات نہیں، عمر کے تیسویں برس شادی نہ کرنے کی صورت میں بھی میرے شیئرز مجھے مل جائیں گے۔''

''اور اس میں پورا سال پڑا ہے۔''

''تم کیا سال تک انتظار نہیں کرو گی؟''

''نہیں، اب ایک پل بھی تمہارے بغیر گزارنا مشکل ہے، محبت اتنا کیوں ستاتی ہے سالار، ہم دو دشمنوں کے بچے کیا کبھی مل نہیں پائیں گے؟'' وہ آنکھوں میں نمی بھر کر بولی۔ سالار نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت پیار کرتی ہو لیکن تمہیں مجھے کچھ وقت دینا ہوگا۔ میں ایسے حالات میں شادی کر کے چچا کو خود سے بدظن نہیں کر سکتا۔''

''تم ان کے اکلوتے وارث ہو انہیں تمہاری خوشی کا خیال رکھنا ہی پڑے گا۔''

''نہیں، میرا ایک بھائی اور بھی ہے۔''

''کیا؟'' وہ بری طرح چونکی ساتھ میں کمال بھی چونکا۔ ''تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔''

''وہ شروع سے لندن میں رہا، وہیں پر بڑھا، تعلیم حاصل کی اور پھر وہیں شادی بھی کر لی اس لیے بہت کم لوگ اس کے بارے میں جانتے ہیں۔''

''ایسے میں چچا سے بالکل بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔ انہیں کسی انجانے شخص نے کال کر کے تمہارے بارے میں بتا دیا ہے ورنہ شادی میں یہ تاخیر نہ ہوتی۔ میں جلد ہی اس شخص کا پتا لگا لوں گا۔ وہ یقیناً کوئی غدار ہے جو نہیں چاہتا کہ ہم ایک ہوں۔''

''اب کیا فائدہ، جو اس نے کرنا تھا، کر لیا۔''

''وہ انجانا حالات کو مزید خراب کر سکتا ہے اسے ڈھونڈنا بہت ضروری ہے۔''

''اسے بھی ڈھونڈ لیں گے۔'' وہ ایک فولڈ کیا ہوا خط شوگر پاٹ کے نیچے رکھتے ہوئے اسے آنکھ مار کر بولی۔ وہ اس کے چونکنے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مجھے کچھ کام ہے دوبارہ ملاقات کرتے ہیں۔'' اسے سی آف کر کے وہ کیفے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی سالار نے وہ خط نکالا اور اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اب مزید بیٹھنا بیکار تھا اسے آج چچا نے ملاقات کے لیے بلوایا تھا اس کا رخ اب اسی طرف تھا۔ گھر آتے ہی وہ سیدھا ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا۔ وہ مقررہ وقت سے کچھ لیٹ تھا اندر آ کر وہ بری طرح چونکا شجاع احمد کے ساتھ انکل یوسف مرزا بیٹھے تھے اور ان کے بالکل ساتھ وہ کیفے والی لڑکی تھی۔ وہ بھی اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ یوسف صاحب سے مل کر چچا سے ملا اور پھر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اب بھی لڑکی پر تھیں۔ یوسف مرزا اور شجاع احمد نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''یہ حنا ہے تمہارے انکل کی بیٹی۔'' شجاع احمد نے تعارف کروایا۔ ''اور حنا بیٹا یہ میرا بھتیجا کم بیٹا زیادہ سالار۔''

''ہم مل چکے ہیں انکل۔'' حنا کو وہ ناخوشگوار ملاقات یاد آ گئی۔

''کیسے..... کب؟''

''ایک قریبی کیفے میں۔''

''تم دونوں نے ایسا ذکر نہیں کیا۔'' مرزا نے بھی لاعلمی کی شاندار ایکٹنگ کی۔

''ذکر کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔'' وہ قدرے منہ بنا کر بولی جبکہ سالار سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ اسے ہر وقت ڈھونڈتا رہا اور وہ ملی بھی تو اس کے اپنے گھر میں۔

''پہلے کبھی انہیں دیکھا نہیں۔'' سالار تعجب سے بولا۔

''یہ پچھلے چار سال سے اپنی خالہ کے پاس بیلجیم میں تھی پچھلے مہینے ہی لوٹی ہے تعلیم مکمل کر کے۔''

''کافی تعجب کی بات ہے میں بچپن سے آپ کے گھر جاتا رہا ہوں میری ان سے پہلے ملاقات نہیں ہو سکی۔''

''تم واقعی ہی شجاع کے بھتیجے ہو ویسے ہی شگفتہ مزاج۔'' مرزا نے بلاوجہ قہقہہ لگایا۔ ''ارے بھئی یہ بچپن سے بورڈنگ ہاؤس میں رہی ہے۔ تمہاری آنٹی کی وفات کے وقت یہ بہت چھوٹی تھی، میں اکیلا کیسے اسے سنبھال پاتا۔ چار سال پہلے میں نے اسے اس کی خالہ کے پاس بھیج دیا اب یہ مستقل رہے گی میرے ساتھ۔''

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' تعارف مکمل ہوا تو وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''کافی دیر سے ہوئی۔'' وہ چڑ کر بولی۔ سالار ایک مرتبہ پھر مسکرانے لگا۔

''اتنی دیر سے ملی ہیں تو خوشی بھی ویسے ہی ری ایکٹ کرے گی نا۔'' وہ براہ راست اس کی نیلی آنکھوں میں جھانک کر بولا، وہ نظریں چرا گئی۔ دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔ سامنے بیٹھا ڈیشنگ جوان اس کا اپنا کزن تھا۔ وہ برسوں بعد اپنے خونی رشتوں سے مل رہی تھی۔ ان رشتوں کے لیے وہ ترستی رہی تھی لیکن حالات نے اپنے ملائے بھی تو کیسے وہ اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کی سگی کزن ہے اس کے پیارے چچا شجاع احمد کی بیٹی ہے۔

''چچا جان آپ نے بلایا تھا؟'' وہ اسے متوجہ نہ پا کر شجاع سے بولا۔

''ہاں تمہارے انکل چاہتے ہیں کہ تمہارے جیسا ذہین بزنس مین ان کی بیٹی کو بزنس کے امور سمجھائے اب بڑی ہوگئی ہے تو بزنس بھی سنبھالے گی۔''

''میں اتنا ذہین نہیں ہوں انکل جتنے چچا جان ہیں ابھی تک ان کی ذہانت کے رعب میں ہوں۔'' ایسا کہتے ہوئے شجاع احمد نے غور سے اسے دیکھا۔

''آج کل کی ینگ جنریشن ہم جیسے بوڑھوں کی کمپنی کو کہاں انجوائے کرتی ہے۔'' مرزا صاحب نے فوراً وضاحت پیش کی۔ ''میں تو چاہتا ہوں حنا میرے ساتھ آفس جایا کرے لیکن یہ میرے ساتھ بور ہوتی ہے۔''

''صحیح کہا آپ نے جب آپ انہیں مجبوراً بزنس سکھائیں گے تو وہ تو ایسے ہی بور ہوں گی اور جبکہ مس حنا کے انٹرسٹ بھی مختلف ہوں۔'' وہ اسے جتا کر بولا تو حنا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ نٹ کھٹ حسینہ اپنے والد کے سامنے شریف بنی ہوئی تھی۔ وہ خاموش ہوگیا۔

''تو پھر کل سے آ رہی ہیں آپ میرے آفس؟''

''میں ڈیڈی کی کوئی بات ٹالتی نہیں ہوں۔ وقت بتا دو کوشش کروں گی آنے کی۔''

وہ گھورنے لگا۔ ''سست اسٹوڈنٹس مجھے بالکل پسند نہیں ہیں صبح نو بجے...... پورے نو بجے میرے آفس نہ آئیں تو......''

''تو؟'' وہ بھی دوبدو بولی۔

''تو کوئی بات نہیں دس بجے آ جانا۔'' اس نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔ حنا نے ہنسی کو بمشکل روکا۔

''تو ٹھیک ہے انکل پھر مجھے اجازت دیجیے۔'' سالار اٹھتے ہوئے بولا۔ وہ جلد از جلد اپنی جیب میں موجود خط کو پڑھ لینا چاہتا تھا۔ ساتھ اسے تجسس بھی تھا کہ عفیفہ نے اسے خط کیوں لکھا۔ ایسا کیا تھا جو وہ اسے خود سے نہیں بتا سکتی تھی۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ لاک کرتے ہی خط نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔ تحریر کچھ یوں تھی۔ ''تم سے مجھے کچھ بھی کہنا ہوا اسی طرح خط لکھ کر تمہیں دے دوں گی۔ میرے سامنے پاپا (کمال) کے متعلق کوئی بھی بات نہ ڈسکس کیا کرو۔ وہ ہماری باتیں ایک وائرلیس فون کے ذریعے سن رہے ہوتے ہیں، تم جانتے ہو وہ میرے سگے باپ نہیں ہیں، ہمارے درمیان جو بھی معاہدہ ہوگا صرف ہمارے درمیان ہوگا۔ پاپا کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ انہوں نے میرے ذریعے بہت سے لوگوں کو بے وقوف بنایا ہے اور ان کی دولت کو لوٹا ہے۔ وہ تمہیں بھی لوٹنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ جس دن تم سے معاہدہ کرنے کے لیے وہ مجھے پاور آف اٹارنی دیں گے، میں اسی دن انہیں چھوڑ دوں گی اور تم سے آملوں گی اس لیے تم بھی تب تک اس مشن میں میرا ساتھ دو پھر ہم شادی کر لیں گے اور ساری دولت بس ہماری ہوگی تم اس بات پر حیران ہو رہے ہو گے لیکن جس شخص نے ہزاروں لوگوں کو لوٹا ہے، اسے لوٹنے میں کیا حرج ہے ویسے بھی یہ ساری دولت میری ہے۔ میری ماں کی وجہ سے پاپا کو یہ دولت ملی جس پر وہ آج قبضہ کیے بیٹھے ہیں عنقریب ان کا سوئٹزرلینڈ میں بزنس سیٹ کرنے کا پلان ہے پھر وہ واپس یہاں نہیں آئیں گے...... تم سمجھ سکتے ہو وہاں ان کا سگا بیٹا رہتا ہے وہ اپنی دولت کا وارث اسے ہی بنائیں گے جبکہ یہ میرا حق ہے مجھے خوشی ہوگی اگر تم میرا ساتھ دو تو...... تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔''

خط کی تحریر نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بات حیران کن تھی کہ انکل کمال ان کی ہر بات براہ راست سنتے تھے عفیفہ نہ بتاتی تو ان کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ ہوتا۔ اس طرح خود کو بے وقوف بنائے جانے پر اسے شدید غصہ آ رہا

تھا۔ اس نے تحریر کو دوبارہ پڑھا کمال نے سوئٹزرلینڈ شفٹ ہونے کی خبر ابھی نئی تھی۔

"ہونہہ...... اسی لیے باسٹرڈ روز شادی پر زور دیتا تھا تاکہ عنیفہ کو یہاں چھوڑ کر دولت لوٹ کر باہر چلا جائے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے عنیفہ پر بھی غصہ آیا کہ اتنا عرصہ وہ باپ بیٹی اسے فول بناتے رہے لیکن عنیفہ شاید ڈری ہوئی تھی اس لیے موقع ملتے ہی اسے بتادیا۔

"ہونہہ تو کمال کا سوئٹزرلینڈ جانا اب میرے ہاتھ میں ہے لیکن مسٹر کمال اب تمہیں میں فول بناؤں گا۔" وہ خط کو پھاڑ کر اسے کموڈ میں بہانے لگا۔

☆☆☆

رات کے کھانے پر یوسف مرزا نے اچھا خاصا اہتمام کیا تھا شجاع احمد نے کھانے کی ٹیبل پر خاموشی سے بیٹھی ریشم کو دیکھا، یہ اس دن کی ریشم سے بہت مختلف نظر آرہی تھی جب وہ اپنی بیٹی کے لیے حق مانگنے آئی تھی یقیناً اس کی ظاہری حالت ٹھیک کرنے میں یوسف مرزا جیسے پرانے دوست کا ہاتھ تھا۔ سلیقے سے دوپٹا اوڑھے مہنگے لباس، جیولری اور مناسب میک اپ میں وہ کافی گریس فل لگ رہی تھی۔ شجاع کو بے ساختہ وہ دن یاد آگیا جب اس نے اسے لان میں پھول توڑتے دیکھا تھا تبھی اس کا بھی دل چاہا تھا اس پھول کو وہ توڑ لے۔ وہ سانولی سلونی سی لڑکی ان دنوں اسے بہت بھا گئی تھی دن رات بس وہی نظر آتی تھی۔ یورپ میں شاید گوریوں کو دیکھ دیکھ کر دل بھر گیا تھا وہ خود بھی گندمی رنگت کا تھا اسے سانولی لڑکیاں شروع سے ہی پسند تھیں اسی لیے ریشم کو حاصل کرنے کے لیے اس نے اس کی نکاح والی شرط بھی مان لی۔ شجاع نے ایک گہری سانس لی اور کھانا شروع کیا۔ وقت بہت تیزی سے گزر جاتا ہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ریشم جیسی ایک عام سی چوکیدار کی بیٹی سے وہ پیار کرنے لگے گا لیکن یہ جذبہ بہت وقتی تھا۔ والد نے جیسے ہی شادی کا اعلان کیا سب سے پہلے اس نے اسی لڑکی کو دھتکارا تھا۔ آج برسوں بعد وہ مالکن کے روپ میں سامنے آبیٹھی تھی۔ وہ اٹھارہ برس اپنی اولاد کے لیے ترستا رہا ایسی اولاد جو اسے باپ کہہ سکے۔ حنا جیسا خوب صورت تحفہ ریشم نے ہی اسے دیا تھا جسے اس نے بری طرح جھٹلایا تھا۔ ریشم آج بھی ویسی ہی تھی جیسی اٹھارہ سال پہلے تھی۔ آج بھی اس کے سامنے ویسے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اٹھارہ برسوں کا فرق صرف حنا میں آیا تھا۔ وہ حنا جس نے اتنے سال باپ کی محرومی میں گزارے تھے وہ اس کی لاتعلقی دکھا رہی تھی لیکن ٹیبل پر بیٹھے اپنے ماں باپ سے اتنی لاتعلق بھی نہیں۔ جانتی تھی ماں نے سب کچھ بھلا دیا ہے پھر سے شجاع احمد کا تعلق ہاتھ تھام لیا ہے۔ اس نے ماں کو باپ کے قریب ہونے سے روکا نہیں، یہ اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ ماں شجاع احمد کو بہلاتی رہتی اور وہ بھی سکون سے اپنا کام کرتی رہتی۔ کچھ دن پہلے وہ اپنی غربت سے لڑ رہی تھی وہ کسی بھی طریقے سے اپر سوسائٹی کا حصہ بننا چاہتی تھی چاہے کسی امیر مالک کو پھانس کر ہی اس لیے وہ ماں سے کام کرنے کی ضد لگائے بیٹھی تھی لیکن قدرت نے اسے بیٹھے بٹھائے کروڑوں کا مالک بنادیا۔ یہ اس کی امیدوں سے زیادہ تو نہیں تھا لیکن ہاتھ پیر ہلائے بغیر ملا تھا اب کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جانتی تھی باپ کے بزنس کی صرف وہی وارث نہیں ہے سالار بھی ہے۔ سالار یا وہ راستے سے کوئی ایک ہٹ جاتا تو وارث ایک ہی بنتا۔ اس نے اتنے ہی سالوں کی دوری جیسا فاصلہ رکھے ہوئے تھے۔ اس کے گلے نہیں لگی تھی۔ بابا نہیں کہا تھا۔ بات سمجھ میں آرہی تھی، وہ شکل میں باپ جیسی تھی اور عادتوں میں بھی، ضدی بھی جانے پر کے بغیر قریب نہیں آنے والی تھی۔ شجاع نے اسے ٹائم دینے کا فیصلہ کیا اسی لیے ایک دفعہ دھتکارے جانے کے بعد دوبارہ حنا کو گلے لگانے کی حماقت نہیں کی۔ حنا

"گڈنائٹ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "مجھے صبح جلدی اٹھنا ہے آفس بھی جانا ہے۔" وہ معذرت کرکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ یوسف مرزا اور شجاع احمد نے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا۔ بیٹی بزنس میں دلچسپی لے رہی تھی یہ کافی امید افزا بات تھی۔ صبح وہ بہت جلد اٹھ جاتی تھی اس لیے آج بھی مقررہ وقت پر آنکھ کھلتے ہی تیار ہونے چلی گئی۔ نک سک سے تیار ہوکر وہ ناشتے کے لیے پہنچی تو شجاع احمد کو وہاں بیٹھا پایا۔ اس نے سلام کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی اور سکون سے بیٹھ کر ناشتا کیا۔ آج وہ مطمئن تھی کسی گھر سے آیا جھوٹا کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ باپ سے لڑائی اپنی جگہ لیکن اس کے نام نے راتوں رات اس کی شخصیت کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ شہر کے امیر ترین شخص کی بیٹی ہونے کے اعزاز نے اس کے اعتماد میں چار چاند لگا دیے تھے۔ شجاع اسے ناشتا کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"یہاں کسی قسم کی پرابلم ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں عنقریب تم دونوں کو گھر لے جاؤں گا لیکن فی الوقت کچھ دن تمہیں کے لیے یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ یہ تمہارا اے ٹی ایم کارڈ ہے۔" وہ ایک کارڈ اس کی طرف بڑھا کر بولا۔ اس

نے ہاتھ نہیں بڑھایا تو اس کے پاس رکھ دیا۔

''مجھے ایک پستول بھی چاہیے۔'' وہ جانے لگا تو اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''گارڈز تمہاری حفاظت کریں گے، بغیر لائسنس کے تم اسلحہ کیسے رکھ سکتی ہو؟''

''مجھے اپنی حفاظت خود کرنا آتی ہے۔''

''پہلے کبھی پستول استعمال کیا ہے؟''

''ہاں، میری دوست کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں انہوں نے ہم دونوں کو استعمال سکھایا تھا۔'' وہ چائے ختم کر کے اٹھتے ہوئے اعتماد سے بولی۔ شجاع احمد نے اسے مسکرا کر دیکھا۔

''ٹھیک ہے شام تک مل جائے گا۔''

''دوپہر تک مل جائے تو زیادہ اچھا ہے۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں، چلی گئی۔ شجاع احمد نے فخر سے اسے جاتے دیکھا۔ بیٹی کی چال بتا رہی تھی، باپ کے ارادوں پر پوری اترنے والی ہے۔

سالار کے آفس تک اس کے گارڈز نے اس کی رہنمائی کی۔ وہ ابھی پہنچا نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے اس کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے ہی جیسے کرنٹ لگا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نہ جانے یہ کیا تھا جو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا اس نے فوراً ایک گلاس پانی پیا۔ اسی وقت سالار آ گیا۔ اسے دیکھ کر متاثر ہوا۔

''لگتا ہے ساری رات سو نہیں سکی تم، اٹھتے ہی یہاں آ گئیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولا۔

''کچھ زیادہ دیر تم نے بھی نہیں لگائی یہاں آنے میں۔'' وہ دو بدو بولی تھی۔

''حاضر دماغی اچھے بزنس مین کی علامت ہے۔''

''تعریف کے لیے بہت وقت ملے گا آپ کو، کسی اچھے وقت کے لیے بچا کر رکھیں۔''

''لگتا ہے تم ابھی تک ناراض ہو۔''

''بغیر تعلق کے کیسی ناراضی؟'' یہ کہنے پر وہ مسکرایا پھر اپنا کوٹ اتار کر کوٹ اسٹینڈ پر لٹکا دیا۔

''چلیں۔'' وہ ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''کہاں؟''

''آج میں تمہیں اپنے ورکرز سے ملواتا ہوں ساتھ ساتھ تمہیں ان کا کام بتاؤں گا۔'' وہ اسے ساتھ لے کر ایڈمنسٹریشن آفس کی طرف بڑھا۔ ''یہاں ہمارے منیجرز بیٹھتے ہیں۔''

''السلام علیکم سر۔'' وہ سب اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ان سے حنا کا تعارف کروانے لگا۔ ''مسٹر سبحان آپ کل سے مس حنا کو منیجمنٹ سکھائیں گے۔'' وہ ان میں سے ایک کو مخاطب کر کے بولا۔ حنا نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر سالار کے ساتھ وہاں سے واپس آ گئی۔

''تم ظاہر کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے پاس میرے لیے وقت نہیں ہے۔'' وہ بھویں اچکا کے بولی۔

''وقت کی بات نہیں ہے انوسینٹ گرل، وہ تمہیں مجھ سے اچھا گائیڈ کرے گا، بزنس سیکھنے کی پہلی سیڑھی منیجمنٹ ہے تم اگر اس پر مضبوطی سے کھڑی ہو گئیں تو بڑے بڑوں کے چھکے چھڑا سکتی ہو۔'' وہ اسے ساتھ لیے بلڈنگ دکھاتا رہا۔ ''یہاں اسسٹنٹس بیٹھتے ہیں۔'' وہ ایک جانب قطار میں بنے کیوبیکلز کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''اور یہاں کلریکل اسٹاف۔'' ویسے ہی کیوبیکلز بائیں جانب بھی تھے۔ وہ ہر چیز کو پوری تفصیل سے سمجھ رہی تھی۔ اس کے انہماک کو دیکھ کر سالار نے اسے کانفرنس رومز اور میٹنگ رومز بھی دکھائے۔ عام لڑکیوں سے ہٹ کر وہ اشتیاق سے ہر چیز کے متعلق جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر کو یہ اس کے باپ کا آفس تھا اور وہ مستقبل کی مالک تھی۔

''یہاں یقیناً سیکیورٹی کا انتظام بھی ہوگا؟'' وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''تم انکل یوسف کی بیٹی نہیں پوری جاسوس لگ رہی ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''آپ نے سے نلوں کی نہیں میں۔'' لہجے میں اصرار تھا بالآخر وہ اسے انڈر گراؤنڈ فلور پر لے گیا۔ جہاں بہت سے کمپیوٹرز ٹیبلز پر ورکرز بیٹھے اپنا کام کر رہے تھے۔ ایک بڑی سی وال اسکرین پر آفس کے اندر باہر کے مناظر نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف سیکیورٹی کا پورا عملہ الرٹ پوزیشن میں بیٹھا تھا۔

''محترمہ اگر کچھ تسلی ہوئی ہو تو کچھ کھا لیتے ہیں آج میں ناشتا کیے بغیر آیا ہوں۔''

''سوری، مجھے علم نہیں تھا، تمہیں بتانا چاہیے تھا۔'' وہ واپسی کے لیے قدم بڑھا کر بولی۔

''انس اوکے۔''

''مطلب ہے تم دیر سے اٹھتے ہو، دیر سے اٹھنے کی عادت اچھی نہیں ہوتی، کیا ڈاکٹر نے نہیں بتایا کہ صحت کے لیے جلدی اٹھنا بہت ضروری ہے، اچھے بزنس مین کے لیے صحت بہت ضروری

ہے۔ وہ کہتے ہیں نا ڈاکٹرز صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا حامل ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ ہی عرصے میں عقل سے پیدل ہو جاؤ گے جب ایسا ہونے لگے تو مجھے ضرور بتانا میں تمہیں بھی اپنے ساتھ واک پر لے جایا کروں گی۔"
وہ بولتی جا رہی تھی اور وہ اسے پہلے حیرانی پھر مسکراتے ہوئے سننے لگا۔ آفس آ گیا تھا اور اندر آتے ہی سالار نے اپنے لیے ناشتا اور حنا کے لیے کافی منگوائی۔

"اس ساری بحث کا حاصل یہ تو نہیں کہ تم مجھے بھی مارننگ واک پر لے جانا چاہتی ہو؟" وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "اگر ایسا ہے تو بحث لاحاصل، میں مارننگ نہیں ایوننگ واک کے لیے جاتا ہوں۔" بات کرتے کرتے وہ زیر لب مسکرایا۔

"یعنی اب تم چاہتے ہو، میں تمہارے ساتھ ایوننگ واک شروع کر دوں؟"

جواباً سالار کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ "تم غضب کی حاضر جواب ہو، چچا جان کو پتا چل جائے تو وہ تمہیں اپنی کمپنی کے لیے ہائر کر لیں۔"

"سیٹ کے لیے کیوں نہیں۔" وہ بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ سالار کا چونکنا لازمی تھا لیکن فوراً ہی اس نے اپنے تاثرات بحال کیے۔ "اچھا مذاق ہے۔"

"کیوں ڈر گئے نا۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"اظہار خیال کرنے میں جلد بازی نہ دکھایا کرو۔" سالار ٹیبل پر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "مجھے ایسے کیوں لگتا ہے کہ میں نے تمہیں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے تمہاری یہ آنکھیں اتنی گہری کیوں ہیں لیکن جتنی تمہاری ادائیں ہیں۔" جواباً حنا نے خود کو قدرے کمپوز کیا، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا راز سالار پر افشاں ہو جائے۔

"اتنا قریب مت آؤ، میں متاثر ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔" وہ اس سے بولی لیکن دل ہی دل میں بڑبڑائی کہ مسٹر چالاک لینز والی آنکھوں میں گہرائی کہاں سے ملے گی۔

"اب تم جلد بازی کر رہے ہو نتیجہ نکالنے میں۔"

"او کے کچھ وقت کے لیے یہ ٹاپک چھوڑ دیتے ہیں۔"

"کچھ وقت بعد بھی اس ٹاپک میں کچھ نہیں ملے گا۔"

اسی وقت ملازم نے کھانے کا سامان ٹیبل پر رکھا۔ سالار بلا جھجک ناشتا کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان تھی۔ حنا کے ساتھ ہونے والی اس نوک جھونک میں اسے بھرپور مزہ آ رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنی ٹکر کی کوئی لڑکی ملی تھی۔ حنا خاموشی سے کافی ختم کرنے لگی، ساتھ ہی وہ آفس کی ڈیکوریشن دیکھنے میں لگ گئی۔ آخر کل کو اسے ہی یہاں بیٹھنا تھا۔ یہ احساس بڑا فرحت بخش تھا۔

"مجھے ابھی جانا ہے، کل آؤں گی دوبارہ۔" کافی کے ختم ہوتے ہی وہ اٹھ گئی۔

"کہاں؟"

"ایک دوست سے ملنے۔"

"حیرت ہے تمہاری کوئی دوست بھی ہے یہاں۔"

"فیملی فرینڈ ہے۔" اس نے جلدی سے بات بنائی۔

"او کے ایز یو وش۔" وہ بولا تو وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔ پارکنگ میں ڈرائیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنی دوست کے گھر کا پتا بتا کر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کی دوست مائرہ اس کی کالج کی فرینڈ تھی۔ اس کا گھر حنا کے گھر سے کچھ ہی دور تھا۔ حنا کا زیادہ تر وقت مائرہ کے گھر میں ہی گزرتا تھا۔ مائرہ کے والد ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے، ایک کمپنی میں جاب کرتے تھے اور دو بجے کے بعد اپنے وقت کا زیادہ حصہ گھر میں اپنی بیٹی کے ساتھ گزارتے تھے۔ انہیں حنا بھی مائرہ کی طرح عزیز تھی۔ وہ دونوں ان سے فوج کے قصے سنتی رہتی تھیں۔ اس دوران میں مائرہ کی ماما مزے مزے کے کھانے اور چیزیں بنا کر انہیں کھلاتی تھیں۔

ڈرائیور نے گاڑی ایک بنگلے کے سامنے جا کر روک دی۔ حنا گیٹ کی جانب بڑھی۔ چوکیدار اسے پہچانتا تھا اس لیے بنا کچھ پوچھے دروازہ کھول دیا۔ وہ بلا جھجک مائرہ کے کمرے کی طرف جانے لگی۔ لان میں انکل طاہر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"انکل آپ؟" وہ ان کے اس وقت گھر پر ہونے پر حیران تھی۔

"آج آفس جانے کا موڈ نہیں ہوا دھوپ انجوائے کر رہا ہوں۔"

"اچھا ہے کبھی کبھار اپنے لیے وقت بھی نکالنا چاہیے، مائرہ اندر ہے۔"

"مائرہ اپنی ماما کے ساتھ مارکیٹ تک گئی ہے بس کچھ دیر میں آنے والی ہیں دونوں۔" وہ اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ نیلے رنگ کے سفید لائنوں والے سوٹ میں ملبوس انکل طاہر کی شخصیت شاندار تھی۔

"چائے بھی ہے اور جوس بھی جو دل کر رہا ہے لے

لو۔'' انہوں نے حقِ میزبانی نبھایا۔ وقت گزاری کے لیے وہ چائے کپ میں ڈالنے لگی۔

'' مجھے مائرہ نے بتایا ہے شجاع احمد تمہارے والد ہیں۔'' وہ کچھ دیر بعد گویا ہوئے۔

'' جی انکل بس زندگی نے ایک دم سے کایا پلٹی ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی میں اتنے امیر کبیر باپ کی بیٹی ہو سکتی ہوں۔'' وہ کھوئے کھوئے انداز میں بولی۔

'' تو اب تم کیسا محسوس کرتی ہو، خوش ہو۔'' وہ ہلکے پھلکے انداز میں بولے۔

'' بہت زیادہ انکل، رات کو آپ سوئیں اور صبح اٹھنے پر زندگی آپ کو کسی محل میں لے جائے اور پھر آپ کو پتا چلے آپ اس محل کے اکلوتے وارث بھی ہو تو خوشی ہوتی ہے۔''

'' میں شجاع احمد کو کافی حد تک جانتا ہوں اس کا ایک بھتیجا بھی ہوتا ہے تا اس کے ساتھ اکلوتا وارث۔'' اکلوتا وارث کہنے پر انہیں سالار یاد آ گیا۔

'' ہاں ہے، اسی سے مل کر آ رہی ہوں سالار نام ہے اس کا۔''

'' شجاع احمد ایک گہرا انسان ہے کتنا جانتی ہو ان کے بارے میں۔'' وہ اسے گہری نظروں سے دیکھ کر بولے۔

'' یہاں تک تو جان گئی ہوں کہ انہیں اپنی دولت اور نام سے بہت پیار ہے۔'' وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔ '' کیا آپ کچھ اور بھی جانتے ہیں۔''

'' ہاں اور یہ تمہارے لیے جاننا از حد ضروری ہے بلکہ میں چاہتا ہوں کہ تم یہ جانو اور اس کے بعد اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کرو۔''

'' اب مجھے آپ کی باتیں خوف زدہ کر رہی ہیں۔''

'' مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تمہیں تمہارا باپ اور مقام مل گیا۔'' وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولے حنا ہمہ تن گوش تھی۔ '' تم دونوں ماں بیٹی نے بہت مشکل وقت گزارہ ہے اب اچھے دن آئے ہیں لیکن یہ بتاتے ہوئے مجھے افسوس بھی ہو رہا ہے کہ تمہارا باپ غیر قانونی کاموں میں بری طرح پھنسا ہوا ہے اتنا کہ اب وہ خود سے چاہے بھی تو اسے کوئی نکال نہیں سکتا۔ میرا دوست ہے ایس ایس پی شجاعت وہ اس کیس پر ہی کام کر رہا ہے اور تمہارے باپ کے بہت پاس پہنچ چکا ہے۔''

'' وہ ایسا کیا کرتے ہیں؟'' حنا انہیں بے ساختہ ٹوکتے ہوئے کچھ خوف اور کچھ بے چینی کے ملے جلے تاثرات لیے

چوپٹ راج

ایک بے روزگار نوجوان ایک ریاست کے نواب کے روبرو پیش ہوا اور سات بار جھک کر فرشی سلام کرنے کے بعد معذرت سے درخواست پیش کی۔ نواب صاحب نے درخواست کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ '' کیا چاہتے ہو؟''

نوجوان نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور کہا۔ '' جہاں پناہ! بے کار ہوں۔ نوکری چاہتا ہوں۔''

'' کتنا پڑھے ہوئے ہو؟'' پوچھا گیا۔

'' حضور گریجویٹ ہوں۔''

'' گریجویٹ کا بچہ!'' نواب صاحب اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔ '' صاف کہو کتنی جماعتیں پاس ہو؟''

'' حضور 14 جماعتیں۔''

'' او ہو۔'' نواب صاحب منہ بگاڑ کر بولے '' ہماری عمر بڑھتے [illegible] رہے ہو۔'' پھر دیوان صاحب سے بولے '' [illegible] سول سرجن لگا دو۔''

'' حضور پہلے والے سول سرجن کو کیا کیا جائے؟'' دیوان صاحب نے ادب سے پوچھا۔

'' اسے [illegible] بنا دو۔''

'' اور حضور پہلے والے [illegible]''

'' اس کو دو سال کے لیے جیل [illegible]۔''

بہاولپور سے بشیر احمد بھٹی کی گزارش

'' بتاتا ہوں پہلے پوری بات سن لو۔'' وہ ٹھہرے لہجے میں بولے حنا بے ساختہ اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو مسلنے لگی۔ '' شجاعت نے کافی عرصے پہلے شجاع کے بارے میں مجھ سے یہ کیس ڈسکس کیا تھا، ہم دونوں نے مل کر کافی کیس حل کیے ہیں میں جب ریٹائرڈ نہیں ہوا تھا تو اس کی کئی معاملوں میں مدد بھی کر چکا ہوں اسی طرح وہ بھی میرے کام آتا رہا ہے اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ اسے بھی میری مدد درکار ہے وہ اس کیس کو جلد از جلد حل کرنا چاہتا ہے، اسے میرے ذریعے علم ہوا ہے کہ تم شجاع احمد کی بیٹی ہو۔''

'' میں سمجھ گئی کہ آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں، آپ لوگ مجھ سے کوئی کام لینا چاہتے ہیں۔''

'' تم نے ٹھیک سمجھا۔'' وہ آرام سے مان گئے اور دل سے اس کی ذہانت کے قائل بھی ہوئے اب انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔

'' اب آپ یہ بھی بتا دیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔''

'' وہ غیر قانونی اسلحے کے بیوپاری ہیں۔'' وہ بولے تو حنا کو ایک دھچکا لگا۔ یہ فطری بات تھی اس کا باپ غیر قانونی

اسلحے کا کاروبار کرتا تھا اور پولیس کو مطلوب تھا۔ پولیس کے نزدیک اس طلب میں وہ ان کی معاون بن سکتی تھی۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

''یہ صرف اتنی بات تو نہیں ہوگی، اسلحے کا غیر قانونی کاروبار تو بہت سے لوگ کرتے ہیں پھر آخر شجاع احمد ہی کیوں انہیں مطلوب ہے؟'' وہ ایک دم سے رک کر پوچھنے لگی۔

''میں نے یہ سب کچھ تم پر اعتماد کرتے ہوئے بتایا ہے۔'' وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھ کر بولے۔

''اگر تم سمجھتی ہو کہ میرا اعتماد کرنا ٹھیک نہیں تو یہ بات ابھی ختم کر دیتے ہیں، تم سمجھنا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔''

''اب آپ بچوں جیسی بات کر رہے ہیں۔'' وہ تلخی سے ہنستے ہوئے بولی۔ ''اور آپ کیا سمجھتے ہیں جہاں تک آپ مجھے بتا چکے ہیں اس کے بعد میں سب کچھ بھول جاؤں گی، یہ کیسے ہوسکتا ہے اب آپ مجھے پوری بات بتانے پر مجبور ہیں، بتائیں مجھے کہ وہ آخر اس درجے تک کیوں مطلوب ہیں؟'' وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے قدرے وحشت سے بولی۔

''ہم یہ ٹاپک کسی اور دن ڈسکس کریں گے۔'' طاہر صاحب اس کی کیفیت بھانپ کر بولے۔

''ٹاپک؟ یہ کوئی ٹاپک نہیں ہے انکل، آپ میری پوری زندگی کو اس ٹاپک کی نوک پر لیے بیٹھے ہیں، یہ ٹاپک آج ہی ڈسکس ہونا چاہیے اور ابھی۔'' اس کی آنکھوں سے یکا یک جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ انکل طاہر نے اسے بغور دیکھا پھر گہری سانس لی۔

''تم بہت جذباتی لگ رہی ہو۔'' طاہر بولا۔

''کیونکہ یہ میں ہوں حنا...... مائرہ نہیں ہوں جس کے پاس سب کچھ ہے، وہ برسوں تک کسی چیز کے لیے ترسی نہیں ہے صرف میں ہی ترسی ہوں، اور آج جب میں حنا شجاع احمد ہوگئی ہوں تو آپ لوگ مجھ سے پھر سب کچھ چھیننے آگئے ہیں۔'' وہ بولی تو اس کی آنکھیں نمی سے بھر پور تھیں۔ ''ہاں میں جذباتی ہوں، جذبات کے بغیر کوئی انسان مکمل نہیں ہوتا پھر آپ کو یہ کیوں لگا کہ میں کوئی... ردعمل ظاہر نہیں کروں گی۔''

طاہر کو وہ اس وقت ایک ایسی ہرنی کے مانند لگی جو شکاریوں سے نکل کر بھاگی ہو لیکن جال میں خود ہی آپھنسی ہو۔ لیکن وہ اسے ابھی بچی جیسی سمجھتے تھے اس لیے اس سے سب کچھ پوشیدہ نہیں رکھ سکتے تھے۔ انہیں جس کے ذریعے حنا کے باپ کا علم ہوا تھا، وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔ آج وہ خود ہی آگئی تو انہوں نے اسے اس کے باپ کی اصل حقیقت بتانا چاہی اور اس کا ردعمل فطری تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

''نہیں، کیوں انکل آپ کو میں اتنی بہادر کب لگی؟'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنی آنکھیں پونچھ کر وہ ان کے پاس دوبارہ بیٹھ گئی۔ ''لیکن میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں آپ کو سننے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔''

''تمہارا باپ وحشت گردوں کو اسلحہ سپلائی کرتا ہے۔'' حنا نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں بے یقینی سے دیکھا۔

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بولی۔ کان کے آس پاس سائیں سائیں ہونے لگی۔ انکل طاہر کچھ بول رہے تھے لیکن اس کی سمجھ سے باہر ہو رہا تھا۔

''وہ ظالم ہو سکتے ہیں، جابر بھی لیکن قاتل نہیں ہو سکتے۔'' وہ کافی دیر کے بعد خود کو سنبھال کر بولی۔

''ہمارے پاس پورے ثبوت ہیں۔'' انکل طاہر بم پھوڑ رہے تھے۔

''ثبوت ہیں تو ابھی تک وہ پکڑے کیوں نہیں گئے؟'' وہ بے یقین تھی۔

''کیونکہ پولیس اسے اس کے ریکٹ سمیت گرفتار کرنا چاہتی ہے، اسلحہ بلیک مارکیٹ سے امپورٹ کیا جاتا ہے۔ شجاع براہ راست ڈیلنگ نہیں کرتا ہے۔ اسلحہ وحشت گردوں کو بھاری داموں میں بیچا جاتا ہے لیکن......'' وہ آگے بولے۔ ''لیکن وہ اکیلا نہیں کرتا اس کا پورا ریکٹ ہے اکیلے شجاع کو پکڑا گیا تو تم لوگوں کی زندگی کا ہوا ختم، دشمن شجاع احمد کے قریب سے بھی گزرنے والے ہر شخص کو اڑا دیں گے اور اس کی جگہ کوئی نیا آجائے گا، میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم لوگوں کو کوئی نقصان پہنچے اور مفت میں مارے جاؤ، جب پورا گروہ ہی پکڑا جائے گا تو خطرہ ٹل جائے گا۔''

''مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''تم پولیس کے لیے کام کرو گی، اس کے پل پل کی رپورٹ دو گی، جتنے لوگ شجاع سے ملتے ہیں، ان کے بارے میں بتاتی رہو گی۔ سالار کے بارے میں بھی پتا لگاؤ گی آیا وہ اس معاملے میں شامل ہے یا نہیں۔''

''آپ کا خیال ہے کہ میں اپنے باپ کے خلاف جاسوسی کے لیے تیار ہو جاؤں گی؟''

''مجھے تم پر اعتماد ہے۔''

''تھوڑی دیر پہلے آپ کا یہ انداز مجھے نروس کر رہا تھا۔'' وہ بولی اور پھر اس کی نظر گیٹ سے اندر آتی مائرہ کی گاڑی پر پڑی۔ وہ اپنی ماما کے ساتھ مارکیٹ سے لوٹ آئی تھی۔ طاہر صاحب نے جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''اگر میرا باپ صرف میری وجہ سے بچ جائے گا تو میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔'' مائرہ کو اپنی جانب آتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔

''تم غلط کرو گی، انتہائی غلط، پولیس آج نہیں تو کل تمہارے باپ اور اس کے گروہ تک پہنچ جائے گی، پھر شاید تم بھی شک کی زد میں آجاؤ۔''

''یہ دھمکی ہے؟''

''وارننگ ہے بس۔''

''ہائے حنا کیسی ہو؟'' مائرہ چہکتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔ ''بہت پیاری لگ رہی ہو امیر باپ کی بیٹی جو بن گئی ہو شاندار لباس، جیولری اور ڈرائیور والی گاڑی۔''

''میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی اب مزید نہیں بیٹھ سکتی پھر کسی دن ملیں گے، بابا کی بار بار کال آرہی ہے۔'' اس نے آرام سے جھوٹ بولا۔ طاہر صاحب لاتعلقی سے اخبار پڑھنے لگے۔

''چلتی ہوں انکل۔'' وہ لفظ انکل پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''میں پُر امید ہوں اور غلط لوگوں پر اعتماد نہیں کرتا۔'' وہ اخبار تہ کرنے لگے۔

''تب میں کہوں گی کہ اپنی غلط فہمی ختم کر لیجیے۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں چلی گئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے آپ دونوں کے بیچ؟'' گیٹ سے نکلتے ہوئے حنا کے کانوں میں مائرہ کی آواز آئی۔

''کچھ نہیں۔'' طاہر صاحب دوبارہ سے اخبار کھولنے لگے۔ مائرہ سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔

☆☆☆

''خوش آمدید میڈم۔'' عفیفہ کھانے کی ٹیبل پر آئی تو ہاؤس کیپر چہرے پر مسکراہٹ پھیلائے کھڑی تھی۔ عفیفہ نے جواباً خفیف سا سر ہلایا اور ٹیبل پر نظر ڈالی۔ ڈنر میں حسب معمول تین سے چار ڈشز تھیں۔ کھانے کی ٹیبل پر دونوں کی پسند کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''

''اوکے میڈم۔'' ہاؤس کیپر چلی گئی۔ اس کی ایڑی کی کھٹ کھٹ ختم ہوئی تو عفیفہ ایک خاص اسٹائل سے ٹیبل پر موجود ڈشز کا جائزہ لینے لگی۔ وہ جانتی تھی ڈائننگ ہال میں کیمرا کہاں نصب ہے اس لیے اپنی پشت کیمرے کی طرف کر کے وہ کمال کی پسندیدہ ڈشز میں ان محلول کے چند قطرے ڈال کر ایسے پیچھے ہٹی جیسے ڈشز کو چکھ کر دیکھ رہی ہو۔ کمال آنے ہی والا تھا اور وہ آج کل اس کی آمد سے پہلے میز پر آجاتی تھی تاکہ وہ دوائی آرام سے کھانے میں شامل کر سکے۔ رات کے کھانے کا وقت دوائی کے لیے مناسب تھا۔ اگر کمال کھانے کے بعد اپنی طبیعت میں کچھ بوجھل پن محسوس کرتا تو اسے نیند کا سبب سمجھتا۔

''ہائے سویٹی۔'' وہ اسے پیار کرتے ہوئے اپنی جگہ پر بیٹھا۔ ''صبح کے بعد ابھی نظر آئی ہو کہاں رہیں تمام دن؟'' وہ کھانا اپنی پلیٹ میں نکالنے لگا۔ عفیفہ نے بے ساختہ سوچا کہ کاش وہ اسے زہر دے سکتی۔ لیکن اس طرح جائداد اس کے ہاتھ آنے کے بجائے الٹا نکل جاتی۔ اس نے سالار کو بتایا تھا کہ کمال کی ساری دولت اس کی ماں کی ہے اور وہ اس کی مالک ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کی ماں ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

''کیا سوچنے لگیں؟'' اسے خاموش پا کر کمال نے سوال کیا۔

''کچھ نہیں سالار کو سوچ رہی ہوں۔ آج کل بہت بزی ہو گیا ہے۔''

''وجہ وہ لڑکی تو نہیں جس کے ساتھ وہ ہر جگہ دکھائی دے رہا ہے؟''

''وہ اس کی پروڈکٹ کے لیے ماڈلنگ کر رہی ہے۔''

''ماڈلنگ کا اثر سالار کے آفس اور پھر گھر تک ہونے لگا ہے۔''

''لگتا ہے آپ کے پاس سالار کی جاسوسی کا سارا نیٹ ورک ہے۔''

''بزنس میں آنکھیں اور کان کھلے رکھنے چاہئیں خاص کر اس وقت جب مخالف آپ کا دُہرا دشمن ہو۔'' وہ تنبیہی انداز میں بولا۔ ''شادی کا معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''فی الوقت شجاع احمد اسے اجازت نہیں دے رہا۔''

''مطلب ناکامی کی وجہ تم ہو؟''

''میں بھی نہیں۔'' وہ کھانا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ ''وہ شجاع کو کنونس نہیں کر پا رہا..... مطلب تمہاری

اہمیت اس کے نزدیک زیرو ہے۔ وہ شجاع کا جانشین ہے اور شجاع اس کی بات ٹال رہا ہے تو مطلب وہ سمجھتا ہے کہ اس انکار سے سالار کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''میں اپنی بھرپور کوشش کر رہی ہوں، یہ آپ بھی جانتے ہیں۔ روزانہ کی پروگریس آپ کے سامنے ہوتی ہے تمہیں امپرومنٹ کی ضرورت تھی تو آپ شروع سے ہی بتا دیتے۔''

''میں نے تمہیں اس سے سارے فاصلے ختم کرنے کی تلقین کی تھی لیکن تم تو ایسے ری ایکٹ کرتی ہو جیسے ان چھوئی دوشیزہ ہو ہمیشہ چار فٹ کا فاصلہ رکھتی ہو۔''

''آپ کا مطلب ہے میں کٹے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گر جاؤں اور اپنی حیثیت دو کوڑی کی کرلوں اور پھر سب کچھ ختم، ساری محنت بیکار ہو جائے۔''

''تو تمہاری کوئی حیثیت بھی ہے؟'' اچانک کمال کا پارا جیسے شوٹ کر گیا۔ آج کل وہ اسی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔ یہ سچویشن حنیفہ کی پسندیدہ تھی۔ لیکن اس کی باتیں اسے غصہ بھی دلا رہی تھیں۔ غصے میں وہ کچھ زیادہ ہی بک بک کرنے لگا تھا۔ ''تم دو کوڑی کی عورت کی بیٹی ہو میرے لیے صرف دل بہلانے کا سامان اور بس، اس سے زیادہ تمہاری کوئی اوقات نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنی اوقات بھلانے کی کوشش کی تو تمہاری سانسیں اپنے ہاتھوں سے ختم کروں گا میرے لیے تم صرف ایک پیادہ ہو، سمجھی تم۔'' وہ سرخ منہ سے بولتا چلا گیا۔ حنیفہ آہستگی سے اٹھی اور چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں شدید نفرت تھی لیکن وہ اسے چہرے پر نہ لا پائی۔ جس دن کوئی کیمرا اسے پکڑ لیتا تو اس کی قبر بھی کسی کو ملنے والی نہیں تھی۔ یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ آج رات فیصل بھی اس سے ملنے والا تھا۔ اس نے ساری بھڑاس تب تک کے لیے جمع کرلی۔ کمرے میں آ کر روزانہ کے معمول کے مطابق وہ سو نہیں سکتی تھی۔ بس روتی رہی اپنی بے بسی اسے بری طرح ہرٹ کرتی رہی۔ رات کو جب فیصل آیا تو وہ اس کے گلے لگ کر کمال کو گالیاں دینے لگی۔ فیصل اسے بہلانے لگا۔ ''خود کو سنبھالو حنی۔'' وہ اسے پیار سے حنی کہتا تھا۔ ''تم یونہی چیختی رہیں تو کوئی آ جائے گا۔''

''میں تنگ آ گئی ہوں فیصل اس زندگی سے اگر یہ سب کچھ کچھ عرصہ اور چلتا رہا تو میرا نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا، ایک ایک لمحہ اذیت سے گزرتے ہوئے اس کے گن رہی ہوں کہ مجھے بکے جانے کے دن قریب آ رہے ہیں۔ میں بہت گھٹن محسوس کرنے لگی ہوں۔'' وہ آنسو پونچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر درد سے بولی۔

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا خود کو اپ سیٹ مت کرو۔''

''یہ میرے پاس آخری چانس ہے اس کی غلامی سے نکلنے کا۔ اگر سالار شادی کے لیے تیار نہ ہوا تو معاہدہ بھی نہیں کرے گا معاہدہ نہ ہوا تو کمال کو کوئی فرق نہیں پڑے گا وہ جانے کے لیے تیار ہے اور چلا جائے گا لیکن پھر میں کبھی آزاد نہیں ہو پاؤں گی۔''

''معاہدے کے لیے شادی شرط ہے۔''

''ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔ سالار کو اس کے حصے کے شیئرز شادی کے بعد ملیں گے، پہلے نکاح ہوگا پھر اسے شیئرز ملتے ہی وہ ہمارے ساتھ معاہدہ کرے گا۔ اس معاہدے میں کمال کا فائدہ ہے وہ اس ڈیل پر سالار سمیت شجاع احمد کو چونا لگانا چاہتا ہے اس کے پاس پیسے کی پہلے ہی کمی نہیں لیکن وہ شجاع کو جھکانے کے لیے کرنا چاہتا ہے اس کے بعد پردہ بھی باہر آف انارن نہیں ہو گا کیونکہ سالار اور شجاع مجھ سے براہ راست ڈیل کریں گے کمال سے نہیں کیونکہ میں ان کی بہو ہوں گی تب پھر میرا گیم ہو گا کمال...... نہیں۔''

وہ اسے دیکھ کر بولی۔ ''ہم دونوں ان دونوں کو چونا لگائیں گے اور پھر اسے ملک چھوڑ دیں گے، ملک چھوڑنے کی ساری تیاریاں تمہیں کرنا ہوں گی۔'' وہ اسے تفصیل سے بتانے لگی۔

''تم بے فکر رہو تمہارا ساتھ پانے کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''ایسا ہے تو حنا کو اغوا کرا دو۔''

''سالار کی ماڈل......؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

''ہاں، مجھے اس لڑکی سے پرابلم نہیں لیکن جانے انجانے میں وہ میرے راستے میں آ رہی ہے۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں اس لیے اسے غائب کرنا پڑے گا، سالار اس کی طرف کچھ زیادہ ہی مائل ہو رہا ہے، اس کے ہٹتے ہی میں اس کے زیادہ قریب ہو جاؤں گی وہ یقیناً شادی کے لیے تیار ہو جائے گا۔''

''ہمارے پاس کتنا وقت ہے؟''

''صرف ایک مہینہ ہے ٹھیک مہینے بعد کمال سوئٹزرلینڈ چلا جائے گا چاہے مشن کامیاب ہو یا نہ ہو وہ یہاں مزید رک ہی نہیں سکتا، وہ اسے سوئٹزرلینڈ میں بڑا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

نقصان اٹھانا پڑے گا۔

''اور اگر سین لیک ہو گیا تو؟''

''تو وہ یقیناً مجھے مار دے گا یا اگر رحم آ گیا تو کسی کو بیچ دے گا وہ ایسا ہی ہے۔''

''تو اس کو پھڑکا دیتے ہیں، نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔''

''نہیں، اس معاملے میں نہیں دیر ہو گئی ہے۔ یہ کام بہت پہلے ہو جانا چاہیے تھا اب ہوا تو ایک تو سالار کمال کی طرف سے مشکوک ہو جائے گا، دوسرا چچا کی موت کے بعد ذمے داریوں کا بوجھ اس پر بڑھ جائے گا اور وہ شادی کو یقینی طور پر ٹال دے گا اور یہ ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔'' وہ ہونٹ بھینچ کر بولی۔

''تو پھر ایکشن میں آنا ہی پڑے گا، میں حنا نامی ماڈل کو اغوا کر لیتا ہوں، باقی کا گیم تم کھیلو گی لیکن ذرا سنبھل کر، اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا، تم میرا سب کچھ ہو تمہارے بعد زندگی ختم۔'' وہ افسردگی سے بولا۔ عفیفہ نے اس کے سینے میں خود کو چھپا لیا۔

☆☆☆

سالار نے حنا کو اپنی پروڈکٹ کے لیے ماڈلنگ کی آفر کی تو وہ انکار نہ کر سکی کیونکہ یہ منصوبے میں پہلے سے طے تھا کہ وہ اس کی ضرورت بن جائے گی۔ وہ باقاعدگی سے اس کے آفس بھی جاتی تھی۔ وہ خود بھی سالار کے قریب ہو رہی تھی تاکہ اس کی اصلیت سے آگاہ ہو سکے اور جتنا وہ اس کے قریب ہو رہی تھی اتنا ہی مشکوک ہو رہی تھی۔ کبھی کبھی اسے سیدھا سادہ سا بزنس مین لگتا اور کبھی عیار اور چالاک لگتا۔ وہ اسے اکثر مشکوک انداز میں فون پر کسی سے بات کرتا دیکھ چکی تھی۔ انکل طاہر کو اس نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی تو انہوں نے ایک سادہ لباس میں انٹیلی جنس کا بندہ اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ حنا کو سالار اور شجاع کی باہر کی سرگرمیوں کی رپورٹ دیتا تھا۔ ظاہر سی بات تھی یہ رپورٹ وہ طاہر انکل اور پولیس ڈپارٹمنٹ کو بھی پہنچاتا تھا لیکن حنا کو اپ ڈیٹ کرنا اس لیے بھی ضروری تھا تاکہ اس کے گروپ کے لنکس ملنے لگے۔ حنا آج کل سالار کے ساتھ اس کے گھر بھی جانے لگی تھی تاکہ ان دونوں سے زیادہ سے زیادہ قریب رہ سکے۔ اس سارے چکر میں وہ سالار کے بھی حد درجہ نزدیک ہونے لگی تھی۔ وہ خود پر بمشکل قابو پاتی کیونکہ جب تک سالار والا معاملہ کلیئر نہیں ہو جاتا تھا وہ اس سے زیادہ قربت بڑھا نہیں سکتی تھی اس سلسلے میں ایک بڑا شک یہ بھی تھا کہ سالار پر اس کی اصلیت نہ کھلنے پائی۔ اگر اسے علم ہو جاتا کہ وہ شجاع احمد کی اولاد ہے تو وہ اسے ختم کرنے میں ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کرتا۔ دولت اور وراثت میں طلبگار اور حق دار بڑھتے جائیں تو یہ مسلسل خطرے کی بات ہوئی ہے ابھی بھی وہ سالار کے دروازے سے چوروں کی طرح لگی کھڑی تھی۔ سالار اندر کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

''اگر تم پکڑے گئے تو میں اس اسلحے کی پیٹیوں کے نیچے تمہیں دبا دوں گا۔'' سالار کی آواز میں غصہ اور دھمکی دونوں تھے۔ وہ ٹھٹک گئی اور دروازے سے مزید چپک گئی۔

''چچا کی نظروں میں آئے بغیر تم اسے غائب کر دو گے۔'' دوسری طرف سے بات سن کر اس نے رازداری سے کہا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی، وہ یقیناً دوسری جانب موجود اپنے بندے کی بات سن رہا تھا۔ خاموشی مزید بڑھی تو وہ تیزی سے دروازے سے دور ہوئی اسی وقت دروازہ کھلا اور سالار باہر نکلا۔ اس کے اس طرح باہر آنے کی دو وجوہات ہو سکتی تھیں، حنا قدرے سہم گئی لیکن چہرے پر مسکان پھیلائے کھڑی رہی سالار کو غالباً شک ہوا تھا کہ دروازے پر کوئی ہے یا وہ عجلت میں باہر نکل رہا تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑی ہو؟''

''میں نے کافی تیار کی تھی تمہیں لینے آئی تھی۔'' وہ بمشکل خود پر قابو پا کر بولی۔

''کافی کسی اور وقت، اس وقت مجھے کہیں جانا ہے۔'' وہ عجلت میں کہہ کر اپنا کوٹ جو اس کے ہاتھ میں تھا پہنتے ہوئے جانے لگا۔

''ٹھیک ہے آج میں انکل کے ساتھ ہی ہوں شام کی چائے اکٹھے پئیں گے۔''

''اوکے۔'' وہ چلتے چلتے مڑے بغیر بولا۔ وہ اس کے پیچھے گیٹ تک آئی جب وہ اپنے گارڈز کے قافلے کے ساتھ چلا گیا تو وہ شجاع احمد کے کمرے میں جانے کے بجائے سالار کے کمرے میں آ گئی۔ اگلا آدھا گھنٹا وہ اس کے کمرے کی تلاشی لیتی رہی لیکن اسے کوئی بھی مشکوک چیز نظر نہ آئی۔ اس نے کمرا جوں کا توں چھوڑ دیا۔ انٹیلی جنس کے بندے کو وہ کمرے میں آتے ہی سالار کے بارے میں انفارم کر چکی تھی۔ اب اس کا رخ شجاع احمد کے کمرے کی طرف تھا۔ جب انسان چیزوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنا شروع کرتا ہے تو ہر چیز پر شک ہونے لگتا ہے اسے اب اس گھر میں ڈر لگنے لگا تھا حالانکہ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ اس کے باپ کا گھر لیکن وہ

یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔ جہاں انسان رہتا ہو اس جگہ سے اپنائیت محسوس نہیں ہوتی۔ شجاع احمد کے دروازے پر اپنا ہاتھ رکھ کر وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ باپ کا دروازہ وہ اچھی نیت سے نہیں کھول رہی تھی کیونکہ باپ کی نیت بھی اچھی نہیں تھی، وہ باپ کو قانون کے شکنجے میں پھانسنے جا رہی تھی لیکن اپنے بڑھتے ہر قدم میں باپ کے لیے دل میں نرم گوشہ بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ تب سے باپ تھا جب اس نے دنیا میں آنکھ کھولی تھی اور اس سے بھی نو مہینے پہلے وہ اس کا باپ ہی تھا لیکن اس نے اس باپ کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا، بچے اسکول اکثر باپ کے ساتھ آتے تھے اور وہ ماں کے ساتھ آتی تھی۔ کہتے ہیں باپ بیٹیوں سے زیادہ پیار کرتے ہیں لیکن اس کے باپ نے سارا پیار لے پالک بیٹے کو دے دیا۔ اس باپ کو وہ کبھی بابا نہیں کہنا چاہتی تھی لیکن اب ایسا کہنے کو دل چاہتا تھا۔ پہلے وہ اسے خود سزا دینا چاہتی تھی دوری بڑھا کے لیکن اب یہ دوری حالات بڑھانے والے تھے شاید اسی لیے وہ اپنے دل میں شجاع احمد کے لیے نرم گوشہ محسوس کرنے لگی تھی۔ باپ برسوں بعد ملا تھا۔ وہ ٹھیک سے دل بھر کے لڑ بھی نہیں لی تھی کہ اسے چھیننے والے آگئے۔ ہلکی آہٹ کے ساتھ ہاتھ کے دباؤ سے دروازہ کھلتا چلا گیا۔ آتش دان کے قریب رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا اس کا باپ ایک پیپر پر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو مسکراہٹ چہرے پر پھیل گئی۔ وہ اسے بابا کہنا چاہتی تھی لیکن آواز حلق میں اٹک گئی۔

"آؤ بیٹی۔" اس نے قریب پڑی چیئر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گئی اور اسے غور سے دیکھنے لگی۔ وہ ایک وجیہہ بزنس مین تھا۔ کنپٹیوں کے سفید بال اس کے گریس میں کئی گنا اضافہ کرتے تھے۔ سرخ و سفید رنگت اور اوپر سے بلیک کلر کے کڑھائی والے کرتے شلوار میں وہ شاندار تھا ہمیشہ کی طرح۔

"کیسی ہے میری پرنسز؟" لہجے میں مٹھاس تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک باپ تھا اور وہ اس کی پرنسز بیٹی۔

"جیسی برسوں پہلے تھی ویسی ہی ہوں۔" چاہتے ہوئے بھی وہ لہجے کو نرم نہ رکھ پائی۔

"میں مجرم ہوں تمہارا، تمہارا رویہ ایسے ہی ہونا چاہیے۔"

"کیا صرف میرے مجرم ہیں؟" آواز میں ان لاکھوں انسانوں کی آہوں جیسا کرب تھا جو اس کے امپورٹ کیے اسلحے کا ایندھن بنے تھے۔ شجاع کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ درد وہ کیسے محسوس کر سکتا تھا۔ لاکھوں بے گناہوں کی آہ و بکا اس نے کبھی سنی ہی نہیں تھی۔ وہ ٹی وی پر خبروں کے چینل دیکھتا تھا لیکن صرف ہیڈ لائنز سننے کے لیے۔ ہیڈ لائنز میں تفصیل نہیں ہوتی اسی طرح درد بھی تب ہی محسوس ہوتا ہے جب اسے گہرائی میں جانا جائے۔ وہ درد کی گہرائی ناپنے سے قاصر تھا کیونکہ اسے آج تک یہ سہنا نہیں پڑا تھا۔ وہ ایک سطحی شخص تھا جو انسانوں کے دماغوں کی تہوں کو کھولنے میں تو دلچسپی رکھتا تھا لیکن دل کو بس ایک ناکارہ پرزہ سمجھتا تھا۔ بیٹی کے لیے نہ جانے اس کے دل میں کتنی محبت تھی لیکن فی الوقت وہ اس کا اہم ہتھیار تھی۔ جو بروقت اسے ملا تھا۔ بازی جو بس پلٹنے ہی والی تھی، اس بیٹی نے آکر سنبھالا دیا۔ وہ خود کو پھر سے طاقتور شے سمجھنے لگا۔ نئی چالیں چلنے کے لیے چاق و چوبند ہو گیا۔

"سالار کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہے؟" اسے افسردہ دیکھ کر اس نے ٹاپک بدلا۔

"وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے لیکن عفیفہ سے ملنا ابھی ترک نہیں کیا۔" وہ خود کار انداز میں بولنے لگی۔ عفیفہ کے متعلق اسے مکمل بریف کیا گیا تھا۔ اس کا رول بھی یہی تھا کہ وہ سالار کے اتنا قریب [illegible] کہ سالار عفیفہ سے شادی کا ارادہ ترک کر دیتا۔

"وہ ترکی کمال کی بیٹی ہے۔ وہ شیطان اسے جان بوجھ کر سالار کے قریب لایا ہے تاکہ وہ اس سے شادی کر لے۔"

"تو شادی میں کیا پرابلم ہے؟" حنا نے اسے کریدا۔

"شادی ہوتے ہی اسے اپنے شیئرز مل جائیں گے اور کمال عفیفہ کے ذریعے اس سے یہ سب ہتھیا لے گا۔"

"آپ کا خیال ہے سالار اتنا بے وقوف ہے کہ یہ سب آسانی سے ہونے دے گا؟"

"خطرہ یہ نہیں ہے کہ وہ بے وقوف ہے۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ بے وقوف نہیں۔" شجاع احمد سنجیدگی سے گویا ہوا۔ حنا نے وضاحت طلب نظروں سے اسے دیکھا۔ "وہ کبھی بھی بے وقوف نہیں رہا شروع سے ہی وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتا آیا ہے۔ اس نے ایک غلطی کو کبھی نہیں دہرایا اب دہرا رہا ہے اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں یا تو وہ میرے خلاف ہو چکا ہے کچھ الگ سے پلان کرنے کی سوچ رہا ہے یا اسے مجھ سے شدید بدظن کر دیا گیا ہے دونوں ہی صورتوں میں حالات خراب ہونے کے شدید چانسز ہیں، میرے خلاف ہونے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا اسے یقیناً کمال نے مجھ سے

بدظن کیا ہے آج کل میری آنکھوں میں دیکھ کر بات بھی نہیں کرتا کہ کہیں میں اس کی سوچ نہ پڑھ لوں۔''

''یعنی ماضی میں آپ اس کی ذات سے وابستہ کچھ نہ کچھ ایسا کر چکے ہیں جس کا علم کمال کو تو تھا لیکن جب سالار کو ہوا تو اسے دکھ ہوا...... اتنا دکھ کہ وہ آپ سے دور جا رہا ہے۔'' حنا بولی تو شجاع نے نظریں پیپر پر جمالیں۔ بچے جوان ہو چکے تھے چہرے سے دل کا حال جاننے لگے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی رفتار سے چونک گیا اگر وہ اسی طرح آگے بڑھتی رہی تو بہت کچھ بے نقاب ہو سکتا تھا۔ وہ سالوں بعد ملی تھی، وہ اسے مزید کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا۔ ایسا ہر بزنس مین کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کی دولت و جائداد کا وارث اس کا اپنا خون ہونا چاہیے۔ اس نے بھی برسوں کی محنت سے یہ دولت اس لیے نہیں اکٹھی کی تھی کہ کمال جیسا دشمن آکے اسے چھین لے۔ وہ پلان کر چکا تھا کہ سالار اس کام سے باز آجائے تو وہ اس کی شادی اپنی بیٹی سے کر دے گا ورنہ اسے ختم کر دے گا۔ وہ دشمن سے ہار کھانے سے بہتر مر جانا سمجھتا تھا۔

''ماضی میں ایسا کچھ نہیں ہوا جس سے سالار کو دکھ پہنچے۔''

''ہو سکتا ہے کچھ ایسا ہوا ہو جو آپ نے سالار کی بہتری کے لیے پوشیدہ رکھا ہو لیکن...'' باپ کی بے چینی ظاہر کر رہی تھی کہ وہ حنا سے اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ بات بدل رہا تھا مطلب دال میں کالا کچھ کالا تھا۔

''اماں کو آپ بھول چکے تھے نا، وہ اسے ابھی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔'' آپ کے ملنے نہ آتیں تو آپ کو ہماری یاد بھی نہ آتی۔''

''نہیں ایسا نہیں ہے، میں نے ریشم کے جانے کے کچھ عرصے بعد اسے بہت ڈھونڈا لیکن وہ ملی نہیں۔''

''آپ جیسی بااثر شخصیت ایسا کہہ رہی ہے؟''

''کبھی سامنے بڑی چیز بھی نظر نہیں آتی۔ میں سمجھتا تھا وہ اس شہر کو چھوڑ چکی ہے، ہاں واقعی اگر وہ خود سامنے نہ آتی تو شاید میں اپنی اولاد سے دور ہی رہتا۔''

''بہت اچھے وقت پر میری آپ سے ملاقات ہوئی ہے، ایسا نہیں ہے کیا؟'' وہ بلا جھجک اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں گا۔''

''جنید بھائی کا علاج کروانے کی بھی کوشش نہیں کی

گئی۔'' اس نے اپنے معذور بھائی کا نام لے کر پوچھا۔

''بہت مرتبہ یہ کوشش کی امریکا بھی لے کر گیا لیکن کچھ خاص فرق نہیں پڑا۔''

''آپ مجھ سے وہ سب کچھ شیئر کر سکتے ہیں جو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے جاننا چاہیے آپ کے بارے میں۔'' اچانک سوال پر وہ چونک گیا۔

''لگتا ہے تم میرے بارے میں مشکوک ہو، کسی نے تمہارے کان بھرے ہیں۔''

''ایسا کون ہے جو میرے کان بھر سکتا ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''سالار تو کبھی نہیں ہو سکتا۔''

''سالار پر اتنا یقین ہے آپ کو؟''

''یہ میری تم پر اعتماد کی بات ہے۔'' وہ بھی مسکرایا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے مجھے آپ کے پاس آئے اور آپ کو مجھ پر اعتماد ہے۔''

''میری اولاد مجھے دھوکا نہیں دے سکتی، ہم سالار سے میرے حوالے سے کوئی بات نہیں کرو گی، یہ میں جانتا ہوں آج کل وہ آپا کل نہیں۔''

''آپ کو پتا ہے آپ بڑے اعتماد سے جھوٹ بولتے ہیں، اتنا اعتماد ایک دم سے نہیں آتا برسوں لگتے ہیں یعنی کچھ ایسا ہے جو برسوں سے چھپاتے آ رہے ہیں جو سالار کو بھی پتا نہیں تھا لیکن اب پتا چل گیا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بری طرح چونکا۔ ''تم مجھے اپنے باپ کو سمجھا کیا رہی ہو؟''

''میں تو صرف نتیجہ نکال رہی ہوں سالار کی آپ سے ناراضی کا۔''

''تم ابھی اس عمر کو نہیں پہنچیں کہ اس طرح کے نتیجے نکالو۔'' وہ غصے سے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا ارادہ تھا شام تک آپ کے ساتھ رہوں لیکن ہم شاید زیادہ دیر اکٹھے نہیں بیٹھ سکتے، چلتی ہوں۔'' وہ کہہ کر رکی نہیں جبکہ شجاع احمد پرسوچ نظروں سے اسے جاتا دیکھتا رہا۔ اور پھر موبائل نکال کر اپنے ایک ملازم کو کال کی۔

''جاوید مجھے حنا کے ہر پل کی خبر دو، کہاں کہاں جاتی ہے اور کس کس سے ملتی ہے۔''

''جی سر۔'' جاوید نے مستعدی سے کہا۔ موبائل آف کر کے شجاع نے ٹیبل پر رکھا اور خود اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سالار نے ابھی تک وہ اہم چیزیں چھپائی

تھیں۔ اس کے والدین کا قتل اور ناجائز اسلحے کا کاروبار۔ ان میں سے ایسی کون سی چیز تھی جس کا کمال کو علم ہوسکتا ہے اور اس نے یقیناً سالار کو بھی بتا دیا۔ یہ بات تو سو فیصد پکی تھی کہ اسے بھٹکانے والا کمال ہی تھا لیکن اگر کمال ان دونوں میں سے ایک بھی بات جانتا تھا تو پھر وہ ابھی تک خاموش کیوں تھا۔ وہ ان دونوں باتوں کو لے کر اسے آسانی سے بلیک میل کرسکتا تھا۔ اگر وہ یہ کام سالار کے پیچھے رہ کر کررہا ہے تو لازماً کوئی وجہ ہوگی اس کے چھپنے کی۔ اب یہ وجہ جاننا ضروری ہوگیا تھا۔ اگر اس سارے کھیل کے پیچھے وہی تھا تو اب اسے کوئی بڑی پناہ گاہ ڈھونڈنے کی ضرورت تھی شجاع اسے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ چھپنے چھپانے والے کھیل سے اسے اب بوریت ہونے لگی تھی۔ دشمن کھل کر سامنے نہ آئے تو بل سے نکالنا ہی پڑتا ہے۔

☆☆☆

"کیا بات ہے فیصل کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے؟" فیصل نے رات کو مسڈ کال دی تھی۔ عفیفہ نے جیمر آن کیا۔ فیصل مقررہ وقت پر کمرے میں آیا تو عفیفہ نے گلے لگتے ہی سوال کیا۔

"حنا کو اتنا آسان نہیں ہے۔ وہ اکیلی نہیں رہتی یوسف مرزا کی بزنس مین کی بیٹی ہے۔ یوسف مرزا اور شجاع کے تعلقات بہت قریبی ہیں۔"

"تو وہ نارمل نہیں ہے۔"

"نہیں صرف سالار کے لیے اداکاری کی ہے، حیرت ہے سالار نے یہ سب تمہیں خود سے نہیں بتایا۔"

"کیا ارادے ہیں اس لڑکی کے؟" عفیفہ نے چھپتے خود سے سوال کیا۔

"مرزا کی بیٹی ہے کاروبار میں لانا چاہ رہا ہے۔ آج کل سالار اسے بزنس سکھا رہا ہے۔"

"یہ چال ہے شجاع احمد کی..... اسی نے مرزا کو کہا ہوگا کہ حنا اور سالار کو ایک دوسرے کے قریب کرو، حیرت کی بات ہے یہ سالار کو سمجھ نہیں آیا۔" وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"وہ چالاک انسان ان دونوں کو ایک دوسرے سے اس لیے قریب کرنا چاہتا ہے تاکہ سالار کی توجہ مجھ سے ہٹ سکے اور ہمارے درمیان نہ ڈیل ہوسکے نہ شادی۔"

"تو پھر کیا کہتی ہو؟"

"فوراً سے پیشتر اس اسٹوپڈ لڑکی کو غائب کرو جب مقصد پورا ہوجائے تب مار کے کہیں پھینک دینا۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

"چار پانچ سیکیورٹی گارڈز ہیں اس کے۔"

"یہ اب تمہارا کام ہے ان سے کیسے نمٹو گے؟" عفیفہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ٹھیک ہے، میں پوری کوشش کروں گا۔"

"ہمارے پاس چونکہ وقت کم ہے کسی بھی وقت ایمرجنسی پیش آسکتی ہے اس لیے میں روزانہ اس وقت جیمر آن کردیا کروں گی تمہیں کوئی کام ہو تو آجایا کرنا۔"

"تھینکس سویٹ ہارٹ، لو یو۔"

☆☆☆

"مجھے آج شجاع احمد نے ایک جگہ ملنے کے لیے بلایا ہے۔" صبح ناشتے کی ٹیبل پر کمال نے انکشاف کیا تو عفیفہ چونک گئی۔

"کس سلسلے میں ہوگی یہ ملاقات؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں، ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہے وہ، ہوسکتا ہے بھتیجے نے مجبور کردیا ہو اور تم دونوں کی شادی پر تیار ہوگیا ہو۔" کمال توس پر جیم لگاتے ہوئے بولا۔

"ہوسکتا ہے ایسا نہ ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"حنا نامی لڑکی کا، کوئی تذکرہ میں نے آپ سے۔"

"ہاں تو؟"

"وہ یوسف مرزا کی بیٹی ہے اور سالار آج کل اسے بزنس سکھا رہا ہے تاکہ باپ کا کاروبار سنبھال سکے۔"

"لیکن مرزا کی تو کوئی بیٹی نہیں ہے۔"

"آپ کو کیسے پتا؟" چونکنا فطری تھا۔

"میں بھی اسی دنیا میں پلا بڑھا ہوں۔ بزنس کیا ہے، کس کے کتنے بچے ہیں، جانتا ہوں۔"

"مطلب کوئی بڑی چال چلی جارہی ہے، مرزا صاحب بھی کوئی گیم کھیل رہے ہیں۔"

"تو پھر آج ہی سالار سے بھی اور مرزا سے بھی ملو۔"

"ٹھیک ہے میں یہ معاملہ کلیئر کرکے ہی لوٹوں گی۔"

☆☆☆

"حیرت ہے آج صبح ہی صبح میرے آفس میں۔" عفیفہ کو آفس میں دیکھ کر سالار خوش دلی سے بولا۔ "ہاں سوچا تمہیں اپنا چہرہ یاد دلا دوں۔" وہ مسکرا کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی ہلکی پھلکی باتوں کے بعد وہ اپنے مقصد پر آگئی۔

"تم نے بتایا نہیں حنا یوسف مرزا کی بیٹی ہے۔"

اس سلسلے میں کوئی بات نہیں ہوئی تم سے ورنہ ضرور بتاتا۔''

''صحیح کہا تم نے بہت مصروف رہتے ہو، صبح سے شام ہونے تک۔'' لہجے میں شکوہ تھا۔

''واقعی آج کل بہت مصروفیت چل رہی ہے۔'' وہ ایک بند پرچہ لیٹر پیڈ کے نیچے رکھ کر بولا۔ یہ عفیفہ کے لیے تھا کیونکہ وہ اسے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ ان دونوں کی گفتگو سنی جاتی ہے۔

''اسی لیے تمہارے کان بہت سی اہم باتوں سے محروم رہتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''حنا مرزا نامی لڑکی شجاع احمد کا تیار کردہ جال ہے تمہارے لیے۔'' اس نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

''وہ نہیں چاہتے کہ تمہاری اور میری شادی ہو اسی لیے انہوں نے اس لڑکی کو تیار کرکے تمہیں پھانسنے کے لیے بھیجا، تم سے بزنس سیکھنا صرف ایک بہانہ ہے تمہارے پاس آنے کا۔''

''یہ الزام بھی ہوسکتا ہے حنا پر، کیونکہ وہ بڑی دلچسپی سے بزنس سیکھ رہی ہے اور اس کی پرفارمنس بہت تیز ہے اگر عفیفہ میرے ہی گھر گھومتا ہوتا تو وہ یہاں بیٹھی ہوتی اس وقت تمہاری جگہ پر، لیکن وہ اکاؤنٹ آفس میں ہے۔''

''میرے پاس ثبوت ہے۔''

''کیسا ثبوت؟''

''یوسف مرزا کی کوئی اولاد ہی نہیں ہے۔'' اس نے انکشاف کیا۔ سالار نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''پہلے میں بھی یہی سمجھتا تھا۔'' وہ بولا اور پھر اسے اپنی اور یوسف مرزا سے ہونے والی بحث سنائی۔ جواب میں عفیفہ چپ رہی۔ وہ کمال کا رسپانس سن کر بولنا چاہتی تھی لیکن وہ بھی شاید سوچ بچار میں پڑ گیا تھا۔

''ہونہہ! تمہاری بات غور طلب ہے لیکن میں پھر بھی کہوں گی کہ آنکھیں بند کرکے کسی بھی بات پر یقین مت کرو۔''

''آنکھیں بند کرکے یقین تو میں تم پر بھی کر رہا ہوں تو کیا یہ غلط ہے۔''

''میرے بارے میں کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے اور نہ میں چھپاتی ہوں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی اسی وقت دروازہ کھلا اور حنا اندر آئی۔ اسے دیکھ کر عفیفہ بری طرح چونکی وہ بغیر دستک کے آئی تھی یعنی سالار سے اس کی بے تکلفی بڑھ چکی تھی۔

''ہائے عفیفہ ڈیئر۔'' حنا مسکرا کر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ جواباً اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔

''تم سے ملاقات سالار کی موجودگی میں ہی ہوتی ہے آؤ نا کبھی گھر پر بھی ملاقات کرتے ہیں۔ آخر سالار سے شادی کرنے جا رہی ہو تم۔ لیکن ہم ایک دوسرے کو زیادہ نہیں جانتے۔''

''ابھی ابھی سالار سے علم ہوا تم انکل یوسف مرزا کی بیٹی ہو، جان کر خوشی ہوئی، جہاں تک ملاقات کا تعلق ہے تو یقیناً جلد ہی ہوگی۔''

''میں چلتی ہوں بس سالار کو بائے کہنے آئی تھی۔''

''میں بھی جا ہی رہی ہوں، اکٹھے ہی نکلتے ہیں۔'' عفیفہ نے اٹھتے ہوئے تیزی سے پرچہ پیڈ کے نیچے سے نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ حنا کی تیز نظروں سے پرچہ اوجھل نہ ہوسکا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی گاڑی تک آگئیں۔

''ایسا لگتا ہے تمہیں کہیں پہلے بھی دیکھا ہے۔'' عفیفہ گاڑی کے قریب پہنچ کر بولی۔

''لیکن مجھے تو نہیں لگتا ہو سکتا ہے میری شکل کسی سے ملتی ہو۔'' وہ مسکرا کر الگ ہوئی عفیفہ اسے گاڑی میں بیٹھنے تک دیکھتی رہی۔ اپنے گارڈز کے ساتھ بیٹھ کر وہ اسے ہاتھ ہلاتے ہوئے سامنے سے گزر گئی۔ عفیفہ بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چل پڑا۔ عفیفہ کے کانوں میں کمال کی آواز گونجنے لگی۔

''مجھے بھی یہ لڑکی دیکھی دیکھی لگتی ہے لیکن کہاں یاد نہیں آرہا۔''

''چار چار گارڈز رہتے ہیں اس کے ساتھ مجھے تو بہت مشکوک لگ رہا ہے یہ سب کچھ۔''

''سارے شکوک دور کرلیں گے جلد ملتے ہیں اس حسینہ سے۔'' کمال کے لہجے کا سرد پن عفیفہ سے چھپا نہ رہ سکا۔ وہ جانتی تھی جلد ہی وہ اسے غائب کروا لے گا۔ وہ زیادہ دیر صبر کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن عفیفہ کے ذہن میں کچھ اور ہی کھٹک رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ فیصل اسے کمال سے پہلے اٹھوا لے۔ اس لڑکی کے ساتھ یقیناً کچھ ایسا راز ہے جسے جاننا اس کے لیے ضروری بھی ہوسکتا تھا۔ اچانک عفیفہ کا دھیان اپنی جیب میں موجود پرچے کی طرف گیا۔ کسی کے ہاتھ سے باہر رکھ کر وہ اسے بآسانی پڑھ سکتی تھی اسی لیے اس نے جب جیب میں ہاتھ ڈالا تو پرچے کو غائب پایا....

بظاہر اس نے دوسری جیب میں بھی ہاتھ ڈالا اور اب اس کا چہرہ روشن ہوگیا۔ پرچہ غائب تھا۔ وہ بے ساختہ حنا کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔

☆☆☆

برسوں پرانے دو دشمن پھر سے آمنے سامنے تھے۔ دشمنی وہ رشتہ ہے جو دو افراد کو نہ چاہتے ہوئے بھی رابطے میں رکھتا ہے۔ دشمنی برقرار رکھنی ہو تو دشمن کے پل پل کی خبر رکھنا پڑتی ہے ورنہ دشمن سبقت لے جاتا ہے۔ وہ دونوں بھی... برسوں سے یہی تعلق قائم کیے ہوئے تھے لوگوں کو دکھانے کے لیے دوستوں کی طرح گلے ملے اور پھر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ یہ ایک مشہور سیون اسٹار ہوٹل کا ٹیرس تھا جہاں بیٹھے وہ اردگرد پر نظر رکھ سکتے تھے۔ دونوں کے گارڈز مناسب فاصلے پر مستعد کھڑے تھے۔ ایک اشارے کے منتظر ان کے ہاتھ اپنی رائفلوں پر جمے ہوئے تھے۔

"[illegible] بھتیجے کو قابو کرنے کے لیے مرزا سے مدد مانگی ہے۔" کمال نے ٹیبل سے کچھ بھی لے کر نہیں کھایا تھا، اس کے بغیر ہی گفتگو شروع کی جبکہ شجاع نے اپنی مرضی کا آرڈر دیا تھا اور سپ لینے لگا اسے اس سے غرض بھی نہیں تھی کہ کمال کچھ کھائے۔

"پرانے دوست اور پرانے دشمن نظر میں رکھنے چاہئیں۔" وہ بھویں اچکا کر بولا۔

"کس لیے بلایا ہے۔" کمال مطلب کی بات پر آیا۔

"سارے شہر کی لڑکیاں چھوڑ بیٹھے ہو میں یہ کیسے مان لوں کہ اپنی سوتیلی بیٹی کو تم نے چھوا بھی نہ ہو۔"

"اس بکواس پر سالار تو یقین نہیں کرے گا۔ عفیفہ عنقریب تمہاری بہو بن رہی ہے روک سکتے ہو تو روک لو۔" کمال طنزیہ ہنستے ہوئے بولا۔ تو شجاع نے ایک تصویر اس کے سامنے پھینکی۔ کمال نے اسے اٹھایا تو بری طرح اچھلا۔ یہ ایک پرانی تصویر تھی جس میں عفیفہ اور وہ بغیر لباس کے ہم آغوش تھے۔ کمال نے دماغ پر زور ڈالا تو اسے یاد آگیا یہ چار سال پہلے کی تصویر تھی جب وہ اور عفیفہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ وہ کام کے سلسلے میں عفیفہ کو لے کر دوسرے شہر گیا تھا اور فراغت پر انہوں نے اچھا ٹائم گزارا۔ لیکن یہ تصویر کس نے اتاری ایسی جرأت کون کرسکتا تھا یہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے تصویر کو فوراً ہی پھاڑ دیا۔ شجاع کے ہونٹوں پر خفیف مسکراہٹ ابھر آئی۔

"ویڈیو ہے جس میں تمہاری اور عفیفہ کی کہانی عیاں ہوتی ہے۔ ساری دنیا کے سامنے بیٹی اور کمرے میں...... ہاہاہا۔" شجاع کا قہقہہ رکنے والا نہیں تھا۔ "بڑی مشکل سے حاصل کی ہے۔"

"کیا چاہتے ہو؟" کمال نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ سارا گیم ہی الٹ چکا تھا۔ شجاع پکے ثبوت کے ساتھ سامنے بیٹھا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ بازی آج بھی اسی کے ہاتھ میں ہے ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ اسے نیچا دکھا رہا تھا۔

"تم جیسے بلیک میلر کو بلیک میل تو کروں گا نہیں بس دفع ہوجاؤ یہاں سے اور اپنی اس محبوبہ کو بھی لے جاؤ اگلے بارہ گھنٹے کے اندر میں تمہارا وجود اس شہر میں نہ دیکھوں ورنہ سالار کے ساتھ ساتھ یہ تصویر...... یہ ویڈیو کسی بھی نیوز چینل کو دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" کمال ایک دم سے اٹھا جیسے مزید بیٹھا تو کرنٹ لگ جائے گا۔ "لیکن اس بار تم جیتے...... [illegible] چوبیس گھنٹے کے اندر اندر یہ شہر چھوڑ دوں گا۔" کمال کے گارڈز [illegible] اور شجاع نے سکون کی سانس لی۔

☆☆☆

حنا نے اپنے کمرے میں آتے ہی عفیفہ کی جیب سے اڑایا ہوا پرچہ کھولا اور پڑھنے لگی۔ پرچے کی تحریر پڑھ [illegible] تھی۔

"عفیفہ میں نے بہت سوچا ہے اور تمہیں ساتھ ملانے پر راضی ہوگیا ہوں، جانتا ہوں تمہارے پاس وقت کم ہے۔ کمال جلد ہی سوئٹزرلینڈ جا رہا ہے اور تم اس کے جانے سے پہلے اس سے جائداد واپس لینا چاہتی ہو لیکن میں خود بری طرح ایک کام میں پھنسا ہوا ہوں۔ ناجائز اسلحے والے کام کا تو تمہیں علم ہی ہے شجاع کے گرد جو جال بُن چکا ہوں اس کی ڈوری کو بس کھینچنے والا ہوں۔ اس کے گروہ کے تقریباً سبھی لوگوں تک رسائی ہوچکی ہے۔ اس دھندے میں جتنے بھی ملوث ہیں سب کو اس کے خلاف بھڑکا چکا ہوں بھڑکانے کے لیے ایک لفظ غدار ہی کافی تھا آج یا کل اس کا انجام دیکھ کر تمہارے سوتیلے باپ سے بھی دو دو ہاتھ کرتے ہیں بس تھوڑا انتظار اور کرو۔ کھل کر سمجھا نہیں سکتا جانتا ہوں تمہارے ذریعے کمال ہماری گفتگو سنتا ہے اسی لیے پرچہ چھپا دوں گا۔"

حنا نے تحریر دوبارہ پڑھی اور پھرتی سے کھڑی ہوئی، پریشان مت ہو یہ تصویر [illegible] اسے انگلی کا ظاہر نہیں کرنا تھا اس لیے جلدی سے اٹھا کر باہر نکل

آئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ طاہر صاحب کو تحریر دے کر ان سے اجازت لے کر آ گئی۔ تحریر کے حوالے سے جو بھی اقدامات کرنے تھے، وہ طاہر اور ایس ایس پی کا دردِ سر تھا۔ اس کا رخ ایک شاپنگ پلازا کی طرف تھا۔ شام کو سالار کی برتھ ڈے تھی اور وہ اسے وش کرنا چاہتی تھی۔ وہ سالار کے لیے ایک اچھی سی شرٹ پسند کر رہی تھی جب اسے اپنی پسلیوں میں چبھن محسوس ہوئی۔

''پلٹنا مت اور جہاں میں کہوں خاموشی سے چلنا ورنہ ساری گولیاں تمہارے خوب صورت وجود میں اتار دوں گا۔'' یہ فیصل تھا جو پستول کی نال اس سے لگائے کھڑا تھا۔

''مارنا چاہتے ہو یا کڈنیپر ہو؟'' وہ ڈرے بغیر بولی لیکن اس کے قدم اُدھر ہی اٹھ رہے تھے جہاں پستول والا اسے چلنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ پلازا کی بیک سائڈ سے نکل کر ایک گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ حنا کے گارڈز دوسرے دروازے پر تھے جب تک انہیں حنا کے غائب ہونے کا علم ہوتا وہ اس جگہ سے دور جا چکی ہوتی۔ گاڑی میں آتے ہی پستول والے نے اس کی کنپٹی پر وار کیا، وہ لڑھک گئی۔ فیصل اسے اپنے گھر لے آیا۔ اس کی والدہ کچھ دنوں کے لیے کسی عزیز کے پاس گئی تھیں اس لیے فیصل کو اسے کچھ دن یہاں رکھنے میں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔

حنا کی جب آنکھ کھلی تو خود کو ایک کرسی پر بندھا ہوا پایا۔ یہ درمیانے درجے کا سجا ہوا بیڈروم تھا اس کے سامنے ایک ٹیبل پر بالترتیب چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ سب یقیناً اسے ڈرانے کی نیت سے رکھی گئی تھیں۔

''کوئی ہے یہاں؟'' اس نے اونچی آواز میں صدا لگائی، آواز دینے پر کوئی ری ایکشن نہ ہوا تو اس نے اپنی بندشوں کو ہلا جلا کر ان کی مضبوطی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ بندش مضبوط نہیں تھی لیکن کچھ زیادہ ڈھیلی بھی نہیں تھی۔ اسے آزاد ہونے کے لیے کافی محنت کرنا پڑتی۔ اگر وہ کرسی سے بندھی نہ ہوتی تو اپنے بازوؤں کو پاؤں کے نیچے سے گزار کر سامنے لے آتی اور پھر خود کو آزاد کرنا زیادہ آسان ہوتا۔ اب جب تک پیچھے بندھے ہاتھ آزاد نہ ہوتے وہ خود کو کرسی سے الگ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ابھی تک حواس برقرار رکھے ہوئے تھی اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس سچویشن میں یقیناً گھبرا جاتی لیکن وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی اس حالت سے سمجھوتا کرنے والی نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ آواز دی تاکہ گھر میں کسی کی بھی موجودگی کا پتا چل جائے اس مرتبہ امید بر آئی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور پستول

والا شخص اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں جوس سے بھرا گلاس تھا جس میں اسٹرا ڈال کر اس نے اس کے منہ کے سامنے کیا۔

''ابھی تمہیں کچھ دن یہاں میرے ساتھ ہی رہنا ہے اس لیے میں چاہتا ہوں تم اپنی توانائی برقرار رکھو۔'' سانولے چہرے اور عام سے نقوش والا آدمی چہرے سے زیادہ کرخت نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا اعتماد قدرے بحال ہوا اور خاموشی سے جوس پینے لگی۔

''مجھے بھوک بھی لگی ہے۔ میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'' جوس پینے کے بعد بھی اسے بھوک محسوس ہوئی تو دھڑلے سے بولی۔

''کھانا ضرور ملے گا لیکن اس سے پہلے کچھ سوالوں کے جواب۔'' وہ گلاس ٹیبل پر رکھ کر اطمینان سے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''دوں گی، سبھی سوالوں کے جواب لیکن انہیں ہٹاؤ۔'' اشارہ ٹیبل پر رکھے لوازمات کی جانب تھا۔

''یہ تب تک یہیں ہیں جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی۔''

''تو ٹھیک ہے اپنی تسلی کر لو۔'' وہ بھویں اچکا کر آرام سے بولی۔

''کون ہو تم؟''

''پہلے تم اپنا تعارف کرواؤ۔''

''زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔'' اس مرتبہ فیصل نے کرخت لہجے میں کہا۔

''میں یوسف مرزا کی بیٹی ہوں۔''

''جھوٹ۔''

''تو پھر تم ہی بتا دو سچ کیا ہے۔''

''مرزا کی کبھی کوئی اولاد نہیں تھی۔''

''تم کیا گائناکالوجسٹ تھے۔'' اس کے بولتے ہی اس کے چہرے پر زوردار طمانچہ رسید ہوا۔

''جتنے جھوٹ، اتنے تھپڑ۔''

''شرم کرو لڑکی پر ہاتھ اٹھاتے ہو؟''

''میں تم سے یہاں شرم و حیا پر لیکچر سننے نہیں آیا نہ میرے پاس زیادہ وقت ہے۔'' وہ ایک چھری منتخب کر کے اسے اٹھا کر پاس آ گیا، وہ سہم گئی۔

''اچھا رکو بتاتی ہوں۔'' چھری کی ہیبت ہی ایسی تھی کہ وہ فر فر بتاتی گئی۔

تم شکل سے مہذب انسان لگتے ہو یہ چاقو چھری والا گیم ختم کرو اپنی ڈیمانڈ بتاؤ کتنے پیسے چاہئیں میں فوراً تمہیں دلوا دوں گی۔"

"تم ایسے نہیں مانو گی۔" وہ چھری اس کے چہرے کے قریب لایا۔ "مجھے بس یہ کرنا ہے کہ تمہارے اس خوب صورت چہرے پر اتنے کٹ لگاؤں کہ تمہاری پہچان ختم ہو جائے تو پھر میں شروع کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ زور سے چیخی۔ "میں بریگیڈیئر طاہر کی بیٹی ہوں۔"

"کون طاہر؟"

"وہ ریٹائرڈ بریگیڈیئر ہیں مجھے نوکری کی ضرورت تھی یوسف مرزا نے کہا کہ نقلی بیٹی کا کردار کرا دو، میں مان گئی بس یہی کچھ ہے سچ۔" وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ لیکن یہ سب الجھاتی تھا اب وہ دوبارہ سامنے بیٹھ گیا۔

"میں پتا لگا لوں گا کہ تمہاری بات میں کتنی سچائی ہے اس لیے اتنا جھوٹ بولنا جتنا ورد سہنے کی طاقت ہو۔" وہ بولا تو اس نے سر ہلا دیا۔ اندر سے اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ اسے جلد ہی علم ہو جاتا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے تو پھر آگے کی صورت حال واضح تھی اب بس یہی دعا کر رہی تھی کہ کسی طریقے سے انکل طاہر کو اس کا علم ہو جائے۔

"اب وہ سب مجھے بتاؤ جو تم یوسف مرزا اور شجاع احمد کے بارے میں جانتی ہو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔"

"کیا تمہیں ڈوز کی ضرورت ہے۔" وہ دوبارہ چھری ہلا کر بولا۔

"نہیں، بتاتی ہوں۔" وہ آہستگی سے ان دونوں کے بارے میں اسے بتانے لگی۔

☆☆☆

سالار کے ہونٹوں پر شاطرانہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں انتقام کی چمک۔ وہ ایک بڑی اسکرین کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک درمیانے سائز کے ہال کمرے کا منظر تھا جس میں ایک شیشے کی میز کے گرد شہر کے معزز لوگ بیٹھے تھے۔ بظاہر یہ چار بزنس مین تھے لیکن پس پردہ اسلحے کی ناجائز خرید و فروخت میں ملوث تھے۔ ان سب کی فیملیز تھیں لیکن یہ دوسروں کے گھر اجاڑنے میں مصروف تھے۔ ملک میں مصروف دہشت گرد عناصر کو اسلحہ فراہم کرانے تھے ان سب نے مل کر اپنا ایک سربراہ بھی رکھا تھا۔ ہر تین ماہ بعد یہ لوگ اسی طرح اکٹھے ہوتے اور ان بزنس سے متعلقہ فائدوں اور نقصانوں کی بنیاد پر نیا لائحہ عمل تیار کرتے اس پر عمل درآمد کی ذمے داری ٹیم کے سربراہ کی تھی جو کہ آج کل شجاع احمد کے ذمے تھی۔ آج کی میٹنگ ہنگامی بنیادوں پر کال کی گئی تھی۔ چاروں بزنس مین آچکے تھے سربراہ یعنی شجاع احمد کا انتظار ہو رہا تھا۔ چاروں کے چہروں پر گمبھیر خاموشی چھائی تھی۔ سچویشن کافی سیریس تھی۔ انہیں مصدقہ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ شجاع احمد ان کے ساتھ غداری کر رہا ہے اس یقین کے پیچھے مسلسل ناکامیوں کی وجوہات تھیں۔ پچھلے سات مہینوں میں ان کے پانچ کنٹینرز پولیس نے چھاپے مار کر حاصل کر لیے تھے۔ یہ ان سب کے لیے پریشانی کی بات تھی یا تو پولیس کو ان کا علم ہو گیا تھا یا پھر کسی نے غداری کی تھی اور اب اس غدار کا انہیں علم ہو گیا تھا۔

ٹھیک دو منٹ کے مزید انتظار کے بعد شجاع احمد ایک چھوٹا سا بریف کیس اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ ان چاروں پر نظر پڑی تو وہ معذرت کرتا اپنی چیئر پر بیٹھ گیا۔

"میرے دوست کی بیٹی کو کسی نے اغوا کر لیا ہے اس کی بازیابی کی کوششوں میں مصروف تھا اس لیے دیر ہوئی۔" اس نے اپنے دیر سے آنے کی وضاحت کی۔

"تو کیا مل گئی اس کی بیٹی؟" رانا سرفراز نامی بزنس مین نے چبھتے لہجے میں سوال کیا۔

"نہیں ابھی نہیں اس لیے میں جلد واپس جاؤں گا، ویسے بھی میں حیران ہوں اس ہنگامی ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی کیا اس غدار کا علم ہو گیا؟" وہ قدرے تجسس سے بولا کیونکہ پچھلی میٹنگ میں یہی بات طے ہوئی تھی کہ جلد از جلد اس آدمی کا پتا لگائیں گے جو پوری ٹیم کو متاثر کر رہا تھا۔ اس لیے ان حالات میں وہ یہی سمجھا کہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ ان کے ساتھ کون دھوکا دے رہا ہے۔

"ہاں علم ہو گیا۔" دلاور نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے لہجے میں کہا۔

"ونس گریٹ۔" وہ خوش ہوا۔ "کون ہے وہ غدار میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا۔"

"ہمارا بھی یہی ارادہ ہے۔" رانا سرفراز کے لہجے کی چبھن نے اسے چونکایا لیکن اس نے نظر انداز کیا۔

"تو پھر کہاں ہے وہ سامنے لاؤ اس خبیث کو۔"

"سامنے ہی تو ہے۔" چاروں بیک وقت بولے تو وہ حیران ہو کر ان کے چہرے دیکھنے لگا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب پتا نے کے لیے ہی تم نے غدار کو بلوایا ہے۔"

"اسٹاپ دس نان سینس، کیا مذاق ہے؟" وہ غصے سے دھاڑا۔

"مذاق نہیں حقیقت ہے تم ہی وہ کمینے ہو جو پولیس کے ساتھ مل گئے اور اب ہمیں بھی پکڑوانا چاہتے ہو۔"

"کیا ثبوت ہے تم لوگوں کے پاس؟"

"اپنے ہی ورکرز نے تمہارے خلاف گواہی دی ہے؟"

"یہ میں نہیں مان سکتا یقیناً تم لوگوں نے انہیں خریدا ہے۔" وہ بے یقینی سے بولا اسی وقت رانا سرفراز کے اشارے پر تین آدمیوں کو اندر بھیجا گیا۔ یہ تینوں شجاع احمد کے اپنے ملازم تھے۔ انہیں دیکھ کر سالار کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ تقریباً آٹھ نو ماہ پہلے اس نے ان آدمیوں کو شجاع کے ورکرز میں شامل کروایا تھا۔ وہ اپنے چچا کا انجام اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنا چاہتا تھا اس لیے اس کے خاص ملازم نے اس کمرے میں ریکارڈنگ کا بندوبست کیا۔ سالار اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا بالکل ساتھ والی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھا چچا کا متوقع انجام دیکھ رہا تھا۔

"ہاں تو پہچان لیا اپنے آدمیوں کو یا پھر سے شناخت کرواؤں۔" دلاور کا شیطانی قہقہہ گونجا۔

"یہ میرے ہی ورکرز ہیں لیکن ان میں نے کچھ... عرصہ پہلے ہی ملازمت دی تھی۔ اس کا مطلب ہے میرے خلاف سازش تیار کی گئی ہے۔" شجاع احمد سر پکڑ کر بولا۔ رانا کے اشارے پر وہ ملازم باہر نکل گئے

"میرا یقین کرو، میں تم لوگوں کو دھوکا دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ گروپ میں نے ہی تشکیل دیا تھا اور اسے بنانے میں برسوں کی محنت ہے، میں اسے چیٹ کر سکتا ہوں؟"

"وضاحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم بھی جانتے ہو اس کھیل میں معافی کا لفظ نہیں ہوتا۔" رانا سرد لہجے میں بولا اور اپنا پستول نکال لیا۔

"ٹھہرو رانا اتنی جلدی کیا ہے اسے ہمارے نئے پارٹنر کا دیدار تو کرا دو۔" دلاور نے گردن کو خاص انداز میں گھماتے ہوئے کہا اور دروازے پر کھڑے ملازم کو اشارہ کیا، اس نے دروازہ کھولا تو جو شخص اندر داخل ہوا اسے دیکھ کر جہاں شجاع احمد اپنی جگہ پر اچھلا وہیں سالار بھی بری طرح چونکا۔

"کمال۔" شجاع احمد کے لبوں سے لرزتے ہوئے نکلا۔

"سرپرائز......" کمال نے اندر آکر مسکراتے ہوئے شجاع احمد کو دیکھ کر کہا۔

"تم کمینے انسان یہ سارا جال تم نے ہی بچھایا ہے۔" شجاع اس کی طرف جھپٹا لیکن دو اسلحہ بردار گارڈز نے اسے جکڑ لیا۔

"وقت ختم ہوا جانِ من۔" کمال اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارا انجام دیکھنے کا شوق ہوا تو سوچا تمہاری خالی کرسی سنبھال لوں۔"

"میں تو جا رہا تھا یہ ملک چھوڑ کر بدلے میں صرف تمہیں کچھ مزہ چکھانا چاہتا تھا لیکن رانا کو بڑی اچھی آفر ہوئی۔" وہ رانا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"رانا پرانا یار ہے اس کی آفر کو ٹھکرا نہیں سکتا، اس نے تمہارا پتا صاف ہونے کا بتایا تو یقین کرو سب پلاننگ چھوڑ کر دوڑا چلا آیا ہوں۔" وہ خباثت سے بولا۔

"اس سیٹ کا نیا... حقدار تمہارا بھتیجا یا پھر کمال ہی ہو سکتا ہے اسی لیے ہم نے مشورہ کیا اور تم نے آفر قبول کر لی۔" رانا نے کمال کے یہاں ہونے کی وجہ بتائی۔ شجاع احمد کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کمال کا خون پی جائے اور باقی چاروں کو بھون ڈالے۔

"چلو اب گڈ بائے کا وقت آ گیا ہے، کافی ڈرامہ دیکھ لی۔" ان پانچوں نے اپنے پستول اس پر تان لیے۔

"یہ دھوکا ہے کمال کی چال ہے، میں تم جیسے غداروں کو برسوں پالتا رہا۔"

"میں نے دھوکا نہیں دیا یقین کر سکتے ہو تو کر لو ورنہ مجھے اعتراف کرنے میں کیا مسئلہ ہوتا لیکن ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔" کمال بولا۔

"تمہارے بھتیجے نے تمہارے بھائی کے قتل کی ویڈیو میں نے ہی بنائی تھی۔" اس نے آنکھ مار کر کہا۔ "سوچا وہ تمہارا منا بزنس میں تمہیں خود ہی اوپر پہنچا دے گا لیکن احمق نکلا تمہارے جیسا بزدل مگر اوپر والے کا انصاف دیکھو تمہیں تمہاری کمینگی کی سزا میرے ہی ہاتھوں دلوا رہا ہے۔" کمال نے شجاع کی دائیں ٹانگ پر گولی ماری۔ تکلیف کی شدت سے وہ بلبلا اٹھا۔

"تمہارے بیٹے کو میری داشتہ عنقریب پھنسا ہی لے گی اپنے جال میں پھر تمہاری دولت پر میرا ہی قبضہ ہوگا یہ اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ تم پریشان مت ہو کہ تمہارے اور تمہارے بھتیجے کے مرنے کے بعد تمہاری دولت ضائع ہوگی، وہ میرے محفوظ ہاتھوں میں ہوگی۔"

"میرے بھتیجے سے دور رہو خبردار تم نے اس کی طرف اپنی غلیظ نظروں سے دیکھا بھی۔" تکلیف کے باوجود وہ

غصے کی شدت سے بولا۔

''انجام تم دیکھ نہیں سکو گے لیکن بے فکر رہو اسے میں نہیں عفیفہ مارے گی کیونکہ میں نے اس کے ذہن میں بچپن سے سالار کے باپ کے بارے میں غلط فہمی ڈالی ہے۔ وہ یہ جانتی ہے کہ اس کی ماں کو کس نے مارا تھا، وہ سالار سے شدید نفرت کرتی ہے اس کی دولت پر قبضہ کرتے ہی اپنے ہاتھوں سے مارے گی۔'' کمال کا انکشاف دل ہلا دینے والا تھا۔ سالار اپنی جگہ سے اچھل پڑا۔ اسی وقت سب نے اپنے اپنے پستولوں سے اسے بھون کر رکھ دیا۔

''مرو گے تم کتے۔'' آخری الفاظ شجاع کے منہ میں ہی رہ گئے اور وہ گر گیا۔ سالار کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو نکلنے لگے۔ وہ ارادہ کر چکا تھا کہ ان لوگوں کو عنقریب بے نقاب کر دے گا اس کے پاس سب کے بارے میں ثبوت بھی تھے اور ان کے پتے بھی جانتا تھا۔ جیسا انجام اس کے چچا کا ہوا تھا ویسا ہی وہ ان کا بھی دیکھنا چاہتا تھا لیکن اسی وقت سائرن کی آواز پر اس نے چونک کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ پولیس ان سب کو گھیرے کھڑی تھی۔ آناً فاناً سب کو ہتھکڑیاں لگائی گئیں۔ پھر دروازے سے ایک لڑکی اندر آئی اور دوڑ کر شجاع احمد کی طرف بڑھی۔

وہ شجاع احمد کے پاس اکڑوں بیٹھ کر رونے لگی۔

سالار منہ کھولے اس لڑکی کو دیکھنے لگا، یہ بلاشبہ حنا تھی۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ ملزموں کو گرفتار کر کے لے جایا گیا۔ ایک سول لباس میں ملبوس شخص حنا کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ افسردگی سے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

''ہمیں دیر ہو گئی انکل، انہوں نے بابا کو مار دیا۔''

''برے کاموں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے بیٹا۔''

''میں اس لیے آئی تھی کہ انہیں گرفتار ہوتا دیکھ سکوں وہ پکڑے جاتے جیل چلے جاتے تو سکون میں رہتی کہ وہ زندہ تو ہیں لیکن اب انہیں کبھی بابا نہیں کہہ سکوں گی۔'' اچانک رونما ہونے والی خونی صورت حال نے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

''روتا نہیں تم میری بہادر بیٹی ہو آج تمہاری وجہ سے ہم اس خطرناک گروہ کو پکڑنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔''

''لیکن انکل طاہر میں انہیں بابا کہہ کر پکارنا چاہتی تھی۔ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ میں ان سے اتنی نفرت نہیں کرتی... جتنی وہ سمجھتے ہیں۔'' روتی بلبلاتی وہ لڑکی حنا اس کے چچا کی بیٹی تھی۔ یہ انکشاف سالار کو حیران کیے دیتا تھا۔ اسی بیٹی نے اپنے باپ اور اس کے گروہ کا شکار لگایا تھا، پھر دوسرا انکشاف تھا [illegible] ابھی کی بات کو سمجھ نہ سکا لیکن اس کی نظر [illegible]

سلسلے کی اسکرین اپنا [illegible] تھیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں کمرا خالی ہو گیا۔ خالی کمرے کی طرح جیسے سالار کا ذہن بھی خالی ہو گیا۔ آج اگر وہ اس کمرے میں بیٹھا یہ سب کچھ نہ دیکھ رہا ہوتا تو اتنے رازوں سے پردہ نہ اٹھتا۔ عفیفہ پر وہ یقین کرنے لگا تھا لیکن وہ اس کے باپ کو اپنی ماں کا قاتل سمجھتی تھی اور اسی وجہ کی بنیاد پر اس کے قریب ہوئی تھی تاکہ بدلہ لے سکے۔ اس کا پورا وجود پسینے میں شرابور ہو گیا۔ چچا کے لیے بچھائی گئی بساط نے آج کتنے چہروں کو بے نقاب کیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اسکرین آف کی اور بمشکل گیراج میں کھڑی گاڑی تک پہنچا۔

☆☆☆

شجاع احمد کی تدفین پر سالار نے اپنے چچا کی پہلی بیوی ریشم کو بھی دیکھا۔ وہ جنہیں مردہ سمجھ چکا تھا، وہ زندہ تھیں۔ ایس ایس پی شجاعت کے ساتھ کھڑے طاہر نے حنا کو اپنے ساتھ لپٹا رکھا تھا۔ پھر وہ اسے ساتھ لیے سالار کی جانب بڑھا، وہ کچھ دیر کھڑا اسی کو دیکھ رہا تھا۔

''بیٹا یہ تمہاری کزن ہے شجاع احمد کی بیٹی۔'' انہوں نے اپنی طرف سے انکشاف کیا۔ سالار سمجھ گیا کہ کیوں وہ اسے پہلے دیکھی دیکھی لگتی تھی کیونکہ آج وہ لینس کے بغیر کھڑی تھی اور ہوبہو شجاع احمد جیسی لگ رہی تھی۔

''میں جانتا ہوں۔'' وہ بولا تو طاہر کے ساتھ ساتھ حنا نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔ ایس ایس پی شجاع بھی وہیں آ گیا۔ ''ہمیں افسوس ہے شجاع صاحب کی اس طرح کی موت کا۔''

''مجھے آپ کو بتانے اعتراف کرنا ہے ایس ایس پی صاحب۔'' وہ قدرے نادم لہجے میں بولا۔

''ہم جانتے ہیں تمہارے اعتراف کو۔'' ایس ایس پی نے کہا تو سالار نے سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

''تم نے جو خط عفیفہ کو دیا تھا وہ حنا نے اس کی پاکٹ سے چرا لیا، یہ ہمارے ہی لیے کام کر رہی تھی۔'' ایس ایس پی کے کہنے پر اس نے حیرانی سے حنا کو دیکھا۔ ''اس خط سے ہمیں اندازا ہوا کہ تم نے شجاع کا گھیراؤ کرنے کا ارادہ کیا ہے ہم وقت پر وہاں پہنچ جاتے لیکن حنا کو بازیاب کروانے میں دیر ہو گئی۔'' ایس ایس پی کے کہنے پر سالار کو یاد آیا اس کے چچا نے آتے ہی اپنے دوست کی بیٹی کے اغوا کا ذکر کیا تھا۔

''لیکن تمہیں کس نے اغوا کیا؟ انکل کمال تو وہیں تھے۔''

''اسی نے جس کا اس نے خط چرایا تھا۔''

خفیف سا سالار کے ہونٹوں سے نکلا۔

''بالکل صحیح اس نے اپنے عاشق کی مدد سے اسے اغوا کروایا تھا۔ ہمارے بندوں نے جلد ہی حنا کو بازیاب کروالیا۔''

''عاشق!'' لفظ عاشق پر وہ چونکا۔

''ہاں وہ کافی عرصے سے کمال کو بے وقوف بنارہی تھی، رات کمال وغیرہ کو گرفتار کر کے ہم نے اس کا بیان لیا تھا وہ اعتراف کر چکی ہے کہ وہ تمہیں بھی لوٹنا چاہتی تھی، تمہاری اور کمال کی دولت پر قبضہ کر کے وہ اپنے عاشق کے ساتھ اس ملک سے فرار ہونے والی تھی۔ لیکن فیصل نامی وہ لڑکا اب اس سے بدظن ہو چکا ہے اس کو نہیں پتا تھا وہ کمال کی داشتہ تھی۔''

''او مائی گڈنیس، وہ چالاک لڑکی سب کو فول بنارہی تھی لیکن اس نے حنا کو کیوں اغوا کیا۔''

''سامنے کی بات ہے۔'' طاہر بولا۔ ''وہ نہیں چاہتی تھی کہ حنا اس کے راستے کی رکاوٹ بنے تمہارا رجحان حنا کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ بات اسے مشکوک کرنے لگی۔ حنا کو کچھ دن غائب رکھ کر اپنا پلان کامیاب ہوتے ہی وہ اسے مار دیتے۔'' طاہر کے بتانے پر اس نے حنا کی جانب دیکھا، وہ سنجیدہ سی کھڑی تھی۔

''جہاں تک تمہارا تعلق ہے تم نے بھی اگرچہ براہ راست قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیا لیکن بلاواسطہ ایسا کیا، شجاع کا امیج اس کے گروپ میں تمہاری وجہ سے خراب ہوا اور نتیجہ انہوں نے اسے بھیانک موت دی لیکن اچھا ہوتا کہ تم پولیس کو انفارم کرتے۔''

''چچا نے میرے ماں باپ کو قتل کروایا تھا تو میرا حق بنتا تھا کہ ان کو ان کے انجام تک پہنچاؤں۔'' سالار اعتماد سے بولا۔ ''یقین جانیے مجھے ذرہ برابر افسوس نہیں ہوا ان کی موت کا، آپ مجھے خوشی سے گرفتار کر سکتے ہیں لیکن میں عنقریب رانا سرفراز اور دلاور وغیرہ کو پکڑ وانے کا ارادہ کر چکا تھا۔''

''میں تمہاری بات پر یقین ہے کیونکہ تمہاری وجہ سے ہی ہم اسلحے کے کنٹینرز کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے چونکہ تم قانون کا ساتھ دیتے رہے ہو اسی لیے تمہیں معاف کیا گیا ہے۔'' ایس ایس پی بولا تو سالار نے مسرت سے انہیں دیکھا۔

''مجھے تم دونوں پر فخر ہے جب تک ہماری نوجوان نسل تم دونوں جیسا جذبہ دکھاتی رہے گی تب تک یقین کرو اس وطن کو کچھ نہیں ہونے والا۔'' بریگیڈیئر طاہر نے بیک وقت حنا اور سالار کے جذبوں کو سراہا۔ اور کچھ دیر میں ایس ایس پی کے ہمراہ چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی سالار نے قدرے سنجیدگی سے حنا کی طرف دیکھا۔

''تم نے سب کچھ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔'' سوال میں شکوہ کا عنصر نمایاں تھا۔

''تم نے بھی تو کچھ نہیں بتایا۔'' وہ ترچھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

''مجھے پتا ہوتا کہ تم میری سوئٹ سی کزن ہو اور پولیس کے ساتھ مل کر اپنے ہی بابا کو پکڑ وانے آئی تو یقین کرو سب سے پہلے تمہیں ہی بتاتا۔''

''میں بھی ایسا ہی مظاہرہ کرتی اگر مجھے تمہاری مکمل بے گناہی کا پہلے علم ہوتا۔''

''کیا مطلب۔''

''مطلب یہ کہ میں اور انکل طاہر وغیرہ یہی سمجھتے تھے کہ تم بھی بابا کے اس کام میں شامل ہو۔''

''کیا بات ہے اور میں میڈم کو خوامخواہ ہی ذہین سمجھتا رہا۔''

''ذہین میں بھی تمہیں لگتی رہی لیکن نفیسہ جیسی آنٹی تمہیں بے وقوف بناتی رہی۔''

''مرد بیچارے خواتین کے معاملے میں بے وقوف ہی ہوتے ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ بھنویں اچکا کر شرارتی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''تو پھر مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار ہو۔''

''اگر تم بناؤگی تو سر کے بل بنوں گا۔'' وہ شریر ہوا۔ اسی وقت ریشم ان کے پاس آگئی۔

''شجاع زندہ ہوتے تو تم دونوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ان کی دلی آرزو تھی کہ اپنی آنکھوں کے سامنے تم دونوں کو ایک ہوتا دیکھتے۔'' وہ جہاندیدہ عورت تھی۔ دونوں کی پسندیدگی ان کی آنکھوں سے پڑھ چکی تھی۔ دونوں نے اپنے اپنے دل میں عہد کیا کہ وہ اپنے چچا اور بابا کی خواہش کو ضرور پورا کریں گے کیونکہ وہ جیسے بھی تھے ان سے حقیقی معنوں میں دل سے پیار کرتے تھے۔ پیار ان دونوں کو بھی تھا لیکن صرف اسی وجہ کی بنا پر وہ ہزاروں بے گناہوں کے قاتل کو معاف نہیں کر سکتے تھے۔ بدی بری بلا کی طرح انسان کے گرد اس کے اپنے ہی اعمال کا جال بنتی رہتی ہے اور ایک دن انسان انہی اعمال کے شکنجے میں بری طرح پھنس جاتا ہے یہی مکافات عمل ہے۔